

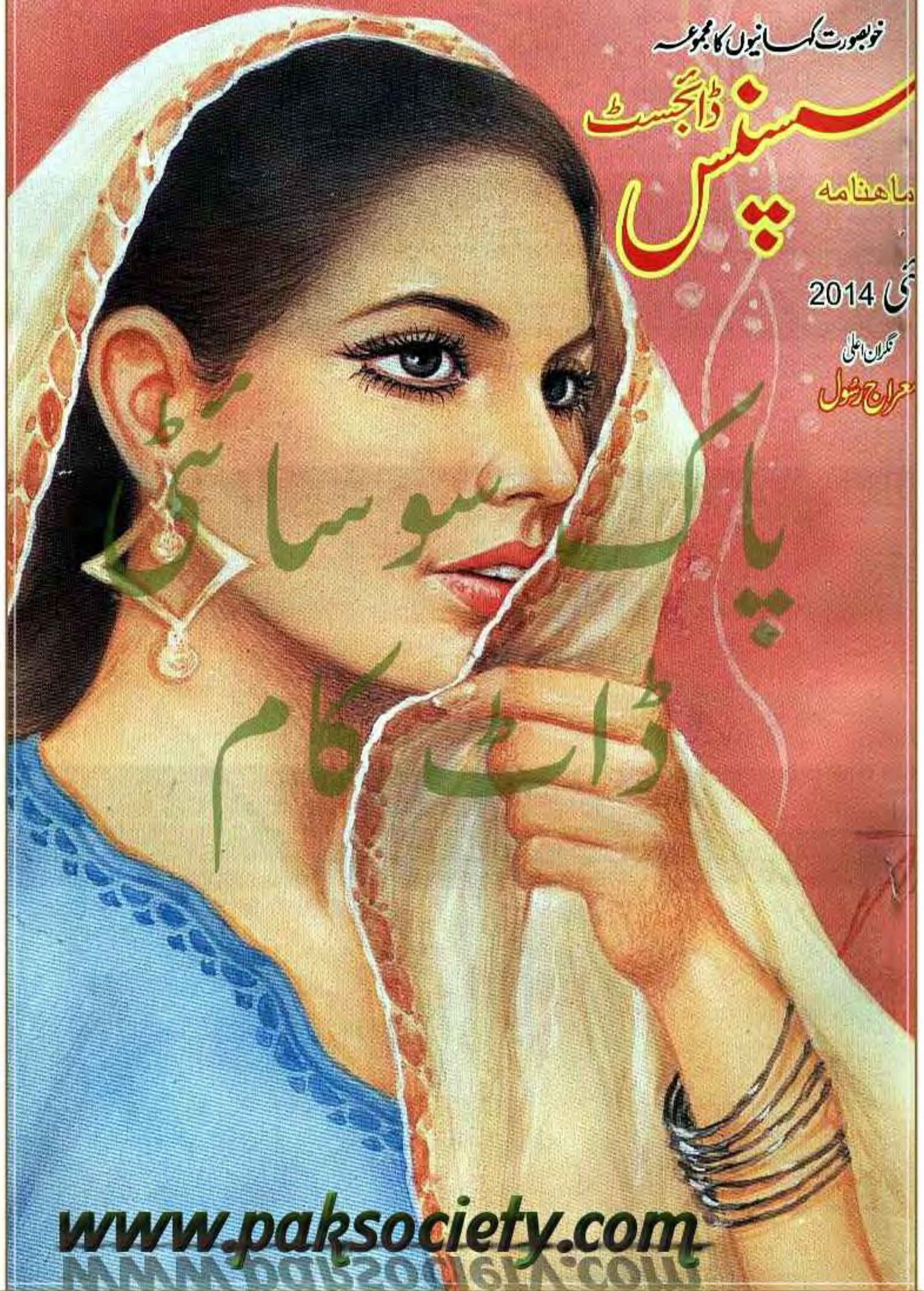
خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

جی 2014

نگران علی
عمران چوہدری



www.paksociety.com



154

قارلین

محفل شعروں

آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

157

قنویہ ریاض

سورا

اس عفت کی ترقی کا راز ہے
لغزشوں سے سیکھنے کا مسرہ آہستہ

162

محی الدین نواب

ماروی

ایک چوڑی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی
عنایتوں، برقاؤں اور رقابتوں کا ایک نل دبا سلسلہ

207

امجد رئیس

ستم ظریف

اغوا برائے تاوان کی ایک
چوٹ کا دینے والی روداد

221

نجمہ مودی

مٹی کی چوری

بے شمار وارداتوں اور دلچسپ واقعات
میں سے ایک کا انتخاب



209

ضیاء تنسیم بلگرامی

متکلم صوفی

اپنی کرامات و عبادات سے مخلوق کو
نسیغ یا ب کرنے والے ولی کی روداد

236

ناصر ملک

بے لاوزان گنبد

تدبیریں جسے خسیروں کا راز پانے والی ایک
عقلمند گھڑیل کی انصاف کی لازوال داستان

000

ادارہ

کترین

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیف، چٹکے
انتہا سے مکرانیں اور قیمتی سب کچھ آپ کے لیے

انٹرایک

7

جون ایلیا

زندگی کی تلخ حقیقتوں اور
رائنگانی پر ایک نوحہ

آج کے خط

8

مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت و ستارین کی تلخ و
شیریں باتیں گلے شکوے اور چٹلوس مشورے

گوشہ دریاں کے اسیر

16

الیاس سینا پوری

ماضی کا آئینہ، ہاں اختیار اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

پس نماں

70

طاہر جاوید مغل

دیہات میں اپنوں سے دور کی لاش میں مگرداں
محبتوں کی کرم فرمایاں اور قیوں کی عنایتوں کی داستان

دست آید

120

فرزاد مجیدی

عدالت کے کھڑے میں
ایک جھوٹے کیس کا سچا فیصلہ



51

کاشف زبیر

باہمت

سگتے جسم و جہاں کے آہستہ کر بناک
لحیات کا عبرت ناک قصہ

113

سلیم انور

انوکھا انتقا

بے وقوف مگر ایک سچے انسان
کے ہاتھوں رسوا ہونے والوں کا انجھام

147

ڈاکٹر شیر شاہ سید

ہیجان

سگریز رستوں پر قدم اٹھاتی
ایک حسینہ کی کاوشوں کا احوال

جلد 44 • شمارہ 05 مئی 2014 • 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتہ: وسنجکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 • فیکس: (021) 35802551 • E-mail: jdpgroup@hotmail.com

پبلشر پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیزا ایکس لینشن، ڈیفنس سٹریٹ کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

راکھیا دھواں

”ابھی کی بات ہے کہ میں آسمان کی نیلگوئی میں کھویا ہوا تھا اور میں اور میرا خیال، دونوں شمال زمردیں کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ ہم دھول اور دھوئیں کی نامہربانی سے بہت اوپر، بہت اوپر تیر رہے تھے۔“

”سچ سچ!“

”ہاں ہاں، سچ سچ۔ کیا میں تجھ سے جھوٹ بولوں گا، اپنے آپ سے۔ اپنے اندر کے یار سے، اپنے اندر کے جوڑی دار سے؟ حد کر دی تو نے بھی۔“

”اچھا تو پھر ہوا کیا؟ تو اور تیرا خیال شمال زمردیں کی طرف پرواز کر رہے تھے تو پھر.....؟“

”میں نے ایک آواز کو گنگنا تے ہوئے سنا۔ نہ جانے وہ مغرب کی آواز تھی یا مشرق کی، شمال کی تھی یا جنوب کی۔ وہ گنگنا رہی تھی۔“

”ہم محبت میں سانس لیتے ہیں تو فضا میں خوشبو پھیل جاتی ہے۔ ہم محبت سے دیکھتے ہیں تو پیڑوں کے پیلے پتے ہرے ہو جاتے ہیں اور اپنی چونچ سے اپنے بال و پر کو کھجاتے ہوئے پردے دھوپ جلی منڈیروں سے اڑتے ہیں اور گھنے پیڑوں کی ٹہنیوں پر جھول کر اور جھوم کر چہانے لگتے ہیں۔“

”وہ آواز گنگنا رہی تھی۔ محبت موسم بدل دیتی ہے، لو چل رہی ہو تو کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ احساس اور خیال کی جھلسی ہوئی سمتوں میں، بھگی ہوئی ہوا بہنے لگتی ہے۔“

”پر کیا، ایسا ہوتا بھی ہے؟“

”تو اور کیا! ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ اور اسی کو بھلا دیا گیا ہے۔“

”کسے؟“

”محبت کو۔ محبت کو یکسر بھلا دیا گیا ہے۔ کیا نہیں بھلایا گیا ہے؟ دلوں میں کھوٹ ہے اور کیسی! کہنے ہیں اور کتنے! میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہی رہا تو سب کے سب یار اکھ ہو جائیں گے یا دھواں۔ میں، ہاں میں کہتا ہوں کہ تم سب راکھ ہو جاؤ گے یا دھواں۔ تم نیچے کا بھی گھانا ٹھہرو گے اور اوپر کا بھی۔“

”تم کتنے برے بولنے والے اور کتنے برے سننے والے ہو۔ تم زہر بولتے ہو اور زہر سنتے ہو۔ تم سے تو زبان بھی پناہ مانگتی ہے اور کان بھی۔ تمہاری زبان دلداری سے اور تمہارے کان غم گساری سے محروم ہیں۔ تم تو اب بس وہی کچھ کہتے ہو جو کہنے کے لیے ہے ہی نہیں۔ سو اب تم بس وہی کچھ سنتے ہو جو سننے کے لیے ہے ہی نہیں۔ وائے ہو تم پر کہ تمہاری مجلسیں اور دوپہریں بداندیشی کی ہوس میں جوتے چٹکتی ہیں۔ تمہاری شا میں بے حسی کو آنکھ مارتی ہیں اور تمہاری راتیں بدانجامی کا پہلو گرم کرتی ہیں۔“

”پھر ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا؟ ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا۔ تم آخر کب تک دلوں کی ویرانی اور خیالوں کی گراں جانی میں دن گزارتے رہو گے؟ کیا اس طرح دن گزار کے تمہاری الجھنیں دور ہو جائیں گی؟ کیا اس طرح زندگی بسر کر کے تمہیں سکون ملتا ہے، کیا تم چین سے ہو؟ ہاں، یہ سوال تو مجھے خوب سوچھا۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، کیا تم سچ سچ چین سے ہو؟

”جھوٹ بولنے کی نہیں ٹھہری اور پھر اس کا کوئی حاصل بھی نہیں ہے۔ جھوٹ بول کر اور پھر خود اپنے آپ سے جھوٹ بول کر نہ اپنے حلق سے لقمے اتارے جاسکتے ہیں، نہ اچھو لگے بغیر پانی کے گھونٹ لیے جاسکتے ہیں اور نہ گہری نیند سویا جاسکتا ہے۔ سنو، جھینو مت! میں تمہارے اندر سے بول رہا ہوں۔ مجھ سے جھینو مت۔ میں، تم ہوں۔ میں تم سب کے اندر کا تم ہوں۔ تم چین سے نہیں ہو۔ میں چین سے نہیں ہوں۔ ہم چین سے نہیں ہیں۔“



محترم قارئین
السلام علیکم!

مئی 2014ء کا دلچسپ شمارہ اور گرم ہواؤں کی آمد ساتھ ساتھ آپ کے پاس..... عہد حاضر کا اگر صرف آلام و مصائب کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ موسم کی گرمی تو قابل برداشت ہے لیکن تباہ کن حالات کا تسلسل تو دراز سے دوا تر ہوتا جا رہا ہے..... اس کا کوئی اختتام بھی ہے کہ نہیں..... اگر اجتماعی اعمال پر نظر ڈالنے کے بجائے ہم انفرادی طور پر صرف ایک لمحے کے لیے اپنی جانب بھی ایک پُر فکر نظر ڈالیں کہ جانے انجانے میں ہم سے بھی تو کہیں کچھ غلامی زدگیں ہو رہی ہوں یا تو بہتر ہوگا۔ جیسا کہ عہد شریف میں ہے کہ "معترب لوگوں پر ایسا بھانسنے والا ہے کہ آدمی پروا نہیں کرے گا کہ حرام مال لے رہا ہے یا حلال۔" اس کے علاوہ مختلف جگہوں پر قیامت کی نشانیوں میں کہا گیا ہے کہ جب تم دیکھو کہ لوگ نمازیں ترک کرنے اور امانت خالص کرنے لگیں، سود کمانے، ناپ تول میں کمی، جھوٹ اور غیبت کو حلال سمجھنے، معمولی بات پر خون ریزی کرنے لگیں، ظلم و طلاق اور ناگہانی موت اور والدین کے ساتھ بدسلوکی عام ہو جائے تو جھوٹا قیامت بہت قریب ہے۔ دیکھا جائے تو یہ وہ باتیں ہیں جن پر عمل کرنے کے لیے تو حکومتی اداروں کی ضرورت ہے اور نہ ہی سیاسی بازی کروں کے جلے جلوس کی ہمران پر عمل کرنے یا ترک کرنے سے ہماری انفرادی زندگی اور معاشرے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اس کا دارا کرنا ہمارے لیے ہمیشہ گزیر رہا ہے۔ قیامت سے پہلے قیامت کا آنا انسان کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے اور ان معاملات میں تربیت کا بہت عمل دخل ہے۔ کیا ہم اپنی اولاد کی تربیت صحیح خطوط پر کر رہے ہیں۔ کیا اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں میں داخل کرا کے ہم اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں۔ نہیں..... اصل تربیت گاہ تو بچے کا اپنا گھر اور ماں کی گود ہے۔ اس سلسلے میں کہیں ہم کسی غفلت کا شکار تو نہیں ہو رہے۔ اپنا تجزیہ کرنے کے لیے کیا ہمارے پاس ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر غفلت کی ابتدا کسی معمولی رسم سے ہو سکتی ہے تو غلطیوں کی اصلاح کا آغاز بھی اسی رسم سے کیا جاسکتا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا..... انہی گھبر گھٹکوں کے بعد ایک خوشگوار بات بھی آپ سے شیئر کرنا چاہتے ہیں۔ کراچی کے پسماندہ علاقوں سے بے روزگاری کے عالم میں کئی کوچوں میں کھیلنے والے باہت کھلاڑیوں نے اسٹریٹ چلڈرن بلڈیال ورلڈ ٹورنامنٹ میں جو حال ہی میں برازیل میں کھیلایا تیسری پوزیشن لے کر پاکستان کا نام روشن کر دیا اور جیت کر دیا کہ اگر حالات سازگار ہوں تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے..... اور اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اپنی اس شگفتہ محفل میں جہاں دلچسپ نوک جھوک جاری ہے۔

محمد صفدر محاسب، تحصیل و ضلع خانیوال سے محفل کی زینت بنے ہیں۔ اپریل کا شمار پشاور کے خوشگوار موسم میں 19 جولائی جہاں پر گرمی آتی تو ہمارے بارش نے موسم کو گھٹا کر دیا۔ پہلے کچھ شادی کی مصروفیات اور کچھ آپ کے دوپے سے دلبرداشتہ ہو گیا تھا کہ ہر بار ہمارا تہجرہ آپ کی نوکری کی نذر ہو گیا۔ ایک بار پھر گرمی اٹھانے پر مجبور ہوئے۔ سرورق کی ماڈل اپنی خوب صورتی کو ظاہر کرتے ہوئے ہماری آمد کا پتہ دے رہی ہے۔ انتہائی گرمی میں جون ایلیا کا اعجاز کھنگوڑا حقیقت کو عیاں کرتا نظر آیا۔ آپ کا ادارہ پڑھا آپ بے حس عکراؤں کو جگاتے نظر آئے کہ خدا کے لیے شرم کرو کہ انسان بھوکوں مر رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ سندھ صاحب یکن کریم یونیس کے مرنے اڑاتے رہے کیا ان کو یاد نہیں کہ ہم نے سب سے بڑے حاکم کو درخشاں حساب دینا ہے کہ زندگی میں حکمرانی کی تو میری مخلوق کے ساتھ تو نے کیا کیا۔ محفل میں آئے تو میرے مقصود ملی صاحب ایچے تہجرے کے ساتھ کرسی صدارت پر قبضہ جاتے بیٹھے تھے مبارک! جی۔ اشفاق شاہین۔ سہرہ بخاری، ارم بٹول، سوبانی، ایچے تہجرے اور محفل والوں کو درگزاؤں نظر آئیں۔ مہرین ناز، اعجاز احمد راشی علی ڈوگر۔ الفاظ کا بہترین چناؤ کرتے ہیں تہجرے میں۔ لالہ قیصر اقبال محفل میں اپنی آمد کی خبر چٹ پٹے تہجرے میں دیتے نظر آئے۔ محفل میں باقی سب کے تہجرے بھی نہایت ہی اچھے تھے۔ اس دفعہ میں زعمال پڑھنے پر بہت مزہ آیا، کہانی نے اپنی گرفت میں لے لیا حجاب کے ساتھ کیا ہے گا اور ہادی کا کیا ہوگا اور ارم کیا گل کھلائے گی ہر گل تہا کا شدت سے انکار ہے۔ ماروی میں اب بہت تیزی آگئی ہے، نہایت ہی دلچسپ قسط تھی۔ اب دیکھتے ہیں کہ مراد کہاں تک بھاگتا اور کامیاب ہوتا ہے اور محبوب نے سچ عاشق ہونے کا ثبوت دیا۔ حساب دشمنان میں لیاقت نے نہایت لرزہ خیز اعزاز میں جیوا کے دشمنوں سے بدلہ لیا اور ملک صاحب کی کیا بات ہے کہ کس طرح مضمون کو دو بوج لیا۔ آبلہ پالہ۔ زینب احمد علی، عامر شمشیر، نور جہاں آذر اور صاحبہ کے کرداروں پر لکھی ایک بہترین کہانی کئی شمارہ میں باقی سب کہانیاں بھی بیسٹ تھیں۔ محفل شعر و سخن کا چناؤ بہترین تھا عالم باطن میں شیخ حسین کے واقعات پڑھ کر دل میں سکون حاصل ہوا۔"

صوبہ اقبال، راولپنڈی سے جلی آری ہیں۔ 22 مارچ کی رات ہم برقی بارش میں پوسٹ میں اگلے نے اپریل کا شمار ہمارے ہاتھوں تک پہنچایا۔ سرورق کی لڑکی اپنی طرف توجہ دلانے میں ناکام رہی تو ٹوکا ٹھہری انتہائی خسارہ پر۔ بے شک انسان ترقی کی منازل طے کرتا جا رہا ہے مگر انسانوں کے اس انہوہ میں خود انسان بے قیمت ہو گیا ہے۔ محفل میں مقصود ملی دنک سیٹ پر نظر آئے، مبارک باد بھائی، ارم بٹول، آپ نے بھی ورلڈ کے ایوارڈ یافتہ بونے کو کھری کھری سا کرول خوش کرو یا تین سلطان نے کامنڈ میم کا خوب مذاق پیش کیا۔ ویسے ہو سکتا ہے چھاری کو بڑھا ہے میں جراتی کے دن یاد آتے ہوں؟ فوزیہ عجم سسر۔

یہ دیا آئی کو ہر اہر ادا کر "اس چیز" کی مثال تو نہیں دی آپ نے؟ بشری افضل آئی، سہرہ بخاری تو خود چاہتی ہیں کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو۔ آپ خود کو بلکان نہ کریں۔ ماروی فاروق، ہماری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔ جس زعمال میں حجاب کا کردار کھلنا جا رہا ہے۔ ہادی کا شیخ کیا رنگ لانا ہے تو ساتھ ساتھ ارم کے پروے بھی گھڑاری کی مدد سے ہٹ جائیں گے۔ ماروی، زبردست قسط دیکھیں مرید کی مراد کے لیے تک و دو کیا رنگ لاتی ہے۔ آخری صفحات پر آبلہ پالہ میں جہاں شمشیر اپنے انجام سے دو جا رہا ہوا وہاں زینب کو اس کے ہر سوال کا جواب بھی مل گیا۔ حساب دشمنان میں لیاقت نے جیوا کے دشمنوں کا قلع قمع کر کے نہ صرف احسان کا بدلہ اٹا بلکہ حق دوتی بھی ادا کیا۔ محفل شعر و سخن میں عرفان احمد کا انتخاب پسند آیا۔"

فوزیہ عجم، خانیوال سے تہجرہ کر رہی ہیں۔ اپریل کا سپینس 20 مارچ کی ایک سہانی صبح کو ہمارے خوب صورت ہاتھوں کی زینت بنا۔ سرورق کی خاص بات لڑکی کے ہاتھ پر لگی مہندی ابھی لگی۔ انتہائی میں انسان کا عروج مگر انسانیت زوال پذیر نظر آئی۔ آپ کے خط میں مقصود ملی کا کہانیوں پر جامع تہجرہ اول قرار پایا، مبارک باد۔ اشفاق شاہین بھائی خوش آمدید کہنے کا بہت شکر ہے۔ سہرہ بخاری صاحبہ کہیں آلو، بیاز کا پڑس تو شروع نہیں کر دیا ہے؟ ارم بٹول ویلڈن ڈیزر، سوبانی! آپ بھی اپنے چہرے سے پردہ ہٹا دیں۔ مہرین ناز لکھا ہے آپ کے بھائی صاحب کہیں تہائی میں بیٹھ کر اپنا منہ فوج رہے ہیں۔ ارے سوری دو تو BIL میں بیٹھے ہیں۔ شوکت بھائی، شانہ سے پوچھ لیا ہوتا، ہو سکتا ہے اس چیز کی ضرورت شانہ جی کو خود یاد ہو۔ بھئی کہانی زبردست مریدان کا کردار اچھا لگا مگر اس کا انجام افسردہ کر گیا۔ پس زعمال کی تیسری قسط خوب رہی۔ ہادی اور حجاب کو حیرت قریب آنے کا موقع ملا۔ دوسری طرف ارم بھی اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ حساب دشمنان میں جیوا کا بچا ہوا حساب اس کے دوست لیاقت نے پورا کیا۔ ماروی میں محبوب چاٹو کی مشکلات تو دوسری طرف مرید کی ضد اور ناگہان کیا رنگ دکھائی ہیں۔ عالم باطن میں شیخ حسین کے حالات واقعات دل کی آنکھوں سے پڑھے۔ آخری کہانی آبلہ پالہ میں زینب کا کردار، شمشیر کا انجام اور آخر میں زینب اور عامر کا ملاپ اچھا لگا۔ محفل شعر و سخن میں اس دن کا اچھا انتخاب پڑھنے کو ملا۔"

اشوک کمار، میر پور خاص سے تہجرہ کر رہے ہیں۔ "M.B.A. فاضل کا اسٹوڈنٹ ہوں، عمر 22 سال سے سپینس ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار ہوں۔ نصائی کتابوں کے علاوہ صرف سپینس ہی میری اسٹڈی میں شامل ہے۔ پچھلے تین چار ماہ سے خط کی محفل میں ایسی دیکھیں دیکھیں جو پہلے نظر نہ آتی تھیں۔ انتہائی اور ادارہ قابل توجہ سائنس ہوتے ہیں۔ اپنی محفل میں آنے کا حوصلہ مجھے ہم مہرین ناز کے بولڈ اور منفرد تہجرے پڑھ کر ہوا۔ وہ سرورق کی جس انداز میں عکاسی اور تحریف کرتی ہیں وہ ذکر اکر اکر کے لیے خراج تحسین ہوتا ہے۔ کیونکہ کئی بھی راسخ اور مصوری تحریف اس کے کام میں نکھار لاتی ہے۔ صدارت پہ آنے والے تہجرے پر فیکٹ ہوتے ہیں لیکن کئی بھی کچھ تہجرے اور ہو جاتے ہیں۔ مقصود ملی صاحب کو صدارت مبارک اس بار تہجرہ صدارت کے قابل ہی تھا۔ اشفاق صاحب آپ کے تہجرے میں کچھ خاص بات نظر نہیں آئی۔ سہرہ بخاری جی آپ ایک ناسخ خاتون ہیں آپ لوگوں کو ان کی اوقات یاد دلواتی ہیں۔ ارم بٹول ایڈیٹ سوبانی آپ کے تہجرے زبردست ہیں، زور قلم اور زیادہ۔ اعجاز احمد راشی صاحب آپ بہت لگی انسان ہیں جو مہرین جی آپ کو اتنی اہمیت دیتی ہیں۔ علی جگر بڑے جی دار بندے ہو آپ! ایلیا آپ کا نام ہی کافی ہے اس محفل میں۔ شین سلطان یہ مرید کس کا تک نم ہے؟ قیصر اقبال آپ کے لیے ایک اور دانہ شہوہ ہے کہ آپ اپنے پاس ایسی لیس کا نمبر Save کر لیں کسی وقت بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ماروی یہ جی الدین نواب کی خوبی ہے کہ وہ کہانی کے ٹیڈ کو تسلسل سے لے کر چلتے ہیں، بہترین کاوشوں پر مبارکباد۔ طاہر جاوید محفل کی پس زندان پڑھی، دلچسپ اور مطومات سے بھرپور صورت تحریر ہے۔ آبلہ پالہ رویندر رشید صاحب کی ہر تحریر شاہکار ہوتی ہے۔ زینب، بہت باہت اور اردو کی بکلی لڑکی ثابت ہوئی۔ خیا عجم بلگرامی صاحب کی عالم باطن میں شیخ حسین کے ایمان افروز حالات واقعات پڑھے۔ ایمان کو جلائی۔ حساب دشمنان اور ملک صفدر حیات اپنی ذہانت اور محنت سے ہمارا سماج کے کل کی اصل وجہ کو سامنے لائے۔ مہر نام کی سوا سیر نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ ہاں البتہ شرمعاس کی غلط جی کچھ اچھی لگی۔ کتر میں کافی پرانی تھیں۔ محفل شعر و سخن میں زہد چوہدری، عامر اقبال، قیصر اعوان، راجا ثاقب اور مہرین ناز کے اشعار بہت پسند آئے۔"

قیصر اقبال گجے بکول ضلع بکر سے محفل کی زینت بنے ہیں۔ "بارشوں کا موسم، سرورقوں کا رخصت ہونا، پھر پلٹ آنا، موسموں کی اس حسین آنکھ مجھ میں ماہ اپریل کا سپینس 20 مارچ کو ملا۔ بارش نے شاید سرورق کی لڑکی کے میک اپ پر بھی اثر ڈالا۔ بھی تو لڑکی کا چہرہ دھلا دھلا سا نظر آ رہا ہے۔ فہرست کو ایک نظر دیکھ کر انتہائی خسارہ سے عبرت کا سامان حاصل کیا۔ بے شک اوموری سچائیوں کے حق نے انسانیت کی صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ آپ کے خط میں جہاں صحرائے تھر کی خشک سالی اور بچوں کی اموات ایک کھلی حقیقت ہے، وہاں کرکٹ کی شکست ایک اور دھچکا ہے۔ محفل میں صدارت کی کرسی مقصود ملی نے سنبھالی۔ مبارک باد آپ کا حق جتا ہے۔ سہرہ بی بی! کیا کرنا یا نہ اسٹور کا کھوکھا کھول لیا ہے جو آلو، بیاز، لہسن کی ہانک لگا رہی ہو۔ چادی سہرہ! کہیں لوگ بخاری کو چناری نہ کہتے لیں؟ ارم بٹول نے حق کا ڈھنگا بھرا ہے ہم علاقہ جادو کی خوب مٹی پلیدی۔ سوبانی! بہت شکر ہے مگر ہمیں کے آگے تین بچا کر تین کی تو ہیں نہ کرو۔ علی ڈوگر بھائی! جس کا منہ اور زبان کالی ہو تو اس کے الفاظ خود بخود کالے ہوتے جائیں گے۔ فوزیہ صاحبہ عجم، مارون رشید برادر اصلاح کر لیں کہ سچے شک نہیں ہوتے۔ شک کرتے ہیں بلکہ ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ ماروی فاروق ہماری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔ آغاز میں زعمال سے کیا، جہاں جلال کے عزائم ارم کے لیے کل کر سامنے آئے، وہاں ہادی بھی گھڑا کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نواب صاحب کی ماروی میں مرید اپنی تک و دو میں معروف ہے تو مراد اور محبوب کی دیوانگی بھی عروج پر ہے۔ محبوب کا مراد کی جگہ لیا عشق کی استہا ہے۔ عالم باطن میں شیخ حسین کے ایمان افروز واقعات ساتھ ساتھ مریدوں کو دے گئے خطابات سے مطومات میں اضافہ ہوا۔ ملک صاحب کی حساب دشمنان میں جہاں قانون کی غفلت سے عابدہ کی موت نے جیوا کو مجرم بنایا، وہیں لیاقت نے بھی دوستی کا حق ادا کر کے سماج اور ہمارے کو کفر کردار تک پہنچایا۔ آخری کہانی رویندر رشید کی آبلہ پالہ کا ایک بہترین کہانی۔ زینب کی حالات کی تک پہنچنے کی جستجو، عامر کا ہر مل ساتھ نبھانا، آگ سے بچانا اور شمشیر کی ہلاکت، سب کچھ بہترین۔ تاریخ کے اور اسی سے الیا س بٹا پوری کی زبردست مریدانہ کارمان سے عشق، ابو جعفر کی سازشیں تو پھر مان کی دجلہ کی

شوکت شہر یار، گورنمنٹ کالونی، اوکاڑہ سے چلے آ رہے ہیں۔ اس مرتبہ اپریل کا شمار 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر ایک پروجے کو دیکھ کر بے اختیار مہرین نازی یاد آگئی۔ محفل میں حاضری دی تو مقصود علی کو کرسی صدارت پر براہمان پایا۔ سہرہ بخاری مسلسل 2 ماہ کی غیر حاضری کے بعد تشریف لائیں۔ وہ نظم۔ ارم بول نے محفل میں دھماکا دار اعتراضی دی اور سب کے چنگے چڑا دیے۔ سید اکبر شاہ آپ کو مہرین نازی کون سی بات سے راحت ملی ہے؟ ماریہ قاروق آپ کو بہن کی شادی مبارک ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مہن زنداں پڑھی، جو آہستہ آہستہ اپنے عروج کی جانب گامزن ہے۔ کاشف ذہیر کی بے خبر ایک انجھی ہوئی تحریر تھی۔ ماریہ اس مرتبہ سیرا کی سازش کا شکار ہو گئی ہے، اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ مختصر کہانیوں میں رقیب، یادداشت، 70 نمبر، سوا سیر، غلط جی، عالم باطن، انجھی تحریریں تھیں۔ اس دفعہ کترنیں شاد اور جس سید اکبر شاہ، ریاض بٹ کے چنگے ایسے تھے۔ محفل شعر و سخن میں محمد امجد ریاض، شبن سلطان، زاہد چوہدری، عارف شاہین، سید اکبر شاہ، مہرین نازی اور احمد خان توحیدی کے اشعار اچھے تھے۔ جمعی طور پر اس ماہ کا شمار شاد ارتھا۔

حسب احمد چٹائے، الگڈی کرک سے حاضر محفل ہیں، ماہ اپریل کا شمار 20 تاریخ کو ملا۔ کل پاک بھارت کا کرا بھی ہے۔ اس ماہ کا ناٹکل سٹار کرنے میں نا کام رہا۔ پھر خطوط کی محفل میں آگئے۔ میرا نام تو بیک لسٹ میں بھی نہیں تھا۔ مقصود علی باپ پر تھے۔ محترم مبارکال، علی بھائی یہاں پر سب ایسا ہی ہوتا ہے پہلے سو سے کھانے کو لیتے ہیں پھر خالی پیٹ ملتی ہے مطلب نام بیک لسٹ میں ہوتا ہے۔ مہرین باقی اعزاز پسند کرنے کا شکر ہے، میرے لیے انکس دعا کرنا۔ کیونکہ 124 پر میں سے میرے سیکڑے ایز کے ایکڑ شروع ہو رہے ہیں۔ بشری باقی سالگرہ کی مبارکباد دینے کا شکر ہے۔ ہمارا تو کبھی کبھار تبصرہ لگ جاتا ہے ویسے یہ میری انعاموں میں سالگرہ تھی۔ مہر نام کی کہانی میں ہمیشہ جسنے پر بخیر کرتی ہے۔ ماریہ میں مریہ نے مراد کو آواز دیا تو کروالیا۔ لیکن مراد کے دل میں اپنی جگہ نہیں بتائی کیونکہ رشتے جذبات سے بچتے ہیں زبردستی نہیں۔ مہن زنداں نے بھی زور پڑ لیا ہے۔ ارم جاب کو گھر سے آؤٹ کرنے کے لیے ہی آئی ہے۔ ملک صاحب کی حساب دشمنیاں بھی ایک سنسنی خیز داستان تھی۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔

زویا اعجاز، لاہور سے محفل میں شریک ہیں۔ اپریل کا شمار 18 مارچ کو اس وقت ہمارے میں آیا جب استقامت کی مصروفیات نے بے حد الجھا رکھا تھا لہذا ڈائجسٹ کا مطالعہ فریفت کے لیے موقوف کرنے کو ترجیح دی۔ ناٹکل پر براہمان محترمہ 80 کی دہائی کی البیہ سیر و سحر کی طرح پوز کرتی ہوئی بالکل نہیں جڑی تھیں۔ جون ایلیا کے لکھے ہر لفظ میں معاشرے کا اصل رنگ جھلکتا ہے۔ شہر کی پکار ہے ہر پاکستانی کا دل ٹھکین اور آنکھیں نم کر دی ہیں مگر اقتدار کے ایوانوں کو جانے کب یہ پکار خواب غفلت اور مٹش و طرب سے جگایا ہے؟ عوام خط اور بدحالی کا شکار ہے اور حکومت و رولڈ ریکارڈ کے لالی باپ کھلا رہی ہے سب کو ایڈیٹر صاحب ایسا کپ میں شکست پر طول نظر آئے مگر عوام کے حوصلے و رولڈ ٹی ٹوئنٹی کے لیے اب بھی جوان ہیں۔ محفل پر نظر دوڑائی تو اپنا نام اس بار بیک لسٹ میں جگہ کا نظر آیا۔ کمال کرتے ہو پائے جی۔ 23 تاریخ کو موصول ہونے والا تبصرہ آپ نے بیک لسٹ کر دیا۔ اس غیر جمہوری اور غیر آئینی اقدام کی وضاحت تو کیجیے۔ (کبھی بھی دل بڑا کر کے دوسروں کو بھی جگہ دینی چاہیے) علی ڈوگر! ہمیں قدرت نے آل دیہی اس دولت سے مالا مال کر رکھا ہے آپ اس حوالے سے کافی ضرورت مند دکھائی دیتے ہیں تو مابعدیت کی طرف سے آپ کو یہ دولت بقدر ضرورت فراہم کی جاسکتی ہے۔ فوریہ تبصیر! بھلا آپ کو ہم نے اس قابل کب سمجھا ہے کہ آپ سیانی بی بی بن کر ہمیں مشورہ دیں۔ آپ اپنے مفت مشورہ سینئر کی جانبداری کریں اور جا کے چکائیے۔ ارم بول خال! آپ کا مرض آپ کو ہی مبارک ہو جی۔ آپ کی کئی غلطیاں ہم کیسے دہراکتے ہیں۔ مہرین نازی! ہم اڑتی چڑیا کے پر گرنے والوں میں سے ہیں۔ کہانیوں میں رویندر رشید کی آبلہ پاستوری آف ہمارے ہی۔ حمرل اور سسٹمز سے بھر پور قدرے طویل اس کہانی نے آخری صفحات کا بھر پور حق ادا کیا اور جہاں کو ہمارے ہر روز یو سیو مائنڈ نے آغاز میں ہی مجرم قرار دے دیا تھا۔ مہن زنداں میں کافی راز و ملت از بام ہوئے مگر جانے کیوں لگتا ہے جاب نے تیش کے حوالے سے کچھ بھلو ہادی سے پوشیدہ رکھے ہیں۔ ماریہ کی یہ قسط ختم ہونے پر شکر کا کل ادا کیا۔ حساب دشمنیاں میں کافی لڑنے و واردات کا احوال سامنے آیا۔ زہر و زہر میں کافی مقامات پر بھی محسوس ہوئی۔ رمان جیسی زیرک صورت کا سب کچھ جانتے بوجھے ایو جیٹر پر اندھا احتیاد سے لے ڈوبا۔ بے خبر سے ہی تجسس میں جکڑ لیا۔ عالم باطن میں ہمارے پسندیدہ عظیم صوفی شاعر شاہ حسین کی زندگی کے کچھ مزید پہلوؤں سے آگاہی ہوئی مگر ماحول وال والا قصہ بھی بھی لکھ لگا۔ سوا سیر کے انجام نے کافی مخطوط کیا۔ رقیب، غلط جی اور 70 نمبر بھی اچھی رہیں۔ اشعار میں سوہانی کا انتخاب بہترین تھا۔

مظہر سلیم، رحیم یار خان سے چلے آ رہے ہیں۔ سسٹمز ڈائجسٹ کے ورق پٹھے ہیں تو قلب و نظری عداوت کے سرے تو اتار کے ساتھ شروع ہو جاتے ہیں۔ سطر سطر مقصود علی بڑھتی چلی جاتی ہے اور لفظ و لفظ روح کی تسکین کا سامان ہم ہوتا رہتا ہے۔ اپریل کا سسٹمز ڈائجسٹ مارچ کو ہاتھوں کی زینت بنا۔ حسب سابق جون ایلیا کے انشائیہ سے مطالعہ کا آغاز کیا۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب نے جن نکات کی طرف توجہ دلائی وہ قابل غور ہیں۔ سچ ہے کہ غزوتوں کی گرم بازاری اور بیخوشی کی قسط سالی میں دگی انسانیت کے دکھ اور بھری بڑھ گئے ہیں۔ ”آپ کے خط“ میں شہر کے موجودہ حالات کے تناظر میں آپ کے ادارے نے سوچ کے دروا کردے منہ جانے حکمران کب ایسے مسائل کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں گے۔ انسانیت کی اکھڑی سانس اور آہو کا پتہ ان کے دل کیوں موم نہیں ہوتے۔ محفل یاراں میں مقصود علی کا تبصرہ اعزاز کی قرار پایا، مبارکال صاحب۔ اس بار کافی سنے نام سامنے آئے۔ مہرین نازی آپ خطوط میں ٹوک جھونک پر مخطوط ہونے کے بجائے مگر مجھ کے آنسو بہاتے ہوئے گوڑے گوڑے تجرے سوچوں کے جوہر میں کیوں اتر جاتی ہیں؟ انکی دوسروں کو مشورہ دینے سے بہتر ہے اپنی اصلاح کریں۔ طاہر جاوید محفل صاحب کا نام کہانی کے لیے پسندیدگی کی سند ہوتا ہے۔ متنوع موضوعات، طرف خیالات، محبت میں رسچے لیے جذبات، زندگی پر محیط روئے معاشرتی مسائل کا ادراک اور ان کا پراثر اظہار، گویا سسٹمز کے صفحات پر زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ مہن زنداں ایک ستر نامہ ایک کہانی، ہادی کی قلاب میں غیر معمولی دلچسپی کی خاص جذبہ کا تاثر دیتی ہے۔ مکی الدین نواب رسالوں کی دنیا کے نواب جب معاشرتی مسائل پر لکھتے ہیں تو معاشرے کے ایسے ایسے پہلوؤں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو اپنی نا سوزی کل اختیار کر چکے ہیں۔ شہت جلالی جیسے مکروہ کردار کی شناخت کو ایسے

سامنے لاتے ہیں کہ قاری اس کردار سے نفرت محسوس کرنے لگتا ہے۔ ملک مقدر حیات کی ڈائری سے اس بار حساب دشمنیاں کے عنوان سے کہانی سامنے آئی۔ قدرت کے انتظام کی جبریت اثر و رسوخ میں سما جھار اور سما جھار کے ہرے گل کا مرکب محفل ”لیاقت یک چشم“ زیادہ دیر تک قانون کی غمروں سے اوچل نہ رہا۔ کا اور آئی زہر اس کا مقدر ٹھہرا۔ اولیائے کرام کے سلسلے میں شیخ حسین کے ایمان افروز واقعات پڑھ کر قلب متور ہوا۔ آخری صفحات کی صفحات ”آبلہ پا“ میں رویندر رشید کے کلم کی جولا نیاں عروج پر نظر آئیں۔ زینب کی آبلہ پائی کی روداد نے بہت متاثر کیا۔ صاحب تحریر طویل عمر سے بعد آخری صفحات پر جلوہ افروز ہو گئے اور چھائیں۔

بشری افضل، بہاولپور سے محفل میں شریک ہیں۔ 20 مارچ کو سسٹمز ملا۔ منف نازک سوچتی اور بڑے اسٹائل سے ماتھے پر ہندی لگے ہاتھ چوڑیوں بھرے بازو، گنگے میں لاکٹ بڑے دلیرانہ اعزاز سے انکار کی گھڑیاں گزرنے کے انتظار میں ہے۔ قابل ذکر بات آنکھوں کے کاجل نے آنکھوں کی خوب صورتی کو بڑھا دیا ہے۔ جون ایلیا کا (خشاہ) پڑھا وہ دنیا کی نفرتیں ختم کرتے کرتے خود ابدی نیند سو گئے۔ ہادی قوم کی نفرت ختم نہ ہوئی۔ اپنی محفل میں پہنچنے انکل کی باتیں بھی کھری کھری ہوتی ہیں اگر لوگ سمجھنا چاہیں گے۔ مقصود علی کو کرسی صدارت مبارک ہو، شکر کریں کہ سید قول مکی نا! یہ بھی ان کا بڑا بہن ہے۔ سہرہ بخاری کا تبصرہ بہت خوب صورت تھا۔ سوہانی میں آپ کی بات سے شفق ہوں نیچر کا احترام کرنا ہر طالب علم پر فرض ہے۔ رقیب میں از سلا ہی اپنے شوہر کے ساتھ غلط نہیں تھی شوہر کے سامنے ہی اس کی دلداری مل گئی کس نہ چوڑی تو خدا نے خود ہی اس کو سزا دے ڈالی۔ یادداشت، میں برائن کی بچی اور بچی نے بڑے صبر سے کام لیا۔ یعنی کی کوشش سے شوہر کی یادداشت واپس آئی۔ 70 نمبر، زبردست تحریر تھی مزہ آ گیا۔ محفل شعرو سخن کو انجوائے کیا۔ اشعار ایک سے بڑھ کر ایک۔ بے خبر، کتنی واقعی بے خبر تھی۔ نام اگر اس کا ساتھ نہ دیتا تو اس کو سزا ضرور دینا چاہیے۔ دلوائے۔ کتنی نے اپنے طور پر انگریزی بھی اچھے اعزاز میں کی۔ عالم باطن، میں ایسے ایمان افروز واقعات نے ہمارے باطن کو بھی روشنی بخشی۔ غلط جی، میں سائرہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس کا ازالہ بھی کر دیا۔

ابراار وارث، سہیلانوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ سسٹمز اس دفعہ 23 مارچ کو ملا۔ سب سے پہلے خطوط پر سرسری سی نظری اور اپنا خط سب سے آخر میں نظر آیا۔ دل بہت خوش ہوا اور ایک خط میرے ہم جماعت عارف شاہین کا تھا وہ بھی میری وجہ سے سسٹمز کی سلسلہ وار کہانیوں کا ایک بار پڑھتے ہی دیوانہ ہو گیا ہے۔ عارف مبارک ہو آپ کا خط بھی شائع ہو گیا ہے اور اس کے بعد اپنے مکن پسند رائٹر طاہر جاوید کی مہن زنداں پڑھی۔ یہ قسط کافی تھمک انگریزی خاص طور پر جاب کی کزن نیش اور اس کے بیٹے ارسلان کی موت سے میرے تھو آنسو گھل آئے آئی دن اک موت۔ اس کے بعد ماریہ پڑھی اور پتائی نہ چلا کب ختم ہوئی ایک تیز رفتار قسط تھی۔ مراد نے اس دفعہ بہت بھکاری دکھائی اور اکیلے ہی مرید کے چنگل سے بھاگ کھڑا ہوا۔ چوہری شہت کا داؤا سی پر لڑنا ہو گیا راہبہ بیگم نے بھکاری کا شہت دیا۔ دونوں سلسلہ وار کہانیاں شروع ہی میں خوب مقابلے پر ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک۔ ملک مقدر حیات کی حساب دشمنیاں پڑھی۔ اتنے بھیا تک اعزاز میں اقدام گل، کیسا ساک قابل تھا جو نام بدل بدل کے ہر جگہ رہا تھا مگر بکرے کی ماں کب تک خیر متائے گی کے مصداق پکڑا گیا۔ آخری صفحات پر طویل ناول پڑھنے کو ملا۔ رویندر رشید نے بہت اچھا لکھا۔ آبلہ پا نام کی طرح بہت عیار انا دل تھا۔ بے چاری زینب نے اپنی شناخت پانے کے لیے کیا کیا نہ کیا اور خود بھی آگ میں جلنے سے بڑی مشکل سے بچی۔ رویندر رشید کی شمشیر اور زور جہاں کا تھوڑا واضح کر کے انجام دکھائیں ان کے بارے تو کچھ بتایا ہی نہیں کہ زور جہاں کہاں گئی۔ کاشف ذہیر انکل کی بے خبر پڑھی۔ کتنی بے چاری اپنے ہی دفتر میں ہونے والی سازشوں سے بے خبر رہی یہ تو اچھا ہوا کہ اسے یاد آ گیا آخری دن اپریل کا تھا جب اس نے ویٹر کو دیکھا تھا۔ نام کی صورت میں کتنی کو زندگی کا بھرن سماجی مل گیا۔ لالچ کے ہاتھوں مجبور سارا دفتر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ویلڈن۔ کترنوں میں عارف عمیر کا جھکا۔ پسند آیا۔ زہر و زہر، عارف شاہین اور رمضان پاشا کے شعر بہت پسند آئے۔ آخر میں ایک دفعہ مجبور تھائی سے دعا ہے کہ ہمارے سسٹمز کے اسٹاف کو ہمیشہ خوش رکھے اور ان کو ہر آزمائش میں کامیاب کرے جو اسے حالات و واقعات کو ہم تک بہت صحت و مردانگی سے پہنچا رہے ہیں۔ (بہت بہت شکر ہے۔۔۔)

الیسی، کراچی سے محفل میں شریک ہیں۔ ”سلام بیت خواد امن آدم، اپریل 2014ء کے حسین ورگین شمارے میں اپنی موجودگی، دل و دماغ کو مجب ساسر دے گئی۔ سسٹمز ادارہ پر قدردان و قابل ستائش ہے۔ ہم انشائیہ اور ادارہ کی دل سے قدر کرتے ہوئے دل والوں کی محفل میں داخل ہوئے۔ جناب مقصود صاحب کو مبارک باد سہرہ بخاری ڈیز کیا بات ہے آپ لی۔ ارم بول آپ نے تو تن کے دکھ دیا سب کو، اعجاز احمد اینڈ مہرین نازی جوڑی تو اس محفل میں نمبر دن رہی۔ سوہانی آپ تو ہمیں گہری گہری پھر اساتذہ تھی ہیں۔ قصیر اقبال اولڈ بوائے تو الہ خیار کی طرح سروس کے کمیتوں میں ناک کھاتے پھر رہے تھے۔ فوزیہ لی بی جلا پچھوڑو اور اپنی لپیا پوٹی کی طرف توجہ دو۔ سسٹمز گلابی آپ کہاں بے مردیتاں کرتی پھر رہی ہو۔ سیدی الدین آپ آج کل کون سے دوروں سے دو چار ہیں؟ علی ڈوگر، حوریہ اور مقدس کا تبصرہ ان کے ناموں کا متنازعہ۔ اعجاز آرا میں آپ کی اتنی اچھی سوچ اور جنک۔ یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ نادر سال ہادی دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔ ماریہ قاروق اپنی مٹھی کے لڈو کب کھلا رہی ہوتا کہ آپ بھی اکیلی نہ رہو۔ شوکت شہر یار ویسے انڈوں کا ملوہ بھی کافی ٹیٹی ہوتا ہے۔ بشری افضل، ہم بہنوں کی وجہ سے تو اس محفل میں رنگ ہیں ورنہ۔ یہ بھائی لوگ۔۔۔؟ طاہرہ گھرارہ، بے جذبہ جون تو بہت نہ ہار۔ رویندر رشید کی آبلہ پا میں زینب کی پوری زندگی آبلہ بن گئی مگر دھن کے کچے لوگ منزل پائی لیتے ہیں۔ ماریہ میں سب مہم (م) کے گرد گھوم رہا ہے۔ محبوب، مراد، مریہ، ماریہ کی کہنے نواب صاحب کے۔ مہن زنداں میں طاہر جاوید محفل صاحب، ہمیں ”نوش“ کی سیر کروا رہے ہیں، بہت اچھی جی بہت اچھے۔ تاریخی اسٹوری زہر و زہر میں ساری برائی رمان پہ آئی۔ ملک مقدر حیات کی حساب دشمنیاں میں لیاقت کی بچی اور کھری باتیں اس کہانی کا نچوڑ تھیں، اللہ پاک نے تمام ہندوں کو یکساں پیدا کیا ہے۔ مہر امام نے سوا سیر میں بتایا کہ سیانا کو اچھے بیٹ پر بیٹتا ہے۔ محفل شعرو سخن نے دل و دماغ کو جلا بخشی۔“



✽ مہرین ناز، حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ 19 مارچ 2014ء کی دوپہر میں جان بہاراں، لاہور والی داستانوں کا مجموعہ سسٹمز ڈائجسٹ ملا تو ایک خوشگوار احساس ہوا۔ سرورق ڈاکٹر اکیٹل کی محنت اور محنت پر تو جتنا کمال ہے۔ فہرست کی ترتیب پر نظر پڑی تو دل خوش ہو گیا۔ انتہائی خالصتہ میں پڑا ہے تو ادارہ پھولوں کی خوشبو سے مٹھ رہا ہے۔ یہ پڑت میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی مہربانی ہے کہ قلم کے مظلوم لوگوں کو زندہ رہنے کا کچھ آسرا ملا۔ صدر تصدق علی صاحب کو چنا گیا، تبصرہ اچھا ہے مبارک باد۔ سحر یہ بخاری آپ کی محفل میں واپسی اچھی لگی، تبصرہ بھی کافی عجزا ہے، اور کچھ یاد دہانی بات ہے۔ بے اختیار ہی غمی آگئی۔ برادر دلاؤ آپ کا مخلصانہ مشورہ اچھا لگا، شکر ہے، ارم بھول آپ جیسی پونڈ لوگوں کی اس محفل میں ضرورت ہے۔ شوکت بھائی ہم سے تو بڑے بڑے منہ کی کھا کر گئے ہیں۔ یہ تو ایک معمولی بات تھی انجیلی جی آپ کا تبصرہ بھی الیبالا۔ علی بیاسا محفل میں آپ کا ساتھ مجھے حوصلہ دیتا ہے۔ شبن سلطان لنگتا ہے تم زور سے پڑی مریج کا چار ڈال کر کھانے کے عادی ہو۔ فوریہ شکر ہے ہمیں کچھ تو نظر آیا۔ ابتدائی صفحات پر الیاس بیٹا پوری زیر زیر کے ساتھ نظر آئے، بلاشبہ علم نجوم کی اپنی ایک اہمیت ہے، مفصلہ الدولہ زمان کے عشق میں جلا ہو کر فرائض زندگی کو نظر انداز کرتا رہا۔ کاشف ذہیر کی بے خبر، سبق آموز تحریر ہے اس میں کوئی شک نہیں جس کا دین ایمان دولت بن جائے تو وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں جیسی کا کردار اچھا لگا۔ غلط فہمی میں شرعاً اس نے بتایا کہ ظاہر باطن میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ظاہر جاوید محفل کی میں زندہ ان نے سسٹمز کے صفحات پر اپنا ڈیرا بجالایا ہے حجاب کی زندگی میں مزید مشکلات آ رہی ہیں۔ جلال دوسری شادی کے حکم میں ہے۔ انجیلی الدین نواب کی ماروی بہتر سے بہتر کی طرف گامزن ہے۔ محبوب چائے پوکا محفل اس کو جتنی تک لے گیا سرادھیا سید حاسا دابندہ مرید جیسی تیز ترین بڑی کو بھی چوٹا کر گیا۔ ملک مسعود حیات کی حساب دشمنان بے شکل تحریر ثابت ہوئی۔ عالم باطن میں ضیا بنگرانی صاحب نے شیخ حسین کے حالات و کرامات پر روشنی ڈالی۔ آبلہ پاء روینہ رشیدی کی ایک قافلہ داد سنواری ہے زینت جیسے لوگ زندگی کے سفر میں بہت مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ محفل شعرو سخن نے بھی دل ٹوٹ لیا، زبردست اشعار و قطعات تھے۔ محمد امجد ریاض، اعجاز احمد رائیل، راجا بنگرانی، انجیلی، رمضان پاشا، امجد حسین اور شبن سلطان کے منتخب اشعار بے حد اچھے لگے۔ اپریل کا سسٹمز ہمارا دل جیتنے میں کامیاب رہا۔

✽ بلقیس خان، واہ کینٹ سے محفل کی زینت بنی ہیں۔ سسٹمز ڈائجسٹ 20 مارچ کو ہاتھ آیا۔ سرورق اچھا تھا۔ سچی بات ہے انتہائی اور ادارہ سے اکثر صرف نظر کرتی ہوں کہ اتنی جگہ کہاں ہے دل و اندام میں۔ مگر اس وقت دل کو حیرت دلا۔ ادارہ کو پڑھا آپ کی بہترین تجویز نگاری کو دل میں سراہا۔ قلم والوں کے لیے دعا میں، ایسا کپ ہار چکے کوئی بات نہیں اب آسٹریلیا سے جیت چکے ہیں خدا مزید کامیابیاں دے۔ محفل میں پہنچے بڑے ناموں کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر احتجاجاً واہ آؤٹ کیا۔ ظاہر جاوید محفل کی میں زندہ ان کی طرح گرفت میں لے لے اور قاری کے دل و دماغ پر چھا جانے والی تحریر ثابت ہوئی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے جو غلط ہے اس کو اگر غلط نہیں سمجھتے تو کم از کم اس کی حوصلہ افزائی تو نہ کریں۔ حجاب کو رائٹر کی خوش گماں سوچ نے انجیلی بڑی دکھایا ہے، وہ ادھی بڑی کی ضرورت ہوگی مگر نہ کرے میں تاہم عرصہ میں تھما لٹا ہرگز اچھی بات نہیں ہے مگر میں غائب میں رہنا اور باہر آزادانہ گھومتا کسی ایکشن کوری ایکشن ہے۔ کاشف ذہیر کی بے خبر جیسے سے بھرپور سسٹمی خبر تحریر تھی۔ رقیب بھی اچھی رہی، حسام بٹ کی حساب دشمنان میں لیاقت کا کردار کمال کا رہا۔ بارہم کی یادداشت ابتدا میں دلچسپ تھی اینڈ غیر متاثر کن تھا۔ 70 نمبر سوچ کے گھوڑے دوڑا دینے والی تحریر ثابت ہوئی۔ سوا سیر منظر امام کی دلکش کہانی تھی۔ روینہ رشیدی کی آبلہ یا ہمارے سیاستدانوں کی چال بازیوں، بد اعمالیوں اور بد کرداریوں کا احاطہ کرتی ہوئی عمدہ تحریر تھی۔ مگر کچھ چیزیں حقیقت کے خلاف لگیں۔ جیسے دھمکیوں کے باوجود اکیلے گھر میں زینب کا رہنا اور ماں باپ کو یادداشت میں نہ دیکھنا جبکہ شیر کو نہ بھولنا۔ الیاس بیٹا پوری کی زیر و زرا بھی زیر مطالعہ ہے۔

✽ محمد جاوید شمیم بربر، علی پور، مظفر گڑھ سے حاضر ہیں۔ اپریل کا شمار معمول سے دو دن پہلے کیا۔ جون ایلیا کا شمار حقیقت پر مبنی تھا۔ ادارہ میں انکل کی کمری کمری باتوں نے جسم کو چھوڑ کر رکھ دیا۔ حکمرانوں کی نااہلی قلم میں دیکھی جا رہی ہے اس کے علاوہ طلحے پر فوس میں جو جنوں کے قہانے بیٹھ میر بڑا دل میں جو واقعہ ہوا ہے اس نے پوری انسانیت کو ہلا کر رکھ دیا ہے اس کے بارے میں مختصر عرض کروں آمنہ بی بی جو بیٹ میر بڑا دل کی رہائی تھی، کیا ہو گیا کلاس کی طالبہ تھی ہر کلاس میں نمایاں پوزیشن لے کر پاس ہوتی تھی۔ اس کے قریبی رشتہ دار نرنے نے زیادتی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی اس نے قانون کا سہارا لیا۔ اس مضمون کو کیا خبر تھی کہ کوئی یورپ کا قہانہ نہیں ہے یہ جنوبی پنجاب کے قہانے ہیں۔ پولیس نے مقدمہ درج کیا پھر بھاری رقم لے کر مڑم کو بری بھی کر دیا۔ ظلم نار بری ہونے کے بعد سیدھا آمنہ کے پاس گیا اسے گالیاں اور مٹھے دے کر میرا کیا کاڑا ہے یہ سن کر آمنہ نے بیٹروں کی کہیں لے کر قہانے کے سامنے اپنے اوپر بیٹروں اٹھل کر خود کو آگ لگا دی کہ اس انصاف سے بہتر ہے کہ موت کو گلے لگا لیا جائے۔ جس سے وہ مجلس کراپتال میں دم توڑ گئی پھر میڈیا، وزیر اعلیٰ کا دورہ افسران محفل وغیرہ وغیرہ پھر ایک اور خوفناک انکشاف ہوا کہ 150 مقدمات زیادتی کیس کے قہانے میں ہیں جن کو ابھی تک انصاف نہیں دیا گیا۔ (اللہ خیر کرے) محمد جاوید علی پور اس وقت بلیک لسٹ میں نظر آئے۔ جاوید بھائی بھی عرش پر بھی فرش پر۔ ارم بھول صاحب نے شہر کے کھسار کی برائی کوئی تنقید نہیں کرتی چاہیے آخر وہ آپ سے بہتر ہیں اور بھلی دفعہ ہمارے شہر کو اعزاز حاصل کرایا ہے۔ زیر و زرا الیاس بیٹا پوری کی بہترین تاریخی کہانی تھی۔ ظاہر جاوید صاحب کی میں زندہ ان رقیب، یادداشت، ہوا سیر، آبلہ پاء بہت زبردست تحریریں تھیں۔

✽ محمد ہمالیوں سعید، بنوں سے چلے آ رہے ہیں۔ مختصر قہانوں والی میک اپ زدہ حسینہ چونکہ ہمیں آدمی آنکھ بھی نہیں بھائی لہذا مسراج انکل اور عذر آگئی کی مجھوں سے سچائی ہوئی محفل کی جانب چل دیے۔ ادارہ میں انکل نے قہر پار کر کے بی بی اور سکرانوں کی بے بسی پر پڑا روشنی ڈالی اور جہاں تک ایسا کپ کے قہانے میں شکست کی بات ہے تو حجاب ہمارا ناقص تو انڈیا کے ساتھ تھا۔ جسے شاہینوں نے زمین یوں کر کے دل خوش کر دیا۔ حضور علی صاحب ا خوب صورت چیزیں ہر ایک کو ہی پسند ہوتی ہیں لہذا آپ کی حیرانی سچا نہیں۔ سحر یہ جی چنگ چور کی ڈانڈی اور چورنی کے ہاتھوں میں ہماڈ بھنگا رہوتی ہیں۔ اس لیے آپ اہل محفل کو اس کے پیامبر بھنے سے سراسر انگاری ہوں۔ ارم بھول جی آپ کو پڑھے نہ لکھے محمد جاوید ایوارڈ یافتہ ہو گئے لگے مگر آپ کی بھلی انٹری کے ارشادات بھی آسکر کے لیے میرٹ پر تاثر دہکتے ہیں۔ مہرین ناز صاحبہ آپ نے نو سسٹمز کی 44 سالہ تاریخ کے



قلم ریکارڈ تو ذکر رکھ دیے جناب۔ شبن سلطان جی آپ نے اپنی عمر بتائی تھی اس کو مد نظر رکھا جائے تو آپ کا تبصرہ آپ سے کم از کم 25 سال بڑا لگتا ہے۔ بشری جی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، سحر یہ کے خلاف نہ سازشیں ہو رہی ہیں نہ انکل دیوار سے لگا یا جا رہا ہے۔ کاشف ذہیر کی بے خبر میں بہت سے جھول تھے۔ بھلی بات اگر سسٹمی سے پہلے ہی دن کام لکھوا لیا گیا تھا تو ایک مہینے تک رکھنے کی وجہ ملک مسعود حیات کا دوری کا سرا قلم کے چنگ تک پہنچنے کا انداز مجھے بہت پسند ہے۔ نمبروں کے گورکھ دھندے میں انجیلی 70 نمبر بہت اعتراف رکھ رہی۔ سوا سیر نہایت غیر متاثر کن رہی۔ خوب صورت جذبات اور نازک رشتوں سے سچی پس زندہ ان کا دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ حجاب کی زندگی ظالم کی نذر ہوئی جا رہی ہے۔ ارم کا کردار بہت ہی ناگوار لگتا ہے۔ بارہم کی یادداشت مکمل طور پر غیر متاثر کن تھی۔

✽ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم باؤن، خانوالہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپریل 2014ء کا شمارہ جاذب نظر محفل کے ساتھ بنا تاخیر موصول ہوا۔ حسد باہر عباس کے تصور میں کم، نحو استراحت نظر آئی۔ انتہائی میں جون ایلیا سے بالکل متفق ہوں کہ آج خود انسان نا پید ہو گیا ہے۔ ادارہ میں انتظامیہ کی بے بسی کا ذکر تھا جو حقیقت پر مبنی ہے۔ پاکستان میں ہر سطح پر فلیٹ موجود ہے مگر "اخلاص" کسی بھی سطح پر نہیں۔ محفل میں اپنا خط وضو نہ چاہا تو ناکامی ہوئی جب تھوڑا غور کیا تو خود کو ظاہر مگر ازکی صدارت میں بلیک لسٹ میں انکا دیکھا۔ کرسی صدارت ہمیشہ کی طرح صنف و جاہت کے قبضہ میں نظر آئی۔ مقصود علی مبارک قبول فرمائیں۔ سحر یہ بخاری بھی اپنی ٹیکسٹوں کے ساتھ موجود تھیں۔ سحر یہ بخاری، جاوید بلوچ نے ایک ہی تو کام کی بات کی جس کو آپ نے بے شکا کہہ دیا۔ ارم بھول! آپ نے آتے ہی بھڑوں کے چپے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ ارم عظیم سے آخری صفحات کے لیے کہانی کی فرمائش تو ہم بھی کر چکے ہیں چلو کی اور نے بھی ساتھ دیا۔ سوا بھائی ایہ جب بحث شروع ہو گئی ہے کہ مرد حضرات لڑکی بن کر لکھتے ہیں آپ کے پاس کوئی دلیل ہے اس کی؟ اب آپ اپنا ہی خط ملاحظہ فرمائیں اس سے کیا سمجھا جائے کہ آپ نے بھی خواتین پر تنقید کی ہے تو کیا آپ بھی.....؟ مہرین ناز میں نے کب کہا کہ جو تعریف کے قائل ہوں ان کی تعریف نہیں کرتی چاہیے؟ آپ کے لیے ایک صیحت کہ انسان کی بھلی و قاداری اس کے اپنے گھر اور رشتوں کے ساتھ ہونی چاہیے۔ علی ڈگر ایک کیٹ کا اصل نام ہے "کالی بی" تھی ہو گئی اب؟ انجیلی کی بھلی انٹری ہے شاید اور یہ تہوار ہو گئی واہ! خوش آمدید۔ راجا ثاقب! ادارہ نے انعام کا سلسلہ کئی سالوں سے ترک کر دیا ہے بس انعام بھی ہے کہ کرسی صدارت پر تشریف فرما ہو جائیں۔ ابرار وارث! اس بار ڈاکٹر انکل نے بی بی یادگار والوں سے کہہ کر دوشیزہ پر کافی "کام" کروایا ہے۔ پس زندہ ان میں ظاہر جاوید محفل ایک بار پھر دین و دنیا کے ضابطوں میں جکڑی ہیر دین لے کر آئے شاید اس حوالے سے ظاہر جاوید صاحب کے ذہن میں کوئی خاص نظریہ موجود ہو۔ بہر حال کہانی بہت اچھی جا رہی ہے۔ نواب صاحب ماروی کے لیے سب کو دوڑا دوڑا کر پٹکان کر رہے ہیں بیشتر قارئین کو یہ کہانی پور کر رہی ہے اور ہم دیوتا جی کاٹ اور قہر کی امید رکھتے ہیں۔ روینہ رشیدی کی آبلہ پاء زبردست رہی۔ زینب کا کردار بہت متاثر کن رہا۔ امجد بھیکس 70 نمبر لے کر آئے۔ گورڈن کا مہن کی چالاک کو برٹس نے ناکام بنا دیا اور محفل ایک کوڑے سے اس تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ شرعاً اس کی غلط فہمی میں ساعدہ کی غلط فہمی جولی کو لے ڈوبی۔ جب کسی شخص کے بارے میں انسان خصوص ذہن بنا لے تو اس کے ہر عمل کو وہ اسی تناظر میں دیکھتا ہے۔ سوا سیر میں منظر امام نے ایک قدیم لٹنے کو کہانی کی شکل دے ڈالی۔ عذرت جیسے کرداروں کے لیے ہی شاید کہا گیا ہے "ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ"۔ عمیر ریاض کی رقیب زبردست رہی۔ مغرب کے ماور پدرا زاد معاشرے کی برائیوں کو آشکار کرتی یہ تحریر اچھی لگی۔ گزشتہ اور اشعار بھی دلچسپی کا حامل رہے۔

✽ سارگر تلوکر، چشمہ بیراج سے تشریف لائے ہیں۔ سسٹمز کا دیدار برقی بارش میں ہوا۔ محفل پر کڑی کی کی یاد میں کوئی ہوئی تھی۔ جون ایلیا کا شمار بڑا حال۔ ہم تو واقعی خسارے میں ہی جا رہے ہیں۔ ادارہ پڑھا اپریل میں پھول تو کھلے ہوئے ہیں۔ مگر دل اداس رہتا ہے بارشوں کے موسم میں۔ پاکستان کرکٹ ٹیم انڈیا سے ہار گئی بہت دکھ ہوا۔ اس دکھ کے بھلانے کے لیے منظر امام کی سوا سیر پڑھی۔ لیوں پر فنی تو لائی مگر بہت گہری کہانی تھی۔ پس زندہ ان محفل صاحب محبت پر ہمیشہ لکھتے ہیں اور میں محبت کرتا ہوں۔ اس لیے محفل میرے پسندیدہ قلم کار ہیں۔ ماروی پڑھتے ہوئے تو کسی بات کا احساس تک نہیں رہتا۔ ماروی پڑھتا ہوں تو فرحت آتی ہے۔ آبلہ پاء بھائی کھسار کی تحریر تھی مگر بہت ہی شاندار۔ محفل شعرو سخن بہت خوب صورت تھی ہوئی تھی۔

✽ انور یوسف نرنی، اسلام آباد سے تشریف لائے ہیں۔ سسٹمز اس بار بھی تاخیر سے ہی 19 مارچ کو ملا۔ لگتا ہے جلد حاصل کرنے کے لیے سالانہ خریدار بننا پڑے گا۔ سرورق بے حد جاذب نظر لگتا ہے۔ آپ کے خط میں کئی ماہ کی کاوش کے بعد اپنا نام دیکھ کر خوش ہوئی۔ محفل کے سردار اس بار کراچی کے مقصود علی شمیم۔ مبارک ہو۔ طویل بلیک لسٹ میں کئی جانے پہچانے نام دیکھ کر دکھ ہوا۔ بہر حال اب کہانیوں کی طرف۔ بھلی تاریخی کہانی الیاس بیٹا پوری صاحب کی "زیر و زرا" ایک پڑاؤ تحریر تھی جس میں ایک عجیب کی پیش گوئی پوری ہوئی دکھائی گئی۔ اس شمارے کی آخری کہانی آبلہ پاء بہترین کہانی قرار پائی مگر شاید کسی مغربی کہانی سے ماخوذ تھی؟ قسط وار کہانیوں میں محفل صاحب کی میں زندہ ان کا ٹیپو اس بار بہت ست رہا۔ حجاب کے کردار کی پریشانی جا رہی ہیں اور بادی کا عشق بھی بڑھتا جا رہا ہے مگر اب اس کے کمرے میں حجاب کی ویش والی تصویر ایک نئی معصیت لانے والی ہے۔ دوسری قسط وار کہانی نواب صاحب کی ماروی ان کی روایتی تحریروں میں سے ایک ہے جس میں کوئی جدت نہیں ملک مسعود حیات کی حساب دشمنان ایک اچھی کاوش تھی جس میں انہوں نے آخر کار عزم کا سراج لگا ہی لیا۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں سب سے بہتر کاشف ذہیر کی بے خبر رہی۔ دیکھی کہانیوں میں منظر امام کی سوا سیر ایک پُر لطف تحریر تھی۔

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
سید علی الدین اشفاق، سچ پورہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ ذاکم علی گور جانی، داخل ضلع راجن پور۔ طاہرہ مگرا، پشاور۔ سید اکبر شاہ، لوگی ماہرہ۔
رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی

گردش دوران کے اسیر

الیاس سیتا پوری

بچہ ہویا بوڑھا یادوں کا ہالہ دونوں کو اپنے حصار میں قید رکھتا ہے یہ اور بات کہ بعض ایسے واقعات جو بچوں پر ستم بن کر بیت جاتے ہیں وہ انہیں بڑھاپے تک بھول نہیں پاتے... تاریخ کا دوسرا نام "یادداشتیں" ہے جو حافظے میں محفوظ رہ جاتی ہیں... ایسی ہی دلخراش یادوں سے جب پردہ اٹھتا ہے تو ماضی ہاتھ باندھے ورق ورق خود کو دہراتا ہے... وہ بچہ بھی اپنی یادوں میں قید دھندلے عکسوں کا تعاقب کرتے ہوئے نگر نگر گھومتا رہا حالانکہ اس کا گمشدہ ماضی تو خود سایہ بن کر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا مگر... اسے ادراک نہ تھا اور جب اسے خبر ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی... بنو امیہ کا دور اپنے حالات و واقعات کی وجہ سے تاریخ میں اس طرح رقم ہوا ہے کہ مٹانے نہ مٹ سکے گا۔ ترک اور عرب... دو مختلف تہذیب و تمدن کا ملاپ... اگرچہ مشکل ترین دور کی عکاسی کرتا ہے مگر چند ایسے یادگار لمحات کا نقش بھی دلوں پر بہت گہرا ہے جو اپنی یادوں کے ساتھ ساتھ رگوں میں لہو کی گردش تیز کر دیتے ہیں لیکن اس گردش دوران کے اسیر وقت کی مدمر تال پر رفتہ رفتہ اپنی ہی کیفیت کی گہرائیوں میں ڈوبتے ابھرتے رہے... جبکہ اگلے دن کا ابھرتا سورج ان ڈوبے ہوئے لمحات کو تاریخ کا خوب صورت حصہ بنا گیا۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

لیکن پھر بھی ایرانیوں کا اثر و نفوذ بغداد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں بے آسانی دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ان کا یہ اثر و اقتدار مامون الرشید کے عہد تک قائم رہا لیکن مامون کے بعد جب اس کے ان پڑھ بھائی معتصم نے تخت خلافت پر قدم رکھا تو اس نے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ خلافت عباسیہ کو ایرانیوں کے اثرات سے پاک کر دے، اس نے ایرانیوں پر ترکوں کو ترجیح دی اور سرحد، فرغانہ اور ماوراء النہر کے دوسرے شہروں اور ترکوں کو خرید خرید کر بغداد میں بساا شروع کر دیا۔ معتصم نے انہیں دیبا کے لباس، سونے کے پٹکے اور زیورات سے لاو کر ایرانیوں اور عربوں کی نظروں میں رنگ و حسد کی چنگاریاں بھردیں۔ جب یہ وحشی اور اجذ ترک اپنے قیمتی اور زریں لباس میں نخوت و تکبر سے سینے پھلائے اور گردنیں ٹیڑھی کیے ہوئے اپنے گھوڑے دوڑاتے تو بغداد کے مقامی لوگ خوف زدہ ہو کر راست

بنو امیہ کو اپنے اقتدار کے قیام و بقا میں عربوں اور شامیوں کا مہول منت ہوتا پڑا تھا اور تقریباً اٹھاسی سال تک اموی ایوان خلافت انہی کے کاندھوں پر قائم رہا پھر ان کاندھوں میں ضعف کے آثار پیدا ہونے لگے۔ بنو عباس تاک میں تھے اور انہوں نے اپنی قوم کے مقابل ایرانیوں کو لا کھڑا کیا تھا۔ ان ایرانیوں کے تعاون و اشتراک سے بنو عباس نے بنو امیہ کے اقتدار کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ پہلے لوہا اقتدار شام کے دمشق میں لہرا رہا تھا اب یہ عراق میں دریائے دجلہ و فرات کے کنارے بغداد میں اڑ رہا تھا۔ ابو مسلم خراسانی اور آل برمک کے مضبوط اور توانا کاندھے عباسیوں کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ عباسی خود بھی اتنے مضبوط اور توانا ہو گئے کہ انہیں اپنے محسنوں کی ضرورت باقی نہیں رہی اور انہوں نے اپنے سرکش اور خود سر محسنوں کو، ان کے خاندانوں کے ساتھ نیست و نابود کر دیا

چھوڑ دیتے۔ یہ ترک گھبرائے اور خوف زدہ عربوں اور ایرانیوں کی پریشانی سے خوب خوب لطف اندوز ہوتے۔ چند چھوٹے چھوٹے بچے کنائیں بھل میں دبائے نہر کے کنارے کنارے کتبے جارہے تھے، ان کا بوڑھا دادا اپنے سر کو رومال وصال سے چھپائے ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریاں اور ضعفی کی کھال میں سٹی، بھینچی آنکھیں زندگی اور دنیا سے کچھ بے تعلق سی نظر آتی تھیں۔ کسی کسی لمحے کسی اجڑ ترک کا گھوڑا سر پٹ بھاگتا ہوا جب ان بچوں کے پاس سے گزرتا تو ان کا دادا انہیں اپنی آڑ میں لے کر کچھ اس طرح سینہ سپر ہو جاتا گویا وہ بچوں کی طرف آنے والے منہ زور گھوڑے کو اپنے ہاتھوں سے دھکیل کر پرے کر دے گا۔ جب گھوڑا گزر جاتا تو دادا میاں عباسی خلیفہ معتمد اور وحشی ترکوں کو برا بھلا کہنے لگتے۔ بوڑھے کو اپنے عرب ہونے پر فخر تھا اور وہ ترکوں کو مسلمان ہونے کے باوجود عربوں سے کمتر سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے پوتوں سے کہا۔

”بچو! ذرا ہوشیاری سے چلو، یہ اجڑ ترک انسان اور جانور میں فرق نہیں کرتے۔“ پھر خلیفہ معتمد کو برا بھلا کہنے لگا۔ ”خدا معتمد پر خیر نہ کرے، عربوں کی جان پر کیا مصیبت مسلط کر دی ہے۔“ مصیبتیں جھیلنے کو عرب تھے اور جب لطف اٹھانے کا وقت آیا تو یہ ترک آگے، میرا بس چلے تو انہیں دجلہ میں غرق کر دوں۔“

ایک بچے نے اپنے پاس سے گزرتے ہوئے ترک کی طرف نفرت سے دیکھا اور تھوک دیا، بولا۔ ”دادا جان! آپ نہ گھبراہیں، جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو ان ترکوں کو نکال باہر کروں گا۔“

ترک، بچے کے حقارت آمیز سلوک سے مشتعل ہو گیا۔ اس نے اپنے سرکش گھوڑے کا رخ اس بچے کی طرف کر دیا۔ دادا اس ترک کے بڑے ارادے کو بھانپ چکا تھا۔ ترک نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر وار اس بچے کو چل دینا چاہا لیکن دادا نے پھرتی سے دھکا دے کر بچے کو ایک درخت کی آڑ میں گرا دیا۔ اس کشمکش میں وہ بچہ توفیق کیا لیکن بچہ دو بچے اس ترک کے گھوڑے سے تلے پکڑے گئے۔ ترک نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا اور دادا جان کو بلکتا اور بچوں کو تڑپتا چھوڑ کر چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ اس دردناک منظر نے راگبیروں کو بھی متاثر کیا اور وہ دادا جان اور زخمی بچوں کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ مجمع جھمنکار ہوا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ کوئی ترکوں کو گالیاں دے رہا تھا،

کوئی معتمد کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور کوئی بڑے میاں کو دلا سے دے رہا تھا۔ انہی میں ایک ہوش مند تھا۔ اس نے کہا۔ ”لوگو! تم سب وقت کیوں ضائع کرتے، ان بچوں کی فکر کوئی نہیں کرتا۔“

اب وہ بچہ بھی اپنے زخمی بھائیوں کے پاس آچکا تھا جسے بچانے کی کوشش میں دادا جان نے ان دونوں کو زخمی کر دیا تھا۔ دونوں بچوں میں سے ایک کا سر گھوڑے کی ٹاپ سے بکھر چکا تھا اور دوسرے کا بایاں بازو الگ ہو گیا تھا۔ دادا نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔ بچہ بھی زار و قطار رونے لگا۔ اچانک یہ مجمع ایک گھڑسوار کی طرف دوڑا، یہ گھڑسوار ایک ترک تھا۔ لوگوں نے اسے گھوڑے سے کھینچ کر زمین پر گرا دیا اور نہایت بے دردی سے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ مجمع میں سے کسی نے آواز بلند کی۔ ”بچے کا سر پکڑا گیا ہے، اس کا بھی سر پکڑ دو۔“

لوگوں نے لکڑیوں اور پتھروں کی مدد سے ترک کا سر پاش پاش کر دیا۔ شروع شروع میں تو وہ بہت چلایا اور بڑی دردناک آوازیں نکالیں لیکن پھر اس کی آواز ڈوبتی چلی گئی اور وہ بے ہوش ہو کر رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں چلا گیا۔ مجمع میں سے پھر کسی کی آواز سنائی دی۔ ”ایک بچے کا بایاں بازو الگ ہو گیا ہے، اس کا بازو بھی الگ کر دو۔“ کسی منصف مزاج نے مخالفت کی، بولا۔ ”لیکن اس ترک نے تو ان بچوں کو نہیں پکڑا تھا، پھر اس سے انتقام کیوں لے رہے ہو؟“

کئی آوازوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ”وہ بھی ترک تھا، یہ بھی ترک ہے، ترک کا انتقام ترک ہی سے لیا جائے گا۔“

اس حق گو نے پھر مخالفت کی۔ ”لیکن یہ ترک تو سر چکا ہے۔ اب اس کا بازو الگ کرنے سے فائدہ؟“ مجمع میں سے ایک شرابی نے اس حق گو پر لعن طعن کی، بولا۔ ”یہ ترکوں کا دوست معلوم ہوتا ہے ترکوں کا دوست ہمارا دشمن ہے، دوستو! یہ بھی جانے نہ پائے۔“

اور پھر وہاں ایسا شور مچا برپا ہوا اور ایسی خطرناک دارو گیر شروع ہوئی کہ کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ ان میں سے کون کس کا حریف ہے اور کون کس کا حلیف۔ عرب آپس میں ہی دست و گریبان تھے۔

دوسرے دن حیدر قریاں تھی۔ خلیفہ معتمد عید کی تمناؤں پڑھ کر محل واپس جا رہا تھا کہ حشری کے چوک میں بچوں کا دادا آگے بڑھا اور معتمد کا راستہ روک لیا۔ معتمد کے ترک

محافظ آگے بڑھے اور اس بوڑھے کو قتل کرو دینا چاہا لیکن معتمد نے انہیں روک دیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بوڑھے کو قریب بلوایا اور رو رہا تھا۔

”کیا بات ہے، تو کیا کہنا چاہتا ہے؟“ بوڑھے نے معتمد کو اس کی کنیت سے مخاطب کیا۔ ”اے ابواسحاق! ترک محافظوں میں سے کسی نے اسے پہچان لیا اور وہ اسے قتل کرنے کے لیے جیٹا لیکن معتمد نے اسے ڈانٹ دیا۔“

”کیا کرتا ہے، اسے بات پوری کرنے دے۔“ حملہ آور ترک خشک کر رک گیا، بوڑھا تند و تیز لہجے میں بولا۔ ”ابواسحاق! خدا تجھے جڑائے خیر نہ دے۔“ پھر اس نے ترکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو نے ان وحشی جنگلیوں کو ہمارے درمیان بٹا کر ہم پر ظلم ڈھائے ہیں۔ ان جنگلیوں نے ہمارے بچوں کو قتل، عورتوں کو بیوہ اور مردوں کو خون کے آنسو روئے پر مجبور کر دیا ہے۔“

حملہ آور ترک نے بوڑھے کی تکذیب کی، غصے سے بولا۔ ”امیر المومنین! یہ جھوٹا ہے بلکہ کل اس نے ہمارے ایک آدمی کو مشتعل جھوم سے قتل کر دیا۔ آپ اس مقتول ترک کے گھر جا کر دیکھیں تب آپ کو پتا چلے گا کہ اس نے کتنا ناقابل طاقی نقصان پہنچایا ہے۔ مقتول ترک کے بچوں نے قسم کھائی ہے کہ وہ اس بوڑھے سے اپنے مقتول باپ کا بدلہ لے کر رہیں گے۔“

بوڑھے نے دانت چیں کر جواب دیا۔ ”مقتول ترک کے بچے مجھ سے کیا بدلہ لیں گے۔ میرے پوتوں نے تو قسم کھائی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس عالم ترک کا پتا چلا کر اسے کیفر کردار تک ضرور پہنچائیں گے۔“

معتمد نے جواب دیا۔ ”تم دونوں ایک دوسرے سے انتقام لینے پر مہم ہو تو تمہیں کون روک سکتا ہے لیکن اللہ عنوا اور احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“ پھر بوڑھے سے کہا۔ ”تو میرے وزیر ابن زیات کے پاس چلا جا اور اس معاملے میں اس سے مدد حاصل کر۔“ پھر ترک محافظ سے کہا۔ ”اور تو بھی، میرا خیال ہے ابن زیات تم دونوں کے دلوں کی کدورت دور کر دے گا۔“

بظاہر تو معتمد نے بوڑھے عرب کو اپنے وزیر ابن زیات سے ملنے کا مشورہ دے دیا تھا لیکن یہ باطن وہ ترکوں کی طرف سے فکر مند ضرور ہو گیا تھا۔ وہ اس مسئلے کو مستحکم حل کرنا چاہتا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد بغداد والوں نے یہ خوش خبری سنی کہ معتمد بغداد کے شمال میں تقریباً ساٹھ میل

دور ایک نیا شہر بسا رہا ہے یہ نیا شہر ہی معتمد کا جدید دار الحکومت ہوگا۔ تمام ترک اور دوسرے عہدیدار بھی اس نئے شہر میں منتقل ہو جائیں گے اور بغداد والوں کا اجڑ ترکوں سے بچھا چھوٹ جائے گا۔

اس نئے شہر کی تعمیر کے لیے معتمد نے تمام اسلامی شہروں سے کارگروں اور فن عمارت سازی کے ماہروں اور مزدوروں کو کھینچا کیا اور تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ ترکوں اور خراسانیوں کو خاص خاص جاگیریں دی گئیں۔ مصریوں کو بھی الگ جاگیریں عطا ہوئیں۔ تاجروں اور ارباب صنعت و حرفت کے لیے مخصوص باز بنائے گئے۔ شہر میں مختلف قسم کے چلوں کے درخت لگوائے اور ایک شاندار جامع مسجد بھی تعمیر ہوئی۔ اب تو ہر طرف سے لوگوں کی ریل چلنے ہوئی تھی۔ لوگوں نے اپنے مصارف سے عمارتیں بنوانا شروع کر دیں۔ اس نئے شہر کا نام سرور من رانی یعنی دیکھنے والے کی خوشی رکھا گیا پھر سرمن رانی (جس نے دیکھا خوش ہو گیا) کہا جانے لگا اور اب تاریخوں میں سامرا کے نام سے مشہور ہے۔

سامرا میں ترکوں کی بستی کا نام کرخ سامرا تھا۔ کرخ سامرا میں ترک شہسوار اس طرح گھوڑے دوڑاتے رہتے جس طرح کبھی بغداد میں دوڑایا کرتے تھے۔ ایک دن صبح ہی صبح کرخ سامرا کی اس شاہراہ پر جو معتمد کے قصر کی طرف جاتی تھی ترک گھڑسوار بے تحاشا گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ یہیں ایک درخت کے سائے میں ایک عرب نوجوان بیٹھا ہوا گھڑسواری کا تماشا نہایت اٹھماک سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی میسں بیگ رہی تھیں اور اس کا بایاں ہاتھ غائب تھا۔ اسے دور ہی سے پہچانا جاسکتا تھا کہ وہ عرب ہے جو ترکوں کی بستی میں پہنچ گیا ہے۔ ترک گھڑسوار سینہ پھلائے انتہائی غرور کے ساتھ اس عرب نوجوان کے سامنے سے گزرتے رہے۔ کوئی کوئی ترک ازراہ شرارت و مذاق اپنے گھوڑے کا رخ اس عرب نوجوان کی طرف کر دیتا اور ایسا لگا گویا وہ اس عرب نوجوان کو پکڑ دے گا۔ یہ عرب بھی بچنے کے لیے درخت کے تنے کے پیچھے دھک جانے کی کوشش کرتا لیکن عین وقت پر ترک گھڑسوار گھوڑے کی لگام کھینچ لیتا اور گھوڑا اگلے دونوں پیر اٹھا کر، پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہو کر ہنہانے لگا۔ گھوڑے کی ہنہات میں ترک سوار کی طہریہ مذاق آمیز ہنسی بھی شامل ہو جاتی۔

جب یہ مکمل جاری تھا، عین اس وقت اس عرب نوجوان کو پیچھے سے کسی نے مخاطب کیا۔ ”شریف عرب

نوجوان اتم ترکوں کی بستی میں کس سے ملنے آئے ہو؟“
عرب نوجوان نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”میں ملنے کسی سے بھی نہیں آیا۔“ پھر اس نے اپنے غائب بازو کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”میں ایک عیب دار انسان ہوں۔ اس نقص نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میں اپنی زندگی سے بے زار ہو چکا ہوں۔“

اس عرب نوجوان نے اپنے مخاطب کو ذرا غور سے دیکھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر ترک تھا۔ حسین، لمبا، ترنگ، پرکشش اور چست و چالاک سا جس کو دیکھ کر کوئی بھی شخص متاثر ہو سکتا تھا۔ یہ ترک، عرب نوجوان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس نے پوچھا۔

”کیا تیرا یہ ہاتھ چوری کے جرم میں کاٹ دیا گیا؟“
عرب نوجوان کا شرم، غیرت اور غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”مجھ پر شرم ناک شبہ نہ کرو، معزز ترک! میں یعنی عربوں کے ایک نامور اور شریف قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔“

ترک نے دریافت کیا۔ ”تو یہاں کس سے ملنے آیا ہے؟“
”کسی سے بھی نہیں۔“ عرب نوجوان نے جواب دیا۔ ”مجھے تفصیلی بات کرنے کا موقع مل سکتا ہے؟“
ترک نے کہا۔ ”بالکل، لیکن پہلے تو یہ بتا کہ تو باتیں نہیں کرے گا یا کہیں اور؟“
”کہیں اور کہاں؟“

ترک نے نہایت شفقت اور مہربانی سے کہا۔ ”تو اگر خواہش کرے تو میں تجھے اپنے گھر بھی لے جاسکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے تیرا گھریا تو ضرور ہوگا۔ یعنی تو تنہا نہیں ہوگا، تیرا باپ کیا کرتا ہے؟“

عرب نوجوان نے جواب دیا۔ ”فی الحال میں تنہا ہوں۔ میرا باپ عموریہ کی جنگ میں قتل ہو گیا اور میری ماں کا بہت پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ میری دو بہنیں بھی ہیں جو عین میں شادی شدہ زندگی گزار رہی ہیں۔ میں ان کے پاس رہ نہیں سکتا ظاہر ہے کہ ان حالات میں میرا کوئی گھر در نہیں۔“
ترک نے نہایت حیرت انگیز نظروں سے عرب نوجوان کو گھورا، بولا۔ ”تو بڑا مصیبت زدہ نظر آتا ہے مگر میں نے تیرا نام تو پوچھا ہی نہیں؟“

عرب نوجوان نے جواب دیا۔ ”میرا نام منصور ہے اور میں اس سے بھی زیادہ مصیبت زدہ ہوں جتنا بظاہر نظر آتا ہوں۔“

ترک نے اذرا و ہمدردی کہا۔ ”گو کہ تو عرب ہے اور عربوں اور ترکوں کی باہمی آویزش اور کشش نے دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف متنفر اور متعصب کر رکھا ہے لیکن میں تجھے انسانی اور اسلامی جذبہ ہمدردی سے اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔“

عرب نوجوان منصور نے کہا۔ ”معزز رحم دل ترک! شکریہ، لیکن یہ رہائش کے ساتھ ہی کیا میرے کام کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے؟“

ترک نے جواب دیا۔ ”وہ بعد کی بات ہے بہر حال کوشش ضرور کروں گا۔“

اس کے بعد ترک نے منصور کو اپنے ساتھ لیا۔ ترک کا گھوڑا ایک درخت سے بندھا اپنے قدموں تلے نیچے ہوئے سبزے سے اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔ چند شریکیاں اس کے سر اور کانوں پر منڈلا منڈلا کر اسے تنگ کر رہی تھیں اور انہیں وہ سر اور کانوں کو ہلا ہلا کر بار بار اڑا دیتا تھا۔ کسی لمحے وہ پورے جسم کو جھرجھری سے لرزش دے دیتا۔ ترک نے اپنے گھوڑے کے پیٹ کو تھپتھا کر منصور سے پوچھا۔ ”تو شاید یہاں تک پیدل ہی آیا ہے؟“

منصور نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں سامرا میں کراپے کے گھوڑے پر آیا تھا لیکن یہاں تک پیدل ہی آیا ہوں۔“
”بہت خوب!“ ترک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں گھوڑے پر بیٹھ جاتا ہوں تو میرے پیچھے بیٹھ جا۔“ یہ کہتے ہوئے ترک ایک کراپے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور بیٹھ جانے کے بعد ہاتھ کے اشارے سے منصور کو اپنے پیچھے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ منصور بھی بے چون و چرا پیچھے بیٹھ گیا۔ ترک نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا لی اور کرخ سامرا کی گنجان آبادی کی طرف سرپٹ بھاگنے لگا۔

☆☆☆

ادھیڑ عمر ترک جب اپنی شاندار حویلی میں داخل ہوا تو حویلی کے دربان اور بعض دوسرے لوگ ترک کے پیچھے بیٹھے ہوئے عرب نوجوان منصور کو نہایت حیرت اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ حویلی کے اندر، صدر دروازے کے فوراً بعد راستے کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے سبزہ زار تھے اور ان کے پتوں نیچے نوارے پانی اڑا رہے تھے۔ دونوں سبزہ زاروں پر مختلف عمروں کے لوگ دودو، تین تین اور کہیں چار چار کی گھڑیوں میں بیٹھے بحث و مباحثوں میں اچھے ہوئے تھے۔ ادھیڑ عمر ترک کو دیکھتے ہی وہ اپنی اپنی جگہوں پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بہت جلد ان کی نظریں

منصور پر جم گئیں۔ ان میں سے چند دوڑ کر ان دونوں کے پاس آ گئے۔ ادھیڑ عمر ترک نے پلٹ کر منصور کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”عرب نوجوان! اب گھوڑے سے اتر جاؤ۔“

اور اس اشارے کے بعد ہی وہ خود بھی گھوڑے سے نیچے آ گیا۔ منصور بھی کود کر نیچے اتر گیا۔ ایک کتر درجے کے ترک بوڑھے نے گھوڑے کی راس پکڑ لی اور اسے لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ادھیڑ عمر ترک نے منصور سے کہا۔ ”منصور! تو میرا مہمان ہے، اب فکر نہ کر، تو یہ مجھ لے کہ تجھے ایک پناہ گاہ مل گئی ہے۔ اب تو یہاں اس وقت تک رہے گا جب تک تیرا جی چاہے گا۔“ پھر اس نے وہاں پر موجود دوسرے ترکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سارے ہی ترک ہیں اور میرے اپنے خاندان کے لوگ ہیں۔ میں ان سب کا سرپرست اعلیٰ ہوں۔ اب تو بھی میرے خاندان کا ایک فرد بن جائے گا۔“ پھر اس نے کہنے لگا۔ ”گویا ترک خاندان میں ایک عرب کا بیٹہ لگ جائے گا۔“

لیکن منصور اپنے ترک میزبان کی باتوں سے خوش نہیں ہوا، بولا۔ ”میرے معزز میزبان! میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم مجھے سرچھپانے کی جگہ دے رہے ہو اور میری معاشی ذمہ داریاں قبول کی ہیں لیکن کیا تمہارا انصاف پسند دل اس سچی بات کی تصدیق نہیں کرے گا کہ میں ایک عرب ہوں، حکمران قوم کا ایک ذی عزت نوجوان اور تم لوگ سرقدور، بخارا اور فرغانہ کے رہنے والے، غلام خاندانوں کے کتر لوگ پھر میں تمہارے خاندان کا ایک فرد کس طرح بن سکتا ہوں۔“

منصور کی باتوں نے ترک میزبان کی پیشانی پر ناگواری کی فٹنیں ڈال دیں۔ منصور نے بھی اس ناخوشگوار کیفیت کو فوراً ہی محسوس کر لیا، بولا۔ ”سچائی سچ ہوتی ہے لیکن پھر بھی، مجھے افسوس ہے کہ میں نے ایسی بات کیوں کی جس سے میرے میزبان کو صدمہ پہنچا۔“

ترک نے فراخ دلی سے جواب دیا۔ ”منصور، میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ جو جی میں آئے کہتا رہ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس قسم کی دل آزاری سے کوئی انسان عزت و وقعت نہیں حاصل کر سکتا۔ اگر تو میرا مشورہ قبول کرے تو میں یہی کہوں گا کہ جن باتوں سے ترکوں اور عربوں میں نفرت اور حسد کی خلیج بڑھ رہی ہو، انہیں فوراً ختم کر دینا چاہیے۔“ پھر بے پردائی سے بولا۔ ”اور خود میں

نے جنہیں اپنے ساتھ لا کر اور اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کر کے بے جا تعصب کو اپنے دل سے کھرچ پھینکا ہے۔“
بظاہر تو ایسا محسوس ہوا گویا منصور اپنے دل میں شرمندہ ہے لیکن وہ شرمسار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ترکوں کے خلاف نفرت اب بھی اسی طرح تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس وقت ان ترکوں کے درمیان سے نکل بھاگتا لیکن کچھ مجبوریاں تھیں جو اس کا دامن پکڑے ہوئے تھیں۔ ترک میزبان نے کہا۔

”میرا خیال ہے اس وقت تجھے آرام کرنا چاہیے۔ میں کسی حد تک تیرے مسائل سے واقف ہو گیا ہوں، جو کچھ نہیں جان سکا ہوں پھر معلوم کر لوں گا اور کوشش کروں گا کہ کسی طرح تیرے کام آ جاؤں۔“

ترک میزبان نے اسے ایک آراستہ مکان دے دیا۔ یہ مکان اس شاندار حویلی کے اندر ہی تھا جس میں اس ترک کے دوسرے بہت سے عزیز رشتے دار تھے۔ شام کو مغرب کی اذان کے ساتھ ہی اس کا مکان بقیعہ نور بن گیا۔ شمعوں اور قندیلوں کی روشنی میں گھر کی ایک ایک چیز دیکھی جاسکتی تھی۔ اس گھر کے درود یوار خوشبو سے بھکے ہوئے تھے۔ ترک میزبان نے اس گھر کی دیکھ بھال اور منصور کی خدمت گزاری کے لیے دو غلام بھی بھیج دیے تھے اور یہ دونوں غلام ایرانی تھے۔ ان دونوں غلاموں نے خوشبو یات چترک چترک کر یا جلا جلا کر پورے گھر کو سحر زدہ سا کر دیا تھا۔

منصور نے نماز مغرب کے بعد ایک غلام سے پوچھا۔ ”تیرا کیا نام ہے؟“

غلام نے جواب دیا۔ ”فیروز۔“
منصور نے پوچھا۔ ”خدا تجھے فیروز مند کرے اور زمانہ ابوسفاح اور ابو منصور جعفر جیسا عروج اور اقتدار عطا فرمائے۔ کیا تو نہایت رازداری سے یہ بتائے گا کہ یہ ترک کون ہے جس نے مجھے اپنا مہمان بنالیا ہے؟“

غلام فیروز نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا آپ سچ سچ اس شخص سے واقف نہیں ہیں؟“
منصور نے جواب دیا۔ ”اگر واقف ہوتا تو یہ سوال کیوں کرتا۔“

فیروز نے کہا۔ ”یہ ترک ایک نامور فوجی سردار ہے۔ اس کا نام ہے مستعین اور یہ نام بھی اس نے خود ہی اختیار کیا ہے، اس کا اصل نام شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہ جب یہاں آیا تھا تو امیر المومنین معتمد سے امداد و اعانت کا خواست گار

ہوا تھا۔ اسے وہ مدد حاصل ہوئی بس یہ اسی وقت سے مستعین ہو گیا جس کے معنی ہی مدد چاہنے والا کے ہیں۔“

منصور نے اپنے دل میں سوچا۔ واسطہ بڑے دلچسپ انسان سے پڑا ہے۔

رات کو عشا کے بعد ترک میزبان منصور کے پاس آیا، اس وقت اس کے ساتھ ایک ترک نوجوان بھی تھا۔ لمبا چوڑا، سرخ و سفید، وجیہ حسین، ترک میزبان نے اپنے ساتھی نوجوان ترک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”منصور! میرے شریف مہمان! اس سے مل، یہ میرا بیٹا نافر ہے۔“ پھر اپنے بیٹے سے کہا۔ ”اونا نافر بیٹے! یہ تو عمر عرب منصور میرا مہمان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں نے اسے جتنی عزت دی ہے تو بھی دے۔“

نافر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بادا جان! ہم ترک فراخ دل واقع ہوئے ہیں اور ہم ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ عربوں کو ہماری ذات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے لیکن عربوں سے ہمیں ہمیشہ ہی تکلیف پہنچتی رہتی ہے۔“

منصور نے کہا۔ ”عربوں کی شکایت بجا ہے، یہ ملک عربوں کا ہے اور عرب جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ملک میں غیر عرب بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور ترک ان کے حقوق غصب کر رہے ہیں تو اس پر عربوں کی برہمی بالکل بجا ہے۔“

نافر نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین نے ہم ترکوں کو جن بلند مراتب پر فائز کیا ہے وہ بلا وجہ نہیں ہے۔ ہم نے جاں نثاریاں اور وفاداریاں عربوں سے زیادہ دکھائی ہیں اور ہمیں یہاں جو کچھ بھی ملا ہے، ہماری صلاحیتوں اور اہلیتوں کے عوض ملا ہے۔ اس پر کسی اور کو یا عربوں کو ملول نہیں ہونا چاہیے۔“

ترک سردار مستعین نے ناگواری سے اس بحث کو ختم کر دینا چاہا، بولا۔ ”تم دونوں اس فضول بحث کو ختم کر دو اور منصور! تم یہ بتاؤ کہ میں کیسا ترک ہوں؟ اگر میں تجھے سہارا دے رہا ہوں اور ایک ہاتھ کی کمی کے باوجود میں تجھے کوئی عزت کی جگہ دلا دوں تو کیا میں تیری نظر میں ایک اچھا ترک نہیں ٹھہروں گا؟“

منصور نے جواب دیا۔ ”میں تمام ترکوں کو برا نہیں کہہ رہا ہوں یقیناً ان میں کچھ اچھے بھی ہوں گے۔ ان اچھوں میں تم بھی شامل ہو لیکن یہ بھی ایک نہایت تلخ اور افسوس ناک حقیقت ہے کہ میرا بایاں ہاتھ.....“ وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گیا اور گریز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”خیر

اس موضوع کو یہیں ختم کر دیا جائے تو بہتر ہے۔“

ترک سردار مستعین کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمودار ہو کر فوراً ہی ختم بھی ہو گئے۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”ترکوں نے عربوں کے ساتھ زیادتیاں بھی کی ہیں لیکن عربوں نے بھی انہیں معاف نہیں کیا مگر اب ہمیں ان باتوں کو بھلا دینا چاہیے اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل جل کر رہنا چاہیے کہ ماضی کی تکلیاں دور ہو جائیں۔“ پھر منصور کی طرف مسکرا کر دیکھا اور نہایت خوش مزاجی سے کہا۔ ”میں نے اس پر عمل شروع کر دیا ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ تو اس پر کہاں تک عمل کرتا ہے۔“ پھر اپنے بیٹے نافر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”نافر! تو اپنے ترک باپ کی پیروی کرے گا۔“

منصور نے نافر کی طرف دیکھا اور نافر نے منصور کی طرف۔ دونوں جذبہ خیر سگالی کے اعلان میں پہل نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدستور کدورتیں موجود تھیں۔ ترک سردار مستعین ان دونوں کی خاموشی سے غمزہ ہو گیا، بولا۔ ”اچھا منصور! اب ہم دونوں واپس جائیں گے۔ میں دو ایک دن میں تجھے امیر المومنین کے وزیر محمد بن عبد الملک الزیات کے پاس لے جاؤں گا اور کوئی اچھا سا منصب دلانے کی کوشش کروں گا۔ وہ ایک عرب ہونے کے رشتے سے ضرور تیری مدد کرے گا۔“

ترک سردار مستعین اپنے بیٹے نافر کے ساتھ واپس گیا اور منصور کو اس سوچ میں چھوڑ گیا کہ ترک کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن ترک سردار مستعین ان سب سے مختلف اور شریف ہے اور کم از کم اس کے لیے اس کو اپنی رائے بدلنا پڑے گی۔

منصور کو کئی دن اپنے مکان میں بند بند سا رہنا پڑا کیونکہ وہ اس ماحول میں بالکل اجنبی تھا اور اجنبی ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ ترکوں میں گھلنا ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے دونوں غلام اسے اکساتے کہ وہ ترک سردار مستعین کے خاندان والوں سے تعلقات بڑھائے اور ان میں گھل مل جائے لیکن منصور کا دل اس پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ اس درمیان ترک سردار اور نافر برابر آتے جاتے رہے اور اس سے مختلف موضوعات پر ہنس کھنکھاتے کرتے رہے اور انہی ملاقاتوں میں منصور نے یہ حیرت انگیز بات بھی محسوس کی کہ اب نافر میں پہلے دن جیسی سختی یا خشونت نہیں پائی جاتی تھی۔ اب وہ بھی کسی حد تک اپنے باپ ہی کی طرح نرم اور

خوش اخلاق ہو گیا تھا جو یقیناً منصور کے خیال کے مطابق مستحق کی نصیحتوں اور ہدایتوں کا نتیجہ ہوگا۔

ایک دن دوپہر کو فیروز نے اسے مطلع کیا کہ ترک سردار مستحق نے منصور کو اپنے گھر کی تقریب میں مدعو کیا ہے۔ یہ تقریب اس کی لڑکی کی صحت یابی کی خوشی میں منعقد ہو رہی ہے۔ منصور نے سوچا، اس تقریب میں یقیناً خود اس کے سوا سارے ہی ترک ہوں گے اور وہ ان سب میں خود کو تنہا اور اجنبی محسوس کرے گا اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس تقریب میں ہرگز شامل نہ ہوگا۔

چنانچہ شام ہونے سے پہلے ہی منصور اپنے مکان میں بند ہو کر بیٹھ رہا لیکن مستحق بھی کوئی ایسا دیر ترک نہیں تھا۔ اس نے مغرب کی نماز منصور کے ساتھ ہی پڑھی اور دعا سے فارغ ہونے کے بعد کہا۔ ”منصور! میں تجھے لینے آیا ہوں۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”کیا میرا اس تقریب میں شریک ہونا ضروری ہے؟“

”ہاں بہت ضروری ہے۔“ پھر ہنس کر کہا۔ ”مجھے تو پہلے ہی یہ شبہ تھا کہ تو ہمارے لئے کی کوشش کرے گا اس لیے میں خود آ گیا اور اب میں لے کر ہی جاؤں گا۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”ساتھ چلنے میں کوئی حرج نہیں لیکن میں وہاں بالکل تنہا ہوں گا۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”تو وہاں تنہا کیوں ہوگا۔ نافر تیرے ساتھ ساتھ رہے گا اور اس بات کی کوشش کرے گا کہ تو وہاں تنہائی محسوس نہ کرے اور میں خود بھی اس کوشش میں نافر کا ساتھ دوں گا۔“

بالآخر منصور مجبور ہو گیا اور اس تقریب میں شامل ہونے کی نیت سے تیار ہونے لگا۔

☆☆☆

رات کو ترک سردار کے محل کو روشنی کا گھبراہٹ یا گیا۔ ایک بہت بڑے ہال میں مہمانوں کے لیے فرش بچھا دیا گیا جس پر سب بیچ کی جگہ چھوڑ کر مربع شکل میں بیٹھ گئے۔ ہال کے درمیان جگہ جگہ خشک اور ترمیوں کے تسلے رکھ دیے گئے۔ یہاں شرویات کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ پھلوں کے عرق کے ساتھ ہی سمجھوتہ کی نیز بھی رکھی ہوئی تھی۔ ترک مہمانوں کے ساتھ ان کے بچے بھی آئے ہوئے تھے اور وہ درمیان میں رکھے ہوئے پھلوں اور خشک میوؤں کو بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہی میں منصور بھی شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی نافر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ترک

مہمانوں کی نظریں بار بار منصور کے کتے ہوئے ہاتھ پر پڑ رہی تھیں اور شاید انہیں اپنے درمیان ایک عرب نوجوان کی موجودگی حیرت میں ڈالے ہوئے تھی۔

کافی دیر بعد خور و نوش کا سلسلہ شروع ہوا۔ نافر، منصور کو اصرار کر کے کھانا پلاتا۔ شریک محفل لوگوں نے خوب خوب کھا یا پیا۔ ادھر سے فارغ ہو جانے کے بعد رقص و موسیقی کا سلسلہ شروع ہوا۔ آزاد منشی اجڑے ترکوں نے رقص و موسیقی سے خوب لطف اندوز ہونے کا مظاہرہ کیا۔ رات کے پچھلے پہر ترک سردار نے ایک غیر متوقع قدم اٹھایا۔ وہ منصور کے پاس پہنچا اور درخواست کی۔

”معزز عرب نوجوان! میں چاہتا ہوں کہ تو صحت یابی کی مبارک باد میری بیٹی کو خود ہی چل کر دے دے۔“

منصور کو اپنی ساحت پر یقین نہیں آیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ترک سردار کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا مجھ سے کچھ کہا؟“

”ہاں اور کس سے کہوں گا۔“ ترک سردار نے جواب دیا۔ ”میں تجھے اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگا ہوں اس لیے کافی غور و فکر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ تجھے اپنی بیوی بچوں سے بھی ملوادوں اور ان سب سے ملنے کا یہ ایک بہترین موقع ہے۔“

منصور کو شبہ گزرا کہ اس کا ایک ہاتھ چونکہ موجود نہیں ہے اس لیے شاید ترک سردار اپنے خاندان والوں میں اس کا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔ اس نے بے دلی سے کہا۔

”ترک سردار! تمہاری نوازشیں یوں بھی میرے حال پر بہت زیادہ رہی ہیں، اب تم مجھے اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہتے ہو۔“ پھر کچھ سوچ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ابھی ملنے ملانے کے تکلفات میں نہ پڑو۔ میں ایک پریشان حال عرب ہوں اور کچھ چتا نہیں کہ میں اس گھر میں کب تک ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس گھر سے میرا کل ہی آپ ودانہ ٹھہ جائے۔“

لیکن ترک سردار نہیں مانا، وہ منصور کو اسی وقت اپنے بیوی بچوں میں لے گیا۔ وہاں بھی مہمانوں کا خاصا ہجوم تھا۔ ترک سردار نے اسے ایک کمرے میں بیٹھا دیا اور بولا۔ ”تو یہیں بیٹھ، میں ابھی انہیں بلا کر لاتا ہوں۔“

نافر بھی اس کے ساتھ ہی آ گیا تھا۔ منصور گھبرا یا ہوا تھا۔ اس نے نافر سے کہا۔ ”نافر! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی، وہ یہ کہ آخر تیرا باپ مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہے؟“

نافر نے جواب دیا۔ ”اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں لیکن جہاں تک میری سمجھ میں کوئی بات آتی ہے تو وہ یہ ہے کہ میرا باپ ذرا زیادہ رحم دل واضح ہوا ہے اور اسے تیرے حال پر کچھ زیادہ ہی رحم آ گیا ہے۔“ لیکن نافر کا بیان کیا ہوا جواز منصور کی سمجھ میں نہیں آیا۔

ذرا دیر بعد ترک سردار واپس آیا تو اس کے پیچھے اس کی بیوی اور بیٹی چلی آ رہی تھیں۔ منصور احتراماً کھڑا ہو گیا اور اس نے سلام میں پہل کی۔ ترک سردار کے علاوہ دونوں نے ہی اجنبی انداز میں سلام کا جواب دیا۔

ترک سردار نے اپنی چالیس پینتالیس سالہ بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”عرب نوجوان! میرے طور طریقوں سے تو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو تو بہتر ہے۔ یہ میری بیوی ہے۔ میں نے تجھے اپنا بیٹا بنالیا ہے اس لیے تجھ پر واجب ہے کہ تو میری بیوی کو اپنی ماں تصور کر۔“

منصور نے ترک سردار کی بیوی کو ذرا غور سے دیکھا تو دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہا کہ حسن اور دلکشی تو شاید ترکوں پر ختم ہو گئی ہے۔ اس چالیس پینتالیس سالہ عورت میں اب بھی بلا کی دلکشی موجود تھی۔ وہ انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ترک سردار کی آواز پھر سنائی دی، وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ”میرے دل اور گھر کی مالکہ! یہ منصور ہے، ایک عرب نوجوان، اس کا نام منصور ہے۔ میں اس کا غائبانہ ذکر کر چکا ہوں۔ یہ یعنی عرب ہے۔ اس کا باپ عمور یہ کی جنگ میں مارا گیا، ماں کا انتقال اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔ اب یہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ بھی کسی جنگ میں شہید ہو چکا ہے۔ اب یہ بے گار ہے کیونکہ اس کے ہاتھ کا یہ نقص اسے ہر جگہ مایوس کر رہا ہے۔ میں نے اس کی داستان سنی تو بہت متاثر ہوا اور اس بات کی ذمہ داری قبول کر لی کہ اسے رہنے کو گھر بھی دوں اور کوئی کام بھی دلادوں چنانچہ رہنے کو گھر دے چکا ہوں اور اب اس کا معاشی مسئلہ اور حل کرنا ہے۔“

اس تفصیلی تعارف پر نافر کو ہنسی آ گئی۔ منصور یہ سمجھ بیٹھا کہ یقیناً اس کے ساتھ کوئی مذاق ہو رہا ہے۔ اس نے نافر سے کہا۔ ”نافر! کیا تم مجھ پر اس لیے ہنس رہے ہو کہ میں ان دنوں زمانے کا ہدف بنا ہوا ہوں۔ تم لوگ طعن و طنز کے تیر چلانا تو فرق کا ایک ذریعہ سمجھ رہے ہو۔“

نافر گھبرا گیا، جلدی جلدی کہنے لگا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے منصور بلکہ میں اس پر ہنس رہا ہوں کہ باوا جان نے تمہارا تفصیلی تعارف گھر میں پہلے ہی کر دیا تھا۔ میں تو

اپنے باوا کے اس جذبہ ہمدردی اور احساسِ رحم پر مسکرا رہا ہوں جس نے انہیں بدحواس اور پریشان کر رکھا ہے۔“

ترک سردار نے نافر کو ڈانٹا۔ ”خبردار نافر! جو تو نے دوبارہ کوئی ایسی ویسی بات کی۔ منصور میرا مہمان ہے اور میرا مہمان تیرا مہمان ہوا اور اب یہ ہمارا مہمان ہی نہیں، تیرا بھائی بھی ہے۔“

ترک سردار کی بیوی بہت خوش تھی، بولی۔ ”میں اس نوجوان عرب سے مل کر بہت خوش ہوئی اور میں اسے اپنا بیٹا ہی سمجھوں گی۔“ پھر اپنی بیٹی کا تعارف کروایا۔ ”اور یہ ہے میری بیٹی بوران۔ آج کی تقریب اسی کی صحت یابی کی خوشی میں منعقد ہوئی ہے۔“

منصور نے ترک سردار کی بیٹی بوران کی طرف دیکھا تو اس کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے، کیا سارے ترک حسین ہوتے ہیں۔

ترک سردار نے کہا۔ ”میری بیوی جس طرح تیری ماں بن گئی ہے اسی طرح میری بیٹی بوران اب تیری بہن بن گئی ہے۔ یہ تیری بھائیوں جیسی عزت کرے گی اور تو ایک چھوٹے سے بھائی کی طرح بوران کا خاص خیال رکھے گا۔“

ترک سردار کی باتیں منصور کے دل پر چوٹ لگا رہی تھیں۔ اس کا دل بوران کو بہن بنانے پر آمادہ نہیں تھا۔

اس تعارف کے بعد سب ایک دوسرے کے دربرو بیٹھ گئے۔ منصور بار بار بوران کو دیکھ رہا تھا۔ آخر بوران نے شرما کر اپنی گردن جھکالی۔ ترک سردار نے اسی وقت ان سب کو پھل پیش کیے۔ وہ ایک نہایت خوشگوار ماحول تھا۔ منصور، بوران کو بار بار دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ترک سردار نے کہا۔

”منصور! میرا خیال ہے کہ تو میری بیٹی بوران کو اپنی بہن تصور کرے گا۔ میں نے اپنی طرف سے وہ سب کچھ کر دیا جس کا میں کافی دنوں سے ارادہ کیے بیٹھا تھا اور آج بہت خوش ہوں۔“

نافر نے کہا۔ ”منصور! اب وقت آ گیا ہے کہ تم سب کے لیے کوئی مشترکہ کام کیا جائے۔ میرے باپ نے تجھے میرا بھائی قرار دیا ہے، کم از کم میں اس رشتے کا زندگی بھر احترام کروں گا لیکن شاید تیری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ میری ماں، باپ اور خود بوران تجھ کو آمیز نظروں سے دیکھ دیکھ کر ہاں یا نہ میں تیرا جواب منٹا چاہتے ہیں۔“

منصور نے کہا۔ ”میں کیا جواب دوں؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”یہ کہ تو آج سے بوران

میں ایک قسم کی وحشت سی پائی جاتی تھی جو یا تو شب بیداری کا نتیجہ تھی یا سو کر اٹھنے، زیادہ دیر نہ سونے کی وجہ سے تھی۔ ترک سردار نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”نوجوان عرب منصور اپنی رات والی غلطی پر پشیمان ہے اور اس نے ابھی ابھی یہ وعدہ کیا ہے کہ یہ بوران کو اپنی بہن بنا کر ترکوں کے لیے اپنے جذبہ خیر سگالی کا اظہار کرے گا۔“

بوران سامنے سے ہٹ گئی اور منصور ایک بار پھر نکلتی کا شکار ہو گیا۔ بوران کے سحر اثر حسن نے اس کی زبان سے قوت گوئی کی جھین لی اور اس کا دل انتہائی جبر اور کوشش کے باوجود بوران کو بہن کہنے پر آمادہ نہ ہوا۔ بوران کا سامنے سے ہٹ جانا اسے گراں گزرا۔ ترک سردار نے بیوی سے پوچھا۔

”یہ بوران کہاں چلی گئی، ذرا بلانا تو اسے۔“

لیکن ذرا دیر بعد جب وہ بوران کے پاس سے واپس آئی تو یہ خبر لے کر کہ۔ ”بوران کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس کے سر میں درد ہے اس لیے اس معاملے کو دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھا جائے۔“

منصور کی جان میں جان آئی کہ خدا نے اس مکروہ معاملے کو ٹال دیا تھا۔

ترک سردار اسے لے کر مقسم کے وزیر محمد بن عبد الملک الزیات کے پاس پہنچا۔ ابن الزیات کا دربار کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے سامنے کئی معزز شخصیتیں نہایت ادب سے بیٹھی تھیں اور ابن الزیات ان پر کوئی توجہ نہ دے رہا تھا۔ ترک سردار نے ابن الزیات کو سلام کیا تو اس نے سر اٹھا کر ترک سردار کو سرسری نظروں سے دیکھا اور زبان کے بجائے گردن ہلا کر سلام کا جواب دیا۔ اس کا طرز عمل ترک سردار کو نہایت گراں گزرا۔ وہ منصور کی نظروں میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ اس نے دوسروں کی پروا کیے بغیر کہا۔ ”ابن الزیات اخلاق کی رسول اللہ ﷺ نے بڑی تعریف فرمائی ہے لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ مسلمان اس قیمتی وصف سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔“

ابن الزیات نے ٹیڑھا منہ بنا کر جواب دیا۔ ”ترک سردار! ذرا ادب سے بات کر، میں انتہائی مصروف آدمی ہوں، تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟“

ترک سردار نے کہا۔ ”اپنی خواہش تو اس وقت بیان کروں گا جب مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ تو اسے خوش دلی اور اطمینان سے سنے گا۔ میں اپنی درخواست پیش کر کے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔“

ترک سردار، منصور کو لے کر جیسے ہی مکان سے نکلا۔ منصور نے کہا۔ ”جناب والا! میں آپ کی جو خواہش رات پوری نہیں کر سکا تھا، پوری رات اس پر شرمسار اور تادم رہا۔ میں کہیں جانے سے پہلے آپ کے گھر چلنا چاہتا ہوں تاکہ جو رات نہیں کر سکا تھا، اسے اس وقت کر گزروں۔“

ترک سردار نے تجسس اور سوالیہ نظروں سے منصور کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ”کیا کچ بچ؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں، کچ بچ۔ ترک سردار! میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں منافق بھی نہیں بن سکتا۔ کل رات میرے دل میں بوران کے لیے بھائیوں جیسے جذبات نہیں تھے لیکن آپ لوگوں کے حسن سلوک نے مجھ ہوتے ہوئے مجھے اس پر مجبور کر دیا ہے کہ میں بوران کو بہن بنا کر آپ سب کی خواہش پوری کر دوں۔“

ترک سردار نے نہایت دکھ سے کہا۔ ”منصور! ایک عرصے سے میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ رہا ہے، میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کانٹے کو نکال باہر کروں لیکن میں اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ چنانچہ کل رات جب تو نے بوران کو بہن ماننے یا بتانے سے انکار کر دیا تو اس پر مجھے غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا لیکن اس وقت میں نے ضبط و تحمل سے اس لیے کام لیا کہ اس ضبط و تحمل میں میرے لیے سکون اور تسلی کا سامان موجود تھا۔“

منصور نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”کل رات تک میرے دل میں ترکوں کے خلاف شدید نفرت موجود تھی اور اگر اس وقت آپ میرے پاس نہ آتے تو شاید غم و غصے کا یہ جذبہ مجھ میں اس وقت بھی موجود ہوتا لیکن اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرے دل میں غم و غصے کے ایستادہ برقیے تو دے پھلتے جا رہے ہیں اور اس کا پانی میرے دل میں موجود کدورت کو دھوئے چلا جا رہا ہے۔“

ترک سردار کے چہرے پر بے باشت کی لہری دوڑ گئی، بولا۔ ”عرب نوجوان! شاید تو یقین نہ کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں عربوں سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تجھے اپنے خاندان کا ایک فرد بنانا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں نے تجھے اپنی بیوی، بیٹی اور بیٹے سے ملایا تھا لیکن پھر معلوم نہیں کیوں تو نے میرا ساتھ نہیں دیا۔“

ترک سردار، منصور کو اسی وقت اپنے خاندان میں لے گیا۔ اس کی بیوی اور نافرمانی صبح منصور کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بوران پر کیا اثر ہوا یہ وہی جانتی ہوگی۔ اس کا چہرہ کچھ متورم سا محسوس ہو رہا تھا اور اس

ترک سردار، نافر اور اس کی ماں کو اس کا یہ رویہ پسند آیا ہوگا؟ اور اس سلسلے میں خود بوران نے کیا سوچا ہوگا؟ وہ اس پر جتنا زیادہ سوچتا، پریشان ہو جاتا پھر وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ترکوں کا مقام تلاش کرتا تو پتا چلتا کہ وہاں ترکوں کے خلاف نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ترکوں کا حد درجہ شریفانہ سلوک یاد آتا تو وہ بے چین ہو جاتا اور کوشش کرتا کہ ترکوں کے خلاف دل میں جو کدورت موجود ہے اسے نکال پھینکے لیکن ایسا کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اب تو اسے یہ شب بھی ہو گیا تھا کہ شاید دوسرے دن علی الصباح ترک سردار یا نافر اسے یہ حکم دینے حاضر ہوں کہ رات بوران کو بہن نہ کہنے کے جرم میں اسے گھر سے نکالا جا رہا ہے۔ اس آخری خیال اور تکلیف دہ غدشے نے اسے پریشان کر دیا اور وہ اپنے رویے پر پشیمان بھی ہوا اور پریشان بھی۔ اس نے افسوس کے ساتھ سوچا کہ اسے بوران کو بہن بنالینا چاہیے تھا خواہ اس عمل میں اس کی منافقت ہی کیوں نہ شامل ہوئی۔ وہ رات گویا بڑی طویل رات تھی۔ اب اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی ترک سردار سے مل کر یہ درخواست کرے گا کہ وہ منصور کو بوران کے رویوں سے چلے کیونکہ وہ غلطی سے جو کام رات نہیں کر سکا، اب کرنے کو تیار ہے۔

صبح چڑیوں کی چھبھٹ میں ترک سردار اس کے پاس آیا۔ اس وقت اذان کی آواز بھی صبح کے سنائے کو لرز رہی تھی۔ غلام فیروز نے وضو کے لیے پانی اس کے سر ہانے لاکر رکھ دیا۔ منصور اوجھل آنگھوں سے ترک سردار کو اپنے سامنے دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا کیونکہ اس کی آمد منصور کی توقع کے مطابق تھی۔ اس کے دونوں کان ترک سردار کے اس حکم کو سننے کے لیے تیار تھے جس میں اس کے رخصت ہو جانے کا مفہوم شامل ہو۔

ترک سردار نے آہستہ سے کہا۔ ”منصور! میں تجھے وزیر ابن الزیات کے پاس لے چلوں گا، تو وضو کر کے فجر کی نماز ادا کر لے۔“

یہ لب و لہجہ اور باتوں کا مفہوم اس کی توقع سے مختلف تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھا، وضو کیا اور ترک سردار کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ اس نے زیر لب دعا میں خدا سے یہ خواہش کی کہ وہ اس کے دل سے ترکوں کے خلاف موجود کدورت کو دور کر دے۔ اسی دوران اسے بوران بھی یاد آئی اور جی چاہا کہ اس کے لیے بھی دعا مانگے لیکن پھر دل ہی دل میں شرماء کے دعا مانگنے سے معذور رہا۔

کو اپنی بہن سمجھے گا۔“

لیکن منصور نے پھر خاموشی اختیار کر لی، ترک سردار اپنے متعلقین سمیت منصور کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ نافر نے کہا۔ ”تو خاموش کیوں ہے؟“

منصور نے جواب دیا۔ ”میں ایک ایسی بات کس طرح اپنی زبان سے ادا کروں جو غلط ہے، جھوٹ ہے۔“ بوران نے چونک کر منصور کی طرف دیکھا۔ ترک سردار، نافر اور اس کی ماں نے بھی گہرا کر منصور کی طرف دیکھا۔ ترک سردار نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ بوران تیری بہن نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اگر تو اسے اپنی بہن سمجھنے لگے گا تو یہ کوئی بری بات نہ ہوگی۔“

منصور نے اکتا کر کہا۔ ”بوران میری بہن نہیں ہے، میں اسے کس طرح اپنی بہن کہہ دوں؟“

ترک سردار کی بیوی اور نافر کو منصور کے اس جواب نے بڑی تکلیف پہنچائی لیکن مفاہمت پسند ترک سردار نے انہیں سمجھایا۔ ”تم لوگ اس عرب نوجوان کی باتوں سے خفا خفا نظر آرہے ہو لیکن میرے خیال میں تمہیں رنجیدہ یا کبیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جس لڑکی سے منصور واقف نہیں ہے، اسے وہ اپنی بہن فی الفور کیوں کہہ دے۔“

بوران اس ضدی اور صاف گو عرب نوجوان کو اچھی طرح دیکھنا چاہتی تھی لیکن ماں باپ اور بھائی کی موجودگی میں وہ ایسا نہیں کر سکی۔ اس کے سر پر رومال بندھا ہوا تھا جس میں سے سیاہ بالوں کی لٹیں نکل کر پیشانی پر بکھر گئی تھیں۔ منصور کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے ترک سردار سے کہا۔

”کیا اب واپس نہ چلا جائے؟“

ترک سردار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہاں اب واپس چلنا چاہیے۔“

منصور نے بوران کی ماں اور نافر کی طرف دیکھا جو اسے گھورنے میں مشغول تھے۔

جب وہ اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹا تو اسے یاد آیا کہ اس نے بوران کو اس کی صحت یابی کی مبارک باد ددی ہی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے بوران کا شرمایا شرمایا چہرہ بطور خاص یاد آتا رہا۔ اسے اس پر بڑا غصہ آیا کہ ترک سردار، بوران کو اس کی بہن بنانے پر کیوں مصر تھا۔ اس نے آخر وقت تک بوران کو بہن نہیں کہا۔ یہ اس کے دل کی بات تھی۔ وہ ایک غلط بات نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن اب بستر پر لیٹا وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا، کیا وہ سب صحیح تھا؟ کیا

ابن الزیات نے سرچھے کیے رکھا، بولا۔ ”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں نہایت مصروف انسان ہوں۔ اگر میں ہر کس و نا کس کی درخواست پر غور کرنا شروع کر دوں تو میں اپنے فرائض منصبی نباہ چکا۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”ابن الزیات! زیادہ مغرور مت بنو اور یاد رکھو کہ کسی کا یکساں وقت نہیں رہتا۔“

”بس بس اپنی صحتیں رہنے دے اور آنے کی غرض و غایت بیان کر۔“

ترک سردار نے منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابن الزیات! یہ عرب نوجوان تیری ہی قوم کا ایک فرد ہے اور اس کا ایک ہاتھ کسی لڑائی میں ضائع ہو چکا ہے، اسے میں تیرے پاس اس لیے لایا ہوں کہ تو اسے کوئی ایسا کام دے دے جس سے یہ باعزت زندگی گزار سکے اور ایک ہاتھ کی کمی نے اس میں جو ایک قسم کا احساس محرومی پیدا کر دیا ہے، اس سے نجات حاصل کر لے۔“

ابن الزیات نے ایک بار پھر سر اٹھا کر منصور کی طرف دیکھا اور درشت لہجے میں کہنے لگا۔ ”ترک سردار! آخر یہ تم سب کو ہو کیا گیا ہے، اس مخوس نوجوان کو کون اپنے پاس رکھنا پسند کرے گا اور پھر یہ ایک ہاتھ سے کون سی خدمت انجام دے سکتا ہے۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”ابن الزیات! یہ محبت کی بات تو کر رہا ہے، کیا سپاہیوں کے میدان جنگ میں ہاتھ بچر نہیں کٹ جایا کرتے؟ جسے تو عیب کہہ رہا ہے یہ تو اس کی بہادری اور جنگ جوئی کا ایک روشن نشان ہے۔“

ابن الزیات نے حاضرین میں سے چند کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ایک دراز ریش اور گندم کون عمر رسیدہ شخص سے کہا۔ ”تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟ میں تجھے کئی بار منع کر چکا ہوں کہ میں امیر المومنین سے تیری سفارش نہیں کر سکتا پھر کیوں تنگ کرتا رہتا ہے۔ اسی وقت دفاع ہو جا یہاں سے۔“

پھر دوسرے گول مٹول سے شخص سے مخاطب ہوا۔ ”کسی درباری امیر نے اگر تجھے ستارہ کھا ہے تو اس کا میری ذات سے کیا تعلق ہے؟“

اور ایک شخص کو تو مارنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ”بس تیری عافیت اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جا۔“

ابھی چار آدمی باقی تھے جنہیں ڈانٹنا تھا کہ ابن الزیات کے آدمیوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں اسے مطلع کیا۔ ”حضور والا! امیر المومنین کے بیٹے واثق تشریف

لا رہے ہیں۔“

ابن الزیات نے سب کو وہاں سے ہٹانا شروع کر دیا۔ ترک سردار سے بھی چلے جانے کے لیے کہا لیکن وہ نہیں ہٹا۔ ابن الزیات تلش میں کھڑا ہو گیا اور ترک سردار سے کہا۔ ”ترک سردار! تھوڑی دیر کے لیے اگر تم کہیں اور چلے جاؤ تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

ترک سردار نے جواب میں کہا۔ ”ابن الزیات! آخر یہ زلزلہ کیوں آگیا؟ کیا واثق کوئی خوں خوار درندہ ہے جو ہر کوئی ان کے آگے پیچھے بھاگنے کی تیاری کر رہا ہے۔“

ابن الزیات نے کہا۔ ”ترک سردار! میں تم سے بحث نہیں کر سکتا۔ واثق یہاں کیوں آ رہا ہے میں جانتا ہوں اس لیے میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم کچھ دیر کے لیے یہاں سے نکل جاؤ، جب میں مناسب سمجھوں گا تم دونوں کو بلا لوں گا۔“

لیکن ابھی یہ بحث جاری ہی تھی کہ واثق، ابن الزیات کے پاس آگیا۔ ابن الزیات نے بے نیازی اختیار کی اور اپنی جگہ بیٹھا رہا، منہ دوسری طرف کر لیا۔ ایسا لگتا تھا گویا مقسم باللہ کے بیٹے کی ابن الزیات کی نظر میں کوئی وقعت ہی نہیں تھی۔

واثق، ترک سردار سے بھی واقف تھا۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی۔ ابن الزیات اس علیک سلیک کو ناگواری سے محسوس کرتا رہا۔ واثق نے ابن الزیات سے کہا۔ ”ابن الزیات! میرے کام کا کیا ہوا؟“

ابن الزیات نے بے مروتی سے جواب دیا۔ ”تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ امیر المومنین نے سختی سے منع کر دیا ہے۔“

واثق نے بے قراری سے کہا۔ ”ابن الزیات! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے جس رقم کا مطالبہ کیا ہے وہ میری جائز ضرورت ہے۔ امیر المومنین کو اس کی ادائیگی میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟“

ابن الزیات نے بہت ہی زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں امیر المومنین پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، وہ مقتدر اعلیٰ ہیں۔ امیر المومنین فرماتے تھے کہ واثق سے کہہ دو اسے جو کچھ ملتا رہا ہے وہ کافی ہے حریہ کی ہوس نہ کرے۔ ورنہ جو ملتا ہے اسے بھی بند کر دیا جائے گا۔“ پھر ذرا زیادہ حقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں نے تم سے وہ بات تو کہی ہی نہیں جو امیر المومنین نے کہی تھی حالانکہ انہوں نے مجھے میں قسم دے کر مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے کہہ دوں کہ مقررہ رقم کے علاوہ کچھ طلب کرنا در پوزہ گری ہے اور امیر المومنین کے

بیٹے کو در پوزہ گری زیب نہیں دیتی لیکن میں نے اسی وقت یہ کہہ دیا تھا کہ اس قسم کی بات میں نہیں کہہ سکوں گا۔“

واثق نے مجھے میں کہا۔ ”اوتیل بیچنے والے کے بیٹے! جو کچھ تجھے کہنا تھا کہہ دیا۔ میں امیر المومنین کا بیٹا واثق در پوزہ گر ہوں۔ بندھ تو نے میرے دل میں فتنہ اتار دیا ہے۔ تو نے اس ترک سردار کے سامنے مجھے ذلیل کیا ہے، میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔“

ابن الزیات نے جواب دیا۔ ”مجھے تیل بیچنے والے کے بیٹے کہہ کر تم ذلیل کرنا چاہتے ہو حالانکہ میں نے خود ہی اسے اپنے نام کا جزو بنالیا ہے۔ میں ابن الزیات (تیل بیچنے والے کا بیٹا) ہوں کسی چور، ڈاکو یا مفسد کا بیٹا تو نہیں ہوں۔“

واثق نے جاتے جاتے کہا۔ ”ابن الزیات! میں اپنی اس بے عزتی کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”ابن الزیات! میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا میں جاؤں؟“

ابن الزیات نے رعوت سے کہا۔ ”ہاں تم سب دفعان ہو جاؤ، مجھے کسی کی پروا نہیں۔“ پھر بطور خاص واثق سے کہا۔ ”اگر تم سمجھتے ہو کہ امیر المومنین کے بیٹے ہو اور میں تم سے ڈر جاؤں گا تو یہ تمہارا خیال خام ہے۔ تم جیسے چلتی ہو مہری ناز برداری کیا کرتے ہیں۔ مجھے اپنی صلاحیتوں اور علم و فضل پر اعتماد ہے۔“

”تمہاری صلاحیتوں اور علم و فضل کو میں دیکھوں گا۔“ واثق باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ہی ترک سردار بھی اٹھ کھڑا ہوا اور منصور کو لیے ہوئے واثق کے قریب پہنچ گیا۔

پیچھے سے آہستہ سے بولا۔ ”مستقبل کے امیر المومنین! مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور ابن الزیات کے ناروا سلوک کو افسوس کی نظر سے دیکھتا ہوں۔“

واثق نے مڑ کر دیکھا، پوچھا۔ ”تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟“

ترک سردار نے منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس شریف عرب نوجوان کو ملازمت دلانے آیا تھا لیکن ابن الزیات نے کوئی توجہ ہی نہیں دی، کہتا ہے کہ ایک ہاتھ کا آدمی مخوس ہوتا ہے۔“

واثق نے کہا۔ ”ابن الزیات کا دماغ خراب ہو گیا ہے، جسے اللہ کو اگر منظور ہو تو میں ٹھیک کروں گا۔“ پھر منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس شخص کو تو میرے پیر کر دے، یہ میری خدمت میں رہے گا۔“

ترک سردار کا مارے خوشی کے چہرہ دیکھنے لگا۔ ایک ایسی خوشی سے، جو خلاف امید اور مانگے بغیر ہی حاصل ہو گئی ہو۔ اس نے منصور سے کہا۔ ”لے اب تو کل کے امیر المومنین کے ساتھ چلا جا۔“

منصور نے کہا۔ ”لیکن میں رہوں گا آپ ہی کے ساتھ۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”یہ میں کب کہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ نہ رہ۔“

واثق نے کہا۔ ”اگر تو میری خدمت میں رہے گا تجھے اس کا موقع ہی کہاں ملے گا کہ اس ترک سردار کے ساتھ رہ سکے۔“

منصور نے متوجہ نہ نظروں سے ترک سردار کی طرف دیکھا۔ ترک سردار نے تکی دی۔ ”میں تو خود بھی تجھے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا ہوں، تو اس نہ ہو۔“ پھر واثق سے کہا۔ ”میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس شریف نوجوان کے سپرد کوئی ایسی خدمت کیجیے کہ یہ میرے ساتھ رہ سکے کیونکہ میں اسے اپنے ساتھ رکھ کر ایک عجیب سی حظ، ایک عجیب سی لذت محسوس کرتا ہوں۔“

واثق نے فس کر جواب دیا۔ ”اچھا، یہ ہفتے میں دو دن تمہارے پاس گزارے گا۔ اب تو تو خوش ہوا؟“

ترک سردار نے خوش ہو کر کہا۔ ”حضور والا کی نوازش، مہربانی، گرم گسٹری۔“ واثق، منصور کو اپنے ساتھ لے گیا اور ترک سردار اپنے گھر چلا گیا۔ جب یہ سب ہو رہا تھا تو ابن الزیات کا جاسوس ان کے آس پاس موجودان کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا چنانچہ اسی وقت ابن الزیات اپنے آدمیوں سے کہہ رہا تھا۔

”یہ بے وقوف، احمقوں کی جنت میں رہنے والے لوگ، یہ بھی نہیں جانتے کہ مملکت عباسیہ میں امیر المومنین کے بعد میری ذات سب سے اعلیٰ و افضل ہے۔ میں ایک اشارے میں زیر و زبر کر سکتا ہوں۔“

☆☆☆

واثق محل میں داخل ہونے کے بعد تھپے میں جا کر ابن الزیات کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اسے لکھتا رہا پھر منصور کو اپنے پاس بلا کر حکم دیا۔

”ابن الزیات نے میرے ساتھ جیسا نازیبا سلوک کیا ہے تو نے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے، اب میں تجھے اس کا گواہ بناؤں گا۔ لے اسے پڑھ۔“

منصور پڑھنے لگا۔ ”آج میں، واثق اپنی وہ رقم حاصل کرنے کے لیے ابن الزیات کے پاس گیا تھا، جسے امیر المومنین نے خود اپنی خوشی سے مجھے دینا پسند فرمایا تھا۔“

مجھے یہ دم ابن الزیات سے ملتی تھی لیکن.....

وائق نے اسے روک دیا۔ ”پوری تحریر مت پڑھ، بس یہ آخر کی چند سطریں پڑھ لے اور اس کے ایک طرف لکھ دے کہ یہ واقعہ میرے سامنے پیش آیا، میں اس کا معنی شاہد ہوں۔“ منصور نے پڑھا۔ ”اگر میں خلیفہ بننے کے بعد ابن الزیات کو بری طرح قتل نہ کروں تو مجھ پر حج و صدقہ واجب ہو اور میرے لونڈی غلام آزاد ہوں۔“ وائق نے اس کے نیچے اپنے دستخط کر دیے تھے۔ دوسرے کنارے پر انگلی رکھ کر منصور کو حکم دیا۔

”تو یہاں لکھ دے کہ یہ واقعہ میرے سامنے پیش آیا، میں اس کا گواہ ہوں اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر دے۔“

منصور نے حکم کی تعمیل کر دی۔ اس کے بعد وائق نے کہا۔ ”ترک سردار سے بھی دستخط کروانا ہیں۔ میں ابن الزیات کو کسی قیمت پر بھی معاف نہیں کروں گا۔“

منصور کو وائق نے ازراہ ہمدردی رکھ لیا تھا۔ یوں اس کے ذمے کوئی خاص خدمت نہیں تھی۔ تیسرے دن وائق نے اس سے کہا کہ وہ ترک سردار کو بلالائے۔ جب وہ ترک سردار کے پاس پہنچا تو وہ منصور سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس وقت تاثر گھر میں موجود نہ تھا اور ترک سردار کی بیوی غسل کر رہی تھی۔ بوران موجود تھی لیکن وہ بھی منصور کو دیکھ کر وہاں سے جانے لگی۔ ترک سردار نے اسے روک لیا۔ بولا۔ ”بوران! میری خواہش تھی کہ تو منصور سے مخالفت نہ اختیار کر لیکن تو ہمیشہ میری مرضی کے خلاف کرتی ہے۔ اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو یہیں موجود رہ۔“

بوران کچھ کہے سے بغیر رک گئی، اس نے منصور کو اچنی سی نظروں سے دیکھا اور گردن جھکا لی۔

ترک سردار نے پوچھا۔ ”نافر کہاں چلا گیا؟“ بوران نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”وہ یہیں کہیں ہوگا۔“ ترک سردار نے کہا۔ ”اچھا میں نافر کو تلاش کر کے لاتا ہوں تاکہ وہ گھر میں رہے اور میں امیر المومنین کے بھائی وائق کے پاس جاؤں۔“

وہ چلا گیا اور منصور، بوران کے پاس تنہا رہ گیا۔ بوران نے منصور کو مخاطب کیا۔ ”میں جلدی میں تم سے ایک بات کہہ دینا چاہتی ہوں۔“

منصور نے اشتیاق سے جواب دیا۔ ”کہو، میں سننے کو تیار ہوں۔“

بوران نے کہا۔ ”میں بہن بننے پر ہرگز تیار نہیں، اس

سے تم بھی اجتناب برتنا۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”میں خود بھی تمہیں بہن بنانے پر آمادہ نہیں ہوں لیکن تمہارے باپ کے اصرار پر میں مجبور ہو گیا تھا۔ اگر اب پھر کوئی ایسا موقع آجائے تو میں تم سے یہ درخواست کروں گا کہ تم سامنے سے ہٹ جانا، بات خود بخود حل جائے گی۔“

اس کے بعد خاموشی چھا گئی لیکن منصور کی حتمی کہ بات کا سلسلہ جاری رہے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ترک سردار کی واپسی کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا بوران خود ہی سلسلہ گفتگو جاری رکھے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بوران نے ایسی چپ سادھی کہ پھر ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ منصور اس انکشاف سے بہت خوش تھا کہ خود بوران بھی بہن بننے پر آمادہ نہیں۔

منصور نے یہ مشکل سوال کیا۔ ”بوران! کیا تم ایک بات بتاؤ گی؟“

بوران نے جواب دیا۔ ”پوچھو، ضرور بتاؤں گی۔“ منصور نے پوچھا مگر اس طرح گویا لفظوں کا پھندا پڑ رہا ہو۔ ”بوران، ادھر میں تین دن سے تم لوگوں سے نہیں ملا، کیا تم میں سے کسی نے بھی مجھے یاد کیا تھا؟“

بوران ہنسنے لگی، بولی۔ ”مجھے تو تم ذرا بھی یاد نہیں آئے۔ دوسروں کا حال میں جانتی نہیں۔“

منصور کے دل پر چوٹ لگی۔ بوران ہنستی رہی۔ منصور کے دل پر اس ہنسی نے اور زیادہ ستم ڈھایا، جل کر بولا۔ ”ترکوں کے بارے میں میری شروع ہی سے بہت بُری رائے ہے۔ اگر میں تمہیں یہ بتا دوں بوران کہ میں یہاں ترکوں کی ہستی میں کیا لینے آیا ہوں تو تم سب میرے جانی دشمن ہو جاؤ گے۔“

بوران نے جواب دیا۔ ”ایک طرف تو تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ تمہیں مجھ سے یا میرے خاندان سے بڑی دلچسپی ہے اور ہم سے یہ امید کرتے ہو کہ تمہاری عدم موجودگی میں ہم لوگ تمہیں یاد کریں اور دوسری طرف تم اپنی ترک دشمنی کا اعلان کرتے ہو۔“

بوران کی ماں غسل کر کے آچکی تھی۔ دونوں کی باتیں وہیں ختم ہو گئیں لیکن منصور ابھی اور باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ماں نے آتے ہی سوال کیا۔ ”ارے منصور! تو کب آیا؟“ پھر

بوران سے پوچھا۔ ”اور سب کہاں چلے گئے؟ تو تنہا ہے۔“

بوران نے جواب دیا۔ ”ابا، نافر کی تلاش میں گئے ہیں۔“

منصور نے کہا۔ ”میں تمہاری دیر پہلے آیا ہوں اور

ترک سردار کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ انہیں امیر المومنین کے بیٹے وائق نے بلایا ہے۔“

ماں نے پوچھا۔ ”اب کیا تو وہیں رہے گا؟ میں نے تو یہ سنا تھا کہ تو یہیں ہمارے پاس رہے گا۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”ابھی تو مجھے وہیں رہنا پڑے گا۔“ پھر نہایت کرب سے کہا۔ ”ایک ہاتھ کی کمی نے میرے اندر ایک مجبوری یا کمزوری کا جو احساس پیدا کر دیا ہے وہ میری امنگوں اور حوصلوں کو قتل کر دیتا ہے۔“ پھر ذرا خاموش رہ کر پر جوش لہجے میں بولا۔ ”اگر مجھے انتقام کا موقع مل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ میرا ایک ہاتھ کس نے ضائع کر دیا تھا تو میں اس سے اتنا بھیانک انتقام لوں کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔“

ماں نے حیرت سے سوال کیا۔ ”لیکن جنگ میں بھی کچھ ممکن ہے، ہاتھ بھی کٹ سکتے ہیں، پیر بھی اور گردن بھی پھر اس نقصان کا کسی ایک شخص سے کس طرح انتقام لیا جاسکتا ہے؟“ منصور نے موضوع کو ٹالنے کے لیے کہا۔ ”آپ کی بات درست ہے لیکن غلط میں بھی نہیں ہوں۔“

ماں اور بوران نے بیک وقت ایک ہی بات سوچی، منصور کی شدید جذباتی دباؤ کی وجہ سے اپنے ہوش دھواں میں نہیں ہے۔

☆☆☆

منصور نے ترک سردار کو وائق سے ملوادیا۔ وائق نے اس کی اثر انگیز پذیرائی کی۔ وائق کی کوشش یہ تھی کہ وہ امرائے عرب اور ترک سرداروں سے تعلقات خوشگوار رکھے۔ اس نے ترک سردار کو بھی ابن الزیات کے معاملے میں شاہد بنالیا لیکن جب ترک سردار وائق چلا گیا تو منصور نے جرأت سے جو بات کی وہ ترکوں کے خلاف تھی۔ اس نے وائق سے کہا۔

”میں ایک معمولی اور عام آدمی کی حیثیت سے آپ کو کوئی مشورہ تو نہیں دے سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ہم عربوں کو ترکوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔“

وائق نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا تو تمام ترکوں کے خلاف ہے اور اس ترک سردار کے خلاف بھی، جس نے تجھ پر احسان کیے ہیں اور تجھے میرے پاس تک پہنچایا ہے۔“

منصور رو ہانسا ہو گیا۔ جذباتی دباؤ نے اس کا حلق خشک کر دیا تھا اور آواز پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔ اس نے یہ مشکل کہا۔ ”اگر آپ ایک عرب ہونے کی حیثیت سے میری ترک دشمنی کا پس منظر سننا یا سمجھنا پسند فرمائیں تو میں

عرض کروں اور اس کے بعد آپ یہ فیصلہ فرمادیں کہ میں اپنے موقف میں کتنا صحیح یا غلط ہوں۔“

وائق نے حیرت اور تجسس کے ملے جلے لہجے میں اجازت دی۔ ”تو سنا اپنا قصہ، میں بھی تو سنوں کہ تجھ پر ترکوں نے کیا ظلم کیا ہے؟“

منصور نے کہنا شروع کیا۔ ”جب میں چھوٹا تھا اور بغداد میں رہا کرتا تھا۔ یہ ترک نئے نئے بغداد میں آئے تھے۔ سرقد، فرغانہ اور بخارا جیسے غیر ترقی یافتہ علاقوں سے آنے والے ان وحشیوں نے بغداد جیسے ترقی یافتہ عروس البلاد میں قدم رکھا تو ان کا دماغی توازن ہی بگڑ گیا۔ یہ اچڑ ترک اپنے گھوڑوں پر سوار بغداد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے رہتے، ان کا اس حد تک دماغ خراب ہو گیا تھا کہ جب یہ اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے بھاگتے تو انہیں اس بات کا بھی خیال نہ رہتا کہ ان کے گھوڑوں کی زد میں کون آرہا ہے چنانچہ ان کے اس باگل پن سے عریضوں کی عورتیں، بوڑھے اور بچے بری طرح مجروح ہوتے رہے۔“ پھر اس نے اپنے غائب بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا یہ غائب ہاتھ بھی کسی ایسے ہی اچڑ ترک کے گھوڑے سے تلے روندے جانے کی نذر ہو گیا۔“ اتنا کہہ کر وہ رونے لگا۔ وائق کے دل پر اس روداد کا خاص اثر ہوا۔ منصور نے اپنی داستان کا بقیہ حصہ بھی سنا دیا۔ ”اس دن میں اپنے دو بھائیوں اور دادا کے ساتھ مدر سے جا رہا تھا۔ میرا ایک بھائی تو بھاگ کر قحط گیا تھا اور دوسرے کا سر گھوڑے کی ٹاپوں تلے کچلا گیا تھا۔“

وائق اس غمزہ عرب نوجوان کی افسوس ناک داستان نہایت افسوس سے سن رہا تھا۔ ”تیرا وہ بھائی کہاں ہے جو کچلے جانے سے قحط گیا تھا؟“ منصور نے جواب دیا۔ ”وہ بغداد میں موجود ہے۔ میرے دادا کا انتقال ہو گیا اور میں گھر والوں کو کچھ بتائے بغیر یہاں آ گیا۔ میں نے اسی دن، جب یہ واقعہ پیش آیا تھا یہ جہد کر لیا تھا کہ بڑے ہو کر میں اس ترک کو ضرور تلاش کروں گا جس نے میرے بھائی کو قتل کر ہلاک کر دیا اور مجھے ہمیشہ کے لیے ایک ہاتھ کا کر دیا تھا اور جب وہ مل جائے گا تو میں اس سے اس کا انتقام لوں گا۔“

وائق نے پوچھا۔ ”لیکن تو نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ تو ایک ایسے ترک کو پھانسی دے گا کس طرح، جس کی کسی نے شکل و صورت ہی نہ دیکھی ہو اور پھر یہ کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ترک زندہ ہی نہ ہو، مرنے کا ہو یا پھر یہاں موجود نہ ہو۔“

اولاد کے بغیر بھی

کوئی زندگی ہے؟

جی ہاں آدمی کے پاس سب کچھ ہو مگر اولاد نہ ہو وہ تمام نعمتیں جو آپ کے پاس ہوں اور دنیا کی ہر خوشی اور آپ کی ایسی زندگی بے رونق بے لطف نامکمل ہی ہو سکتی ہے جگہ جگہ سے ٹھوکریں کھا کر ہزاروں لاکھوں روپے گنوا کر لٹا کر مایوس ہو چکے ہوں تو دل چھوٹا نہ کریں دل مانتا ہو تو فون کر کے بذریعہ ڈاک V.P پارسل کورس منگوا کر استعمال کریں اللہ تعالیٰ کی رحمت آپکو مایوس نہیں کرے گی۔ آپ صاحب اولاد ہو جائیں گے۔

رحمن غوثیہ دواخانہ

فیصل آباد

اوقات فون: 11 بجے 10 بجے رات 10 بجے
0322-6506989

بوران نے پوچھا۔ ”لیکن آپ شب و روز تو نہیں موجود رہتے ہیں؟“
”ہاں یہ درست ہے لیکن میں باہر نکل کر ترکوں سے ملتا جلتا بھی رہتا ہوں۔“
بوران نے نہایت بامعنی بات کی۔ ”ہاں ہم سب جانتے ہیں کہ آپ ترکوں سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ ان سے کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ کسی نے باواجان کو یہ بتا رکھا ہے کہ آپ ہم ترکوں میں کس قسم کی جستجو فرما رہے ہیں۔“

منصور کے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی لیکن ہوش و حواس قابو میں رکھے، بولا۔ ”بوران! کیا مجھے صاف گوئی کی اجازت ہے اور کیا میں تم سے یہ امید کروں کہ میری جی باتیں تمہارے دل کو دکھائیں پہنچاؤں گی؟“
بوران نے بے پروائی سے کہا۔ ”لمبی چوڑی تمہید کا قائدہ، جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالیے، میں کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتی۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”بوران! میں تمہارے خاندان کو مستحق قرار دے کر بار بار یہی کہوں گا کہ میں ترکوں سے نفرت کرتا ہوں، میں ان کی شکل دیکھ کر پاگل ہو جاتا ہوں۔“
”آخر کیوں؟ ان ترکوں نے آپ کو کون سا نقصان پہنچایا ہے؟“

منصور نے جواب دیا۔ ”جب میں کسی ترک گھڑ سوار کو گھوڑا دوڑاتے دیکھتا ہوں تو میرا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے اور اس وقت میرا یہ حال ہوتا ہے کہ میرا بس نہیں چلتا ورنہ میں انہیں قتل کر دوں، گھوڑے سے گرا کر ہلاک کر دوں۔ اس کے سوا اکثر میرا جی چاہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر ترکوں کے بچوں کو روندنا ہوا گزر جاؤں۔“
بوران حیرت اور خوف سے منصور کی شکل دیکھنے لگی، بولی۔ ”تو اندر سے آپ اتنے ظالم ہیں۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”ظالم میں نہیں، ترک ہیں۔ میری یہ خواہش ایک قسم کی بازگشت ہے، جسے تم نہیں سمجھ سکتیں۔“
بوران نے کہا۔ ”میں نے آپ کی سچ بات تو برداشت کر لی، اب آپ میری حق گوئی کا وار نہیں۔“
منصور نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“

بوران نے کہا۔ ”آپ نے تو ترک دشمنی اور ترک عناد میں میرے خاندان کو مستحق قرار دے دیا تھا لیکن میں کسی کو بھی مستحق نہیں قرار دوں گی۔ میں آپ سمیت تمام عربوں سے نفرت کرتی ہوں اور آپ کا یہاں رہنا مجھے

کے دل میں نفرت پائی جاتی تھی۔

منصور اسی دن سے ترک سردار کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اسے بوران کو بہت زیادہ قریب سے اور بار بار دیکھنے اور بات کرنے کا موقع ملا اور یہ انکشاف ہوا کہ بوران کچھ ضرورت سے زیادہ مفرد و واضح ہوئی ہے۔ وہ منصور سے بہت کم باتیں کرتی تھی۔

شام قریب تھی اور فضا میں پرندوں کے غول بھر لینے کے لیے شمالی سمت میں جو پرواز تھے۔ مغربی افق پر شفق پھول رہی تھی۔ کہیں کہیں ابر کے ٹکڑے ڈوبتے ہوئے سورج کی کمزور شعاعوں کی زد میں آ کر دھوپیں زدہ نور کی شکل میں چمک رہے تھے۔ منصور شام کے دلکش مناظر میں کھویا ہوا اپنے ماضی میں سفر کر رہا تھا۔ اس ماضی میں جس کی ایک راہ حال سے گزر کر مستقبل میں چلی جاتی تھی۔ اس راہ پر اس کا مطلوبہ ترک کا مزین تھا اور منصور اس کا تعاقب کر رہا تھا لیکن ان دونوں میں قاصد کچھ اتنا زیادہ تھا کہ منصور کے اپنے آگے اس کا پلکا سا سایہ ہی دکھائی دے رہا تھا اور اس کی رفتار منصور سے اتنی زیادہ تیز تھی کہ اس کے تعاقب میں منصور کا وجود ہلا جا رہا تھا۔ سانس پھولنے لگی تھی اور مایوسی قلبہ پاتی جا رہی تھی۔ شاید اس ترک کو نہ پکڑا جاسکے لیکن کیوں نہیں پکڑا جاسکتا؟ وہ اسے ضرور پکڑے گا اور اس سے انتقام لے کر رہے گا۔ اس نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا، پرندوں کے غول بدستور جو پرواز تھے۔ اس نے ان پرندوں میں قابل رشک طہائیت اور سکون محسوس کیا اور آہستہ سے کہا۔

”اے کاش میں پرندہ ہوتا جو تعصب اور اپنی نسل کشی کے مرتکب نہیں ہوتے۔“

سامنے والان میں بوران ٹھہر چکے تھے اور بوران کی ماں وضو کرنے گئی ہوئی تھی۔ اسی وقت ایک خادمہ منصور کے پاس آئی اور مطلع کیا۔ ”مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔“
بوران فرما رہی ہیں کہ وضو کر لیجیے۔“ منصور چونک گیا اور فوراً ہی وضو کرنے چلا گیا۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہو چکنے کے بعد خلاف توقع بوران اس کے قریب آگئی اور تکلیف دہ سوال کیا۔ ”کیا آپ نے امیر المومنین کے بھائی واثق کی ملازمت ترک کر دی؟“

”نہیں تو۔“ منصور نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت بھی واثق کا ملازم ہوں۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”سب کچھ ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے وہ زندہ ہو اور میری بچان میں آجائے۔“
واثق نے کہا۔ ”بڑا مشکل کام ہے اور اب جبکہ تو میری خدمت میں رہے گا، ترکوں میں کس طرح اس شخص کو تلاش کرے گا، میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔“
منصور نے جواب دیا۔ ”اسی لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میرے سپرد کوئی ایسا کام بھیجیے کہ میں ترکوں میں رہ سکوں۔“

واثق نے کہا۔ ”میری طرف سے تجھے اس کی اجازت ہے کہ ترکوں میں بود و باش اختیار کر لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ایک ایسی ہم میں اپنی نوجوانی اور زندگی کے قیمتی لحاظ مت ضائع کر جس کے سر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔“
منصور نے جذباتی آواز میں کہا۔ ”میں ایک شریف عرب ہوں اے مستقبل کے امیر المومنین! اس لیے میری نظر میں اپنی نوجوانی اور زندگی کے قیمتی لحاظ سے زیادہ قیمتی اپنا عہد ہے اور میں اسے پورا کرنے کے لیے زندگی تک گنوا سکتا ہوں۔“

واثق نے کہا۔ ”ان باتوں کو تو خود بہتر سمجھتا ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ تو ترکوں میں چلا جا اور اپنے مطلوبہ ترک کو تلاش کرتا رہے اور اگر اتفاق سے وہ مل جائے تو انتقام لینے سے پہلے اسے میرے علم میں ضرور لے آنا، ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی قیمتی ترک ہو اور خلافت کو اس کی جان بہت زیادہ عزیز ہو۔“
منصور اسی دن ترک سردار کے گھر پھر منتقل ہو گیا۔

☆☆☆

اس بار ترک سردار نے منصور میں یہ تبدیلی محسوس کی کہ وہ دوسرے ترکوں میں بھی گھلتے ملتے لگا ہے اور یہ بھی کہ وہ ترکوں میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ اس بار منصور نے ترک سردار سے یہ بھی کہا۔ ”ترک سردار! جب آپ مجھے اپنے خاندان کا ایک فرد بنانا ہی چاہتے ہیں تو پھر مجھے اپنے ہی گھر میں رہنے کی جگہ کیوں نہیں دیتے۔“

ترک سردار نے غوثی کا اظہار کیا، بولا۔ ”میں کب منع کرتا ہوں کہ تو میرے ساتھ میرے گھر میں نہ رہے۔ تو شوق سے میرے ساتھ ہی رہ، میرے لیے اس سے بڑی اور کون سی خوشی ہو سکتی ہے کہ تو میرے خاندان کا ایک فرد بن جائے۔“
منصور نے شاید پہلی بار اس ترک کی شرافت کا اثر اپنے دل کی گہرائیوں میں بری طرح محسوس کیا۔ اسے اس ترک کو ان ترکوں سے الگ کر دینا پڑا جن کے خلاف اس

جنات اور ان کی اقسام

قرآن مجید میں جن پر اسرار مخلوقات کا ذکر ہوا ہے، ان میں جنات سرفہرست ہیں، مگر ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان کے ذکر سے قرآن مجید میں ایک مکمل سورت ”جن“ کے نام ہی سے موجود ہے۔ روایات کے مطابق انسان کی آباد کاری سے پہلے زمین پر جن آباد تھے۔ جنات کے اجسام شفاف ہوتے ہیں اور یہ ہماری دنیا میں مختلف روپ دھار کر داخل ہوتے ہیں، کالے کتوں، کالی بلیاں، کالی چنگا دڑوں اور سانپوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور بسا اوقات یہ انسانی روپ میں بھی سامنے آتے ہیں اور انسانوں کو ضرر بھی پہنچاتے ہیں، تاہم ان میں سب برے نہیں ہوتے، سورۃ ”جن“ کی گیارہویں آیت میں جنوں کی زبان سے یہ اعتراف ملتا ہے کہ ہم جنوں میں سے کچھ نیک ہیں اور کچھ بد۔

بعض علمائے جنات کی جو پانچ قسمیں بیان کی ہیں وہ یہ ہیں۔

☆ ایک قسم ”جان“ کہلاتی ہے جو کہ نہایت ضعیف اور بزدل جن ہوتا ہے۔

☆ دوسری قسم ”شیطان“ کہلاتی ہے جو کہ بری ارواح ہوتی ہیں۔

☆ تیسری قسم ”عفریت“ کہلاتی ہے، یہ ایک طاقتور بدروح ہوتی ہے۔

☆ چوتھی قسم ”مرید“ اس سے بھی زیادہ طاقتور بدروح ہوتی ہے۔

☆ پانچویں قسم ”پریوں“ کی ہے جنہیں نیک جن عورتیں کہا جاتا ہے۔

(تہج القرآن۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ، ہائی سکیورٹی زون، نیوسینٹرل جیل ملتان

کہا میں ترکوں سے نفرت کرتا ہوں، اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جب میں کسی ترک کو گھوڑا دوڑاتے دیکھتا ہوں تو میرا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے اور اس وقت یہ حال ہو جاتا ہے کہ اس ترک سوار کو ہلاک کر دینے کو بھی چاہتا ہے۔ پھر نہایت جوش میں کہنے لگی۔ ”اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ گھوڑے ستے ترک بچوں کو کل کر لذت حاصل کرنے کا جو پارہتا ہے۔ اس کی یہ ساری خرافات اور دل آزاریاں میں کس طرح برداشت کر سکتی۔“

ترک سردار یہ ساری باتیں بڑے تحمل سے سنا رہا، پھر بولا۔ ”لیکن جب میں نے تجھے یہ حکم دیا تھا کہ تو اندر جا، پھر تو واپس کیوں آگئی۔ کیا تو اپنے باپ کی حکم عدولی کے نتیجے سے بھی واقف نہیں؟“

بوران نے جواب دیا۔ ”اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ میری عدم موجودگی میں یہ عرب نو جوان غلط بیانی سے کام لے گا تو میں قطعی پاس ہی چھپ کر اس کی باتیں نہ سنتی۔“ ترک سردار نے کہا۔ ”اچھا تو کہیں پاس ہی موجود رہے لیکن میرے سامنے سے چلی جا۔“

بوران پھر چلی گئی۔ ترک سردار نے شکایتاً منصور سے کہا۔ ”اور تجھے بھی اپنی زبان قابو میں رکھنی چاہیے۔ تو نے جو کچھ کہا میں اسے بھی درگزر کرتا ہوں لیکن میں اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ ہی رہ، کہیں اور مت جا۔“

منصور نے بوران کے بارے میں کچھ عرصے تک یہی رائے قائم کی تھی کہ وہ ایک خاموش طبع سیدھی سادی لڑکی ہے لیکن اب وہ ایک تیز طرار، جوشیلی اور غصہ ور ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت بوران کے بارے میں معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا۔

ترک سردار نے کہا۔ ”پھر تو نے کیا فیصلہ کیا؟ میرے ساتھ ہی رہے گا یا کہیں اور چلا جائے گا؟“

منصور نے پوچھا۔ ”کیا اس گھر میں میرا حریہ رہتا تنکیاں زیادہ نہیں بڑھا دے گا؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”یہ تمکیاں وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی جائیں گی۔ جب عرب اور ترک ایک عرصے تک مل جل کر مخلوط زندگی گزاریں گے تو یہ ترک بھی عرب کہلا جائیں گے۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا عربوں اور ترکوں میں آپس میں شادیاں نہیں ہوں گی؟ اور اگر یہ شادیاں ہوں گی تو کیا ان دونوں کی اولادیں بھی ہماری تمہاری طرح سوچیں گی؟“

منصور نے کہا۔ ”شاید نہیں لیکن کیا خود میں ترکوں

بوران نے منصور کو شرمندہ کیا۔ ”عرب نو جوان! جھوٹ نہ بولے۔ ہم دونوں خوب جانتے ہیں کہ آپ نے یہ گھر چھوڑنے کا اچانک فیصلہ کیوں کیا۔“

منصور نے مشتعل ہو کر ساری روداد ترک سردار کو سنا دی پھر بولا۔ ”بوران! میں اس لیے خاموش تھا کہ میں تجھ پر کوئی الزام نہیں لگانا چاہتا تھا لیکن میرے اس نیک جذبے کی تو نے کوئی قدر نہ کی اور مجھے جھوٹا کہہ دیا۔“

ترک سردار نے اپنی بیٹی کو ڈانٹا۔ ”بوران! کیا اپنے مہمان کو یوں خوار کرنا شرافت کی بات ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا تمہیں منصور کے ساتھ اس طرح پیش آنا زیب دیتا ہے اور کیا منصور نے جو کچھ کہا ہے اس میں کچھ غلط بھی ہے؟“

بوران نے جواب دیا۔ ”منصور نے جو کچھ کہا، درست ہے لیکن میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ منصور ہمارے گھر میں بیٹھ کر اور رہے جس کر جو ہمارے ہم قوم بھائی ترکوں کی خدمت کرتا رہتا ہے، اس میں یہ کس حد تک حق بجانب ہے۔“

منصور نے جوش میں کہا۔ ”ہاں یہ بات میں ترک سردار کے سامنے بھی کہوں گا کہ مجھے اس گھر کے افراد کے علاوہ تمام ترکوں سے نفرت ہے اور مجھ میں یہ نفرت اس وقت تک موجود رہے گی جب تک میں اس دنیا میں موجود ہوں، زندگی کے آخری لمحوں تک، آخری ساعتوں تک۔“

ترک سردار کی پیشانی پر ناگواری سے بل پڑ گئے، بوران سے کہا۔ ”تو اندر جا۔“ پھر اپنی بیوی سے کہا۔ ”اور تو بھی، میں اس عرب نو جوان سے چند ضروری باتیں کروں گا۔“

وہ دونوں چلی گئیں تو ترک سردار نے منصور سے کہا۔ ”عرب نو جوان! تجھ میں بلا کی مصیبت پائی جاتی ہے اور تو ہر کس ونا کس کے سامنے اپنے دلی خیالات ظاہر کرنے لگتا ہے۔ آخر تیری سمجھ میں یہ معمولی بات کیوں نہیں آتی کہ جس طرح تو عرب قوم کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہے اسی طرح ہم ترکوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی قوم سے محبت کریں۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”میں اس سے کب منع کرتا ہوں۔“ ترک سردار نے کہا۔ ”پھر تو نے بوران کی باتوں کا برا کیوں مانا؟“

منصور نے کہا۔ ”مجھے اس کی یہ بات بری لگی کہ اسے میرا اس گھر میں رہنا بالکل پسند نہیں۔“

اسی وقت بوران سامنے آگئی، بیچ میں بول پڑی۔

”بات کو تو ضرور کے مت بیان کرو عرب نو جوان۔“ پھر اپنے باپ سے کہا۔ ”پوری بات یہ بھی باوا جان کہ اس نے مجھ سے

بالکل پسند نہیں۔“

منصور کو اس صاف گوئی سے واقعی بڑا صدمہ پہنچا، کچھ دیر تک وہ بوران کے چہرے پر نظریں جمائے گویا رحم کی درخواست کرتا رہا۔

بوران نے کہا۔ ”اگر آپ واقعی ہم ترکوں سے نفرت کرتے ہیں تو یہ بھی سن لیجئے کہ آپ جس امید میں اس گھر میں اقامت گزریں ہیں، وہ بھی پوری نہ ہوگی۔ میں ایک ایسے عرب نو جوان سے کس طرح محبت کر سکتی ہوں جس کا ایک ہاتھ ہی غدار ہو اور پھر ایک ایسا عرب، جس کی رہائش اور کھانے وغیرہ کی ذمہ داری باوا جان نے اپنے ذمے لے رکھی ہو۔“

بوران کی باتیں منصور کے دل پر بجلی بن کر گر رہی تھیں۔ نہایت غمزہ آواز میں بولا۔ ”اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ میں یہاں سے صبح شام ہی میں چلا جانے والا ہوں۔“

بوران نے اس طرح طنز کیا کہ منصور کو شرم سی آنے لگی اور اس سے یہ سبق ضرور لیا ہوگا کہ کسی کا احسان مند نہیں ہونا چاہیے۔ منصور نے نہایت ہیرا پھیری کے انداز میں کہا۔ ”بوران! شاید تم یقین نہ کرو کہ میں تم لوگوں سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“

بوران نے جواب دیا۔ ”اور اس کے ساتھ ہی میں اس حقیقت سے بھی واقف ہوں کہ آپ میرے ترک بھائیوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔“ منصور بوران کی شکل بڑی بے بسی سے دیکھنے لگا۔

دوسرے دن ترک سردار کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا کیونکہ منصور نے جانے کی تیاری کر لی تھی اور ترک سردار نے منصور کے اس اچانک فیصلے کو ناگواری اور تعجب کی نظر سے دیکھا تھا۔ وہ منصور سے اس کے اس فیصلے کا پس منظر جاننا چاہتا تھا لیکن منصور، بوران کی شکایت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ پوچھتے پوچھتے عاجز آ گیا تو ایک طرف سے اچانک بوران کی ماں آگئی اور اس نے اپنے شوہر کو مطلع کیا کہ۔

”ایک دن پہلے شام کو بوران اور منصور کی کچھ تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسی تلخ کلامی کی وجہ سے منصور نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔“

ترک سردار نے فوراً اپنی بیٹی کو طلب کر لیا اور اس کے سامنے منصور سے پوچھا۔ ”کیا اس سے کوئی ٹھیک ہوگئی ہے؟“

منصور نے بوران کی طرف دیکھا اور لگی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں۔“

کسی بات پر گھر چھوڑ دینا میری سمجھ میں نہیں آتا۔“ منصور پھر مجبور ہو گیا لیکن دوسرے ہی دن یہ انکشاف ہوا کہ خود تافہ بھی منصور کو اس حیثیت سے نہیں پسند کرتا، جس حیثیت میں یوران نے اسے مسترد کر دیا تھا کیونکہ تافہ ایک ترک نوجوان کی حیثیت سے عربوں سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی منصور ترکوں سے لیکن اپنے اس جذبے کا وہ آزادی سے اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

منصور، واقع سے ملتا رہا اور ترک سردار بھی واقع سے تعلقات استوار کیے رہا۔ وہ اپنا خالی وقت واقع کی دربارداری میں گزارنے لگا۔ خلیفہ معظم کا وزیر ابن الزیات ایسے تمام آدمیوں سے حسد رکھتا تھا جو واقع سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ ایک دن یہ افواہ کرم ہو گئی کہ معظم کی طبیعت ناساز ہے۔

قریب دو پہر ایک گھڑسوار نے، منصور کو راستے میں روک لیا، پوچھا۔ ”کیا منصور تیرا ہی نام ہے؟“ منصور نے جواب دیا۔ ”ہاں منصور میرا ہی نام ہے۔“ گھڑسوار نے پوچھا۔ ”اور تو وہی منصور ہے جو مستعین ثانی ترک سردار کے ساتھ رہتا ہے اور واقع کی ملازمت میں ہے؟“ منصور نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”ہاں، ہاں میں وہی منصور ہوں تو جس کی تفصیل بیان کر رہا ہے۔ مجھ سے تیرا کام کیا ہے؟“

گھڑسوار نے پوچھا۔ ”تو نے کبھی ابن الزیات سے ملازمت کی خواہش کی تھی؟“

”ہاں کی تھی پھر؟“ گھڑسوار نے خوش ہو کر کہا۔ ”خدا تجھے جرات دے دے اور خوش حالی اور مسرتوں سے ہمکنار کرے، ابن الزیات نے تجھے یاد کیا ہے اور وہ تجھے کسی اعلیٰ منصب پر فائز کرنا چاہتے ہیں۔“

منصور نے تذبذب سے پوچھا۔ ”مجھے ابن الزیات کے پاس کب جانا ہے؟“

گھڑسوار نے جواب دیا۔ ”ابھی، اسی وقت۔ میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

منصور، واقع کا گواہ تھا اس لیے ابن الزیات سے نہیں ملنا چاہتا تھا لیکن گھڑسوار نے اسے فکر مند دیکھ کر سمجھایا۔ ”منصور! نادانی نہ دکھا اور چپ چاپ میرے ساتھ چلا چل کیونکہ ابن الزیات خلافت عباسیہ کا وزیر ہے اور ریاست کے اتنے بڑے آدمی کی دشمنی مول لینا اچھی بات نہیں ہے۔“

میں شادی کر سکتا ہوں؟ کیا ترک مجھے قبول کر لیں گے؟“ ترک سردار نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ ”ترک تجھے کیوں نہیں قبول کریں گے؟“

منصور نے اپنے غائب ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے اس نقص نے مجھ میں کتنی ہی احساس پیدا کر دیا ہے۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”میدان جنگ کا یہ عیب، عیب نہیں مردوں کے لیے ان کی عظمت کا نشان ہے۔“

منصور کی زبان سے اچانک نکل گیا۔ ”لیکن یوران تو یہ کہتی ہے کہ میرا یہ عیب کسی بھی لڑکی کو مجھ پر مائل نہیں کر سکتا۔“

اسی وقت یوران پھر آگئی، تیز لہجے میں بولی۔ ”عرب نوجوان! میں نے یہ نہیں کہا تھا، جو کہا تھا وہی دہراؤ۔“

ترک سردار کو ہنسی آگئی، بولا۔ ”یوران! تو بڑی شریر ہے۔ تو نے تو منصور کا یوں لٹا دھوا کر دیا ہے۔ اچھا بتا تو نے کیا کہا تھا اور منصور نے اس میں کتنی ترمیم کر دی ہے۔“

یوران نے جواب دیا اور بے باکی سے جواب دیا۔ ”میں نے تو یہ کہا تھا کہ تو جس امید میں اس گھر میں رہ رہا ہے وہ کبھی بھی پوری نہ ہوگی اور میں ایک ایسے عرب نوجوان سے کس طرح محبت کر سکتی ہوں جس کا ایک ہاتھ ہی نثار ہو۔“

ترک سردار نے یوران کو ڈانٹ دیا۔ ”لیکن یوران تجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے گی۔“

یوران نے جواب دیا۔ ”جس طرح اپنے دل کی بات آزادی سے یہ عرب نوجوان کہہ رہا تھا، اسی طرح میں بھی اس کی غلط فہمی دور کرانے میں حق بجانب تھی۔“

ترک سردار نے دونوں کو مخاطب کیا۔ ”اچھا اب یہ باتیں بند ہو جانی چاہئیں۔ جہاں تک شادی کا تعلق ہے، یوران کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ اپنی مرضی کا اظہار کرے لیکن میں یوران کا باپ ہوں اور مجھے بھی اتنا اختیار حاصل ہے کہ اس کی شادی کسی بھی لڑکے سے کر سکتا ہوں۔“

منصور کے دل میں یوران کے لیے پھر امید کی کرن پیدا ہو گئی۔ یوران یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ ”اسلام نے انسان کو انفرادی آزادی بھی تو عطا کی ہے۔ کیا میں اس سے محروم رکھی جاؤں گی؟“

ترک سردار نے منصور سے کہا۔ ”تجھے اس نادان اور شریر لڑکی کی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیے۔ اس گھر میں تجھے میں لایا تھا اور میں ہی تجھے رکھنا چاہتا ہوں اور پھر یوران کی

منصور نے بھی اسی میں عافیت سمجھی کہ ابن الزیات سے مل ضرور لینا چاہیے اور اس کے پیش کیے جانے والے منصب کو بعد میں مسترد بھی کیا جاسکتا ہے۔ وہ خاموشی سے گھڑسوار کے ساتھ ہولیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ابن الزیات کے روبرو پہنچ گیا۔ اس وقت ابن الزیات کئی آدمیوں میں گہرا بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر درشتی اور غصے کے آثار پائے جاتے تھے۔ وہ منصور کو دیکھتے ہی برس پڑا۔

”او ذلیل نوجوان! تجھے عربوں کے خلاف ایک ترک سردار سے ساز باز کرتے شرم نہیں آتی۔ میں تیری حرکات و سکنات اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس ترک سردار کی لڑکی یوران نے تیرے دل پر قبضہ کر لیا ہو لیکن ایک لڑکی کی خاطر عربوں کے خلاف سازش کرنا یا اس سازش میں حصہ لینا بڑے افسوس کی بات ہے۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”میں نے کسی ایسی سازش میں حصہ نہیں لیا جو ترکوں نے عربوں کے خلاف تیار کی ہو اور رہی یہ بات کہ میں ترک سردار مستعین کے ساتھ رہ رہا ہوں، اس پر تجھے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جب میں نے تیرا سہارا لیتا جا ہا تھا تو تو نے میرا ہاتھ جھک دیا تھا اور تو جانتا ہے کہ اس وقت امیر المومنین کے بیٹے واقع نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔“

ابن الزیات نے واقع کو بھی برا بھلا کہا، بولا۔ ”خدا امیر المومنین کو صحت یاب کرے۔ میں واقع کو بھی سمجھ لوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میرا بدترین دشمن ہے۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”ابن الزیات! طاقت کے نشے میں اتنا بے قابو بھی نہیں ہو جانا چاہیے۔ میں کیا، پوری ریاست تیری طاقت اور اختیارات سے باخبر ہے لیکن تجھے بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو تجھ سے بھی زیادہ طاقت ور گزرے ہیں انہیں بھی خاک بسر ہونا پڑا ہے اور زمانے اور قسمت نے انہیں اتنا ہی خوار بھی کیا ہے جتنا خوش بختی نے انہیں سر بلند کیا تھا۔“

”او ایک دلی و خوار نوجوان تو مجھے نصیحتیں کر رہا ہے۔ بخدا میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ جو بھی تجھے دیکھے گا عبرت حاصل کرے گا۔ میں تجھے عبرت کا نمونہ کیوں نہ بنا دوں؟“ اس کے بعد وہ غصے میں اٹھا اور منصور کے علاوہ دوسرے موجود لوگوں کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا، بولا۔ ”تم لوگ میرے ساتھ آؤ تاکہ میں تم سب کو وہ جگہ دکھا دوں جہاں ایک نہ ایک دن تم سب کو یکے بعد دیگرے فروکش ہونا ہے۔“

منصور اور دوسرے موجود لوگ ابن الزیات کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ابن الزیات اپنے محل کے بالکل پچھلے حصے میں انہیں لے گیا۔ وہاں ایک گوشے میں ایک کنواں کھدا ہوا تھا۔ ابن الزیات نے ان سب کو حکم دیا۔ ”تم سب باری باری اس کنویں میں جھانک کر دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ تم نے اس میں کیا دیکھا۔“

باری باری سبھی نے اس کنویں میں جھانک کر دیکھا۔ یہ ایک آدمی کے قد سے ذرا زیادہ گہرا تھا اور اس میں چاروں طرف، دیواروں میں اوپر سے نیچے تک گولا کی توپ کی سلاخیں پیوست تھیں۔ سلاخوں کی نوکیں آنسو سانی تھیں اور یہ لمبائی میں اتنی تھیں کہ اگر اس کنویں میں کسی آدمی کو کھڑا کر دیا جاتا تو یہ بالکل اس کے جسم کے مقابل رہتیں۔ ابن الزیات نے سب سے سوال کیا۔ ”تم سب نے اس میں کیا دیکھا؟“

ان سب نے جو کچھ دیکھا تھا، باری باری بتا دیا۔ ابن الزیات نے کہا۔ ”یہ ابھی نامکمل ہے، اس کی تیاری میں کچھ وقت اور لگے گا۔ ابھی اس کی چلی سلاخ پر ایک چھوٹا سا چوتھرہ بنانا ہے۔ اسے میں نے اپنے مخالفین کے لیے بنوایا ہے۔ میں جسے سزا دوں گا، اسے اس کنویں میں اتار دوں گا۔ وہ اگر ذرا نرمی کا سہی ہوگا تو وہ اس کنویں کے اندر دھونے چوتھرے پر بیٹھ بھی سکے گا لیکن آرام نہیں کر سکے گا۔ اس کو پشت ٹکانے کا کوئی بھی سہارا حاصل نہ ہوگا اور اگر بدستی سے اس نے اپنی پشت ٹکانی بھی چاہی تو اس کی نوکلی سلاخیں اس کے جسم میں پیوست ہو جائیں گی اور میرے وہ مخالف، جو میری ذرا سی ہمدردی یا رحم کے سہی نہیں ہیں انہیں اس میں کھڑا رکھا جائے گا۔ شب و روز چوبیس گھنٹے کھڑے رہیں گے یہاں تک کہ جب ان کی قوت برداشت رخصت ہو جائے گی تو وہ بے بس ہو کر ان سلاخوں پر گر جائیں گے اور یہ سلاخیں ان کا کام تمام کر دیں گی۔ ان سلاخوں کو زہر میں بچھا کر تنور میں پوست کیا گیا ہے۔“ سبھی خوف و دہشت سے کانپنے لگے۔ ابن الزیات کہتا رہا۔ ”تم اسے کنواں کو یا تنور۔۔۔۔۔ یہ دونوں ہی حالتوں میں موت کا گھر ہے۔ میں اسے تنور ہی کہتا ہوں، موت کا تنور۔ ابھی اس جیسے مجھے معلوم نہیں کتنے تنور بنانا ہیں۔ اب تم سب کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ میرے پاس سے رخصت ہو کر تمہیں میری مخالفت کرنا ہے یا میری دوستی حاصل کرنا ہے۔“ منصور کے علاوہ سبھی نے بیک آواز جواب دیا۔ ”ہمیں تمہاری دوستی عزیز ہے۔“

ابن الزیات نے منصور کو قبر کی نظروں سے دیکھا، گرج کر بولا۔ ”تو تجھے میری دوستی نہیں دے گا کہ ہے؟“ منصور نے جواب دیا۔ ”میں تیری دوستی بھی نہیں چاہتا۔“ ابن الزیات نے کہا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے، تو مجھ سے عداوت رکھتا ہے۔ ابھی تو میں تجھ سے کچھ بھی نہ بولوں گا، ہاں امیر المومنین ذرا اچھے ہو جائیں پھر میں تیری خیریت معلوم کروں گا۔“ منصور نے ترکی یہ ترکی جواب دیا۔ ”دشمن اگر قوی تو نگہبان قوی تر است۔“

ابن الزیات نے غضب میں پاؤں پٹکنا شروع کر دیے، بولا۔ ”میں جانتا ہوں تو کس کے برے پر اس طرح اکر رہا ہے، امیر المومنین کی علالت نے مجھے حطاکر رکھا ہے اور میرا موت کا تصور بھی ابھی نامکمل ہے لیکن شاید اس میں اترنے والا تو پہلا بد نصیب ہوگا۔“

منصور نے ابن الزیات کے پاس سے واپس آتے ہی ساری باتیں واثق کے گوش گزار کر دیں۔ اس دن واثق بہت خوش تھا، اس نے منصور سے کہا۔ ”تو میرے کام لے اور کچھ خدا کو کیا منظور ہے۔“

منصور نے کہا۔ ”اگر ابن الزیات کا کوئی علاج نہ ہوا تو یہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو اسی موت کے طور میں اتر دے گا۔“

واثق نے جواب دیا۔ ”تو اس خبر سے خوش ہوگا کہ میرے امیر المومنین سے تعلقات خوش گوار ہو گئے ہیں۔ آج ہم سب امیر المومنین کے ساتھ دجلہ کی سیر کریں گے، میں تجھے بھی اپنے ساتھ لے چلوں گا کیونکہ میں اپنے ساتھ چند خدمت گاروں کو لانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔“

دریائے دجلہ میں بہت ساری کشتیاں رواں دواں تھیں۔ ان میں مقتسم کی کشتی سب سے نمایاں تھی۔ اس کشتی میں مقتسم کے بیٹوں کے علاوہ خاص خاص خدمت گار اور مفتی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دربار کا مشہور زمانہ سازندہ زنام بھی موجود تھا اور واثق کے ساتھ منصور بھی بیٹھا تھا۔ مقتسم کسی کو اپنی مرضی سے چلوار ہاتھ نہ دے گا۔ آخر یہ کشتی ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں سے مقتسم کے باغات اور محلات بہت صاف دکھائی دیتے تھے۔ مقتسم انہیں نہایت حسرت و مایوسی سے دیکھتا رہا۔ چند دن پہلے تک ان باغات اور محلات میں اپنات ہی محسوس ہوتی رہی تھی لیکن اب یہ اجنبی دکھائی دے رہے تھے۔ اب یہ غیر نظر آتے تھے۔ مقتسم پر وحشت کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے اسی حالت میں اپنی جیب سے ایک

پرزہ نکالا اور زنام، سازندہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”زنام! تم یہ کلام گا کر سناؤ شاید یہ میری آخری خواہش ہوگی، اس کے بعد شاید میں اس دنیا میں نہ رہوں۔“ زنام اور دوسرے موجود لوگ بھی زار و قطار رونے لگے۔ زنام نے کلام سنانا شروع کر دیا۔

”اے وہ گھر، جو ابھی ویرانے سے دو چار نہیں ہوا، تو ابھی تک ویرانی سے دو چار ہونے سے مستحکم ہے۔“

اے محلات و باغات! میں تمہاری ویرانیوں پر نہیں روتا بلکہ اس پر روتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی تمہاری گود میں گزاری اور افسوس کہ یہ زندگی ختم ہو جائے گی۔

ایک نوجوان جن چیزوں پر روتا ہے، ان میں سب سے بیشی شے زندگی ہے اور غمزدہ کو تسلیم دینا ضروری ہے۔“ اسی وقت کشتی میں مقتسم کے پاس جو بھی موجود تھا اسے یقین ہو گیا کہ مقتسم کا وقت پورا ہو چکا ہے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب اس کے کان میں کسی شہر نے یہ خوش خبری سنائی۔ ”امیر المومنین تو انتقال فرماتے ہی والے ہیں۔“ واثق نے ڈانٹا تو کسی قدر خاموشی بھی آگئی۔

آخر ایک دن مقتسم کا انتقال ہو گیا اور عالموں نے مقتسم کو مشن (آٹھ آٹھ والا) قرار دیا۔ یہ عباس بن مطلب کی آٹھویں پشت پر تھا۔ خلیفہ بھی آٹھواں تھا۔ اس کی خلافت آٹھ سال آٹھ ماہ رہی۔ وہ شعبان میں پیدا ہوا تھا جو آٹھواں مہینا ہے۔ اس کے آٹھ لڑکے اور آٹھ لڑکیاں تھیں، اس نے آٹھ جنگیں لڑیں۔“

واثق حصول خلافت میں سرگرداں و پریشان تھا۔ واثق کو چند آدمیوں کی طرف سے یہ شبہ تھا کہ وہ اسے خلیفہ نہیں بننے دیں گے لیکن اس نے ان کی پروا نہیں کی۔ واثق خلیفہ بن گیا۔

کسی نے واثق کی خدمت میں ابن الزیات کے چند اشعار پڑھے۔ ان اشعار میں مقتسم کا مرثیہ اور واثق کی مدح موجود تھی۔ واثق کے قریب ترکوں کا ہجوم تھا، ان میں ترک سردار مستعین بھی موجود تھا۔ اس نے ابن الزیات کے اشعار سنانے والے کو حکم دیا۔

”ذرا یہ اشعار یہ آواز بلند تو سنانا۔“

اس شخص نے اونچی آواز میں سنانا شروع کر دیا۔ ”جب لوگ تجھے ذن کر کے پانی اور مٹی سے اپنے ہاتھ جھاڑ چکے تو میں نے کہا رخصت ہو چکا کیونکہ تو دنیا اور دین دونوں کے لیے بڑا اچھا دوا گار تھا۔“

خدا اس امت کی نگہبانی کرے گا جو تجھ (مقتسم)

گردش دوران کے اسیر

جیسے کھوکھاروں (واثق) جیسے خلیفہ کو پیدا کرے۔“ ترک سردار نے زور سے کہا۔ ”یہ اس شخص کے اشعار ہیں جو منافق ہے اور جس نے ایک مرتبہ امیر المومنین کو بہت شرمندہ کیا تھا۔“ اگر مجھے کچھ کہنے کی اجازت عطا ہو تو منصور نے کہا۔ ”اگر مجھے کچھ کہنے کی اجازت عطا ہو تو میں بھی کچھ کہوں۔“

واثق نے کہا۔ ”کہہ، کہہ کیا کہنا چاہتا ہے تو، ذرا میں بھی تو سنوں۔“

منصور نے کہا۔ ”ابھی چند دن پہلے ابن الزیات نے مجھے موت کا تصور دکھایا تھا۔ وہ اس قسم کے اور بہت سارے تصور بھی بنواتا چاہتا ہے۔ اس تصور میں چاروں طرف تو کئی سلاخیں نکلی ہوئی ہیں۔ وہ اس تصور کو اپنے مخالفین کو دکھا کر ڈراتا اور دھمکا تا رہتا ہے۔“

واثق نے حکم دیا۔ ”ابن الزیات کو حاضر کیا جائے۔“ لیکن اسی دوران اس نے دس ایسے لائق آدمیوں کو جمع کر لیا۔ جن کی لیاقت مشہور تھی۔ واثق نے انہیں ایک مضمون سمجھا کر حکم دیا کہ وہ سب الگ الگ اپنے اپنے انداز میں اس مضمون کو تحریر کریں۔

ان سب نے ذرا دیر بعد جب اپنے اپنے لکھے ہوئے کاغذ واثق کی خدمت میں پیش کیے تو اس نے باری باری انہیں پڑھ کر منہ بنایا۔ اسے ان میں سے کسی ایک کی بھی تحریر پسند نہ آئی۔

واثق باتوں میں مشغول ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسے مطلع کیا گیا کہ ابن الزیات حاضر ہے، اجازت ہے تو پیش کر دیا جائے۔

واثق نے حکم دیا۔ ”حاضر کیا جائے۔“

واثق کا حاجب (سیکرٹری) اٹھا اور ابن الزیات کو بلا لایا۔ اس نے کپکپاتی آواز میں خلیفہ کو سلام کیا۔ واثق نے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا لیکن وہ کاتب رہا تھا اور خوف نے اس کی آنکھوں کا نور چھین لیا تھا، اس نے ڈر کے مارے درباریوں کو بھی نہیں دیکھا۔

واثق نے اپنے خادم کو حکم دیا۔ ”میرا وہ عہد نامہ حاضر کرو جس کا ابن الزیات سے تعلق ہے۔“

ابن الزیات کے رہے سبے ہوش بھی جاتے رہے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ واثق نے ترک سردار اور منصور سے بطور خاص کہا۔ ”اور تم دونوں ابھی یہیں رہنا کیونکہ میں نے اس عہد نامے میں تم دونوں کو شاہد بنا رکھا ہے۔“

ابن الزیات کی بے بسی اور خوف کو دیکھ کر درباری

بہت خوش ہو رہے تھے کیونکہ ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جسے ابن الزیات سے کبھی نہ کبھی تکلیف نہ پہنچی ہو۔ کچھ دیر بعد خادم وہ عہد نامہ لے آیا، واثق نے یہ عہد نامہ ابن الزیات کے سامنے رکھ دیا اور حکم دیا۔

”اسے بلند آواز میں پڑھ کر سنا۔“

ابن الزیات کا ہنسی ہوئی آواز میں عہد نامہ پڑھنے لگا۔ درباریوں کے چہرے خوشی سے دھک رہے تھے۔

جب وہ عہد نامہ پڑھ چکا تو واثق نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تو نے اس دن میرے باپ کو وہ رقم دینے سے منع نہیں کر دیا تھا؟“

ابن الزیات میں انکار کی سکت ہی نہیں تھی، روتے ہوئے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! میں تو آپ کا غلام ہوں، اگر آپ مجھے سزا دیں تو اس کا آپ کو پورا اختیار حاصل ہے اور اگر آپ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر کے مجھے زندہ رکھیں تو یہ آپ کی شان کے زیادہ مطابق ہوگا۔“

واثق نے اپنے حاجب سے پوچھا۔ ”تو کیا کہتا ہے؟“ حاجب نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین ہی کوئی فیصلہ فرمائیں گے۔“

واثق نے وہی مضمون جو دس لائق آدمیوں سے لکھوا چکا تھا، ابن الزیات کے حوالے کیا، بولا۔ ”اسے اپنے طور پر لکھ، میں تیری وہ لیاقت دیکھنا چاہتا ہوں جس نے میرے باپ مقتسم کو تجھ پر فریفتہ کر رکھا تھا۔“

ابن الزیات نے ذرا سی دیر میں اس مضمون کو نہایت خوب صورت پیرائے میں لکھ ڈالا۔

واثق اسے پڑھنے لگا اور ابن الزیات کی نظرس واثق کے چہرے کا نہایت ذوق و شوق سے جائزہ لیتی رہیں۔ وہ واثق کے دل میں اتر کے اس کے ارادے کا پتا چلا نا چاہتا تھا۔

مضمون پڑھ چکنے کے بعد واثق نے داد و تحسین کی نظروں سے ابن الزیات کی طرف دیکھا پھر حاضرین سے کہا۔ ”لوگو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس شخص کو کس طرح قتل کروں جس کی تحریر اور اسلوب نگارش نے مجھے پہلے ہی قتل کر دیا۔ میں حیران تھا کہ میرے والد مقتسم نے اس شخص کو اتنا عزیز کیوں رکھا تھا لیکن اب میں خود بھی اس کے مداحوں میں شامل ہو گیا ہوں۔“ پھر حاجب سے بطور خاص کہا۔ ”حکومت اس شخص کی محتاج ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔“ واثق کے اس فیصلے نے ابن الزیات کے مخالفین کو مایوس کر دیا۔ ترک سردار نے منصور سے سرگوشی میں کہا۔ ”بخدا میں اس کا قاتل ہو گیا کہ تقدیر بھی کوئی چیز ہے

اور ہر شخص اپنی عمر عالم بالا سے لکھوا کر لایا ہے۔“ منصور نے مایوسی سے کہا۔ ”اب تو یہ اپنے مخالفین سے اچھی طرح انتقام لے گا۔“

ابن الزیات ایک مرتبہ پھر اختیار و اقتدار کی کرسی پر متمکن ہو گیا۔ واثق کی نظر میں ترک سب سے زیادہ لائق اعتبار تھے۔ منصور یہ سوچ سوچ کر مایوس ہوتا چلا جا رہا تھا کہ وقت اور زمانہ ترکوں کے موافق ہے اور شاید عربوں کا ستارہ اقبال اس آب و تاب سے کبھی بھی طلوع نہ ہو سکے جیسا کہ دورِ بنو امیہ میں طلوع ہو چکا تھا۔ ترک سردار، واثق کے دربار میں پہلے سے زیادہ اثر رسوخ کا مالک بن چکا تھا۔ نافر اس سے لائق رہنے لگا اور بوران اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔

ماحول کی یکسانیت سے اسکا کہ منصور نے ترک سردار سے اجازت طلب کی، بولا۔ ”معرز ترک سردار! میں کچھ عرصے کے لیے سامرا سے باہر جانا چاہتا ہوں۔“ ترک سردار نے پوچھا۔ ”باہر کہاں؟ کیا سامرا میں حیرا دل نہیں لگ رہا؟“

منصور نے جواب دیا۔ ”در اصل میں یکسانیت سے عاجز آ گیا ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ ذرا آب و ہوا بدل ڈالوں۔“ ترک سردار نے پوچھا۔ ”کہاں، یمن جاؤ گے؟“

”ہاں، یمن جاؤں گا اور وہاں غالباً ایک سال تک رہوں گا۔“ ترک سردار نے افسوس سے کہا۔ ”اگر تو جانا ہی چاہتا ہے تو میں تجھے نہیں روکوں گا لیکن اگر نہ جانا تو بہتر تھا۔“

نافر بھی اس گفتگو میں شریک ہو گیا، پوچھا۔ ”ایک دم یمن کا خیال کس طرح آ گیا؟“ منصور نے جواب دیا۔ ”میں ایک قوی انسان ہوں۔ واثق کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے یہ سوچا کرتا تھا کہ شاید کسی دن مختصم کے بعد کوئی ایسا انقلاب آجائے کہ ریاست و خلافت میں عربوں کا عمل دخل زیادہ ہو جائے لیکن میں تو اب یہ دیکھ رہا ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، امید کے خلاف ہو رہا ہے اور تو اور ابن الزیات جیسا گناہ گار تک آزاد اور پہلے سے زیادہ اختیار و اقتدار کے ساتھ زندہ ہے۔“

نافر نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”تو یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہاں تو جس مقصد سے آیا تھا، اس میں ناکامی ہوئی اس لیے واپس چلا جانا چاہتا ہے۔“ ترک سردار نے نافر کو تند و تیز گفتگو کرنے سے منع کیا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ جس شخص کو میں نے عزیز کی طرح

اپنے ساتھ رکھا، اب اس کو بدحرگی سے رخصت کیا جائے۔“ منصور نے کہا۔ ”نافر! میں واپس آؤں گا۔ اگر یہاں تک آنے میں میرا کوئی مقصد کارفرما تھا تو وہ عارضی طور پر چلے جانے سے مر نہیں جائے گا۔“

ترک سردار نے نافر کو ہٹا دیا، بولا۔ ”نافر! تو یہاں سے چلا جا، میں اس سے خود ہی باتیں کر لوں گا۔“ نافر منہ بناتا ہوا چلا گیا۔ ترک سردار نے کہا۔ ”اب تو، تو یہاں سے جاعی رہا ہے۔ اب ہم ترکوں کے لیے بہترین دور آیا تھا۔ میں تجھے کسی اعلیٰ منصب پر فائز کروا سکتا تھا۔ تو اپنی خوش قسمتی سے واثق تک پہنچ گیا تھا لیکن جب واثق نے اقتدار سنبھالا تو دوسرے خوشامدی آگے بڑھ گئے اور تو سب سے پیچھے رہ گیا حالانکہ اگر تو چاہتا تو اس وقت نہایت اہم شخص ہوتا۔“

منصور نے سردمہری سے کہا۔ ”ترک سردار! کسی شخص کو اگر اس کی زندگی کا مقصد نہ حاصل ہو سکے تو وہ خوش نہیں رہ سکتا۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”اپنا مقصد مجھے بتا، میں شاید تیری مدد کر سکوں۔“ منصور نے کسی قدر تامل سے جواب دیا۔ ”اپنا مقصد بتا تو سکتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ سے میں اسی وقت تک قریب ہوں اور ہمارے تعلقات خوشگوار ہیں جب تک کہ میں خاموش رہتا ہوں۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”حالانکہ یگانگت کا تقاضا یہی تھا کہ تو مجھے اپنے اعتماد میں لیتا لیکن اگر کسی وجہ سے تو اپنے دل کا راز نہیں بتانا چاہتا تو تیری مرضی، میں مجبور نہیں کروں گا۔“ منصور نے انتہائی مایوسی سے کہا۔ ”اور پھر میں نے اس گھر میں آپ کے سوا شاید کبھی کو خود سے بے زار دیکھا ہے۔“

ترک سردار نے ذرا بگڑ کر جواب دیا۔ ”عرب نوجوان! تو جہاں اور جس خاندان میں بھی جائے گا، وہاں کبھی لوگ تجھ سے اچھی طرح نہیں پیش آئیں گے۔ جب میں تیری عزت کرتا رہا ہوں تو تجھے کسی اور کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔“ منصور خاموش رہا۔ ترک سردار کچھ دیر تک منصور کے جواب کا منتظر رہا، آخر خود ہی بولا۔

”میں ایک باپ اور ترکوں کا عزت دار سردار ہونے کے باوجود تجھ پر ایک انکشاف کر رہا ہوں، جو تجھے چلا دے گا اور میری یہ بات جس کے علم میں بھی آئے گی چونک پڑے گا۔ یہاں تک کہ میرے گھر کے افراد بھی اسے ناپسند کریں گے۔“

مگر دیش حوراں کے اسیر

منصور اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ ترک سردار نے تکلیف دہ لہجے میں کہا۔ ”افسوس کہ تو ضرورت سے زیادہ سرد واقع ہوا ہے اور ایسا کیوں ہے میں اس کا سبب تم سے زیادہ جانتا ہوں۔“ پھر ذرا خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔ ”تو مجھ سے یہ پوچھ ہی سکتا تھا کہ میں کون سا انکشاف کرنے والا ہوں لیکن تو نے یہ بھی نہیں پوچھا۔ خیر، میں پھر بھی بتا رہا ہوں میں نے یہ محسوس کر کے کہ تو بوران سے محبت کرنے لگا ہے لیکن بوران تجھے ناپسند کرتی ہے، میں بوران کی تجھ سے شادی کر دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔“

منصور واقعی چونک پڑا اور حیرت اور اشتیاق سے ترک سردار کی صورت دیکھنے لگا۔

ترک سردار کہتا رہا۔ ”لیکن تو نے یہ فیصلہ کر کے مجھے مایوس کر دیا ہے کہ تو یمن جا رہا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تو پھر واپس بھی آئے گا یا نہیں، اس لیے بوران کی بابت کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔“

منصور دبے لہجے میں بولا۔ ”لیکن آپ بوران کو اس کی مرضی کے بغیر مجھ سے کیوں وابستہ کر دیتا چاہتے تھے اور مجھ پر آپ کی غیر معمولی عنایات اور مہربانیوں کی وجہ کیا ہے؟“ ترک سردار نے جواب دیا۔ ”تو یمن سے واپس آ جا پھر اس کا سبب بھی بتا دوں گا۔“

اس موقع پر بوران نے بھی اس سے بات کی، خلاف معمول اس نے منصور سے خوش اخلاقی سے بات کی۔ اس نے کہا۔ ”تو نے واپس جانے کا فیصلہ کر کے دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس پر سب سے زیادہ میں خوش ہوں۔“ منصور نے جواب دیا۔ ”اور میں بھی محض تجھے خوش کرنے کے لیے ہی یہاں سے جا رہا ہوں۔“

بوران نے پوچھا۔ ”واپس آؤ گے؟“ منصور نے جواب دیا۔ ”پہلے تو واپس آنے کا ارادہ تھا لیکن اب شاید واپس نہ آؤں۔“

”وہ کیوں؟“ ”اس لیے کہ میری واپسی کو تو پسند نہیں کرتی۔“ بوران نے کہا۔ ”میرا خیال اپنے دل سے نکال دے اور شوق سے واپس آ جا۔“ منصور نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن علی الصبح منصور نے سامرا کو چھوڑ دیا۔

☆☆☆

ابن الزیات کو جب یہ معلوم ہوا کہ منصور سامرا سے چلا گیا ہے تو اسے افسوس ہوا۔ وہ ترک سردار اور منصور کا اس دن سے دشمن ہو رہا تھا جس دن اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ

یہ دونوں ابن الزیات اور واثق کے معاملے میں شاہد تھے۔ وہ ان دونوں کے خلاف کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ جب ترک سردار کی زبانی اسے یہ معلوم ہوا کہ منصور یمن چلا گیا تو اسے ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ اس نے واثق کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ترک سردار نے عرب نوجوان کے خلاف سازش کی ہے اور اپنی بیٹی بوران اور منصور کے معاشرے پر پردہ ڈالنے کے لیے منصور کو راہ سے ہٹا دیا ہے۔ واثق نے اس معاملے میں خاصی دلچسپی لے لی۔

ترک سردار نے ابن الزیات کو سمجھایا اور کہا۔ ”ابن الزیات! تو لوگوں کے معاملات میں فضول دخل اندازی مت کر۔ تو ایک بار قتل ہوتے ہوئے فک چکا ہے، میرا مشورہ مان اور لوگوں کی دشمنیاں مت مول لے۔“

ابن الزیات نے درشتی سے جواب دیا۔ ”ترک سردار! کیا یہ بات غلط ہے کہ منصور تیری بیٹی بوران سے عشق کرتا تھا اور تو نے اسے غیرت و حمیت میں اپنی راہ سے ہٹا دیا ہے۔“

ترک سردار غصے میں بولا۔ ”کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے منصور کو ہلاک کر دیا ہے؟“ ”میں یہ کہنا نہیں چاہتا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جسے تو نے لوگوں سے چھپا رکھا ہے۔“

”یہ غلط ہے۔“ ترک سردار نے غصے میں کہا۔ ”بلکہ میں تو بوران کی اس سے شادی کر دیتا چاہتا تھا حالانکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بوران اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ میرے دل میں منصور کے لیے بڑی محبت تھی۔“

ابن الزیات نے ترش لہجے میں کہا۔ ”یہ سراسر جھوٹ ہے۔ کیا تو وہ سبب بتائے گا جس کی وجہ سے تو بوران کو منصور سے وابستہ کر دیتا چاہتا تھا؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں وہ سبب نہیں بتا سکتا۔“

ابن الزیات نے طنز یہ ہنستے ہوئے کہا۔ ”تب پھر اس معاملے میں امیر المومنین کا فرمان بھی سن لے۔“ اس کے بعد ابن الزیات اٹھا اور اپنے کاغذات کھنگالنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک پروانہ ترک سردار کے حوالے کر دیا۔ یہ فرمان خلافت تھا جو ترک سردار کے نام جاری کیا گیا تھا۔ اس میں ترک سردار کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے عرب مہمان منصور کو ابن الزیات کی خدمت میں حاضر کرے کیونکہ خلافت کو باوثوق ذرائع سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ منصور کو قتل کیا جا چکا ہے۔ آخر میں ترک سردار کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ

جب تک منصور نہ مل جائے ترک سردار اپنی بیٹی بوران کی شادی نہیں کر سکتا۔

ترک سردار کو سکھتہ سا ہو گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ابن الزیات کو کیا جواب دے۔

ابن الزیات نے سختی سے کہا۔ ”فرمان خلافت سن لیا، اب خبردار جو تو نے بوران کی کسی سے شادی کی۔“

ترک سردار اس اور منجھل گھر پہنچا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ یمن جا کر منصور کو تلاش کیا جائے یا پھر اس کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔ دونوں تجویزوں میں سے کوئی ایک بھی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اس واقعے کو کئی سال گزر گئے، منصور واپس نہیں آیا۔ اس دوران کئی ترک نو جوانوں نے بوران سے شادی کی درخواست کی لیکن ترک سردار بات ٹالتا رہا، یہاں تک کہ گھر کے سبھی لوگ ترک سردار کی اس انکاری روش سے تنگ آ گئے۔ لوگ اس سے انکار کا سبب پوچھتے مگر وہ نہ بتا پاتا۔

اسی دوران بوران ایک ترک نو جوان پر مائل ہو گئی اور ان دونوں میں محبت اتنی زیادہ پروان چڑھی کہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر جینا محال ہو گیا۔ ترک سردار اس عمل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کی حیثیت بڑی نازک تھی۔ وہ اگر دونوں کو منع کرتا تھا تو یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس انتہاء کا سبب کیا بتائے اور اگر دونوں کو ان کے حال پر چھوڑتا تو اس کا انجام سمجھ میں نہ آتا تھا۔

آخر ایک دن ترک سردار کی بیوی نے بوران کی وکالت کی، بولی۔ ”جب بوران نے اس ترک نو جوان کو پسند کر لیا ہے تو تمہیں شادی کرنے میں کیا تامل ہے؟“

ترک سردار نے درستی سے جواب دیا۔ ”تو بوران کو سمجھا دے کہ اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔“

ماں نے بھی سختی اختیار کی، بولی۔ ”آخر بوران کی شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟ مجھے بھی تو وہ سبب معلوم ہونا چاہیے۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”میں منصور کا انتظار کر رہا ہوں جب تک وہ واپس نہیں آ جاتا بوران کی شادی نہیں ہو سکتی۔“

ماں نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم اب بھی اس ٹنڈے نو جوان عرب پر مائل ہو۔ میں بھی بوران کی ماں ہوں اور اپنا یہ فیصلہ ستانے پر مجبور ہوں کہ منصور میری بیٹی کا شوہر نہیں بن سکتا۔“

”تو میری باتوں کا غلط مطلب مت لے۔ مجھے پہلے

یہ نہیں معلوم تھا کہ منصور میرے خاندان کے حق میں اتنی بڑی مصیبت ثابت ہوگا۔“

ماں نے پھر بیٹی کی طرف داری کی۔ ”مجھے بوران کی خوشی عزیز ہے اور تم جو چاہو کرو، میں بوران کی شادی اس کے پسندیدہ ترک نو جوان سے ضرور کروں گی۔“

ترک سردار نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ ”تو مجھے پریشان نہ کر، میں نے جب یہ کہہ دیا کہ جب تک منصور واپس نہ آجائے، بوران کی شادی نہیں ہو سکتی تو تمہیں خاموش ہو جانا چاہیے۔“

ماں تو چپ ہو کر چلی گئی لیکن بوران، باپ سے بات کرنے آگئی، آتے ہی پوچھا۔ ”بادا جان کیا آپ اب بھی اسی ٹنڈے سے لو لگائے ہوئے ہیں؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”نہیں تو بیٹی، یہ تو نے کس طرح سمجھ لیا؟“

بوران نے سختی سے کہا۔ ”بادا جان! میری شادی کسی سے بھی ہو لیکن یہ میرا بھی اکل فیصلہ ہے کہ میں اس ٹنڈے سے ہرگز شادی نہ کروں گی۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔“

ترک سردار نے بوران کو اپنے برابر ہی بٹھالیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹی بوران! میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں۔ تجھے نہیں معلوم کہ اس منصور نے مجھے کتنا پریشان کیا ہے۔ خدا کی قسم اب تو میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تیری شادی کسی سے بھی کر سکتا ہوں لیکن اگر نہیں کر سکتا تو وہ منصور ہے۔ میں منصور سے تیری شادی اب تو کر ہی نہیں سکتا۔“

لیکن بوران کو اپنے باپ کی باتوں پر یقین نہیں آیا، بولی۔ ”بادا جان! اب آپ کو منصور کا انتظار کیوں ہے؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”بوران! کچھ ایسی بات ہے جس کا میں تیرے سامنے ذکر نہیں کر سکتا۔“

پھر ترک سردار نے قرآن پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی۔ ”تجھے یقین دلانے کے لیے میں قسم کھاتا ہوں کہ تو جس سے کہے گی تیری شادی اس سے کی جائے گی لیکن شادی اسی وقت ہوگی جب منصور مل جائے گا۔“

بوران باپ کے پاس سے ہٹ کر ایک گوشے میں جا کر آنسو بہانے لگی۔

☆☆☆

منصور نہیں آیا اور نہ واپس آنے کی امید ہی باقی رہی۔ بوران کی بے بسی اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آتی کہ وہ اس معاملے میں امیر المومنین

سے رحم کی درخواست کرے لیکن ہمت نہ پڑی۔ آخر ابن الزیات ہی پر نظر پڑی کہ اس سے اس سلسلے میں سفارش کروائی جائے۔ خواہ رشوت ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

جب وہ ابن الزیات کے پاس پہنچا تو ایک بار پھر یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابن الزیات اپنے خوشامد یوں میں گھرا بیٹھا ہے اور اس کے سامنے امیر المومنین خلیفہ ثالث کا چھوٹا بھائی جعفر عام آدمیوں کی طرح کھڑا ہوا ہے۔ ابن الزیات نے خلیفہ کے بھائی جعفر کو ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھا اور اپنے کاغذات میں مشغول ہو گیا۔ ترک سردار کو اس بے التفاتی سے بڑی وحشت سی ہوئی۔ کچھ دیر بعد ابن الزیات نے خلیفہ کے بھائی جعفر سے پوچھا۔

”کیا بات ہے، تو یہاں کیوں آیا ہے؟“

جعفر نے جواب دیا۔ ”مجھ سے امیر المومنین ناراض ہو گئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ تو امیر المومنین سے میری طرف سے درخواست کر کہ وہ مجھ سے خوش ہو جائیں۔“

ابن الزیات نے اپنے حاشیہ نشینوں کی طرف دیکھتے ہوئے طنزاً کہا۔ ”حضرات! ملاحظہ فرمایا؟ اس نے پہلے تو اپنے بھائی کو ناخوش کر دیا اور اب چاہتا ہے کہ امیر المومنین اس سے دوبارہ خوش ہو جائیں۔“ پھر جعفر کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ”جا بھاگ جا اور خبردار جو پھر آنے کی کوشش کی۔“

جعفر نے کہا۔ ”ابن الزیات! تو امیر المومنین کے مزاج میں بڑا رسوخ رکھتا ہے اس لیے اگر تو چاہے گا تو وہ مجھ سے راضی ہو جائیں گے۔“

ابن الزیات نے بدستور درستی سے جواب دیا۔ ”میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، تو اپنی اصلاح کر اور ناراضی کی وجہ دور کر، امیر المومنین خود راضی ہو جائیں گے۔“

اس کے بعد ابن الزیات، ترک سردار کی طرف رجوع ہوا، پوچھا۔ ”تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”ابن الزیات! خدا کے غضب سے ڈر، کسی کے تو کام آجایا کر۔“ پھر جعفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ امیر المومنین کے بھائی ہیں، تو نے ان کا تو احترام کیا ہوتا۔“

ابن الزیات نے دھمکی دی۔ ”ترک سردار! تو نے ایک جرم تو پہلے ہی کر رکھا ہے۔ اب دوسرا یہ کر رہا ہے کہ خلافت کے ان معاملات میں دخل دے رہا ہے جو تیری ذات سے تعلق نہیں رکھتے۔ میرا تیرے لیے یہ آخری مشورہ ہے کہ تو کسی بھی طرح منصور نامی عرب نو جوان کو حاضر کر،

ورنہ تیرے خلاف بھی کوئی سخت کارروائی کی جائے گی۔“

ترک سردار اور جعفر ایک ساتھ واپس آئے۔ راہ میں جعفر نے کہا۔ ”مستعین! تو نے ابن الزیات کا رویہ دیکھا۔ کیا اسے میرے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہیے تھا؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”جناب! میں کیا کہہ سکتا ہوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے ایک بار امیر المومنین کے دوروی عہدی میں ان سے بھی اہانت آمیز سلوک کیا تھا اور انہوں نے دو آدمیوں کی گواہی میں یہ عہد کیا تھا کہ جب وہ خلیفہ بنیں گے تو اس ابن الزیات کو قتل کر دیں گے لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے خلیفہ بننے کے ایک ماہ کے اندر اندر ابن الزیات کو اپنا وزیر بنالیا۔“

جعفر نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا، خوف زدہ آواز میں کہا۔ ”کہیں ہماری یہ باتیں ابن الزیات کے کانوں تک نہ پہنچ جائیں۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”میں اس سے نہیں ڈرتا کیونکہ میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ ہم ترکوں کے بل بوتے پر خلافت عباسیہ کی عمارت کھڑی ہے۔“

جعفر نے پوچھا۔ ”کیا تو میری مدد کر سکتا ہے؟“

ترک سردار نے پوچھا۔ ”کس کے خلاف؟“

جعفر نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”کس کا نام لوں، شاید ابن الزیات کے خلاف۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”لیکن مشکل یہ ہے کہ جب آپ برسرِ اقتدار آجائیں گے تو آپ بھی ابن الزیات ہی کو وزیر بنالیں گے۔“

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف ابن الزیات دائیں کو ایک خط لکھ رہا تھا۔

”یا امیر المومنین! جعفر بن مقسم میرے پاس آئے تھے اور یہ درخواست کر رہے تھے کہ میں امیر المومنین سے ان کی سفارش کر دوں کہ آپ ان سے راضی ہو جائیں۔ امیر المومنین! میں حلفیہ عرض کر رہا ہوں کہ اس وقت جعفر بن مقسم کی حج حج بالکل بھجوں جیسی تھی۔ ان کے لیے بے بال گردن تک لٹک رہے تھے۔ اس کے علاوہ ترک سردار مستعین بھی اسی وقت حاضر ہوا تھا۔ اس نے ابھی تک منصور نامی عرب نو جوان کو حاضر نہیں کیا۔ جعفر بن مقسم، ترک سردار کے ساتھ ہی میرے پاس سے رخصت ہوئے تھے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ امیر المومنین کے بھائی اس ترک سردار سے مل کر کوئی سازش نہ کر رہے ہوں۔“

دائیں نے ابن الزیات کو فوراً جواب دیا۔ ”جعفر کو اسی

وقت اپنے پاس بلا بھیج اور حجام کو بلوا کر اس کے بال کٹوا دے اور پھر کسی کو حکم دے کہ جعفر کے بالوں کو اس کے منہ پر کھینچ مارے۔ اس کا ردوائی سے پہلے ترک سردار کو بھی بلوالے اور مناسب ہوگا کہ یہ ساری کارروائی اس ترک سردار کے روبرو عمل میں لائی جائے اور اس دوران نہایت ہوشیاری سے ترک سردار کے چہرے کا جائزہ لیتا رہے اور جو کچھ اس کے چہرے پر محسوس کرے اس سے مجھے مطلع کر۔ ترکوں کے سلسلے میں ہماری روش اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔ ہم ان سے بگاڑ نہیں پسند نہیں کرتے۔ ہاں تو اپنے طور پر اس سے منصور کی بابت پوچھ کچھ کرنا ہے لیکن سختی ہرگز نہ کرنا۔

☆☆☆

جب یوران اور اس کی ماں کا دباؤ زیادہ بڑھا تو اس نے بدرجہ مجبوری انہیں سب کچھ بتا دیا۔ دونوں کا صدمہ سے چہرہ ست گیا۔ بیوی نے پوچھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“ ترک سردار نے جواب دیا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ امیر المومنین اپنے اس فرمان کو واپس لے لیں۔“ یوران نے پوچھا۔ ”کیا ہم اس عرب نوجوان کو تلاش کر کے حاضر نہیں کر سکتے؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”میرا خیال تھا کہ وہ واپس ضرور آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ میں اسے تلاش کروا کے حاضر بھی کر سکتا ہوں لیکن یہ ذرا پیچیدہ عمل ہے۔ میں مختلف ذرائع سے یہ کوشش کر رہا ہوں کہ امیر المومنین کو ان کے فرمان کی منسوخی پر آمادہ کر لوں۔ اگر میں اس میں ناکام ہو گیا تو منصور کو ضرور تلاش کرواؤں گا۔“

انہی باتوں کے دوران ابن الزیات کا آدمی آگیا اور بتایا کہ وہ ترک سردار کو اسی وقت بلارہا ہے۔ ترک سردار خوب جانتا تھا کہ ابن الزیات کا یہ بلاوا کوئی محنتی رکھتا ہے۔ اس نے بیوی اور بیٹے نافر کو ہدایت کی کہ اگر اس کی واپسی میں دیر ہو جائے تو وہ فوراً ابن الزیات کے پاس آدمی بھیج کر خیریت معلوم کر لیں۔

جب ترک سردار ابن الزیات کے پاس پہنچا تو وہ بہت خوش دکھائی دیا۔ اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ”ترک سردار تم آگئے، مجھے تمہارا بڑا انتظار تھا۔“ ترک سردار نے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے، کیا امیر المومنین نے میرے بارے میں کوئی خاص ہدایت فرمائی ہے؟“

ابن الزیات نے جواب دیا۔ ”ذرا دیر بعد یہاں ایک دلچسپ تماشا پیش آنے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں،

اسے تم بھی دیکھ لو کیونکہ اس قسم کے تماشے بار بار نہیں دکھائے جاتے۔“

ترک سردار کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس وقت کون سا تماشا دکھایا جائے گا۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں جلتا تھا کہ جعفر بہترین سواد (درباری پوشاک) پہنے داخل ہوا۔ درباری پوشاک کا رنگ سیاہ تھا اور یہ بالکل نئی تھی جعفر خوش تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی ابن الزیات سے کہا۔

”ابن الزیات! مجھے یقین تھا کہ تو میری امیر المومنین سے سفارش ضرور کرے گا اور امیر المومنین راضی ہو جائیں گے چنانچہ جیسے ہی تیرے فرستادے نے مجھے یہ بتایا کہ تو بلارہا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی، ہاں اب بتا کہ امیر المومنین نے کیا کہا؟“

ابن الزیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جعفر! ذرا انتظار کر ابھی تجھے معلوم ہو جائے گا کہ امیر المومنین نے میری بابت کیا حکم دیا ہے۔“ اس کے بعد اس نے ایک خدمت گار کو حکم دیا۔ ”جا، اور اسے فوراً لے آ۔“

خدمت گار فوراً چلا گیا۔ ابن الزیات فس فس کر جعفر سے ہاتھ کرنے لگا پھر اچانک بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”جعفر! تو نے زنانوں کی طرح یہ کاکلیں کیوں چھوڑ رکھی ہیں؟“

جعفر نے جواب دیا۔ ”ابن الزیات! میں امیر المومنین کا بھائی ہوں تجھے مجھ سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔“

ابن الزیات نے کہا۔ ”تو، تو لب و لہجے کی شکایت کر رہا ہے، میں اور کیا کچھ کر سکتا ہوں ذرا دیر بعد یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔“

جعفر پریشانی سے ماحول کا جائزہ لینے لگا لیکن وہاں ایسی کوئی بات نہیں محسوس ہوئی جس سے ابن الزیات کے عزائم کا پتا چل سکتا۔ ترک سردار بھی پریشان، محاطات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد خدمت گار واپس آگیا۔ وہ تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک حجام بھی تھا۔

ابن الزیات نے حجام کو حکم دیا۔ ”آگے بڑھ اور جعفر کا سر مونڈ دے۔“

جعفر نے گھبرا کر کہا۔ ”ابن الزیات! تو یہ کیسا حکم دے رہا ہے۔ اپنے ہوش میں تو ہے؟“

ابن الزیات نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں بالکل ہوش میں ہوں۔ ہاں تو البتہ ہوش و حواس میں نہیں کہ

گردش دوران کے اسیر

چنانچہ میں نے نئی پوشاک پہنی اور ابن الزیات کے پاس آگیا۔ میں یہاں خوش خبری سننے آیا تھا لیکن اس نے مجھے مونڈھ لیا۔“

ترک سردار نے گھرواہیں جا کر جب پورا واقعہ گھروالوں کو سنایا، تو وہ سب خوف زدہ ہو گئے۔ اب ترک سردار کے سامنے یوران کے مسئلے کا ایک ہی حل رہ گیا تھا اور وہ تھا منصور کو تلاش کر کے سامرا لے آنا اور اسے ابن الزیات اور امیر المومنین کی خدمت میں پیش کر کے گلو خلاصی حاصل کرنا۔

وہ تیاری کر کے یمن روانہ ہو گیا اور اپنے پیچھے گھروالوں کے لیے یہ ہدایت چھوڑی کہ وہ منصور کو لے کر ہی واپس آئے گا۔ اس کی عدم موجودگی میں نافر اس خاندان کا سربراہ ہوگا۔

☆☆☆

ترک سردار دو سال تک غائب رہا، اس نے یمن کا چپا چپا جھان لیا لیکن منصور کا کہیں پتا نہ چلا۔ نافر، یوران اور اس کی ماں اس کے انتظار سے تنگ آ چکی تھیں اور ان کے دلوں پر اندیشوں اور وسوسوں کا کھر چھا چکا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب ترک سردار کو کہاں تلاش کیا جائے۔ ابن الزیات الگ الگ اس کے خاندان کو تنگ کر رہا تھا۔ نافر چوری چوری یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ چھ ماہ کے اندر اندر اس کا باپ واپس نہ آیا تو وہ اپنے خاندان کو چوری سے لے کر ماوراء النہر چلا جائے گا اور وہاں کے کسی گمنام قریبے میں کاشکار بن کر زندگی گزار دے گا۔

اس دوران سامرا میں یہ افواہ گرم ہونے لگی کہ دانش مرض استقاء میں مبتلا ہے اور اسے یہ مرض بہت تنگ کر رہا ہے اور شاہی اطباء اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یہ افواہ ابھی گرم ہی تھی کہ ایک رات اچانک ترک سردار واپس آگیا۔ شمعوں کی روشنی میں اس کے اندر کی مایوسی چہرے پر دیکھی جاسکتی تھی۔ نافر، یوران اور ان کی ماں، تینوں ترک سردار سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی سوال کرنے کی ہمت نہ تھی۔

ترک سردار نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم سب مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا وہ آیا تھا؟“

اس کی بیوی نے جواب دیا۔ ”کیا تم نے اسے سمجھا تھا؟“ ترک سردار نے بڑی مایوسی سے کہا۔ ”اگر وہ مجھ مل گیا ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ لے کر آتا۔“ تینوں کے چہرے اتر گئے اور یوران وہاں سے ہٹ گئی۔

”میرے علم کی تکمیل کر۔“

اس کے بعد اس نے جعفر کے سامنے دانش کی تحریر رکھ دی۔ ”اسے پڑھ لے کہ یہ میرا نہیں امیر المومنین کا حکم ہے۔“

جعفر نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”اگر یہ امیر المومنین کا حکم ہے تو میں خاموشی سے اس کی تعمیل کر دوں گا۔“

ترک سردار کو ابن الزیات کی اس شرارت سے بڑا دکھ پہنچا۔

ابن الزیات نے خدمت گار کو حکم دیا۔ ”تو حجام اور جعفر کے پاس ہی کھڑا رہ اور سارے بال جمع کرنا۔“

جعفر نے انتہائی لجاجت سے درخواست کی۔ ”ابن الزیات! میں بال منڈوانے میں ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کروں گا لیکن میری نئی پوشاک پر بالا پوش تو ڈلوادے۔“

ابن الزیات نے گویا جعفر کی بات سنی ہی نہیں۔ حجام کو بڑی سختی سے حکم دیا۔ ”تو میرے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کرتا۔ کیا تیری شامت تو نہیں آگئی۔“

حجام نے ابن الزیات کے حکم کی پوری پوری تعمیل کر دی اور جعفر کے نئے درباری لباس پر ہی حجام نے اس کے بال مونڈ دیے۔ خدمت گار ان بالوں کو اکٹھا کرتا رہا، جب سر منڈھ چکا تو ابن الزیات نے خدمت گار کو حکم دیا۔

”ان بالوں کو جعفر کے منہ پر مار دے۔“ خدمت گار نے یہ بال جعفر کے منہ پر کھینچ مار دیے۔

ابن الزیات اس کارروائی کے دوران ترک سردار کے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔ ترک سردار مختل بھی تھا اور پریشان بھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو شخص امیر المومنین کے بھائی کو اتنا ذلیل کر سکتا ہے وہ ترک سردار کو کتنا خوار کر سکتا ہے۔ شاید اس سے کہیں زیادہ۔

ابن الزیات نے دونوں کو ایک ساتھ رخصت کیا۔ جعفر بہت زیادہ ملول تھا۔ راستے میں جعفر نے ترک سردار سے کہا۔ ”مستعین! تو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، میں تجھے عینی شاہد بنا رہا ہوں۔“

ترک سردار نے پوچھا۔ ”ابن الزیات کے آدمی نے مکن لفظوں میں بلوایا تھا؟“

جعفر نے جواب دیا۔ ”جب ابن الزیات کے آدمی نے مجھے یہ بتایا کہ مجھے فوراً بلایا گیا ہے تو میں یہ سمجھا کہ اس نے امیر المومنین کا دل میری طرف سے صاف کر دیا ہوگا

Italiano®

Permanent Hair Colour Cream

Free Developer Inside



01 Natural Black

02 Dark Brown

03 Medium Brown

04 Light Brown

Nourishment for Hair With Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner

گردش حوراں کے اسید

خلافت واثق کے بھائی جعفر کے نام نکل آیا۔ وہی جعفر ہے ابن الزیات نے کئی بار ذلیل کیا تھا اور آخری بار سرمنڈوا کے بال اس کے منہ پر پہنچ مارے تھے۔ ارکان شوریٰ نے منتظم شریات بٹا کو حکم دیا کہ وہ جعفر کو ارکان کے فیصلے سے مطلع کر دے اور بلا لائے۔

بٹا، جعفر کو تلاش کرتا ہوا محل کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں جعفر نیلے کپڑوں میں ملبوس ترک بچوں میں گھبراہٹا تھا۔ بٹا نے کہا۔ ”حضور والا کو ارکان شوریٰ نے طلب فرمایا ہے۔“

جعفر اسی وقت اس مجلس میں پہنچ گیا۔ مجلس کے ایک رکن احمد بن ابی داؤد نے مجلس کا فیصلہ سنایا۔

”قرعہ خلافت آپ کے نام نکل چکا ہے میرے قریب آئیے تاکہ میں رسم خلافت ادا کر دوں۔“

جعفر کو اپنے بھائی واثق کی موت کا اب بھی یقین نہ تھا، جواب دیا۔ ”مجھے خوف ہے کہ واثق زندہ ہوں گے۔“

احمد بن ابی داؤد نے جعفر کو واثق کی میت پر کھڑا کر دیا پھر وہاں سے واپس آکر جعفر کو خلافت کا لباس پہنایا، عمامہ باندھا اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دے کر ادب سے عرض کیا۔

”السلام علیکم یا امیر المومنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔“ احمد بن ابی داؤد کے بعد دوسروں نے بھی اسی طرح سلام کیا۔ ابن الزیات نے بیعت نامہ خلافت لکھا۔

ترک سردار کو اس تہدیلی نے کسی قدر خوش کروا لیکن بعد میں اسے کچھ مایوسی ہونے لگی کیونکہ جعفر نے سر پر آرائے خلافت ہونے کے بعد ابن الزیات کو اس کے منصب پر برقرار رکھا تھا۔ اس نے بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر مبارک باد دی اور اشاروں میں جعفر کو یاد دلایا کہ ابن الزیات کے معاملے میں ترک سردار کو ایک مرتبہ شاہد بنایا تھا۔

جعفر نے کہا۔ ”پہلے میں ایک عام آدمی تھا اب میں امیر المومنین ہوں، عام اور خاص آدمیوں کی سوچ میں جو فرق ملتا ہے وہی فرق ایک عام جعفر اور خلیفہ جعفر کی فکر میں پایا جاتا ہے۔“

ترک سردار سمجھ گیا کہ اب جعفر کی فکر میں غیر متوقع فرق آچکا ہے۔ اس نے ابن الزیات کی مخالفت تو نہیں کی لیکن جعفر کے سامنے اپنا مسئلہ رکھ دیا اور درخواست کی۔ ”مجھ پر سے منصور کی بازیابی کی پابندی دور کر دی جائے تو بڑا کرم ہوگا۔“

جعفر نے ابن الزیات کو بلا کر اسے حکم دیا کہ ترک

ترک سردار نے دریافت کیا۔ ”میرے پیچھے کوئی خاص بات تو نہیں ہوگی؟“

نافر نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین مرض الموت میں مبتلا ہیں اور ابن الزیات کی شرارتوں سے تنگ آکر ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ خاموشی سے ماوراء النہر کے کسی قریے میں چھپتی باڑی کرنے لگیں گے۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”اگر امیر المومنین نہ رہے تو معلوم نہیں حالات کیا رخ اختیار کریں، بہر حال میں ایک بار پھر منصور کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔“

نافر نے نفرت سے کہا۔ ”نہیں، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں، اب آپ گھر ہی میں رہیں جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔“

ماں نے پوچھا۔ ”مگر بوران کا کیا ہوگا؟“

نافر نے جواب دیا۔ ”ہم اس کی شادی کر کے سامرا سے ہٹا دیں گے اس کے بعد ہم پر جو بیٹے کی جھیل لیں گے۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”یہ تیرا جذباتی فیصلہ ہے جس سے میں متفق نہیں ہو سکتا۔“

نافر نے غصے میں کہا۔ ”تب پھر اب میں منصور کو تلاش کرنے جاؤں گا۔“

ترک سردار نے بے دلی سے پوچھا۔ ”تو تلاش کرنے جائے گا مگر کہاں جائے گا؟“

نافر نے جواب دیا۔ ”ہاں میں جاؤں گا اور کہاں جاؤں گا اس کا جواب تو ابھی میرے پاس بھی نہیں ہے۔“

اس بات چیت کے چوتھے دن نافر اچانک غائب ہو گیا۔ اپنے پیچھے اس نے اپنے باپ کے نام ایک خط چھوڑا تھا۔

”بادا جان! میں منصور کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ مجھ سے بہن بوران کی اداسی نہیں دیکھی جاتی۔ میں یا تو منصور کو پکڑ کر اپنے ساتھ لاؤں گا یا پھر ہمیشہ کے لیے تم ہو جاؤں گا۔ دعا کیجیے، خدا مجھے کامیاب کرے۔“

ترک سردار کے دل پر ایک گھونسا لگا۔ اس نے پہلی بار تھلا کر منصور کو برا بھلا کہا۔ ”منصور! میں نے تیرے ساتھ بھلائی کی تھی پھر مجھے یہ سزا کس بات کی مل رہی ہے۔“

☆☆☆

سامرا ماتم کدہ بن گیا۔ واثق اطبا کے مشورے پر گرم خور پر بیٹھ کر بھاپ لیا کرتا تھا۔ ایک دن زیادہ گرم خور پر بیٹھ کر بھاپ لی تو بخار آ گیا اور اسی بخار نے اس کی جان لے لی۔

ابن الزیات نے کوشش کی واثق کا کسن پٹا خلیفہ بنادیا جائے لیکن ارکان مشورت نے مخالفت کی اور قرعہ

شرمندگی اٹھانی پڑے۔“
اس کے بعد ترک سردار منصور کو ایک گوشے میں لے گیا اور اس سے کہا۔ ”منصور! اب وقت نہیں رہا، میں نے تیرا بہت انتظار کیا مجھے افسوس ہے کہ تو نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ جب تو بغداد میں رہتا تھا تو یمن کیوں بتایا تھا؟“
منصور نے جواب دیا۔ ”ترک سردار! میں یہاں جس مقصد سے آیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ میں اس قسم کی غلط بیانی سے کام لوں۔“
ترک سردار نے کہا۔ ”اچھا، اب تو اپنا مقصد مت بتا اور اسے میری زبان سے سن لے۔“ پھر ذرا دم لے کر کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے تیرا انداز ہاتھ کسی ترک گھڑسوار کے گھوڑے سے چلا گیا تھا اور تو نے اس بارے میں اب تک جو کچھ مشہور کر رکھا ہے غلط ہے اور تو سامرا اس لیے آیا تھا کہ تو اس ترک کا کسی طرح پتا چلا کر انتقام لے لے۔“
منصور نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ سب کچھ آپ کو کس طرح معلوم ہوا؟“
ترک سردار نے جواب دیا۔ ”تو یہاں کے ترکوں میں کس بیٹے کو جس قسم کی کریدنے والی باتیں کیا کرتا تھا، مجھے اس سے شبہ ہوا تھا، کیا میرا شبہ غلط تھا؟“
منصور نے نہایت کرب سے کہا۔ ”درست ہے۔“
ترک سردار نے کہا۔ ”اچھا، اب ایک بات اور بتا کیا تیرا تعلق بغداد کے اس گھرانے سے تو نہیں جس خاندان کے دادا کی موجودگی میں کسی ترک سوار نے ایک بچے کا بھیجا پاش پاش کر دیا تھا اور دوسرے کا بازو توڑ دیا تھا؟“
منصور تڑپ گیا، آہستہ سے جواب دیا۔ ”وہ میرا دادا تھا اور مرنے والا میرا بھائی تھا۔ بازو میرا ہی ٹوٹ گیا تھا لیکن یہ ساری باتیں آپ کو کس نے بتائیں؟“
ترک سردار نے کہا۔ ”اگر میں اس گھڑسوار سے تجھے ملوا دوں تو تو اس سے کیسا سلوک کرے گا؟“
منصور نے جواب دیا۔ ”میں اس سے انتقام لوں گا۔“
ترک سردار نے کہا۔ ”میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ بوران کی شادی تجھ سے کر دوں گا اس لیے کہ میں اپنے باطنی کرب کو اسی طرح تسکین دے سکتا تھا لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ میں زندگی بھر اس کرب میں جتلا رہا ہوں گا۔“
منصور نے کہا۔ ”لیکن ترک سردار! آپ نے اس ظالم گھڑسوار کی نشاندہی نہیں کی؟“
ترک سردار نے کہا۔ ”ادھر میری طرف دیکھ، وہ میں ہی ہوں اور.....“

سردار کو مزید تنگ نہ کیا جائے اور واقع کا فرمان چاک کر دیا جائے۔ ابن الزیات نے اس حکم پر فوراً عمل کیا اور ترک سردار نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا۔ اسے ایسا لگا جیسے کئی سال سے پڑی ہوئی گلے کی رسی کو دور کر دیا گیا ہو۔
ادھر فرمان واقع چاک ہوا اور نافر اپنے گھر میں اس طرح داخل ہوا کہ منصور اس کے ساتھ تھا۔ ترک سردار نے واپس آ کر نافر اور منصور کو گھر میں جو دیکھا تو زیادہ خوش نہیں ہوئی۔ نافر نے جوش میں کہا۔ ”آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا اور اب منصور کو ابن الزیات اور امیر المومنین کی خدمت میں پیش کر کے فرمان چاک کروا سکوں گا۔“
ترک سردار نے جواب دیا۔ ”اب اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں یہ کام ابھی ابھی کروا کے آیا ہوں۔“
اس کے بعد اس نے پوری روداد سنائی۔ نافر ہنس دیا، بولا۔ ”قسمت کی ستم ظریفی، بہر حال میں تو منصور کو تلاش کر لایا۔“
ترک سردار کچھ دیر حسرت و افسوس سے منصور کو دیکھتا رہا پھر ہنس کر کہا۔ ”تو نے مجھے بہت پریشان کیا منصور۔ میں تجھے دو سال تک یمن اور اس کے مضافات میں تلاش کرتا رہا۔“ پھر نافر سے پوچھا۔ ”یہ تجھے کہاں ملا؟“
نافر نے جواب دیا۔ ”بغداد میں۔“
”بغداد میں؟“ ترک سردار حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔
ترک سردار کی بیوی منصور کو دیکھ کر منہ بناتی ہوئی چلی گئی۔ بوران اسے چھپ چھپ کر دیکھ رہی تھی۔
نافر نے پوچھا۔ ”بوران کی شادی کب تک کر دی جائے؟“
منصور کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، وہ خوش فہمی میں جھٹلا ہو گیا۔
ترک سردار نے منصور کے چہرے سے اس کی خوش فہمی کو سمجھ لیا بولا۔ ”میں دن تاریخ کا بہت جلد اعلان کر دوں گا۔“ اس کے بعد منصور کو اشارے سے ایک طرف لے جانے لگا۔
نافر نے نفرت سے کہا۔ ”بادا جان! اب آپ کوئی غلطی نہ کر بیٹھے گا۔ اس عرب نوجوان سے آپ جو بات کرنا چاہتے ہیں، ہمیں میرے سامنے کیوں نہیں کر سکتے۔“
ترک سردار نے جواب دیا۔ ”نافر! تو مطمئن رہ میں کوئی ایسا کام نہ کروں گا جس سے مجھے حیرے سامنے

منصور کی ہلکی سی چیخ کھل گئی۔ ترک سردار کہہ رہا تھا۔ ”اگر تو مجھے ہلاک کر کے، اپنے دل کو سکون پہنچا سکتا ہے تو میں حاضر ہوں۔“
منصور نے سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ آنسو بہانا شروع کر دیے۔
ترک سردار نے مزید کہا۔ ”اور تجھے یہ علم بھی ہوگا کہ اسی دن تیری قوم کے لوگوں نے ایک ترک گھڑسوار کو ہلاک بھی کر دیا تھا۔ وہ ہلاک ہونے والا ترک کون تھا؟ کیا تو جانتا ہے؟“
منصور نے فنی میں گردن ہلائی۔ ترک سردار نے کہا۔ ”وہ نافر کا چچا تھا، میرا بھائی اور اس کی موت پر نافر نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنے چچا کا بدلہ ضرور لے گا۔“
منصور نے سوچا شاید ترک سوار غلطی ماقات میں بوران کی شادی اب بھی اسی سے کرنے والا ہے، بولا۔ ”پھر اب کیا ارادہ ہے کیا بوران مجھے پسند کر لے گی؟“
ترک سردار نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ تیری عدم موجودگی میں بوران نے ایک ترک نوجوان کو پسند کر لیا اور دو چار دن میں وہ دونوں شادی کر لیں گے۔“
منصور میں اب زیادہ باتیں کرنے کا حوصلہ نہیں رہ گیا تھا، باتوں کا سلسلہ فوراً بند کر دیا، بولا۔ ”کیا میں آج ہی اسی وقت بغداد واپس چلا جاؤں؟“
ترک سردار نے جواب دیا۔ ”نہیں، تو ابھی چند دن اور رہ، ہو سکتا ہے کہ غلطی کی کوئی اور صورت نکل آئے۔“
ان انکشافات نے گھڑ والوں کو بہت پریشان بھی کیا اور حیرت زدہ بھی۔ بوران کی ماں نے مشورہ دیا۔ ”اب اسے ساتھ نہیں رہنا چاہیے کیونکہ کچھ پتا نہیں کہ اس میں کب جذبہ انتقام بیدار ہو جائے۔“
لیکن ترک سردار کو منصور کی عرب شرافت پر اعتماد تھا، بولا۔ ”یہ عرب نوجوان دھوکے سے دار ہرگز نہ کرے گا، مجھے اس پر اعتبار ہے۔“
لیکن نافر نے سب کچھ جان لینے کے بعد اس سے اس طرح انتقام لیا کہ بوران کی شادی اس کی موجودگی میں کر دی اور منصور کو شرمندہ کرنے کے لیے یہ اعلان کر دیا کہ وہ اس طرح منصور سے اپنے مرحوم چچا کا انتقام لے رہا ہے۔
ترک سردار نے بیٹے کو ڈانٹا بھی لیکن منصور نے اسے روک دیا، بولا۔ ”نافر نے جو کچھ کیا، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“

منصور قسمت کے سارے وارنسی خوشی جھیلتا رہا، جب اس کا دل بہت زیادہ گھبرایا تو اس ظالم ماحول سے نکل کر دوسرے ظالم ابن الزیات سے ملنے چلا گیا۔ ابن الزیات عرب تھا اور اپنی قوم کا ظالم بھی اسے عزیز تھا لیکن جب وہ ابن الزیات کے گھر پہنچا تو پتا چلا، خلیفہ جعفر نے جو اب متوکل کہلاتا تھا ابن الزیات کو قید کر دیا ہے۔
وہ بہ مشکل ابن الزیات کے قید خانے تک پہنچ گیا۔ ابن الزیات نے منصور کو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ کمزور آواز میں پوچھا۔ ”تو کب آیا؟“
منصور نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ”یہ آپ کا کیا حال ہے؟“
ابن الزیات نے جواب دیا۔ ”معصیت یہ نہیں ہے کہ میں قید ہوں بلکہ یہ ہے کہ قید خانے کا عملہ مجھے سونے نہیں دیتا۔ جب بھی آنکھ لگتی ہے کوئی نہ کوئی آگے بڑھ کر میرے جسم میں سونیاں چھونے لگتا ہے۔ آج دو ہفتے گزرے کہ میں ہلک تک نہیں چھپا سکتا۔“
منصور نہایت افسوس سے ابن الزیات کی حالت پر غور کرتا رہا پھر ابن الزیات کو یا خود سے باتیں کرنے لگا، وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ”اے محمد! تو عافیت و آرام سے تھا، راحت و نعمت، اچھی سواریاں، عمدہ محل، اعلیٰ پوشاک غرض تجھے سب کچھ میسر تھا مگر تو نے قناعت نہ کی اور وزارت کے درپے ہوا۔ اب اپنے کروت کا مزہ چکھ۔“ منصور بغداد واپس چلا گیا، ترک سردار کو بتائے بغیر۔
ابن الزیات کو قید خانے سے نکال کر اسی کنویں میں ڈال دیا گیا جسے ابن الزیات نے اپنے دشمنوں کے لیے بنوایا تھا۔ سلاخوں والا تھور اور اس تھور میں اس کی موت واقع ہوئی۔
لاش پر ابن الزیات کے دونوں بیٹے سلیمان اور عبید اللہ کچھ دیر گھڑے دیکھتے رہے۔ ان دونوں نے بھی باپ سے بڑی تکلیف اٹھائی تھیں، آخر ان دونوں نے لاش پر جھک کر بیک آواز کہا۔ ”الحمد للہ کس قاسق سے نجات پائی۔“
☆☆☆
زمانے کا تغیر و تبدل جاری تھا، زمانہ کروٹیں لے رہا تھا۔ جعفر متوکل نے ترکوں کا زور توڑنے کے لیے انہیں معزول کرنا شروع کر دیا۔ اس زد میں ترک سردار بھی آ گیا۔ متوکل کے دل میں ترک سردار کاٹنے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ ترک سردار متوکل کی رسوائیوں، ذلتوں اور بے عزتیوں سے واقف تھا اس لیے وہ اس کاٹنے کو کسی بھی طرح دور کر دینا چاہتا تھا۔ خلیفہ کی نظریں کیا بدلیں کہ سامرا

کاشفِ زبیر بہمت

دشوار گزار رستوں پر ہی انسان کی ہمتوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ جب جان لپ دم ہو... جب زندگی اپنے انجام کی جانب گامزن ہو مگر اس اختتام سے قبل آغاز کے یہ شمار کام ادھورے رہ جائیں تو آخری لمحات کا کرب بہت مضطرب کر دیتا ہے۔ وہ بھی اسی اضطراب میں مبتلا اپنی ہمت سے بڑھ کر بکھری ہوئی اس بساط کو سمیٹ لیتا چاہتا تھا جس نے اس کی زندگی کے اوراق پریشان کر دیے تھے۔

گلے جسم و جاں کے آخری کرناک لمحات کا عبرت
ناک قصہ

کے گاؤں اور گھروں پر ٹوٹنے والے درندوں نے سب سے پہلے انہیں پامال کیا اور پھر انہیں ہاتھ پاؤں باندھ کر اس یک اپ گاڑی میں نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ کئی مہینوں سے سن رہے تھے کہ جنگ ان کے گاؤں کی طرف آ

روینہ ترانا ایک گاڑی میں سوار تھی۔ جس میں اس کے ساتھ ایک درجن نوجوان لڑکیاں اور عورتیں اور بھی تھیں، ان سب کی حالت تباہ تھی۔ کپڑے بھٹے ہوئے اور جسم زخموں سے چور تھے۔ وہ سب اپنی عزت کھو چکی تھیں۔ ان

سب کو مہمان بنا کے چھالیا۔ یہ سب کئی دن تک امید و بیم میں جلا ذہنی اذیتیں جھیلتے رہے۔ منصور نے اپنے بوڑھے باپ کو ان ترکوں کے بارے میں سب کچھ صحیح بتا دیا، وہ ان مہمانوں کو خوشخوار نظروں سے دیکھتا رہا۔ ترک سردار کو اب یقین ہو چکا تھا کہ منصور تو ان کی مدد کر سکتا تھا لیکن شاید منصور کا باپ انہیں معاف نہ کرے۔

خلافت کے خوشخوار سپاہی ترک سردار اور اس کے خاندان کی یوسوگتے پھر رہے تھے۔ یہ روپوش خاندان موت وزیت کی اذیت میں جلا تھا۔ ایک دن دوسروں کی نظروں سے بچ کر یوران نے منصور سے پوچھا۔ ”کیا ہم سب گرفتار کر لیے جائیں گے؟“

منصور نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر ایک دن منصور اور اس کے بوڑھے باپ نے اپنے مہمانوں کو دجلہ کے اس پار پہنچا دیا، وہاں تاجروں کا ایک قافلہ کوچ کے لیے تیار کھڑا تھا اور اس قافلے میں کچھ غیر تاجر بھی شامل تھے۔ انہیں اس قافلے میں چھوڑتے ہوئے منصور کے بوڑھے باپ نے کہا۔

”اب تم سب نہایت اطمینان سے نکل جاؤ گے۔“ اور منصور یوران سے کہہ رہا تھا۔ ”تو نے چند دن پہلے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا ہم سب گرفتار کر لیے جائیں گے؟ میں نے اس وقت تیرے اس شک و شبہ کے سوال کا جواب قصداً نہیں دیا تھا لیکن تیرے اس سوال نے مجھے دکھ ضرور پہنچایا تھا۔ میں ایک عرب ہوں اور عرب اپنے دشمنوں کو بھی پناہ دے کر ان سے دھوکا نہیں کرتے اور تجھ سے تو میں محبت بھی کر چکا ہوں۔“

نافر اپنی جگہ شرمندہ تھا کہ اس نے اس شریف نوجوان کو یوران کے معاملے میں کس قدر ذلیل کیا تھا۔ منصور کے سامنے اس کی نظریں نہیں اٹھتی تھیں لیکن منصور نے ناخر کو گلے لگا کر بھائیوں کی طرح رخصت کیا۔

قافلہ روانہ ہو گیا، گردوغبار اڑتا رہا اور صدائے جرس دیر تک سنائی دیتی رہی۔ منصور چلتے ہوئے قافلے پر نظریں جمائے حسین ماضی میں گم رہا جہاں یوران اس کے سامنے کھڑی بہن بننے سے انکار کر رہی تھی۔

کے درود یوران کے دشمن ہو گئے۔ ترک سردار نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ماوراءالنہر واپس چلا جائے۔ اس دوران متوکل کی طرف سے پروانہ گرفتاری جاری ہو گیا لیکن چالاک ترک سردار اس سے پہلے ہی اپنے خاندان کے ساتھ راتوں رات بغداد روانہ ہو چکا تھا۔ ترک سردار اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا کہ ”منصور کے پاس لے چلو۔“

لیکن ناقر یہ کہتا تھا کہ ”ہم سب خلافت کے محبوب ہیں اس لیے منصور ہمیں پکڑوا کر انعام لے لے گا۔“

ترک سردار نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”نافر! تو اس بھول میں مت رہ کہ ہم سب یہاں سے بے آسانی نکل جائیں گے، کوئی بھی عرب ہمیں گرفتار کروا سکتا ہے پھر میں منصور کے پاس پناہ لے کر ایک جوا کیوں نہ کھلیوں۔ اگر اس نے ہمیں گرفتار کروا دیا تو اس طرح وہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے جذبہ انتقام کو تسکین پہنچالے گا اور اگر اس نے فرار ہونے میں ہماری مدد کی تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔“

چنانچہ یہ لوگ بغداد روانہ ہو گئے۔ انہوں نے عام شاہراہ چھوڑ کر قبرستان سے ہو کر گزر جانا چاہا۔ تاروں کی روشنی میں یہ چند افراد کا قافلہ قبرستان سے آئینی ارواح کی طرح گزر رہا تھا۔ ایک قبر کے پاس چند کتے آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ اس قافلے کو اپنے سر پر دیکھ کر کتے بھاگ گئے۔ تاروں کی ہلکی روشنی میں کوئی سفید چیز پڑی دکھائی دی، کتے اس سفید چیز کے پاس لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ترک سردار نے اسے جھک کر دیکھا، یہ کسی کی کفن میں لپٹی ہوئی لاش تھی۔ اس نے چھوٹی سی موی شیخ جلا کر لاش کو غور سے دیکھا۔ کتوں نے لاش کا پیٹ چاک کر دیا تھا اور بازوؤں کا گوشت چٹ کر کھاتے تھے، چہرہ ابھی تک محفوظ تھا، یہ ایک شہساز چہرہ تھا۔ ترک سردار کی چیخ نکل گئی۔ ”آہ ابن الزیات! یہ تو ہے، خدا تجھے معاف کرے، میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔“

اس نے ناقر کی مدد سے ابن الزیات کی لاش کو دوبارہ اس کی قبر میں اتار کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔

رات کے پچھلے پہر منصور نے ان سب کا خیر مقدم کیا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ سب خلافت کے محبوب ہیں تو وہ ذرا سی دیر کے لیے کسی سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ان

تاریخ طبری، ابن جریر الطبری۔ تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون۔ فتوح البلدان، بلاذری۔

تاریخ الخلفاء، جلال الدین سیوطی۔ تاریخ اسلام، معین الدین ندوی

مسلمانوں کی سیاسی تاریخ، ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن۔ الفخری، ابن طباطبائی

ماخذات

رہی ہے۔ گاؤں کے بیشتر مرد پہلے ہی دشمن سے لڑنے کے لیے فوج میں بھرتی ہو کر جا چکے تھے۔ محدودے چند مرد اور نوجوان لڑکے تھے وہ کسی حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھے۔ آنے والے اتحاد میں کہیں زیادہ اور پوری طرح مسلح تھے۔ عام ہتھیاروں کا اتنا بڑا انبار تھا کہ جب وہ جیسے میں داخل ہوئے تو ان کی نہیں گولیاں اگل اگل کر سرخ ہو گئی تھیں۔

رومینہ کو کچھ پتا نہیں چلا کہ باہر کیا ہو رہا ہے کیونکہ جیسے ہی دشمن گاؤں میں داخل ہوا اس کی ماں نے اسے ایک الماری میں کباڑ تلے چھپا دیا اور اس کی بڑی بہن کو لے کر خود باہر چلی گئی۔ اس نے اشارے سے رومینہ سے کہا کہ وہ اس جگہ سے باہر نہ نکلے ورنہ امکان ہے کہ دشمن اسے بھی لے جائے گا یا مار دے گا۔ رومینہ تقریباً سولہ سال کی خوب صورت اور صحت مند لڑکی تھی اس کے چہرے پر جوانی کی چمک کے بجائے بچپن کی مصویت تھی۔ وہ گوشتی اور بھری تھی اور یہ عارضہ اسے بچپن میں بخار کے بعد لاحق ہوا تھا۔ وہ دیکھی جیٹھی تھی کہ اس نے ارتعاش محسوس کیا جیسے اس پاس دھماکے ہو رہے ہوں۔ پھر دشمن مکان میں گھس آئے وہ سلامتی لے رہے تھے اور چیزیں توڑ پھوڑ رہے تھے۔ اسے خوف آ رہا تھا، وہ جانتی تھی کہ دشمن عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے تھے۔

بالآخر وہ اس کمرے میں آئے اور انہوں نے یہاں بھی سامان الٹا پلٹا۔ ان میں سے کوئی الماری کی طرف نہیں آیا تھا مگر جب وہ واپس جا رہے تھے تو اچانک ایک دشمن رکا اور اس نے الماری کی طرف دیکھا شاید اس نے رومینہ کی موجودگی محسوس کر لی تھی، وہ اچانک الماری کی طرف آیا اور دروازہ کھولتے ہوئے رومینہ کو بالوں سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے پھلتے اور چلانے لگی مگر ان کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی اور دو فوجی اسے بازوؤں سے تھام کر باہر لے آئے۔ یہاں چاروں طرف دشمن پھیلے ہوئے تھے۔ وہ گھروں میں گھس گھس کر لوگوں کو نکال رہے تھے اور ان کو بے دریغ قتل کر رہے تھے خاص طور سے مردوں کو بھڑے بچے کے امتیاز کے بغیر مار رہے تھے۔ وہ بوڑھی عورتوں کو بھی قتل کر رہے تھے۔

لیکن جوان عورتوں اور لڑکیوں کو نہیں مار رہے تھے۔ انہیں پکڑ کر ایک طرف کیا جا رہا تھا۔ رومینہ کو سنائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک قیامت تھی جو اس کے لوگوں پر ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ لوگ اپنی جان

بچانے کے لیے دیوانہ وار بھاگ رہے تھے مگر ان کے لیے کہیں امان نہیں تھی۔ جن عمارتوں سے آنے والی فوج کا مقابلہ کیا جا رہا تھا انہیں ٹینکوں اور توپوں سے نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اچانک رومینہ نے اپنی ماں کو دیکھا وہ اس کی بہن کو اپنی پشت پر کیے اور بچن کی چھری آگے کیے دشمن کے سامنے سینہ پھینکی۔ چار پانچ فوجیوں نے رومینہ کی ماں اور بہن کو گھیر رکھا تھا اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دشمن فوج کا کمانڈران کی طرف متوجہ ہوا۔ کمانڈر تقریباً چالیس سال کا سخت چہرے اور گھٹے جسم والا شخص تھا، قصبے پر حملہ کرنے والی فوج کا کمانڈر وہی تھا اور بذات خود دل عام کی کارروائی میں حصہ لے رہا تھا۔ اس نے رومینہ کی ماں کو دیکھا اور پھر اپنے ایک آدمی کو اشارہ کر کے آگے بلا کر کچھ کہا۔ وہ آدمی آگے بڑھا اور اس نے پستول سیدھا کیا تو رومینہ چلانے لگی۔ وہ بول نہیں سکتی تھی مگر چیخ تو سکتی تھی وہ خود کو اس فوجی سے چھڑانے لگی جس نے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

جو فوجی آگے آیا وہ گول گھٹے سر والا خوب صورت نوجوان تھا مگر اس وقت موت کا روپ دھار رکھا تھا۔ رومینہ کی ماں خوفزدہ ہو گئی اس نے چھری نیچے کر لی مگر جوان نے اپنا ہاتھ نہیں روکا، اس نے عورت پر لگا تارکئی قاتر کیے اور وہ اپنے رنگین ہوتے لبادے کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ رومینہ اور اس کی بہن دھاڑیں مار کر رونے لگی تھیں۔ دشمن فوجی رہے تھے پھر وہ رومینہ اور اس کی بہن کو ایک عمارت میں لے آئے جہاں پہلے ہی پکڑی جانے والی جوان عورتیں اور لڑکیاں موجود تھیں۔ ان پر قیامت ٹوٹنا شروع ہو گئی تھی اور ان کی چیخوں سے مکان لرز رہا تھا مگر ان سنگ دل لوگوں پر ذرا اثر نہیں ہو رہا تھا، وہ اپنی درندگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ رومینہ یہ سب دیکھ رہی تھی اچانک اس کا سر چکرایا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا اسے ہوش اس وقت آیا جب اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ کئی لڑکیاں اور عورتیں تھیں اور ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ سب لٹ پٹ کر بڑے حالوں میں تھیں لیکن رومینہ ٹھیک تھی، اس کا لباس درست تھا اور جسمانی طور پر بھی ٹھیک تھی، اسے بے ہوشی نے بچا لیا تھا۔

پک اپ پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے کئی گھنٹے بعد ایک قصبے میں داخل ہوئی۔ وہاں جرج کی عمارت اور دوسری کچھ چیزوں سے رومینہ نے اندازہ لگایا کہ یہ دشمن کا قصبہ تھا۔ قصبہ ویران لگ رہا تھا، بہت کم چھل پھل تھی۔ جنگ نے اسے بھی متاثر کیا تھا۔ پک اپ قصبے کے آخر

میں رکی، اس کے ساتھ ایک فوجی جیب میں کمانڈر اور اس کے چند ساتھی تھے۔ پک اپ کا شور سن کر مکان کا دروازہ کھلا اور ایک خون منہ آدمی باہر آیا۔ اس نے لڑکیوں کا معائنہ کیا اور پھر درشت لہجے میں نیچے اترنے کو کہا۔ لڑکیاں سہم کر نیچے اتر آئی تھیں۔ کمانڈر نے اس سے کچھ بات کی کیونکہ اسے جلدی تھی اس لیے وہ لڑکیوں کو اس خون منہ آدمی کے حوالے کر کے وہاں سے چلا گیا۔ لڑکیاں ایک ہی رسی سے بندھی تھیں اس لیے ان میں سے کوئی فرار بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

رومینہ نے نظر اٹھا کر دیکھا یہ اس کے مکان جیسا تھا، دو منزلہ اور سب سے اوپر کونوی چھت میں دو چھتی تھی۔ وہ جانتی تھی اس مکان میں اندر خالی جگہ رکھی جاتی ہے تاکہ بند کمروں میں بھی ہوا کی آمد و رفت برقرار رہے۔ خون منہ آدمی انہیں ہانک کر اس دو منزلہ مکان کے اندر لے آیا۔ مکان اندر سے گند اور بدبودار تھا لیکن یہ بہت مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور باہر آنے جانے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا جس پر بہت مضبوط لاک لگا ہوا تھا۔ خون منہ آدمی انہیں دھکیلتا ہوا گراؤنڈ فلور کے ایک بڑے کمرے تک لایا۔ یہاں قدیم وکٹورین انداز کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ وہاں موجود میز کے پیچھے چرمی کرسی پر ایک سیاہ بالوں والا شخص موجود تھا۔ اس کے نقوش بتا رہے تھے کہ اس کا تعلق سرب نسل سے ہے۔ وہ سرد اور کاٹ دار نظروں سے لڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں خون منہ آدمی سے کچھ پوچھا۔ اس نے اسی زبان میں جواب دیا تو سیاہ بالوں والے کے تاثرات بگڑ گئے۔ وہ اٹھ کر سامنے آیا اور خون منہ کو حکم دیا۔ اس نے چاقو نکالا تو لڑکیاں بے اختیار کراہنے اور لرزنے لگیں مگر اس نے صرف ان کے ہاتھوں کی رسیاں کاٹنے پر اکتفا کیا تھا۔

سیاہ بالوں والا کسی قسائی کی طرح ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ خراشوں اور زخموں سے خون بہہ کر کپڑوں اور جسموں پر جم گیا تھا۔ اسی لیے اسے رومینہ کے صاف سحرے ہونے پر کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔ وہ تقریباً ساری خوب صورت اور نوجوان لڑکیاں تھیں البتہ ایک لڑکی کی قدر بڑی اور شکل صورت کی خاص نہیں تھی۔ سیاہ بالوں والے نے اس کی طرف اشارہ کیا تو خون منہ آدمی نے اسے آگے دھکیل دیا۔ وہ رونے لگی تھی، سیاہ بالوں والے نے اسے گھما کر اس کا رخ لڑکیوں کی طرف کیا اور پھر وہ بہت نرمی سے اس کے الجھے بال سنوارنے لگا اس نے انہیں جمع کر کے گردن سے ہٹایا اور اچانک ہی ایک چھوٹا چاقو اس کی گردن میں اتارا تو تمام

لڑکیاں چیخ اٹھیں البتہ لڑکی کی چیخ نہیں نکلی تھی وہ ہاتھ سے خون کا فوارہ روکنے کی کوشش کرتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گئی اور پھر اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گئی۔ سیاہ بالوں والے نے سرد نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا اور ان کی زبان میں بولا۔

”میرا نام وکٹر ایمائل ہے اور تم یہاں میرے حکم کی تعمیل کرنے آئی ہو۔ جس نے حکم نہیں مانا اس کے ساتھ ایسا ہوگا۔ لے جاؤ انہیں۔“ اس نے آخری جملہ خون منہ شخص سے کہا۔ ”ان سب کو ان کے کمروں میں پہنچا دو۔“

خون منہ کا نام گارسیا تیر وکٹر تھا، لڑکیوں کو دھکیلتے ہوئے وہاں سے لے جانے لگا لیکن رومینہ ساکت کھڑی رہی، وہ وکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ گارسیا نے اسے بھی بازو سے پکڑنا چاہا تو وکٹر نے اسے روک دیا۔ ”نہیں اسے رہنے دو۔ یہ میرے پاس رہے گی۔“

گارسیا نے شانے اچکائے اور بقیہ لڑکیوں کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ وکٹر رومینہ کے پاس آیا، اس نے غور سے اس کا معائنہ کیا اور پھر اس کی زبان میں بولا۔ ”تمہیں کسی نے چھوا نہیں؟“

رومینہ لب ریڈنگ کر سکتی تھی اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وکٹر کا منہ بگڑ گیا اس نے غرا کر کہا۔ ”زبان سے جواب دو۔“

تب رومینہ نے اشارے سے بتایا کہ وہ بول اور سن نہیں سکتی۔ وکٹر خلاف توقع خوش ہو گیا۔ ”یہ تو اچھی بات ہے تم میرے بہت کام آؤ گی اور کسی کو اس بارے میں نہیں بتا سکو گی۔“

رومینہ اسے دیکھ رہی تھی اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اس سے کیا کام لینا چاہتا تھا اور وہ کسی کو اس بارے میں بتا بھی دیتی تو اسے کیا فرق پڑتا۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ درندوں کی ہستی میں آگئی ہے۔ بلقان کا یہ خطہ صدیوں سے ان کا مسکن تھا۔ انہوں نے یہاں بہت سے دور دیکھے تھے اور ترکوں کے بعد انہیں بہت مشکلات سے گزرنا پڑا تھا۔ رومینہ کو مقامی سیاست کا بہت کم علم تھا۔ اس کی ساری دنیا اپنے گھر تک محدود تھی۔ اس کا باپ کاشت کار تھا اور ان کے پاس کئی مویشی بھی تھے۔ وہ بہت دولت مند نہیں تھے لیکن ان کی گزراوقات اچھی ہوتی تھی۔ پھر جنگ شروع ہو گئی۔ رومینہ کو اتنا معلوم ہوا کہ کوسوو کے مسلمان اپنا الگ ملک چاہتے ہیں اس پر صدیوں سے ان کے ساتھ رہنے والے پڑوسی درندوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے

تھے۔ مجبوراً ان لوگوں کو بھی ہتھیار اٹھانے پڑے تھے۔ روینہ اور اس کی بہن موینہ کا باپ ازگر لڑنے چلا گیا۔ اب اس کی ماں ماری گئی تھی، موینہ کا کچھ پتا نہیں تھا اور وہ خود اس خوفناک مکان میں تھی جہاں اس کے ساتھ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

وکر اسے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ڈرومت مجھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“ وکر نے اسے اوپری منزل پر سب سے آخر والا کمرہ دیا تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر شیشوں کی جگہ لکڑی کے تختے بڑے تھے اور ان میں کہیں کہیں سوراخوں سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ وہاں لوہے کا ایک پتنگ تھا جس پر اسپرنگ والا گدا اور ایک گھبل تھا۔ فرش لکڑی کا تھا مگر صاف تھا جب کہ باقی گھر کا فرش بہت میلّا تھا۔ وکر نے اسے بستر کی طرف دھکیلا اور اس بار بدلے لہجے میں بولا۔ ”تم یہاں رہو گی اور بلا ضرورت باہر نہیں نکلو گی ورنہ تمہیں بھی ان لڑکیوں میں شامل کر دیا جائے گا۔“

روینہ لرزنے لگی تھی وکر کے جانے کے بعد وہ سکوڑ سٹ کر بیڈ پر لیٹ گئی اور کھیل اپنے اوپر کر لیا وہ ماں کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ اسے رو رہ کر اس سخت چہرے والے کمانڈر کا خیال آ رہا تھا جس نے گول چہرے والے کو اس کی ماں کو شوٹ کرنے کا آرڈر دیا تھا۔ موینہ ان لڑکیوں میں شامل تھی جنہیں گاؤں والے مکان میں لے جایا گیا تھا لیکن وہ ان لڑکیوں میں شامل نہیں تھی جو اس کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ پھر اسے اپنا باپ یاد آیا۔ وہ نہ جانے کہاں تھا اور اسے معلوم بھی تھا یا نہیں کہ اس کے خاندان اور گاؤں والوں پر کیا گزری تھی۔ روینہ کو نہیں معلوم تھا کہ کتنے لوگ بچ کر نکلے تھے میں کا مایاب رہے تھے اور کتنے مارے گئے تھے۔ وہ روتی رہی اور گھر والوں کو یاد کرتی رہی۔ اچانک دروازہ کھلا اور گارسا نے اندر جھانکا اور اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وکر نے اسے بھی بتا دیا تھا کہ وہ گونگی بھری ہے اس لیے اب وہ اشاروں میں بات کر رہا تھا۔ روینہ اٹھ کر باہر آئی۔ گارسا اسے ایک کمرے میں لے آیا، وہاں وکر ایک لڑکی کے پاس بیٹھا تھا وہ بستر پر دراز تھی اور کسی بھیڑی طرح سہمی ہوئی تھی۔ وکر کے ہاتھ میں ایک لکڑی کا پکاس تھا۔ اس نے روینہ کو پاس بلایا اور گھٹنوں کے بل لڑکی کے پاس بیٹھنے کو کہا۔ روینہ نے حکم کی تعمیل کی تو وکر نے اسے جیس جیس دیکھا، روینہ نے اسے کھولا تو اس میں ترتیب اور سلیقے سے ایک ایک خانے میں سرنجیں، سفید پاؤڈر والی چھٹی، ایک چھوٹا

لیکن گہرا دھاتی چمچ ڈسٹل واٹر کی شیشی، ایک چڑے کی بڑی اور ایک لائٹر رکھا تھا۔ وکر نے اس کا سراپنی طرف گھمایا اور بولا۔

”میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔“

روینہ نے مجبوراً سر ہلایا وہ ڈر رہی تھی۔ اس نے وکر کی ہدایت کے مطابق چڑے کا ٹکڑا کس کر لڑکی کے بازو پر باندھا پھر اس نے چمچ میں چھٹی سے تھوڑا سا سفید پاؤڈر نکالا اور اس میں کچھ ڈسٹل واٹر ڈال کر اسے لائٹر سے گرم کیا حتیٰ کہ پاؤڈر پانی میں حل ہو گیا۔ پھر اس نے اسے سرنج میں بھرا اور سرنج کی سوئی لڑکی کی ابھر آنے والی نرس میں داخل کر کے محلول انجیکٹ کر دیا۔ فوراً ہی لڑکی کی آنکھیں دھندلانے لگیں اور وہ منہ کھول کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ وکر اس کے کام سے خوش نظر آ رہا تھا کیونکہ اس نے جیسا جیسا کہا روینہ نے ویسا ہی کیا تھا۔ پھر وہ اسے دوسری لڑکی کے کمرے میں لایا اور یہاں بھی یہی مشق دہرائی گئی۔ یکے بعد دیگرے روینہ تمام کمروں میں گئی اور لڑکیوں کو ہیر وئن کا انجیکشن لگایا۔ کمروں میں آتے جاتے اس نے دیکھا کہ راہدار یوں اور سیزجیوں پر کئی لوگ موجود تھے وہ آپس میں گپ شپ کر رہے تھے اور شراب پی رہے تھے آخر میں وکر اسے سیزجیوں کے نیچے کچن میں لایا اور ایک کینٹن کھول کر لکڑی کا بکس اس میں رکھ دیا۔ پھر اس نے روینہ سے کہا۔

”اب تمہاری ذمہ داری ہے تم سے جب کہا جائے گا تم ان لڑکیوں کو اسی طرح انجیکشن دو گی۔ یہ ان کے لیے اچھا ہوگا کیونکہ اس طرح انہیں ملنے والی اذیت کی تکلیف کم محسوس ہوگی۔ میری بات سمجھ رہی ہوتی؟“

روینہ نے سر ہلایا تو وکر نے دوبارہ کہا۔ ”اس کے علاوہ تم صفائی کرو گی اور سب کے لیے کھانا بناؤ گی۔“ اس بار بھی روینہ نے سر ہلایا تو وکر نے اسے اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اوپر سیزجیوں کی طرف آئی تو اس نے راہدار یوں میں موجود افراد کو بھوکے کتوں کی طرح کمروں کی طرف جھپٹے دیکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آئی، اسے معلوم تھا کہ لڑکیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا۔ وہ سن نہیں سکتی تھی مگر اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ یہاں بھی وہی کھیل کھیلا جا رہا تھا جو اس کے گاؤں میں کھیلا گیا تھا اور جسے دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ بستر میں گھس کر لیٹ گئی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آنے والے چند دنوں میں اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ کب اسے کیا کرنا ہے؟ وہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے بالٹی میں پانی اور صفائی کا

سامان لے کر لڑکیوں کے کمرے میں جاتی اور ان کے دھون کی دوا ملے پانی سے صفائی کرتی تھی۔ پھر کچن میں آ کر ان کے لیے کھانا بناتی اور انہیں ان کے کمروں میں کھانا پہنچاتی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اس دو منزلہ مکان کی صفائی کرتی۔ یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ مکان بہت بڑا تھا۔ یہاں لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ یہ سب گندے ذہن اور گندے جسموں والے لوگ تھے۔

دوپہر کے بعد لوگوں کی آمد شروع ہو جاتی اور اس کا اصل کام شروع ہوتا تھا۔ کٹر آنے والوں سے بھاری رقم وصول کرتا تھا اور پھر اس کے اشارے پر روینہ تمام لڑکیوں کو ہیر وئن کے انجیکشن دیتی تھی۔ یہ مکان اصل میں ایک تجربہ خانہ تھا اور یہاں مجبور لڑکیوں پر ہوس کے مارے لوگ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ مکان عام گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھا اور یہاں ہونے والی سرگرمیوں کی خبر شاید دوسرے لوگوں کو نہیں تھی۔ ممکن ہے ہوتی تب بھی کوئی اعتراض نہ کرتا کیونکہ جن لڑکیوں کے ساتھ یہاں ظلم ہوتا تھا وہ سب دشمن قوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہاں آنے والے زیادہ تر لوگ آس پاس کے رہنے والے تھے۔ ان میں فوجی بھی ہوتے تھے۔ روینہ نے دیکھا کہ لڑکیوں والے کمروں کے تمام ہی بستر خون کے پرانے دھبوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان پر چادریں بدل دی جاتی تھیں اور جب وہ ایک حد سے زیادہ نکلی ہو جاتیں تو ان کی جگہ دوسری چادر ڈال دی جاتی اور اتاری جانے والی چادریں مکان کی بھیڑ میں ڈال کر جلا دی جاتی تھیں۔

پھر ایک صبح روینہ معمول کے مطابق لڑکیوں کی صفائی کرنے کا سامان لے کر ایک لڑکی کے کمرے میں پہنچی تو وہ ساکت لیٹی رہی۔ روینہ کے ہلانے پر بھی اس نے حرکت نہیں کی تو وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی اور پھر اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی لڑکی کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اس نے شیشے کا گلاس چبایا تھا اور شیشے نے اس کا منہ کاٹ دیا تھا۔ اس کی چیخ سن کر گارسا اندر آیا اور اس نے مردہ لڑکی کو دیکھ کر زیر لب کچھ کہا اور پھر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بڑی چادر لے کر آیا اور اسے بچھا کر لڑکی کی لاش اس پر گرا دی اور پھر اسے چادر میں لپیٹ کر کھینچتا ہوا وہاں سے لے گیا۔ روینہ نے دیکھا کہ وہ اسے سیزجیوں سے نیچے لے جا رہا تھا۔ اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا اس نے چونک کر دیکھا وہ وکر تھا جو اسے خشکیں نظروں سے گھور رہا تھا، اس نے کہا۔

”جا کر اپنا کام کرو۔“

روینہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ دو گھنٹے بعد وہ فارغ ہو کر کمرے میں آئی اور بستر پر بیٹھ کر کھڑکی کے تختوں سے باہر دیکھنے لگی۔ مکان کے سامنے دور تک جنگل تھا۔ قصبہ بائیں طرف تھا۔ اچانک اس کی نظر سامنے دیوار میں لگی جالی پر گئی۔ یہ ایگزاسٹ کی جالی تھی جو مکان کے اندرونی خلا میں کھلتی تھی روینہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اٹھ کر جالی کو پاس سے دیکھا یہ دو موٹے اسکرور سے جڑی تھی اور ان اسکرورز کو انگلیوں سے بھی کھولا جاسکتا تھا۔ اس نے کوشش کی اور اسکرور کھول لیے پھر اس نے خلا میں جھانکا۔ یہ مکان کے بیچ میں تھا یہاں مکان کے ستون اور بنیم تھے، لکڑیاں ایسی تھیں جو آڑی تر تھیں ہو کر مکان کے اسٹرکچر کو مضبوط کر رہی تھیں ان کے درمیان کہیں کہیں خلا تھے۔ روینہ نے سوچا اور پھر دروازے کا لاک اندر سے لگا کر وہ خانے تک آئی اس کا جسم ہلکا اور چھریرا تھا اس لیے وہ آسانی سے اندر داخل ہو گئی۔ پتلا سارا ستہ چارہا تھا وہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ شاید اسے خیال تھا کہ ممکن ہے یہ راستہ اسے مکان سے نکلنے میں مدد دے۔ وہ آنے والے راستوں پر مڑتی رہی اور جہاں ایگزاسٹ کی جالی تھی وہاں سے باہر دیکھتی رہی کہ وہ کس جگہ تھی۔

ایک گھنٹے کی کوشش کے باوجود اسے مکان سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آئی تھی مگر وہ مایوس نہیں ہوئی کیونکہ اس نے ابھی پوری طرح خلا نہیں دیکھا تھا جو مکان کے اوپری حصے تک جا رہا تھا۔ اس کے بعد جب اسے موقع ملا وہ اپنے کمرے کے ایگزاسٹ کے راستے خلا میں داخل ہو جاتی تھی۔ یہاں سے وہ ہر کمرے تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ اس نے یہ کیا کہ تمام خانوں کی جالیوں کے اسکرورز رفتہ رفتہ کھول کر بند کر دیے اور یوں وہ رواں ہو گئے اب وہ جب چاہتی کسی بھی جالی کے اسکرورز اندر سے بھی کھول سکتی تھی، اس کی پتلی لمبی انگلیاں اس کام میں بہت مددگار ثابت ہوتی تھیں۔ وہ اندر سے دو انگلیاں باہر نکال کر اسکرورز کھول لیتی۔ ان ایگزاسٹ سے وہ ہر جگہ جاسکتی تھی لیکن وہ کوشش کے باوجود مکان سے باہر جانے کا راستہ تلاش نہیں کر سکتی تھی شاید راستہ نہیں تھا یا شاید پھر اسے ملا نہیں تھا۔ کیونکہ جتنا بڑا یہ مکان تھا اتنا ہی بڑا اس کا ایگزاسٹ والا خلا تھا اس میں نیچے خانے کی بھیڑ سے آنے والے دھوپ کے اخراج کے پائپ بھی گزر رہے تھے۔ اس میں پانی کی لائنیں بھی تھیں۔ کئی ایسی جگہیں تھیں جہاں سے وہ بھی نہیں گزر سکتی تھی وہاں خلا تاریک تھا اور اسے تاریکی میں جاتے ہوئے ڈر لگتا

تھا، اس کے پاس روشنی کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔

خلا میں جا رہے جاگزی کے جالے گئے ہوئے تھے، مٹی اور گرد کی تھیں جی نہیں۔ جب وہ اندر جاتی تو سر سے پاؤں تک مٹی میں اٹ جاتی تھی پھر اسے خود کو دوش روم جا کر صاف کرنا پڑتا تھا ویسے اس نے اسکرٹ کے ساتھ لمبی اونٹنی فراک پہن رکھی تھی یہ مٹی پکڑتی نہیں تھی اور جھاڑنے پر آسانی سے صاف ہو جاتی تھی اس کی ٹانگوں پر ٹانگوں کے لیے موزے تھے یہ بھی گندے نہیں ہوتے تھے صرف اس کا اسکرٹ میلا ہوتا تھا تو وہ اسے صاف کر لیتی تھی پھر اس نے یہ حل نکالا کہ خانے کی رفتہ رفتہ صفائی شروع کر دی۔ وہ ایک میلا کپڑا لے کر جاتی اور اس سے اپنا راستہ صاف کرتی اور پھر مویج پا کر پڑا دھو لیتی تھی۔ شروع میں اسے چوٹیں بھی لگی تھیں کیونکہ خلا خطرناک موڑوں، لکڑیوں اور کیلوں سے بھرا پڑا تھا لیکن پھر وہ ان تمام مقامات سے اچھی طرح واقف ہو گئی اور اب وہ رات میں اس خلا میں سفر کر سکتی تھی لیکن وہ عام طور سے بہت صبح یا شام کے وقت ہی ایسا کرتی تھی۔ جب وہاں اوباشوں کا کوئی گروپ آتا اور وہ لڑکیوں کو نشے کا انجکشن دے کر آتی تو اس کے بعد دو سے تین گھنٹے اسے کوئی ٹنگ نہیں کرتا تھا۔ وہ اسی دوران میں خلا کی سیر کرتی، مختلف کمروں میں جھانکتی جہاں موجود لڑکیاں آنے والے مردوں کی ہوس کا نشانہ بن رہی ہوتی تھیں۔

وہ دیکھتی اور کانپ جاتی، اسے خیال آتا کہ جلد یا بدیر اسے بھی ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑے گا۔ کبھی بھی اسے حیرت ہوتی کہ وہ اب تک بچی ہوئی کیسے ہے۔ حد یہ کہ وکٹر نے بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ اس سے کام لیتا تھا اور اس کا خیال رکھتا تھا لیکن اس نے بھی اسے اپنے کمرے میں نہیں بلایا۔ اس کے بجائے وہ کبھی موڈ میں ہوتا تو اسے مائی لائل لٹل انگل کہہ کر پکارتا۔ شاید اس کے گلے میں موجود اس لاکٹ کی وجہ سے جس پر فرشتے کی شبیہ تھی۔ یہ لاکٹ اسے اس کی ماں نے دیا تھا۔ جب وہ چند مہینے پہلے سولہ سال کی ہوئی تھی اس کی ماں نے اسے بتایا کہ اب وہ جوان ہے اور جب وہ اس کی شادی کر دیں گے تو وہ خود کئی بچوں کی ماں بنے گی، اس کا اپنا گھر اور اپنا خاندان ہوگا۔ لیکن اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا اس کا خاندان بکھر گیا تھا اور خود وہ ایک قحبہ خانے میں قید تھی۔

وکٹر دونوں ہاتھوں سے کما رہا تھا۔ ہوس کار وہ پھر سے پہلے ہی اس کے مکان کے پاس حج ہونا شروع ہو جاتے تھے لیکن اندر آنے کی اجازت بس ان کو ملتی تھی جن کے

پاس ادا کرنے کے لیے رقم ہوتی تھی اور یہ زیادہ تر اوباش ہوتے تھے جو اس پاس مسلمانوں کے گاؤں دیہات سے لوٹ مار کر کے آتے اور اس رقم سے عیاشی کرتے تھے۔ وکٹر نے کچھ اصول و قواعد بنائے ہوئے تھے۔ دھندادو پھر تین بجے شروع ہوتا تھا۔ ہر آدمی کو ایک گھنٹا ملتا تھا اور پھر لڑکی کو دیکھنے آرام کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس دوران میں روئینہ لڑکیوں کی صفائی کرتی۔ ہر بار وہ ان جسموں پر نئے زخم پاتی تھی۔ وہ روٹی دھوتی تھیں، اس کے سامنے گڑ گڑاتیں کہ وہ انہیں یہاں سے نکال دے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ روئینہ خود بھی یہاں قیدی تھی۔ جو یہاں سے نکلنے کی التجا نہیں کرتی تھیں ان کی خواہش ہوتی تھی کہ روئینہ انہیں ہیر و من کا انجکشن نہ دے۔ وہ جانتی تھیں کہ مسلسل نشہ اور ہوس کاروں کا ساتھ انہیں موت کی طرف لے جا رہا تھا۔ روئینہ یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دوسرا دور چھ بجے ہوتا اور تیسرا اور آخری دور نو بجے ہوتا تھا اس کے بعد لڑکیوں کو کھانے کے ساتھ دوا بھی دی جاتی تھیں تاکہ وہ آنے والے دن کے لیے تیار ہوں۔ انہیں خوراک اچھی دی جاتی تھی اس کے باوجود لڑکیاں مسلسل کمزور اور نیم جان ہو رہی تھیں۔ ایک مہینے میں تین لڑکیاں مر چکی تھیں اور ان کی لاشیں تو منہ شخص اسی طرح چادروں میں لپیٹ کر کہیں لے جا چکا تھا۔ روئینہ کو علم نہیں تھا کہ ان لاشوں کے ساتھ کیا کیا جاتا تھا۔ دوسرے مہینے کے اختتام تک مزید دو لڑکیاں زندگی ہار گئی تھیں اور اب وہاں پانچ لڑکیاں تھیں اس کے بعد وہاں مزید لڑکیاں نہیں لائی گئی تھیں۔ یہ پانچ بھی بڑے حالوں میں تھیں اور اب وکٹر بیٹے میں دو دن انہیں مکمل آرام کا موقع دیتا تھا مگر روئینہ کو لگ رہا تھا کہ جلد یہ پانچوں بھی مرجائیں گی اور اس کے بعد شاید اس کی باری آئے گی۔ جب اسے یہ خیال آتا تو وہ کانپ جاتی تھی۔

کئی بار ایسا ہوا وہاں آنے والے عیاشوں نے وکٹر کو روئینہ کے عوض بہت بڑی رقم کی پیشکش بھی کی لیکن اس نے ہر بار یہ پیشکش ٹھکرا دی، کوئی زیادہ ہی سر ہوتا تو وکٹر کا جواب ہوتا کہ وہ اس کی محبوبہ ہے اس لیے وہ مجبور ہے۔ وکٹر کے دفتر میں جہاں روئینہ اور لڑکیوں کو بیک باریش کیا گیا تھا ایک چھوٹی سی لیکن بہت مضبوط ججوری تھی یہ نمبروں سے کھلتی تھی اور روئینہ نے اس کا نمبر بھی معلوم کر لیا تھا کیونکہ کئی بار جب وہ ایگزاسٹ کے خانے سے وکٹر کے دفتر میں جھانک رہی ہوتی تھی تو اس نے ججوری کھولی تھی اور یہ رقم سے بھری ہوتی تھی۔ ہر دن اس رقم میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ روئینہ چاہتی تو

اس کی ججوری کھول سکتی تھی مگر اس نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ اس رقم کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس مکان میں وکٹر اور گارسیا کے سوا کوئی نہیں رہتا تھا، باہر کے سارے کام گارسیا کرتا تھا۔ وہ سامان لاتا اور جب باہر جاتا تو لڑکیوں کے کمرے باہر سے لاک کر جاتا تھا۔ وہ لڑکیوں پر کوئی نظر رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ روئینہ کو کسی قدر چھوٹ تھی اس کے باوجود وہ اس پر بھی نظر رکھتا تھا۔

مکان کے عقبی حصے میں بھی ایک دروازہ ہوتا تھا لیکن اب اسے تختے لگا کر مستقل بند کر دیا گیا تھا۔ بچے کی ساری کھڑکیوں پر لوہے کی گرلز تھیں اور اوپری کھڑکیوں پر لکڑی کے تختے بھی لگے تھے۔ یعنی فرار سے روکنے کا پورا انتظام تھا۔ حالانکہ وہاں کسی لڑکی میں فرار کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اس طرف آنے ہوئے روئینہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ دشمن کے علاقے میں بہت اندر تک آ گئے تھے، کیونکہ سڑکوں پر ان کی زبان کے بورڈ تھے اور چادروں طرف ان کی صورتوں کے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ پھر مختلف علاقوں میں جنگ چھڑی تھی اور اس دوران میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ شاید محاذ جنگ یہاں سے بہت دور بھی نہیں تھا کیونکہ کبھی کبھی رات کی تاریکی میں روئینہ کو دور سے ہونے والے دھماکوں کی چمک دکھائی دیتی تھی۔

اب جو پانچ لڑکیاں بچی تھیں انہوں نے خود کو تقدیر کے سپرد کر دیا تھا۔ مزاحمت تو ان میں سے پہلے ہی کسی نے نہیں کی تھی لیکن وہ پر امید تھیں کہ شاید ان کی فوج اس علاقے تک آ جائے اور وہ آزاد ہو سکیں لیکن اب ان کی امید اپنی چھ ساتھیوں کی طرح دم توڑ گئی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ اس قید خانے سے موت ہی آ کر انہیں آزاد کر سکتی تھی۔ ان میں ایک لڑکی جس کا نام ساشا تھا وہی روئینہ سے بات بھی کر لیتی تھی، اسے پتا چل گیا تھا کہ روئینہ کوگی بھری ہے اس لیے ایک دن اس نے اچانک اشاروں کی زبان استعمال کی تو روئینہ حیران اور خوش ہو گئی تھی۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”تم اشاروں کی زبان جانتی ہو؟“

ساشا ہلکے انداز میں مسکرائی۔ ”میری ماں کوگی تھی میں نے اس کے لیے یہ زبان سیکھی تھی۔ میرا تعلق تیرا سا ہے۔“

”میرا زور سکو ہے۔“ روئینہ نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ کیونکہ وہ اشاروں میں بات کر رہی تھیں اس لیے کسی کے سن لینے کا خطرہ نہیں تھا۔ جو آخری شخص ساشا کے پاس سے گیا تھا اس نے درندگی کی حد کر دی تھی۔ ساشا کا

چہرہ اور ہونٹ خون آلود اور سوچے ہوئے تھے، اس کی کلاٹیاں اور رانیں زخموں سے بھر پئی جا رہی تھیں اور نیچے بیڈ شیٹ خون کے دھبوں سے بھر چکی تھی۔ روئینہ یہ سب دیکھ کر دھمی ہو رہی تھی۔ اسے روتے دیکھ کر ساشا نے پیار سے اس کا چہرہ سہلایا اور اشاروں سے کہا۔ ”یہ ہمیں مسلمان اور دوسری نسل کا ہونے کی سزا دی جا رہی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے چہرہ گمراہ لے مار دیے گئے۔ میرے چار بھائی، میری ماں اور باپ کو ان درندوں نے مار دیا، میں لڑکی تھی اس لیے مجھے بے آبرو کرنے کے لیے یہاں لے آئے۔ مجھے معلوم ہے میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گی۔ جلد موت مجھے میرے ماں باپ اور بھائیوں کے پاس لے جائے گی۔“

روئینہ کو ساشا سے انسیت محسوس ہو رہی تھی بعد میں اس نے سوچا تو اسے خیال آیا کہ ساشا کی صورت اس کی بہن موئینہ سے بہت ملتی تھی۔ موئینہ کا خیال آتے ہی اس کے اندر ہوک سی اٹھتی تھی، نہ جانے اس کی بہن کہاں اور کس حال میں ہوگی زندہ بھی ہوگی یا اسے بھی ان چھ لڑکیوں کی طرح زیادتی کا نشانہ بنا کر مار دیا گیا ہوگا۔ جن دونوں میں لڑکیوں کو آرام دیا جاتا تھا اس دوران میں انہیں تھانے دھونے اور خود کو صاف کرنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ لباس ان کے پاس وہی تھے۔ روئینہ انہیں دھو کر بھیجی کے پاس لٹکا کر سکھا دیتی تھی جب تک لڑکیاں گرم پانی سے اپنے زخموں اور دکتے بدن کی سٹائی کرتی تھیں۔ پانی کا ٹب تہ خانے میں تھا۔ یہاں روئینہ کو موقع ملتا تھا کہ وہ ساشا سے ذرا مکمل کر بات کر سکے۔ ورنہ اوپر وہ صرف کام کے موقع پر یا صفائی کرتے اور کھانا دیتے ہوئے اس کے پاس جا سکتی تھی اور یوں اسے زیادہ وقت نہیں ملتا تھا۔

سردیوں کے آغاز کے ساتھ ہی ان کی کم بختی آگئی تھی کیونکہ مکان کو گرم رکھنے کا نظام زیادہ بہتر نہیں تھا اور اوپر والی منزل تو بہت سرد ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے کنبلوں میں بھی ٹھنڈی تھیں لیکن کس سے فریاد کرتیں، وکٹر کے نزدیک وہ دشمن قوم کی اور کمانے والی مشینیں تھیں۔ اگر ایک مشین ناکارہ ہو جائے تو اس کی جگہ دوسری مشین آ جاتی ہے۔ روئینہ کا کمر اکھلا ہوا تھا اور کھڑکی سے بہت سرد ہوا اندر آتی تھی، اس نے اس پر کاغذ اور گتے لگا کر بند تو کیا تھا مگر پھر بھی جھریاں ہوا کرتی تھیں جب اسے زیادہ سردی لگتی تو وہ ایگزاسٹ والے خانے میں کس کر بھیجی والے پائپ کے پاس بیٹھ جاتی۔ اس سے گرم ہوا گزرتی تھی اور روئینہ

اس سے گری حاصل کرتی تھی۔ پھر جب اسے سکون ہوتا تو واپس کمرے میں آکر سو جاتی تھی۔

دودن کی چھٹی کے بعد جب میرا تو کڑ بہت خوش تھا کیونکہ فوجیوں کا ایک دستہ جو چھٹی گزارنے گھر جا رہا تھا وہ راستے میں کچھ وقت یہاں رکھا، ان کے پاس تنخواہ اور لوٹ کا مال تھا، اس لیے وکٹر کو امید تھی کہ آج بہت اچھا کاروبار ہو گا۔ اس نے لڑکیوں کو بیچ سے تیار ہونے کا حکم دیدیا تھا۔ بیڈز پر بنی چادریں بچھائی گئی تھیں اور روینہ سے کمرے بھی صاف کرائے گئے تھے۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ روینہ نے دیکھا تھا وہاں آنے والوں کو اس گندگی کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی تھی، انہیں اجڑی اور نوچی کھسوٹی لڑکیوں کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی وہ تو بس اپنی حیوانیت کی تسکین کرنے آتے تھے۔ وکٹر نے اسے نیا سامان مہیا کیا تھا کیونکہ پرانا سامان ختم ہو گیا تھا۔ سر نہیں بنا کارہ ہو گئی تھیں اور ہیر وین پاؤڈر ختم تھا۔ اسے ہر بار پانچوں لڑکیوں کو ڈوز دینا ہوتی تھی۔ دوپہر سے پہلے ہی بھوکے پیٹ پر وہاں آگئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ قسم قسم کی شرابیں لائے تھے اور راہداریوں میں کھڑے آپس میں بے ہودہ مذاق کر رہے تھے۔ ان میں سے اکثر نے اپنی گندی وردیاں ہی پہن رکھی تھیں۔ ان کی تعداد زیادہ تھی اس لیے وکٹر نے اپنا دو گھنٹہ وقفہ والا اصول ختم کر دیا۔ یہ دن ان لڑکیوں کے لیے قیامت بن کر گزارا تھا۔ مگر شام تک وکٹر کی تجوری میں خاصی بڑی رقم کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جب ان وردیوں کے جانے کے بعد روینہ لڑکیوں کے کمرے میں گئی تو ان کی حالت دیکھ کر اس کی روح تک لرز گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آنے والے سچ بچ بھڑپے تھے، انہوں نے سب کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ تین لڑکیوں کو تو ہوش بھی نہیں تھا اور ان میں سے ایک ایک انگ انگ کر سانس لے رہی تھی، وہ تو بس آج رات کی مہمان ہی لگ رہی تھی۔ ساشا ہوش میں تھی لیکن حالت اس کی بھی خراب تھی جب روینہ اس کے زخم صاف کر رہی تھی تو اس نے روینہ کی کلائی پکڑ لی اور سرگوشی میں بولی۔

”میں مرجانا چاہتی ہوں پلیز میری مدد کرو۔۔۔ مجھے کوئی چیز لا دو۔“

چن کی چھریاں روینہ کے اختیار میں تھیں لیکن اگر وہ ان میں سے کوئی چھری ساشا کو لا دیتی تو بعد میں خود اس کا کیا ہوتا، وہ صرف سوچ سکتی تھی۔ وکٹر کا رویہ اس کے ساتھ کتنا ہی اچھا سکی وہ اس کی سفاکی سے روز اول سے واقف تھی، جب اس نے صرف ان کو ڈرانے کے لیے ایک لڑکی کی شر

رگ کاٹ دی تھی۔ وہ غصہ وراور سخت آدمی تھا جب وہ روینہ سے غصے میں بات کرتا تو وہ ڈر جاتی تھی۔ اس نے نفی میں ہلایا اور اشارے سے بولی۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتی ورنہ وہ مجھے ماروے گا وہ بہت سفاک آدمی ہے۔“

”جب مجھے انجکشن مت دو، میں اذیت برداشت کر کے مرجانا چاہتی ہوں۔“

روینہ جانتی تھی یہ بھی ممکن نہیں تھا، وہ ساشا کو انجکشن نہ دیتی اور وکٹر کو پتا چل جاتا تب بھی اس کی خیر نہیں تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اسے ساشا کے زخم صاف کرتی رہی۔ وہ اسے الٹا آئینہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”پلیز۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

اچانک روینہ نے اسے اسٹینچ اور بالٹی ایک طرف رکھ دی اور ساشا کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ روینہ تھی اس کے آنسو اس کی بے بسی کا اقرار کر رہے تھے۔ ساشا اپنی تکلیف بھول کر بے قرار ہو گئی، وہ اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔ ”مت رو۔۔۔ ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے کچھ مت لاؤ۔۔۔ تم مجھے انجکشن دے دینا لیکن رومٹ۔“

روینہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنے گے سے فرشتے کی شبیہ والا لاکٹ اتارا اور اسے ساشا کے گے میں پھنسا دیا اور اشارے سے بتایا کہ یہ اس کی ماں ہے اسے تحفظ کے لیے پھنسا دیا تھا آج وہ ماں کی اس نشانی کو اس کے سپرد کر رہی ہے۔ وہ اس کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ساشا لاکٹ اور زنجیر میں لے کر سسک سسک کر رونے لگی۔ روینہ اسے پیار کرنے اور چہ کرانے لگی۔ اچانک دروازہ کھلا اور گارسیا نے اندر جھانکنا اس نے غرا کر کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے، اپنا کام کر کے باہر آؤ وقت نہیں ہے ابھی۔“

روینہ جلدی سے بالٹی اور سامان اٹھا کر باہر آ گئی ساشا نے لاکٹ اپنی گھٹائی میں چھپا لیا تھا۔ اس رات وکٹر نے غیر متوقع طور پر روینہ کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ پی رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس نے روینہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میرا ۶ گھنٹہ تم میرے لیے خوش قسمتی لے کر آئی ہو لیکن مجھے لگ رہا ہے اب میری خوش قسمتی کا دور ختم ہونے والا ہے۔“

ایوان آ رہا ہے۔“

روینہ نہیں جانتی تھی کہ ایوان کون تھا اور اس کے آگے سے وکٹر کی خوش قسمتی کیسے ختم ہو جائے گی۔ وکٹر اس کے پاس آیا۔ ”ایوان اچھا آدمی نہیں ہے درحقیقت اسی نے مجھے

دھندے پر لگایا ہے اور ایسا لگ رہا ہے وہ کل مجھ سے حساب لینے آئے گا۔ ممکن اس کے بعد میں یہاں نہ رہوں یا اس دنیا میں نہ رہوں۔ مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک چابی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ ”یہ اس گھر کے ہر تالے کو کھول سکتی ہے۔“

روینہ نے چابی تمام لی مگر وکٹر نے اس پر گرفت کم نہیں کی اور بولا۔ ”یہ اس وقت کے لیے ہے جب تم دیکھو کہ میں یہاں کا آقا نہیں رہا ہوں اس وقت تم یہاں سے فرار ہو سکو گی۔ اسے سنبھال کر رکھنا اور یاد رکھنا اگر اس سے پہلے بھاگنے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھ ان لڑکیوں جیسا حشر ہو گا۔ تم مجھے دھوکا دے کر نہیں جاسکتیں۔“

روینہ نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وکٹر اس کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیوں کر رہا ہے، وہ اچھا انسان نہیں تھا اور اب تک روینہ نے اسے دوسروں سے جس طرح پیش آتے دیکھا تھا اسے وکٹر سے کسی اچھائی کی امید بھی نہیں تھی اس کے باوجود روینہ سے اس کا رویہ حیران کن تھا۔ اس نے چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ وکٹر کی باتوں سے ایسا لگا جیسے وہ جلد یہاں سے نکلتی چلا جائے گا۔ لڑکیوں کی حالت ویسے ہی خراب تھی اور وہ سچ بھی کہیں تو یہ لوگ انہیں مار دیتے۔ روینہ کو خیال آیا کہ اس صورت میں اس کا کیا ہوگا؟ کیا وکٹر اسے ساتھ لے جائے گا اور ساتھ لے گیا تو کس حیثیت سے لے جائے گا۔ وہ اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ وہ اس کے جرائم کی معنی گواہ تھی بلکہ وہ اس کے جرائم میں شامل تھی لیکن یہ بات اسے وکٹر کے خلاف جانے سے نہیں روک سکتی تھی، یہ بات وکٹر بھی سمجھتا تھا اس لیے امکان تھا وہ اسے ساتھ ہی رکھے گا۔ کہیں جانے نہیں دے گا۔

چابی لے کر روینہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ چابی لے کر چپکے سے نکل جائے مگر پھر وہ گارسیا کا سوچ کر سہم گئی وہ رات میں دروازے کے سامنے کرسی رکھ کر سوتا تھا تاکہ کوئی لڑکی فرار نہ ہو سکے۔ وہ چوکس بھی بہت تھا اس کے ہوتے ہوئے چابی رکھنے کے باوجود روینہ کا باہر نکلنا محال تھا۔ وہ سوچے سوچے سو گئی۔ پھر صبح اس کی آنکھ کھلی تو کچھ دیر اسے احساس نہیں ہوا پھر اسے محسوس ہوا کہ باہر کوئی آیا تھا، اس نے اٹھ کر کھڑکی کے رخنے سے جھانکا تو اسے مکان کے سامنے ایک فوجی کار دکھائی دی۔ اس سے چار پانچ افراد اتر رہے تھے۔ وہ اپنا اسلحہ اتار کر کار کی ڈکی

میں رکھ رہے تھے اور پھر ایک شخص نے ڈکی بند کر کے لاک کر دیا۔ پھر وہ مکان کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے اور اس کی نظروں سے اوچھل ہو گئے۔ روینہ اٹھ گئی یہ وہی لوگ تھے جن کا کل وکٹر نے ذکر کیا تھا۔ وہ سیزہیاں اتر کر نیچے آئی تو وہ لوگ اندر آچکے تھے اور روینہ یہ دیکھ کر ایک لمحے گور کی کہ ان میں وہ کمانڈر اور گول چہرے والا لوجوان بھی تھا جو اس کی ماں کے قاتل تھے۔ کمانڈر نے حکم دیا تھا اور گول چہرے والے نے اس کی ماں کو شوٹ کیا تھا۔ اب وہ یہاں وکٹر سے علیک سلک کر رہے تھے۔ روینہ نے وکٹر کے ہونٹوں پر غور کیا وہ کہہ رہا تھا۔

”ایوان تم کیسے آئے؟“ وکٹر کا لہجہ سرد تھا۔

ایوان مسکرایا۔ اس نے گول چہرے والے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرا چھوٹا بیٹا رہا تھا ہے اور یہ میرے آدمی ہیں۔ ہم نے گزشتہ ہفتہ بہت سخت گزارا ہے، ہمیں آرام کا موقع کم ملا اور کام بہت زیادہ تھا۔“

”کیسا کام؟“

وکٹر کے سوال پر ایوان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”تم جانتے ہو صفائی کا کام۔۔۔ ابھی کچھ کام ہوا ہے لیکن بہت سارا باقی ہے۔ ایک دودن یہاں آرام کر کے میں اور میرے آدمی دوبارہ کام پر جائیں گے۔ یہ بہت تھک گئے ہیں، میں چاہتا ہوں یہ تازہ دم ہو جائیں۔“

وکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا نہیں خیال کہ اب تمہیں مزید کام کا موقع ملے گا، تم جانتے ہو نیوڈ والے یہاں آچکے ہیں۔“

ایوان کا چہرہ یک دم تاریک ہو گیا، اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”فرق پڑے گا نہیں، فرق پڑ چکا ہے۔“ وکٹر نے کہا۔ ”نیوڈ فوج اور اس کے ساتھ دشمن ہمارے علاقے کے پاس پہنچ گئے ہیں اس کا مطلب ہے اب تمہارا واسطہ نہتے اور عام لوگوں سے نہیں بلکہ مرنے مارنے والے لوگوں سے پڑے گا۔“ اس نے ایوان کے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ”کیا انہیں مسلح افراد سے نمٹنے کا تجربہ ہے؟“

وکٹر نے آئینہ دکھایا تو ایوان کا چہرہ بگڑ گیا اس نے غرا کر کہا۔ ”یہ سب فضول باتیں ہیں اصل کام وہ ہے جو ہم یہاں کرنے آئے ہیں، مجھے یقین ہے تمہاری لڑکیاں میرے آدمیوں کو خوش کریں گی۔“

وکٹر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے لیکن تم لوگ یہاں رکو گے نہیں۔“

”اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔“ ایوان نے کہتے ہوئے پہلی بار روئینہ کو دیکھا۔ ”اوہ، یہ چڑیا یہاں ہے اسے ہم نے پکڑا تھا اور اس کی ماں کو گرگنی نے شوٹ کیا تھا۔“ اس نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز میں بھائی کے لیے محبت تھی۔ وہ ہنس دیا اور روئینہ اس کے پاس سے ہوتی ہوئی اوپر جانے لگی تو گرگنی نے اس کا بازو پکڑنا چاہا مگر روئینہ پھرتی سے کئی کئی کرکلیں گئی۔ گرگنی نے اس کے پیچھے جانا چاہا، وہ کچھ بیتاب ہو رہا تھا مگر وکٹر نے روک دیا۔

”نہیں، یہ اس کام کے لیے نہیں ہے۔“
”یہاں ہر لڑکی ایک ہی کام کے لیے ہے۔“ ایوان نے سخت لہجے میں کہا۔
”اوہ، لیکن ابھی نہیں اسے بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں اگر یہ بھی دھندے پر لگ گئی تو وہ کام رہ جائیں گے۔“ وکٹر نے مصالحتانہ انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن اگلی بار یہ نہیں ہوگا۔“ ایوان نے سر ہلایا، اس کی حریفیں نظریں اس وقت تک روئینہ پر جمی رہیں جب تک وہ سیزھیاں چڑھ کر اوپر نہیں چلی گئی۔ ایوان کے ساتھ چار افراد تھے اور یہ چاروں اس کے خاص آدمی تھے جن میں ایک اس کا بھائی بھی تھا۔ ایوان فوجی تربیت یافتہ تھا لیکن جنگ کے وقت وہ مشرقی یورپ اور روس کے درمیان ایک ریکٹ چلا رہا تھا، یہ ریکٹ وسط ایشیا سے غیر قانونی تارکین وطن کو مغربی یورپ پہنچاتا۔ جنگ کا سن کر اس نے فوج میں شمولیت اختیار کی۔ اس نے اپنے گروپ کے ساتھ مل کر مسلم علاقوں میں قتل و غارتگری اور لوٹ مار کی۔ اس نے لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا کر کے قبیہ خانوں کو سپلائی کیا اور بھاری رقم کمائی تھی۔ وکٹر کو لڑکیاں اسی نے مہیا کی تھیں اور اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس سے حساب لینے آیا ہو۔ وکٹر فکر مند نظر آ رہا تھا، اس نے ایوان کے آدمیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”لڑکیاں ہیں لیکن ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے انہوں نے بہت مشکل دن گزارا ہے کل۔“

”تم فکر مت کرو۔“ ایوان نے بے پروائی سے کہا۔ ”وہ زیادہ سے زیادہ مر جائیں گی۔۔۔ ابھی بات ہے مر جائیں۔“

”ان سے میرا بزنس چلتا ہے۔“ وکٹر نے کہا۔
”میں نے کہا تھا فکر مت کرو، جلد یہاں تازہ مال آئے گا۔“
وکٹر نے گہری سانس لے کر گارسیا کی طرف دیکھا تو

اس نے سر ہلایا اور ایوان کے آدمیوں کو لے کر اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ ان کے جانے کے بعد وکٹر ایوان کو اپنے دفتر میں لایا۔ ایوان نے دفتر کا معائنہ کیا اور جا کر وکٹر کی کرسی پر بیٹھ گیا، مجبوراً اسے اس کے سامنے جگہ سنبھالنا پڑی تھی۔ ایوان کا انداز حاکمانہ تھا اور وکٹر بڑی مشکل سے اسے برداشت کر رہا تھا۔ اس نے ایوان کے لیے سرخ واڈ کا کی بوتل کھولی اور گلاس میں ڈال کر اس کی طرف بڑھائی جسے وہ بغیر انتظار کے ایک گھونٹ میں ہی پی گیا، اس نے زحمت نہیں کی کہ وکٹر اپنے لیے بھی نکالے اور وہ اس کا ساتھ دے۔ ایوان کا رویہ ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی ادنیٰ ماتحت کے ساتھ ہو۔ مجبوراً وکٹر کو دوبارہ اس کا گلاس بھرنا پڑا۔ اس بار اس نے چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے امید ہے تم نے میری بھیجی کھپ سے اچھا کمایا ہوگا۔“

”خاص نہیں۔“ وکٹر غصہ سے کہتا ہوا کہتا ہوا۔
”واقعی؟“ ایوان نے اسے شرارت سے دیکھا۔
”ہاں، جنگ کے دوران جا بے جا ایسے قبیہ خانے کھل گئے ہیں اور اب گاہک زیادہ رقم نہیں دیتا اگر اس سے زیادہ مانگو تو وہ کہیں اور چلا جاتا ہے اس لیے کمائی خاص نہیں رہی۔“

ایوان نے نظریں گھما کر دفتر کا معائنہ کیا اور پھر اس کی نظر تجوری پر آ کر رک گئی۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے لگا۔ وکٹر کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ ”میری تجویز ہے کہ تم اور تمہارے آدمی رات سے پہلے رخصت ہو جائیں کیونکہ نیو اور دشمن کی فوج نزدیک ہے اگر وہ یہاں آگئے تو تمہاری وجہ سے میں بھی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔“

”فکر مت کرو۔“ ایوان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں چھوڑوں گا۔“
☆☆☆
روئینہ نے پانچوں لڑکیوں کو انجکشن دیدیا تھا۔ لیکن اسے ساشا پر بہت ترس آ رہا تھا اس کی حالت سچے سچ خراب تھی، وہ کھانسی رہی تھی اور اس کا جسم ہر بار لرز اٹھتا تھا۔ بیڈ کی نئی چادر بھی خون سے بھر گئی تھی۔ ساشا رونے لگی، اس نے روئینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکال دو۔“

اگر یہ کام روئینہ کے بس میں ہوتا تو وہ کرگزرتی لیکن یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ ایک لمحے کو اس کی نظر ایگزاسٹ کے خانے کی طرف گئی لیکن ساشا اس سے بھی نہیں نکل سکتی تھی، ایک تو وہ بھاری جسم کی تھی اور دوسرے

اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ چند قدم چل سکتی، خانے میں گھس کر وہ کیسے کہیں جاتی۔ روئینہ نے اس سے نظریں چراتے ہوئے اسے انجکشن دینا چاہا تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور لٹی میں سر ہلانے لگی۔ اس بار روئینہ اس کی بات رد نہیں کر سکی تھی۔ اس نے انجکشن اپنی فراک کی جیب میں کیا اور خالی کر دیا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور گارسیا نے اندر جمناک کر اسے اشارہ کیا کہ وہ جلدی کرے۔ روئینہ نے ساشا کے بازو سے اسٹریپ کھولی اور باہر آ گئی۔ جب وہ دوسری لڑکیوں کے کمروں میں آ جا رہی تھی تب اس کی نظر بار بار راہداری میں ساتھیوں سے گپ شپ کرتے ہوئے اور جیتے ہوئے گرگنی پر جاتی تھی یہی شخص تھا جس نے اس کی ماں کو قتل کیا تھا۔ مگر وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک کمزور لڑکی تھی جس کا کسی پر اختیار نہیں تھا۔ وہ خود ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔

اپنا کام کر کے اس نے سامان واپس کچن میں رکھا اور اوپر کمرے میں آ گئی۔ کمرہ اندر سے لاک کر کے اس نے ایگزاسٹ کا خانہ کھولا اور اس کے اندر درنگ گئی۔ وہ اس کام کی اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ اب کسی پچھلی کی طرح اس خلا میں آسانی سے تیرتی تھی۔ اس کا رخ وکٹر کے دفتر کی طرف تھا۔ کچھ دیر میں وہ جالی کے ساتھ تھی اور ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ ایوان بتا رہا تھا کہ جلد یہاں ہی لڑکیاں آئیں گی اور بزنس دوبارہ چمک جائے گا اور وکٹر اس سے کہہ رہا تھا کہ یہ اس کا گھر ہے اور یہاں ہونے والا ہر فیصلہ وہی کرے گا۔ جواب میں ایوان نے اس پر پستول تان لیا تھا، اس نے کہا کہ وہ اسے شوٹ کر دے اور اس کی لاش جنگل میں پھینک دے تو اس گھر کا مالک کون ہوگا؟ وکٹر ڈر گیا تھا، وہ ایوان کو منانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ایوان نے توجہ دے بغیر اسے وہاں سے جانے کا حکم دیا اور وکٹر اپنے دفتر سے نکل گیا۔

روئینہ پلٹی اور اب وہ رہتی ہوئی ساشا کے کمرے کی طرف جا رہی تھی، اسے ساشا کی فکر تھی وہ پہلے ہی نیم مردہ تھی اب اس کے ساتھ نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کمرے کی جالی کے پاس آ کر اس نے ڈرتے ڈرتے اندر جمناک اور پھر اس کا سانس رک گیا تھا۔ ایوان کے ساتھ آنے والا دیو قامت شخص ساشا کے پاس تھا۔ وہ اس کے پنجوں میں بے بس چڑیا کی طرح پھنسی ہوئی تھی اور اس کے کھلے منہ سے مسلسل چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس کی آواز روکنے کے لیے دیو قامت آدمی نے اپنی کلائی اس کے گردن پر رکھ دی اور اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ غالباً دیو قامت کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا بے پناہ

وزن اس کی کلائی پر آ رہا ہے اور لڑکی کا سانس رک رہا ہے یا اسے اندازہ تھا تب بھی اسے پروا نہیں تھی۔ جالی سے جمناک روئینہ کو لگا کہ ساشا بس کچھ دیر کی مہمان ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے تب اس کی نظر دیو قامت کے فرش پر پڑے کپڑوں پر گئی تھی۔

روئینہ نے سوچا اور انگلیاں باہر نکال کر جالی کے اسکرؤز کھولنے لگی۔ وہ خاموشی سے کام کر رہی تھی، اسے خوف تھا کہ دیو قامت کو پتا چل گیا تو وہ کچھ نہیں کر سکے گی۔ بہت احتیاط سے اس نے دونوں اسکرؤز کھولے اور جالی نیچے میز پر رکھ دی۔ پھر وہ کسی سانپ کی طرح رینگ کر خود بھی بے آواز میز پر اتر آئی۔ اس نے دیو قامت کی طرف دیکھا مگر وہ دنیا سے بے خبر تھا۔ روئینہ نے دیو قامت کی وردی کے ساتھ رکھا خنجر اٹھا لیا، یہ فوجی خنجر ریزر سے زیادہ تیز دھار تھا۔ روئینہ خنجر اٹھا کر آگے آئی، ساشا دیو قامت کے نیچے اس طرح چھپی تھی کہ اسے دیکھنے کے لیے روئینہ کو خاصا آگے آنا پڑا تھا۔ تب روئینہ نے دیکھا کہ ساشا کا منہ کھلا تھا اور اس کی آنکھیں ساکت ہو گئی تھیں۔ مگر دیو قامت کو اس کی پروا نہیں تھی۔

روئینہ کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے خنجر دیو قامت کی پشت میں گھونپ دیا۔ وہ کسی پھینسے کی طرح ڈکرایا اور کروٹ لے کر دوسری طرف گرا تھا۔ خنجر روئینہ نے واپس کھینچ لیا تھا اور وہ گھوم کر اس کی طرف آئی، اس بار اس نے دیو قامت کے منہ پر وار کیا اور خنجر اس کے نکلے منہ میں گھس کر ایک طرف گال سے نکل گیا۔ دیو قامت کی دھاڑ خون کی وجہ سے فراروں جیسی آواز میں بدل گئی۔ روئینہ نے خنجر نکالنے کی کوشش کی تو اس نے روئینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ روئینہ نے زور لگا کر ہاتھ اور خنجر چھڑایا۔ وہ زخمی تھا اور بدحواس بھی، ورنہ روئینہ اس حالت میں بھی اس سے ہاتھ نہیں چھڑا سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ کھینچا تو خنجر دیو قامت کا گال چیرتا ہوا باہر آ گیا۔ اس بار روئینہ نے خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا اور دیو قامت نیچے گر گیا۔ اسے چھوڑ کر روئینہ ساشا کے پاس آئی۔

پھر وہ رونے لگی کیونکہ ساشا کا جسم روح سے خالی ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کا دیا ہوا فرشتے کی شبیہ والا لاکٹ ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ روئینہ نے اس کے ہاتھ سے لاکٹ نکالا اور انگلیوں سے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دیو قامت خنجر لیے اس کے پیچھے کھڑا

تھا، اس نے ہاتھ گھمایا۔ روینہ بروقت جھکی اور ٹخرا اس کے سر سے گزر گیا۔ خون میں اس کا باؤں پھسلا اور وہ گری تو اٹھنے کے بجائے وہ دیو قامت کی کھلی ٹانگوں کے نیچے سے نکل۔ اس نے گھومنا چاہا لیکن وہ بھی اپنے ہی خون میں پھسل کر گرا اور ٹخرا اس کے پیٹ میں اتر گیا۔ اس بار بھی اس نے غرارے نما دھاڑ ماری تھی۔ روینہ خانے کی طرف لپکی اور اندر گھس کر اس نے جلدی جلدی جالی کے اسکرولز لگانا شروع کر دیے۔ اسی لمحے دروازہ بچنے لگا۔

☆☆☆

دوسرے کمروں میں مصروف اس کے ساتھیوں اور تنومند شخص نے دیو قامت کی آوازیں سن لی تھیں اور وہ دروازے پر دستک دے رہے تھے لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر سے اس کے دھاڑنے کی آوازیں آرہی تھیں مگر وہ دروازہ نہیں کھول رہا تھا۔ گرگی اور دوسرے دروازے کو ٹکریں مار رہے تھے۔ شور سن کر ایوان اور وکٹر بھی وہاں آگئے تھے۔ ایوان نے گرج کر پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”اندر آندرے چلا رہا ہے لیکن دروازہ نہیں کھول رہا۔“ گرگی نے کہا۔ ایوان نے سستے ہی حکم دیا۔

”دروازہ توڑ دو۔“

اس بار انہوں نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی اور چند مشترکہ ٹکروں سے دروازے کا لاک کھل گیا وہ اندر گھسے اور رک گئے۔ زمین پر خون میں ڈوبے آندرے دم توڑ چکا تھا۔ اس کا چہرہ ہوا منہ بہت بھیا نک لگ رہا تھا۔ فرش پر مشکل سے ہی کوئی ایسی جگہ تھی جہاں خون نہ ہو۔ ایوان خون کی پروا کیے بغیر اندر آیا۔ اس نے کمرے کا معائنہ کیا۔ جس وقت وہ اندر گھسے تھے اسی وقت روینہ نے آخری اسکرولز لگا کر اٹھکیاں اندر کھینچی تھیں وہ اب جالی سے ایوان اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ رہی تھی، وہ سب غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ یہ حیران کن بات تھی کہ کمر اندر سے بند تھا اور یہاں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی جس سے نکلا جاسکتا۔ دوسرے ساٹھا دم توڑ چکی تھی اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس نے بستر پر ہی دم توڑا تھا، تو آندرے کو کس نے قتل کیا؟ اس کا اپنا ٹخرا اس کے پیٹ میں اتر ا ہوا تھا مگر باقی زخم وہ خود نہیں لگا سکتا تھا یقیناً کسی نے اسے مارا تھا۔ ایوان نے دھاڑ کر کہا۔ ”یہ کس نے کیا ہے؟... کون تھا یہاں؟“

وکٹر اور گارسیا گھبرائے ہوئے تھے۔ وکٹر نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم، میں تو نیچے اپنے کمرے میں تھا۔“

”میں سیڑھیوں کے پاس تھا۔“ گارسیا نے بھی کہا

باقی سب بھی کمروں میں تھے۔ اگر ان میں سے کوئی اس کام میں ملوث ہوتا تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ خون سے بچ جاتا۔ اچانک ایوان نے کوئی آواز سنی اور اس نے سب کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ سب خاموش ہو گئے پھر سب نے سنا ایسا لگا جیسے کوئی لکڑی کے تختوں پر چل یا گھسٹ رہا ہے۔ ایوان نے آس پاس دیکھا اور پھر اس نے آواز کا تخرج تلاش کر لیا، اس نے جھٹکے سے ایگزاسٹ کی جالی کھینچ لی اور بولا۔

”اس میں کوئی ہے۔“

”اس میں کوئی کیسے جا سکتا ہے؟“ وکٹر نے اعتراض کیا۔

”دیکھو تلاش کرو، مکان میں کون اپنی جگہ نہیں ہے۔“ ایوان نے حکم دیا تو وہ سب پھیل گئے۔ مختلف کمروں اور جگہوں پر جھانکنے لگے۔ روینہ اس وقت نیچے جا رہی تھی۔ وہ اس ایگزاسٹ تک پہنچنا چاہتی تھی جو داخلی دروازے کے پاس نکلتا تھا، وہاں سے وہ نکل کر جالی کی بند سے باہر جاسکتی تھی۔ اس نے جالی ٹوٹنے کا ارتعاش محسوس کر لیا تھا اور اب اوپر نیچے بھاگ دوڑ کی دھمک محسوس کر رہی تھی۔ اس کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ ایوان اور وکٹر زور زور سے بات کرتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے آئے۔ ایوان اپنے آدمی کے مرنے پر دیوانہ ہو رہا تھا اور وکٹر سے کہہ رہا تھا کہ اگر قاتل اس خانے سے باہر نہیں آیا تو وہ اس مکان کو آگ لگا دے گا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے، یہ میرا مکان ہے۔“ وکٹر بولا۔

ایوان نے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”اس وقت تم مکان کی نہیں اپنی فکر کرو، یہ قتل یہاں ہوا ہے اور تمہیں بھی اس کا جواب دینا ہوگا۔“

”میں... میں تم سے تعاون تو کر رہا ہوں۔“ وکٹر نے گھبرا کر کہا۔

”اسی میں تمہاری بہتری ہے مجھے بہر صورت اپنے آدمی کا قاتل چاہیے۔“

اسی لمحے ان کے عقب میں فرش سے کچھ اوپر جالی والا خانہ کھلا۔ روینہ سن نہیں سکتی تھی اس لیے اسے ان دونوں کی موجودگی کا یہاں علم نہیں ہوا تھا۔ وہ باہر آئی اور جب تک اسے وہ نظر آتے وہ نصف باہر آ چکی تھی وکٹر کا رخ اسی کی طرف تھا۔ وہ روینہ کو دیکھ کر چونکا اور اس کے تاثرات دیکھ کر ایوان چونکا، اس نے مڑ کر دیکھا اور پستول نکال لیا۔ خطرہ بھانپتے ہوئے روینہ تیزی سے واپس اندر گئی اور

ایوان قاتر کرتا اس کی طرف دوڑا، وہ دیواروں پر گولیاں برسا رہا تھا۔ وکٹر نے اسے روکا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو ساری دیوار تباہ کر دی۔“

”بکومت۔“ ایوان غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ سورخ بہت چھوٹا تھا، اس نے گردن اندر ڈال کر دیکھا تو اسے روینہ اوپر جاتی دکھائی دی، اس نے ہاتھ اندر کر کے اندازے سے اس طرف قاتر کے لیکن کھسٹے اور لکڑی چھٹنے کی آوازیں بہ دستور آتی رہیں کوئی کوئی روینہ کو نہیں لگی تھی اس لیے وہ حرکت میں تھی۔ قاترنگ کی آوازیں کراہیوں کے دوسرے ساتھی دوڑے چلے آئے تھے۔ ایوان نے ان کا جائزہ لیا اور اپنے سب سے چھریے ساتھی سے کہا۔ ”اس خانے میں جاؤ، لڑکی اسی میں ہے۔“

وہ تربیت یافتہ فوجی تھا لیکن خانے میں جانے کا سن کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ اپنے دیو قامت ساتھی کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اس نے ٹھوک لگ کر کہا۔ ”میں جاؤں۔۔۔؟“

”ہاں تم۔“ ایوان دھاڑا۔ ”اس خانے کو بڑا کرو۔“ وہ سب ہل پڑے تھے ذرا سی دیر میں انہوں نے خانے کے کنارے لگی لکڑی توڑ کر اسے اتار بڑا کر دیا کہ ان کا ساتھی اس میں جا سکے۔ اس نے اپنا پستول کمر میں اڑسا اور خانے میں کھس گیا۔ چھریا ہونے کے باوجود اسے بہت مشکل پیش آرہی تھی۔ وہ کسی طرح کھسٹ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ کیلوں اور لکڑی کے نوکیلے ٹکڑوں سے اسے گھروٹے لگ رہے تھے اور اس کا لباس پھٹ رہا تھا۔ روینہ کا رخ اوپر کی طرف تھا اس لیے وہ بھی اوپر ہی جا رہا تھا۔ آڑے ترچھے راستوں پر اسے روینہ ٹھیک سے نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک موقع پر اس کی ذرا سی جھلک نظر آئی تو اس نے غلٹ میں پستول نکال کر قاتر کیا اس بار بھی کوئی نشانے نہیں لگی تھی۔ جھکے سے اس کا ہاتھ پیچھے کیا تو اس کی کئی کسی نوکیلی چیز سے لگی اور اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر پیچھے جا گرا۔ اس نے بے اختیار گالی دی، نیچے جانے کا وقت نہیں تھا اور وہ جا بھی نہیں سکتا تھا، وہ بری طرح پھنس گیا تھا اور اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ اوپر چڑھتا رہے اور لڑکی کو پکڑ لے۔

روینہ مکان کے اوپری حصے میں جا پہنچی تھی وہ کچھ اوپر تھی لیکن ایک جگہ وہ سستانے کے لیے رکی، اسے یہ تو معلوم تھا کہ کوئی اور بھی اس خلا میں آ گیا ہے لیکن وہ کہاں ہے اسے یہ نہیں معلوم تھا۔ آدی رہتا ہوا اس کے پاس آ رہا تھا، یہاں ایک بڑا خلا تھا جو مکان کی بنیاد تک گیا تھا۔ اس نے اچانک روینہ تک پہنچنے کی کوشش کی، یہاں تاریکی تھی

روینہ بھڑک کر پیچھے ہٹی اور فوجی کا جو ہاتھ اس کا پاؤں پکڑنے والا تھا وہ خلا میں لہرا گیا، اس کا توازن بگڑا اور ایک طویل چٹخ کے ساتھ خلا میں گر گیا۔ نیچے کوئی نوکیلی لکڑی انھیں ان میں سے ایک اس کے جسم میں کبھ گئی تھی۔ روینہ نے جھانک کر دیکھا اور دوبارہ اوپر کی طرف بڑھنے لگی مگر پھر اسے خیال آیا اور اس نے رخ بدل کر پہلی منزل کی طرف کر دیا تھا۔

☆☆☆

ایوان اور وکٹر سڑکیوں کے پاس تھے جب انہوں نے چھریے سپاہی کی چٹخ سنی۔ اس چٹخ میں بسا موت کا کرب بتا رہا تھا کہ وہ بھی مارا گیا۔ اس کے علاوہ کوئی اندازہ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایوان نے اپنے بال جکڑ لیے اور چلا کر بولا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ یہ لڑکی کون ہے؟“

”تم نے سبھی تھی۔“ وکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں نے اسے دوسرے کاموں پر لگا لیا تھا۔“

”جھوٹ بولتے ہو تم۔“ ایوان غرایا اور سڑکیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ وکٹر اس کے پیچھے تھا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں اپنے آدمیوں کی اس قاتلہ کو اپنے ہاتھ سے مارنا چاہتا ہوں۔“

”وہ زیادہ دیر اس خلا میں نہیں رہ سکتی۔ جلد نکلے گی۔“

”میں انتظار نہیں کر سکتا۔“ ایوان نے خطرناک لہجے میں کہا۔

”کیا کر لو گے تم؟“

ایوان ایک کمرے میں آیا جہاں ایک لڑکی بے ہوشی کی حالت میں دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ ایوان نے پستول سیدھا کیا اور بلا توقف اسے گولی مار دی۔ وکٹر چلا آٹھا۔

”کیا کیا تم نے؟“

”اگر تم خود کو اور اپنے بزنس کو بچانا چاہتے ہو تو اس لڑکی کو پکڑنے میں میرا ساتھ دو۔“ ایوان نے سرد لہجے میں کہا۔

وکٹر کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے ایوان پر نوٹ پڑنے کی خواہش پر قابو پایا ہے، وہ گہری سانسیں لے رہا تھا اور بالآخر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن اب میرے مکان اور کسی لڑکی کو نقصان نہیں ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے تم نیچے جاؤ اور میں اوپر دیکھتا ہوں۔“ ایوان نے کہا۔

وکٹر سر ہلاتا ہوا نیچے آ گیا۔ وہ اپنے دفتر والے کمرے

میں آیا اور اس نے ایک دروازہ کھولی اور اس میں رکھا ہوا پستول نکال کر اپنی پتلون کے عقب میں اڑس لیا، اسے لگ رہا تھا جلد اسے اس کی ضرورت پڑے گی۔ ایوان پاگل ہو رہا تھا، وہ اسے اور اس کے مکان کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس دوران میں گر گئی اور اس کا سامنے باہر کھڑی گاڑی سے اپنا اگلہ نکال لائے تھے، ان میں اسوک گرینڈ بھی تھے۔ ایوان خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”یہ کام کی چیز ہے نا، اوپر سے لے کر نیچے تک ہر خانے میں گرینڈ چھپک دو۔“

وہ سب حکم کی تعمیل میں لگ گئے۔ ایگزاسٹ کی جالیاں توڑ توڑ کر اندر اسوک گرینڈ پھینکتے لگے۔ ذرا سی دیر میں اندر اور کسی قدر باہر بھی دھواں بھرنے لگا تھا۔ روینہ ابھی درمیان میں تھی کہ اس نے دھواں محسوس کر لیا، یہ حلق میں خراش ڈال رہا تھا۔ اس نے راستہ بدل دیا اور دوبارہ نیچے کی طرف جانے لگی اس بار اس کی رفتار تیز تھی۔ چند منٹ بعد وہ ہاتھ روم میں نکلی اس نے اپنی فراک کا ایک حصہ پھاڑ کر اسے پانی میں بھگوایا اور منہ پر لپیٹ لیا پھر وہ وہاں سے نکل کر بکن میں آئی، ایک چھری اٹھائی اور بکن میں موجود ایگزاسٹ کے خانے سے اندر داخل ہو گئی۔ اب دھواں بہت زیادہ تھا اور نظر بھی مشکل سے آ رہا تھا۔ وہ پھر اوپر کی طرف جانے لگی۔ اس دوران میں وکٹر دوبارہ ایوان کے پاس آیا اور اس نے پوچھا۔

”اسوک گرینڈ سے آگ لگ سکتی ہے؟“

”اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔“ ایوان نے کہا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو اگر وہ نیچے سے نکل گئی تو۔۔۔“

وکٹر دوبارہ نیچے آ گیا۔ یہاں ایوان کا تیسرا ساتھی تھا۔ خود ایوان اور گر گئی اوپر تھے۔ یہاں گارسیا بھی تھا۔ اچانک وکٹر نے ایوان کے ساتھی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ رہی۔۔۔“ اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا اور ایوان کے ساتھی نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تو وکٹر نے پستول نکال کر اس پر دو قاتر کیے۔ دونوں گولیاں اس کے سر پر لگیں اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وکٹر نے جلدی سے پستول واپس اڑس لیا۔ قاترنگ کی آوازیں کراہیوں کے ایوان بھاگتا ہوا آیا اور اپنے ساتھی کو فرش پر مردہ پڑے دیکھ کر سکت ہو گیا۔ وکٹر نے دونوں ہاتھ آگے کیے اور بے بسی سے بولا۔

”وہ کتنا اس خانے سے نکلی اور تمہارے آدی کو شوٹ کر دیا میں خالی ہاتھ تھا اس لیے کچھ نہیں کر سکا۔“

”اس کے پاس پستول کہاں سے آیا؟“ ایوان نے پاؤں شیخ کر کہا۔

”ممکن ہے اندر جانے والے آدی کا پستول اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔“ وکٹر نے وضاحت پیش کی۔

ایوان دانت نہیں رہا تھا اور گالیاں دے رہا تھا، وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ لڑکی اس کے ہاتھ آگئی تو وہ اسے بہت اذیت دے کر مارے گا۔ پھر اس نے دھاڑ کر گارسیا کو اوپر جانے کا حکم دیا اور وکٹر سے کہا۔ ”مجھے غلطی ہوئی، مجھے یہاں دو آدی رکھتے تھے۔ اگر دوسرا شخص ہوتا تو وہ وار کر کے بچ نہیں سکتی تھی۔“

”مجھے اس کے انداز سے لگ رہا ہے کہ وہ تربیت یافتہ ہے۔ اس نے دو قاتر کیے اور دونوں نشانے پر لگے۔“ وکٹر نے لاش کی طرف دیکھا۔ ذرا سی دیر میں اس کے قحبہ خانے میں پانچ افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور وکٹر سوچ رہا تھا کہ اسے فوری طور پر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ وہ اتنی دولت کما چکا تھا کہ مغربی یورپ کے ملک میں مزے سے زندگی گزار سکتا تھا۔ مسئلہ ایوان سے اپنی جان اور دولت بچانے کا تھا، اسے یقین تھا ایوان اس کی دولت اور جان دونوں لینے آیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ روینہ نے اس کا کام آسان کر دیا تھا لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی تیز نکلے گی، اسی کے گھر میں اس نے آمد و رفت کے خفیہ راستے بنائے ہوئے تھے اور اسے کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی، فکر ہے وہ کسی راستے سے باہر نہیں نکل گئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے خفیہ خانے کا اچھی طرح پتا تھا اور وہ بہت عرصے سے اسے استعمال کر رہی تھی۔ ایوان نے کسی بھی چیز کی طرح دانت کھوستے ہوئے کہا۔

”وہ کتنی ہی تربیت یافتہ کیوں نہ ہو ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

وکٹر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ عجیب گیا، وہ سمجھ گیا کہ وکٹر نے بغیر کہے کہہ دیا ہے کہ وہ اس کے تین آدی پہلے ہی ہلاک کر چکی تھی اور اب وہ اور اس کا بھائی گر گئی بچے تھے۔

”وہ کہاں ہے؟“ وکٹر نے سوچا اور بھی خیال وہاں موجود ہر فرد کے ذہن میں تھا کہ روینہ کہاں ہے؟

☆☆☆

روینہ اس وقت دھویں سے بچی اور راستہ ٹھنکتی ہوئی اوپر جا رہی تھی، دھواں اتنا بڑھ گیا تھا کہ براہ راست اسے آنکھوں میں لگ رہا تھا۔ مگر منہ پر گیلیا کپڑا ہونے کی وجہ سے دھواں اس کے جسم میں نہیں جا رہا تھا۔ راستہ دیکھنے میں

دشواری کی وجہ سے وہ کسی قدر دیر سے اوپر اپنے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب رہی لیکن فوری باہر نکلنے سے پہلے اس نے سن کن لی اور پھر سر باہر نکال کر دیکھا، کمر خالی تھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ جلدی سے باہر آئی اور منہ سے کپڑا ہٹا دیا۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کر کے اس کے پیشل تلے کرسی پھنسا دی۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس آئی اور اس پر لگے کچھ کمزور تختے اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کوشش میں شور ہوگا اور باہر والے خبردار ہو جائیں گے مگر اس کے پاس فرار کے لیے بھی ایک راستہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایوان اپنے آدمیوں کی ہلاکت پر پاگل ہو رہا ہوگا اور وہ اس کے ہاتھ آگئی تو وہ اسے بلا توقف ہلاک کر دے گا۔

اچانک اسے پیچھے حرکت کا احساس ہوا اس نے مڑ کر دیکھا، کوئی دروازہ بجا رہا تھا۔ رویہ نے کوشش تیز کر دی اور ایک تختہ اکھاڑ دیا جیسے ہی اس نے دوسرا تختہ اکھاڑا، دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور گارسیا اندر داخل ہوا۔ رویہ نے جلدی سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن گارسیا نے جھپٹ کر اس کی ٹانگ پکڑ کر اندر کھینچ لی۔ اس نے رویہ کو بستر پر گرا دیا اور قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ رویہ نے محسوس کیا کہ وہ اس کا لباس اتارنے کی کوشش کر رہا تھا بھی وجہ یہی کہ اس کی توجہ رویہ کے ہاتھوں کی طرف نہیں گئی۔ رویہ نے اچانک چھری سے اس کے چہرے پر وار کیا اتفاق سے چھری براہ راست آنکھ میں لگی اور گارسیا کے دماغ میں اتر گئی۔ دارمہلک ثابت ہوا تھا۔ وہ بے جان ہو کر رویہ پر ہی اونڈھے منہ کر گیا تھا۔

ایوان نیچے تھا جب اس نے شور سنا اور وہ تیزی سے اوپر کی طرف بھاگا، ساتھ ہی وہ چیخ کر گر گئی کو نیچے کا خیال رکھنے کا کہہ رہا تھا۔ گر گئی اس کے پاس سے گزر کر نیچے آگیا۔ پہلی چیخ کے بعد گارسیا کی آواز اب رک گئی تھی لیکن ایوان نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ راہداری کے آخری کمرے سے آئی تھی، اسے علم نہیں تھا کہ یہ کمرہ رویہ کا ہے، دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے اسے کھولنے کی کوشش کی اور ناکامی کے بعد پیچھے ہٹ کر شانے سے بھرپور ٹکرائی، دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ گارسیا اونڈھے منہ بستر پر پڑا تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ فوراً ہی ایوان کی توجہ مکمل جانے والی کھڑکی نے کھینچ لی اور وہ لپک کر اس کے پاس آیا، تختوں کے درمیان اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ باہر جھانک سکتا، اس نے ایک تختے پر لات ماری تو وہ ہلا اور

دوسری لات پر ٹوٹ کر باہر جاگرا، اب ایوان باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے گردن نکال کر جھانکا تو نیچے پر اسے لڑکی ہاتھ دکھائی دیئے اس نے پستول باہر نکالا اور انداز سے فائر کیا لیکن جب نیچے دیکھا تو لڑکی کے ہاتھ غائب تھے اسی لمحے اسے لڑکی کی جھلک دکھائی دی، وہ درختوں کے درمیان بھاگ رہی تھی۔ وکٹر بھی اس کے پیچھے کمرے میں آگیا تھا، اس نے گارسیا کو سیدھا کیا اور گہری سانس کر رہا تھا۔ وہ بھی مارا گیا تھا۔ وہ حیران ہوا کہ رویہ کی تھی، ایک گونگی بھری کمزور لڑکی نے کیسے بڑے بڑے سورماؤں کو چت کر دیا تھا۔

”چلو میرے ساتھ؟“ ایوان نے اس کا پکڑا۔ ”وہ جنگل میں بھاگ گئی ہے۔“

وکٹر اس کے ساتھ نیچے آیا مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ ”جب تک مجھے کوئی ہتھیار نہیں ملے گا میں لڑکی کے سامنے جانا پسند نہیں کروں گا۔“

ایوان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے ایک سرے والے سپاہی کا پستول اسے دیا اور بولا۔ ”لیکن کوئی خیال ذہن میں مت لاتا۔“

وکٹر نے پستول لیا۔ ”تم فکر مت کرو، اب یہ میری کامیابی ہے اس لڑکی کا مرنا بہت ضروری ہے۔“

ایوان نے دانت پیسے۔ ”وہ بچے کی نہیں۔۔۔ اسے اپنے ہاتھ سے ماروں گا۔“

وہ تینوں باہر آئے۔ مکان کے دائیں طرف جنگل اور یہ خاصا گھنا تھا، وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ ایوان لڑکی کو اسی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس حکمت عملی بیان کی۔ ”لڑکی کو زندہ پکڑنا ہے، زخمی کر سکتے لیکن اگر خطرہ ہو کہ وہ بھاگ جائے گی تو اسے قتل کر دینا۔“

اس طرف جاؤ میں اس طرف سے جاتا ہوں۔“ ایوان وکٹر سے کہا۔ وکٹر سر ہلاتا ہوا آگے بڑھا تو ایوان اشارے سے گر گئی کو کہا کہ وہ وکٹر پر نظر رکھے۔ گر گئی جو اشارے کے بعد وکٹر کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ ایوان درختوں کے درمیان بھاگ رہا، اسے اس کام کا بہت تجربہ تھا اس کئی دن اور راتیں جان بچا کر بھاگنے والوں کے تعاقب میں اسی طرح جنگلوں میں بھاگتے گزری تھیں اور اسے کھیل میں لطف بھی آتا تھا، اس کے اندر دردندوں والی اور خوشی بیدار ہو جاتی تھی۔

رویہ بھاگ رہی تھی۔ شروع میں اس پر جوش غالب تھا حالانکہ وہ بلندی سے نیچے چلی زمین پر گر گئی تھی اور اس کی

کمر دکھ رہی تھی۔ اس نے ایوان کو پستول باہر کرتے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی نیچے سے ہاتھ چھوڑ دیئے تھے۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتی تو اسے گولی لگ سکتی تھی۔ نیچے کرنے کے بعد بھی وہ وقت ضائع کیے بغیر اٹھ کر بھاگی تھی۔ ابھی کچھ دیر بعد بانی تھے اور وہ یقیناً اس کے پیچھے آتے۔ ان کے آنے سے پہلے وہ اس جگہ سے نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر کچھ دیر بعد ہی اس پر ٹھکن غالب آنے لگی۔ وہ ہانپ رہی تھی اور بعض اوقات اس کا سر پکڑنے لگتا تو وہ کسی درخت کا سہارا لے کر رک جاتی تھی۔ اسی طرح بھاگتے ہوئے وہ ایک ڈھلان پر آئی، یہاں اسے سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا۔ پھر ایک جگہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے تک آئی اور ایک جگہ کچھڑ میں جا گری۔ جب اس نے اٹھنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ وہ کئی مزی لاشوں کے درمیان گر گئی تھی۔

ایک متعفن تالاب تھا جس میں کئی لاشیں پڑی تھیں اور یہ سب عورتوں کی لاشیں تھیں۔ بدبو سے دماغ پھٹ رہا تھا، وہ مگر پڑتی اس تالاب سے باہر آئی۔ اس کا لباس سیاہ بدبودار کچھڑ میں تھم گیا تھا۔ یہ ان لڑکیوں کی لاشیں تھیں جو اس کی ساتھی تھیں اور ماری گئی تھیں، ان کی بے کفن لاشیں یہاں پھینک دی گئی تھیں۔ تالاب سے نکل کر وہ لرزتی کانپتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ بھینکنے سے جسم سرد ہو رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا جیسے ہر گزرتے لمحے اس کی توانائی زائل ہوتی جا رہی ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی اور ایسا ہوتا تو اس کے پیچھے آنے والے اسے تلاش کر لیتے۔ اچانک اسے کسی نے آواز دی اور اس نے بھڑک کر چاقو نکال لیا۔ کچھ دور وکٹر کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں پستول تھا لیکن اس کا رخ رویہ کی طرف نہیں تھا۔ وہ آگے آیا تو رویہ نے چاقو اس کی طرف کر لیا۔ وہ نرمی سے بولا۔

”ڈرو مت“ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا، یہ دیکھو۔۔۔“ اس نے پستول بیلٹ میں لگا لیا۔ ”مجھ پر اعتماد کرو، تمہیں مدد کی ضرورت ہے میں تمہیں حفاظت سے تمہارے گھر تک پہنچا دوں گا۔“

رویہ لرز رہی تھی، اس کا چاقو والا ہاتھ کانپنے لگا تھا۔ وکٹر بہ دستور نرمی سے بات کر رہا تھا۔ اب تک وہ رویہ کی مدد کرتا آیا تھا بے شک اس نے رویہ سے کام لیا تھا لیکن ساتھ ہی اس نے اسے بچایا بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رویہ نرم پڑ گئی۔ اس کا چاقو والا ہاتھ جھک گیا اور جب وکٹر نے چاقو اس کے ہاتھ سے لیا تو اس نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ وکٹر نے چاقو لے کر اسے بیلٹ میں اڑس لیا اور نرمی سے اسے ایک

بازو میں لے کر خود سے لگا لیا۔ اس نے کہا۔ ”تم نے کئی آدمیوں کو مارا۔۔۔ تمہاری وجہ سے میری دو لڑکیاں ماری گئیں۔۔۔“ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بدل گیا۔ ”اور تم جتنی ہو میں تم سے پہلے کی طرح مہربانی سے پیش آؤں گا۔۔۔“ اس نے بالوں سے پکڑ کر رویہ کا سراپہ کھینچا۔ اس کی چیخ نکل گئی تھی اسی لمحے دو سمتوں سے ایوان اور گر گئی نمودار ہوئے، انہوں نے پستول تان رکھے تھے ان کو دیکھتے ہی وکٹر نے تیزی سے رویہ کو آگے کر کے اپنا پستول نکال لیا اور ایوان کی طرف تان لیا۔ ایوان نے کہا۔

”لڑکی میرے حوالے کر دو۔“

”یہ تمہاری ہے۔“ وکٹر نے کہا۔ ”لیکن پہلے پستول ہٹاؤ سامنے سے۔“

”تم نے کیوں پستول تانا ہے؟“

”تم لوگوں کی وجہ سے۔“ وکٹر نے کہا۔

”ہم نے لڑکی کو دیکھ کر پستول نکالا ہے۔“ گر گئی بولا۔ ”اسے چھوڑ دو۔“

”نہیں، پہلے تم دونوں پستول نیچے کر دو۔“ وکٹر بولا، اس نے رویہ کو گردن سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے سینے تک آ رہی تھی اور نیم بیٹھی پوزیشن میں تھی۔ اسے اپنے شانے میں کچھ چھپا تو اس نے کن آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا چاقو تھا جو وکٹر نے بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ ایوان اور گر گئی نے اپنے پستول نیچے کیے تو رویہ پر وکٹر کی گرفت نرم پڑ گئی۔ اسے موقع ملا تو اس نے اچانک چاقو نکالا اور وکٹر کی ران میں گھونپ دیا۔ اس کے منہ سے دھار نکلی اور اس کے ہاتھ میں دبے پستول سے فائر ہوا۔ گولی گر گئی کے سینے میں اتر گئی۔ ایوان چلا یا۔

”نہیں۔۔۔“

گر گئی نیچے گر گیا تھا اور اس کے سینے سے خون اٹل رہا تھا۔ ایوان نے وکٹر پر لگا تار کٹی فائر کیے وہ جھٹکے سے پیچھے جا کر۔ رویہ پہلے ہی نیچے گر چکی تھی۔ اس لیے فحش گئی پھر وہ اٹھ کر بھاگی۔ ایوان کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی، وکٹر کے گرتے ہی وہ گر گئی کی طرف بھاگا تھا۔ گر گئی اس کا ایک ہی بھائی تھا اور وہ اس دنیا میں اگر کسی سے محبت کرتا تھا تو وہ گر گئی ہی تھا۔ گر گئی انک انک کر سانس لے رہا تھا اور اس کے ہونٹوں سے خون کے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ گولی دل سے ذرا اوپر لگی تھی اور وہ دم توڑ رہا تھا۔ ایوان رونے لگا۔ ”میرے بھائی۔۔۔ مرنا نہیں۔۔۔ میرے ساتھ رہو۔۔۔ میرے بھائی۔۔۔“

گر گئی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا اور اس نے دم توڑ دیا۔ اس لمحے بے شمار بے گناہ

انسانوں کے قاتل ایوان کو پتا چلا کہ موت کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ خاص طور سے جب وہ اپنے کسی پیارے کی ہو۔ اس نے گری کی کاسریچے رکھ دیا اور اس کی مٹی آنکھیں بند کر کے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ پھر اس نے گری کی کاسریچے میں پتوں اور پتوں کے سوراخوں سے خون اٹل رہا تھا اور وہ بھی چند لمحوں کا چہرہ... لگ رہا تھا مگر ایوان نے ایک انتہائی جذبے کے ساتھ اس پر دونوں پستول خالی کر دیے اور پھر اس پر تھوک کروہاں سے چل پڑا۔ اب اسے لڑکی کو تلاش کرنا تھا اور اسے موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔

☆☆☆

روینہ خالی ذہن اور خالی جسم کی کیفیت میں چلی جا رہی تھی، اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، وہ کئی بار گری اور اٹھ کر دوبارہ چلنے لگی۔ وہ جنگل میں تھی لیکن ایک بار اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے سامنے مکانات کی قطار دکھائی دی۔ ہر مکان کے سامنے چھوٹا سا باغ بھی تھا لیکن بیشتر باغ موسم اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اجڑ رہے تھے۔ وہ سست قدموں سے ایک مکان کی طرف بڑھی جس کے آگے الٹی پر سوکنے کے لیے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہاں کون رہتا تھا۔ وہ سرب تھے یا کوموین مسلم، اسے بس پناہ چاہیے تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور پھر بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ اس کے بعد اسے لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہے کہ کوئی اسے کسی گرم جگہ لے گیا ہے، کسی نے اس کے گتے بے ہوش ہو جانے والے کپڑے اتارے اور پھر گرم پانی اور اسٹنج سے اس کا جسم صاف کیا، اس کے بال دھوئے اور پھر اسے صاف ستھرا لباس پہنا دیا۔

اچانک اسے ہوش آیا، وہ ایک صوفہ کم بیڈ پر لیٹ ہوئی تھی۔ یہاں سکون آمیز گرمی اور خاموشی تھی، اس کے جسم پر ہلکا آؤٹی باجامہ اور گرم ٹی شرٹ تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ دیکھا جہاں زخم تھا اس پر پٹی چپکانی گئی تھی۔ تو وہ خواب نہیں تھا، کسی نے سچ سچ اسے صاف کر کے دوسرا لباس پہنایا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ سامنے آتش دان کے اوپر ریک پر خنزیر کے گلابی جیسے رکھے تھے۔ اس کا دل ڈوبنے لگا، اس کا مطلب تھا وہ کسی سرب کے گھر میں تھی۔ ایک طرف میز پر ٹیلی کی تصاویر تھیں۔ وہ ابھی دیکھ رہی تھی کہ ایک عورت وہاں آئی۔ اس نے سوپ کا پیالہ اٹھا رکھا تھا۔ اس نے مسکرا کر روینہ کو دیکھا اور پیالہ اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس نے سرب زبان میں پوچھا۔

”تم کیسی ہو؟“

روینہ نے اشارے سے بتایا کہ وہ بول اور سن سکتی ہے۔ عورت نے افسوس کیا۔ ”اوہ... میرا نام مونی ہے اور یہ میرا گھر ہے۔“

اس نے روینہ سے سوپ پیئے کو کہا، اس نے ہنسی ہوئے پہلا پیچ لیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر بھوکے تھی اس نے بے تابی سے سوپ کے گرم ہونے کی پروا کیے بغیر پورا پیالہ ختم کر دیا۔ مونی نے خالی پیالہ اٹھایا اور اشارے سے بولی کہ وہ اس کے لیے اور سوپ لاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد روینہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تب اس نے باہر میز پر رکھی تصویروں کو غور سے دیکھا، اسے پتا نہیں چلا کہ باہر فون کی گھنٹی بج رہی تھی پھر مونی نے فون دیکھا کیا۔ ”ہاں بات کر رہی ہوں... کیا...؟“ اس نے کہا اور اس کے ہاتھ سے پیالہ چھوٹ کر نیچے گرا اور ٹوٹ گیا۔ پھر اس نے ٹوٹی آواز میں کہا۔ ”کب... کس نے، کہاں؟“

روینہ اس گھٹکے سے بے خبر مونی کے ساتھ تصویر میں کمرے میں کود کر رہی تھی یہ وہی دیو قامت شخص تھا جسے اس نے ساشا کے کمرے میں مل کیا تھا۔ وہ اس عورت مونی کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ وہ میاں بیوی تھے۔ روینہ کے ہاتھ سے تصویر چھوٹ کر گری اور اس کا فریم ٹوٹ گیا۔ وہ گھبرا گئی، اس نے جلدی سے فریم اور ٹوٹا شیشہ وہاں بچھے فٹ میٹ کے نیچے کر دیا اسی لمحے مونی کا اندر آئی اس کے تاثرات عجیب ہو رہے تھے، اس نے ہاتھ پیچھے کر رکھا تھا اور اندر آ کر اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ روینہ پیچھے ہٹی۔ مونی نے اشارے سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے جواب میں روینہ نے دروازے کی طرف جانے کی کوشش کی تو مونی نے اچانک ہاتھ آگے کیا۔ اس میں چھری تھی۔ روینہ پیچھے ہٹ گئی۔ مونی ایک وحشیانہ چخ کے ساتھ اس کی طرف بھٹی اور اس کے سینے پر وار کر چاہا، روینہ اچھل کر پیچھے گئی مگر چاقو اس کی آستین کاٹا ہوا گزر گیا۔ روینہ صوفہ کم بیڈ پر گری اور پھر پلٹ کر دوسری طرف گری۔ اسی لمحے مونی آ کر صوفے پر گری اور وہ بھی پلٹ کر روینہ پر آئی۔ اس کا چاقو والا ہاتھ روینہ نے قہقہہ لپا۔ مونی زور لگا رہی تھی، اس وقت اس کے نرم نقوش بکھر گئے تھے۔ اس کے منہ سے غراہٹیں نکل رہی تھیں شوہر کی موت کی خبر اور اس کی قاتلہ کی اپنے گھر میں موجودگی نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ روینہ چاہتی تھی تو اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے اس کے شوہر کو کن حالات میں موت کے گھاٹ

اتارنا تھا۔ اگر وہ بتا سکتی تو مونی کہاں سختی؟ اس وقت وہ بالکل پاگل اور جنونی ہو رہی تھی۔

روینہ نے زور لگا کر اسے دھکا دیا اور پھر اٹھ کر بھاگی۔ مونی نے اس کا پاؤں پکڑا تو وہ منہ کے بل گری گئی۔ اس کا ہاتھ فٹ میٹ پر گیا اور اسے خیال آیا، اس نے نیچے ہاتھ ڈالا تو ایک شیشہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ مونی اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ روینہ نے پلٹ کر اندھا اندھ ہاتھ چلایا، مونی کا ہاتھ مار کر پیچھے گئی، اس کا ہاتھ اپنے پیٹ پر تھا وہاں سے خون اٹل رہا تھا، شیشے نے اس پیٹ کاٹ دیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹی اور پھر لڑکھڑا کر نیچے گری تھی۔ روینہ نکل کر بھاگی۔ گھر سے باہر آ کر وہ نظر آنے والی پہلی سڑک پر چل پڑی تھی۔ اسی لمحے دوسری طرف سے ایک کار آ کر مونی کے مکان کے سامنے رکی اور اس سے اتر کر ایوان اندر کی طرف بڑھا۔ اندر آتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ پھر اسے مونی کی لاش نظر آئی، اس کا جسم گرم تھا یعنی اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ایوان تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور سڑک پر نکل آیا۔

روینہ نے کار کا ارتعاش محسوس کیا تو پلٹ کر دیکھا اور پھر تیزی سے بھاگی، اس نے ایوان کی کار پہچان لی تھی۔ اس سڑک پر کہیں جائے پناہ نہیں تھی پھر اسے بائیں طرف کسی فیکٹری نما عمارت کے آگے نظر آئے وہ اس طرف گھوم گئی۔ ایک چھوٹی دیوار کو پھلانگ کر وہ دوسری طرف آئی۔ کار اس طرف نہیں آ سکتی تھی اس لیے ایوان اس سے اتر کر اس کے پیچھے آنے لگا۔ روینہ فیکٹری کی عمارت میں داخل ہوئی تو وہاں بڑے سے ہال میں کئی افراد کام کر رہے تھے، مشینیں چل رہی تھیں۔ روینہ ایک مزدور کے پاس آئی۔ اسی دوران میں ایوان اندر گھس آیا، اسے دیکھ کر روینہ سمجھ کر اس مزدور کے پیچھے ہوئی۔ ایوان نے بڑا سافوٹی چاقو نکالا اور غرا کر بولا۔ ”سب یہاں سے باہر چلے جائیں فوراً۔“

مزدور دیکھ رہے تھے کہ وہ فوجی وردی میں تھا اور وہ سب سرب تھے اس لیے حکم کی تعمیل نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے باہر جانے لگے۔ ایوان نے آخری آدمی سے کہا۔ ”دروازہ باہر سے بند کر لیتا۔“

جب آخری آدمی بھی باہر نکل گیا اور فولادی دروازہ آواز سے بند ہوا تو ایوان روینہ کی طرف متوجہ ہوا لیکن وہ اس جگہ نہیں تھی۔ ایوان تیزی سے آگے آیا۔ یہاں بڑے ساڑھی کی مشینیں ساتھ ساتھ گئی تھیں اور ان کے درمیان اتنا خلا تھا کہ روینہ جیسی لڑکی دوسری طرف نکل جاتی۔ ایوان نے پورا

ہال گھوم کر دیکھ لیا مگر روینہ کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ اس جگہ سے دور نہیں گئی تھی اور یہاں سے غائب بھی نہیں ہو سکتی تھی، پھر وہ کہاں تھی؟ اس سوال کا جواب بھی اس کے اوپر لگے بڑے ساڑھے کے فولادی پائپ سے آئی آواز سے ملا۔ روینہ بھی اس کے راستے اس میں داخل ہو گئی تھی کیونکہ بھی بند تھی۔ ایوان کا فصرہ بڑھنے لگا اور وہ سوچے سمجھے بغیر بھی اس کے راستے اس کے پائپ میں گھس گیا۔ اندر راگھ کی تہی تھی لیکن اس کی وجہ سے پائپ اندر سے کھر دیا ہو گیا تھا اور اس پر چڑھا جاسکتا تھا۔

ایوان جسم تھا اس لیے اسے روینہ کے مقابلے میں زیادہ مشکل پیش آرہی تھی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ اوپر نکلنے والے آخری ایل سے مڑتے ہوئے وہ پھنس گیا اور پھر نکلنے کی کوشش میں ایسا پھنسا کہ واپس بھی نہیں جا پا رہا تھا۔ روینہ اس دوران میں آگے نکل گئی تھی۔ ایوان کی آواز سن کر اس نے مڑ کر دیکھا اور پھر اسے پھنسے پا کر وہ واپس آئی۔ ایوان کے بالکل پاس آ کر اس نے اس کا محاسبہ کیا اور اشارے سے بولی۔ ”تمہیں میری ماں یاد ہے؟“

”ہاں۔“ ایوان بولا۔ ”میری مدد کرو، میں یہاں پھنس گیا ہوں۔“

اسی لمحے نیچے ہال میں شور سنائی دیا، ایوان نے چلانے کے لیے منہ کھولا تھا کہ روینہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اس کی قمیص کی جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پہلے ہی پھنسے تھے اب منہ بھی بند ہو گیا تھا، وہ کسی صورت آواز نہیں نکال سکتا تھا۔ کارخانے میں کام کا آغاز ہو رہا تھا اور پھر کسی نے بھی میں آگ روشن کر دی۔ ایوان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں، وہ مچلنے لگا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فوراً ہی نیچے سے تیش آنے لگی۔ روینہ مسکرائی اور واپس پلٹ گئی۔ وہ آٹھی واپس گئی اور پھر چپنی سے باہر نکل گئی۔ ایوان محسوس کر رہا تھا تیش رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی اور کچھ دیر بعد وہ زندہ روست ہو کر رہ جاتا۔ اس کی ناک سے آوازیں نکل رہی تھیں جنہیں اب کوئی نہیں سن سکتا تھا۔

روینہ چپنی سے باہر نکلی اور اس نے سامنے دیکھا تو اسے ڈھلان کے پار ایک فوجی کیمپ دکھائی دیا جس پر میٹھا کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اسے وہاں جانا تھا۔ وہ ترچھی چھتوں سے اترتی زمین تک آئی اور پھر وادی میں اترنے لگی۔ خوف بہت پیچھے رہ گیا تھا، آگے امید کھڑی تھی۔

پسِ زندان

طاہر حبیب

چوتھا حصہ

عکس منظر کا ہوا یا پس منظر کا، بعض اوقات اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ سوچ کے انداز بدل جاتے ہیں مگر... یہ بھی حقیقت ہے کہ عکس بن کر تعاقب کرنے والے کبھی سائے کی ٹھنڈک نہیں دیتے۔ ان سے تنہائی دور ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں میں کمی آتی ہے۔ ایسے میں جب ہجر کا موسم طاری ہو اور ہل ہل دل پر بھاری ہو تو ان بھید بھرے لمحات میں کوئی دریافت کرتا ہے یا کسی کو پر یاد کرتا ہے۔ لیکن اس کا شمار دریافت کرنے اور تسخیر کرنے والوں میں ہوتا تھا کیونکہ اسے کٹھن کام کا جتن تھا جبکہ کسی انسان کو سمجھنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور اگر وہ انسان عورت ہو جو پہیلی بن کر جستجو بھڑکاتی ہے اور جو لفظوں میں بند ہو کر کتاب کی صورت کسی کے من میں گھر کر جائے تو کیسے ورق ورق کر کے لفظ بہ لفظ اسے کھوجنے کی لگن اس میں پیدا نہ ہو... مگر ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب آپ کی سوچ کے زندان میں کوئی قید ہو جائے... وہ بھی منظر اور پس منظر کے درمیان الجھ گیا تھا... جو کچھ اس نے دیکھا اس کی تہ میں اترا چاہتا تھا مگر... حدود و قیود کا حامی آگے بڑھنے سے قاصر تھا۔ ایسے میں یہ بستی نے اسے آنسوؤں کے سمندر میں دھکیل دیا جہاں وہ تنکا تنکا بہتا رہا اور وحشتوں کے طوفان اسے اپنے گھیرے میں لیتے رہے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ چڑھنے والا سورج اپنے دامن میں کیا کچھ سمیٹ لایا ہے۔ بالآخر پتھر سے ٹکراتے ٹکراتے اسے یہ ادراک ہوا کہ جہاں عمل ہے وہاں کہیں رگِ عمل بھی چھپا ہوا ہے... بس اسی فراست نے اسے مطمئن کر دیا... یہ اور بات کہ اس اطمینان نے بہت سوں کا چین برباد کر ڈالا تھا۔

دیارِ غیر میں انہوں نے دور کی اپنے کی

تلاش میں سرگرداں محبتوں کی کرم

فرمائیاں اور رقبوں کی

مناجیوں کی

داستان



ہادی کے کمرے میں حجاب کی تصویر اور اس انداز کی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے کمرے کی اسکرین پر تصویر کو زوم ان کیا اور ششدر رہ گئی۔ یہ حجاب ہی کی تصویر تھی، لیکن حیران کن طور پر یہ تصویر پتلون اور شرٹ میں تھی۔ حجاب کے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ یہ سائڈ پوز تھا، وہ ایک طرف جھکی ہوئی کچھ دیکھ رہی تھی۔

”اوہ گاڈ!“ ارم کے ہونٹ دائرے کی شکل میں مسکڑ گئے۔

آصف، ارم کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اس دوران میں وہ بھی تصویر دیکھ چکی تھی اور اس کے چہرے پر بھی حیرت نظر آرہی تھی۔ ”یہ دیکھو بھئی، یہ کیا سین ہے؟“ آصف نے ماہ نور اور نادیا کو متوجہ کیا۔

ارم نے جلدی جلدی کچھ مزید تصویریں دیکھیں۔ مزید کہیں حجاب کی تصویر نہیں تھی۔ ہادی ابھی تک بالکونی میں کھڑا بات کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی گفتگو اختتامی مراحل میں ہے۔ ارم نے اپنا شوذر بیگ کھولا۔ اس میں سے اپنا قیمتی موبائل فون نکالا۔ ڈیجیٹل کیمرے کے ڈس لپے پر اس نے مطلوبہ تصویر کو اپنی ضرورت کے مطابق اتار کر لیا۔

”یہ تو بڑی خامی کی چیز ہے بھئی۔“ ارم نے کہا اور اپنے موبائل فون کے کیمرے کے ذریعے حجاب کی تصویر اپنے موبائل فون میں منتقل کر لی۔ رزلٹ بہت اچھا رہا۔

”یہ چپکے چپکے کیا چکر چل رہے ہیں ارم؟“ ماہ نور نے آنکھیں نیچا گئیں۔

”مجھے کیا پتا۔“ ارم نے منہ بنا کر کہا۔

”لگتا ہے کہ جلال سے تمہاری شادی کو حجاب نے ہضم نہیں کیا۔ وہ ری ایکشن دینے کے موڈ میں ہے۔“

”ری ایکشن ساری ایکشن۔ یہ تو تھلکے بچ جائے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اندر خانے کوئی گڑبڑ ہو بھی چکی ہے۔ جلال بھائی شاید اسی لیے حجاب کو میکے سے واپس گھر نہیں لائے بلکہ پرانی کوئی لے گئے ہیں۔“ آصف نے خیال ظاہر کیا اور سوالیہ نظروں سے ارم کو دیکھنے لگی۔

”مجھے تو کچھ پتا نہیں یار۔ ان سائڈ کیا کر رہے ہیں یہ لوگ۔“ ارم نے کہا۔

”اتنی بھولی نہ بنو۔ پتا تو بہت کچھ ہوگا تمہیں۔ بس ہم سے شیر نہیں کر رہی ہو۔۔۔۔۔۔ لیکن ایسی باتیں چھٹی نہیں ہیں جان من۔“ ماہ نور نے لقمہ دیا۔

”اچھا چپ ہو جاؤ۔ لگتا ہے وہ آرہا ہے۔“ ارم نے کہا اور کیمرہ واپس شیشے کی تپائی پر رکھ دیا۔ اس کے ذہن

میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ایسی باتیں جنگ کی آگ کی طرح پھلتی ہیں۔ چہ میگوئیاں تو کافی ہاؤس والے واقعے کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں اور ان چہ میگوئیوں کو ہوا دینے میں بکس پر وہ ارم ہی کا ہاتھ رہا تھا۔ مگر اب تو کھلم کھلا باتیں کی جارہی تھیں۔ روم میں راؤ خاندان کی تین چار فیملیاں رہائش پذیر تھیں، دہلیہ خاندان کے بھی دو تین گھر تھے۔ ان سب لوگوں کے ہاتھ ایک نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز خبر آگئی تھی۔ خبر میں کچھ تو سنسنی کا مواد واقعی موجود تھا، بہت سا مریج سالہ بھی لگا لیا گیا تھا۔ بر ملا کہا جا رہا تھا کہ پاکستان سے آنے والے شاعر محمد ہادی کے ساتھ حجاب کا باقاعدہ معاشرتی چل رہا ہے۔ حجاب اپنی دوست ماریہ کی شادی کے بہانے اسی سے ملنے بیٹھ گئی تھی۔ وہاں وہ دونوں خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے۔ بعد ازاں ہادی، حجاب کے پیچھے ہی پیچھے روم چلا آیا بلکہ جلال کے گھر تک بھی پہنچ گیا۔ یہاں ہونٹوں کو اسکوڑے میں بھی وہ دونوں مسلسل ملتے رہے ہیں۔۔۔۔۔

حجاب چونکہ الگ تھلک درس والے گھر میں تھی اور اس نے فون بھی بند کر چھوڑا تھا اس لیے وہ اس انتہائی تشویش ناک صورت حال سے بے خبر تھی۔ اسی بے خبری کے عالم میں وہ کل دل کڑا کر کے ڈرائیور کے ساتھ بازار بھی گئی تھی۔ اس نے ارم کے لیے کچھ کامدار سوٹ خریدے تھے، یہ اپنے گلے پر اپنے ہاتھ سے چھری چلانے والی بات تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ اس کا یہ عمل جلال کے اشتعال کو کم کرنے میں مدد دے گا۔ ویسے بھی جو کام اب کرنا تھا وہ تو کرنا ہی تھا۔ پھر اس میں تاخیر اور ہچکچاہٹ سے قاعدہ؟ پچھلے دو تین روز میں وہ بہت روٹی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رورور اس کا سر اور سینہ دونوں خالی ہو گئے ہیں۔ اب اس کے اندر ایک طرح کا ٹھہراؤ سا پیدا ہونے لگا تھا۔ وہی ٹھہراؤ جو اکثر ویسٹر ہاری ہوئی عورت کا سہارا بنتا ہے اور اسے بدترین حالات میں بھی زندگی کو جاری رکھنے کے راستے دکھاتا ہے۔

آج رات جلال آرہے تھے۔ حجاب نے خود کو بے مشکل کیپوز کیا۔ فریش ہو کر لباس تبدیل کیا۔ اس کی ہدایت پر شریفان نے سندھی بریانی بنائی اور جلال کے پسندیدہ سچ کباب تیار کیے۔ شریفان کچھ خاموش خاموش مگر شام کے بعد تک حجاب کو اس کا اندازہ نہیں ہوا۔ آٹھ بجے کے قریب جب حجاب کھانے کی میز سجا رہی تھی اور جلال کے

آنے میں آدھ پون گھنٹا باقی تھا، حجاب کو شریفان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آئی۔ وہ الماری میں سے بیچ نکالتے نکالتے رک گئی۔ ”کیا بات ہے شریفان! کوئی مسئلہ ہے؟“ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ باقاعدہ سسکیاں لینے لگی۔ حجاب نے اسے اپنے ساتھ لگا دیا اور وجہ پوچھی۔ وہ پہلے تو خاموش رہی۔ پھر بولی۔

”باجی! دوپہر کو میں نے آپا خاتم کو فون کیا تھا، وہ تو سو رہی تھیں۔ کلثوم (ملازمہ) سے بات ہوئی۔ وہ بڑی پریشان کرنے والی باتیں بتا رہی تھی۔“

”پریشان کرنے والی؟ کیا مطلب؟“

”وہ۔۔۔۔۔۔ آپ کے بارے میں بتا رہی تھی جی۔ مجھے ڈھاڈا دکھ ہوا ہے۔ ان لوگوں کو تو بس باتیں بنانے کا بہانہ چاہی دہوندا ہے۔“

”مجھے کھل کر بتاؤ شریفان۔ کیا باتیں بتا رہے ہیں؟“ وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ ”مجھے تو اس کے پیچھے بھی اس بی بی ارم کا ہتھ ہی لگدا ہے جی۔ وہ ہتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس نے باتیں مشہور کی ہیں جی، آپ کے اور۔۔۔۔۔۔ ان ہادی صاحب کے بارے میں۔“ شریفان کی آواز لرز رہی تھی۔

حجاب کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ منہ خشک ہونے لگا۔ وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ ”مجھے تفصیل سے بتاؤ شریفان۔“

”میرا دل کرتا ہے کہ منہ توڑ دوں ان سب کے۔ اللہ کرے ان کی زبان مڑے۔ کہتے ہیں آپ اور ہادی صیب پہلے سے ایک دوجے کو جانتے ہیں اور ہادی صیب آپ ہی سے ملنے کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہادی صیب نے چھوٹے بھائی جان ظہیر کو بھی چکر دیا۔ انہوں نے چھوٹے بھائی جان کو اس طرح بے وقوف بنایا کہ وہ ان کو اپنے گھر میں ہی لے آئے۔ بعد میں وڈے بھائی جان کو شک ہوا تو انہوں نے ہادی صیب کو گھر سے نکال دیا۔ لیکن آپ دونوں۔۔۔۔۔۔ پھر بھی باز نہیں آئے اور ہونٹوں میں ایک دوجے سے ملتے رہے۔“

حجاب کا سر گھوم رہا تھا۔ ”کون کر رہا ہے یہ باتیں؟“ اس نے پوچھا۔

”سارے ہی کر رہے ہیں جی۔ مجھے تو لگدا ہے کہ وڈے بھائی جان تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ یہ لوگ کسی تصویر کی گل بھی کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ تصویر ہادی صیب کے پاس سے ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ بڑی بے ہودہ تصویر ہے۔ میں تو مگر بھی ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتی جی۔“

”تصویر۔۔۔۔۔۔ کیسی تصویر؟“ حجاب کی آواز حیرت آمیز دکھ سے کپکپا رہی تھی۔

”مجھے کیا پتا جی۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔ آپ کے لیے بڑی مصیبت بن جائے گی۔ مارنے والے کا ہتھ پکڑا جاسکتا ہے، پر بولنے والی کی زبان کو کیسے پکڑا جائے۔ وہ تو کمپیوٹر کی گل بھی کر رہے ہیں۔ کیا کہتے ہیں جی اس سڑن جو گے کو۔۔۔۔۔۔ انٹرنیٹ۔“

”آہو جی۔ کہتے ہیں کہ آپ کا اور۔۔۔۔۔۔ ہادی صیب کا معاملہ انٹرنیٹ پر شروع ہوا تھا۔ بڑھتے بڑھتے گل یہاں تک پہنچی ہے۔ باجی! آپ وڈے بھائی جان سے گل کریں فوراً اور ان باتوں کو روکیں جی۔ یہ کوئی معمولی گل ہے اس طرح کسی کو بدنام کرنا۔۔۔۔۔۔“

حجاب کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ اسے لگا کہ اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ اس نے کرسی کا سہارا لیا اور بیٹھ گئی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ وہ پیچھے تو ہٹ گئی تھی، پسا تو ہو گئی تھی۔ اب یہ لوگ اسے کہاں تک دھکیلتا چاہتے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آئی کہ یہ جھوٹ کون تراش رہا ہے اور کس لیے؟ ظاہر ہے کہ شریفان جھوٹ تو نہیں بولی سکتی تھی۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں تو اس کی زبان تک آئی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں اپنے ابو امی کے چہرے گھومے۔ وہ تو پہلے ہی حالات کی سنگینی سے ڈرے سہمے تھے۔ ابھی تو وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ان تک جلال کی دوسری شادی کی خبر کس طرح اور کس انداز سے پہنچائے کہ انہیں کم سے کم دچکا لگے (حالانکہ وہ اس معاملے سے یکسر بے خبر بھی نہیں تھے) اب یہ دوسری مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی جلال کو فون کرے اور اسی سے اس بارے میں بات کرے۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ جلال اب پندرہ بیس منٹ میں پہنچنے ہی والا تھا۔

وہ بے چینی سے برآمدے میں ٹھہرے لگی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد جلال کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور حجاب کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔

جلال اندر آیا تو حجاب نے السلام علیکم کہا۔ اس نے جواب دیا۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوا کرتا تھا۔ آج بھی چہرہ سنجیدہ تھا۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ اس کے کانوں تک وہ باتیں پہنچی ہیں یا نہیں جو ابھی شریفان نے بتائی ہیں۔

”پہنچ کریں گے؟“ حجاب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جلال نے مختصر جواب دیا۔

”کھانا لگواؤں؟“

”نہیں، ابھی نہیں۔ میں ذرا ایک فون کر لوں۔“

وہ فون والے کمرے میں چلا گیا۔ لینڈ لائن پر کسی سے پانچ دس منٹ بات کی۔ پھر باہر آ گیا۔ دونوں ڈانٹنگ روم میں ہی صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ملازم باہر گیراج میں تھا۔ شریفان بچن کی طرف جا چکی تھی۔ ”میلانو میں کام ہو گیا؟“ حجاب نے پوچھا۔

”ہوں۔“ جلال نے مختصر جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”تم کیا کرتی رہی ہو؟“

”آج تو گھر میں ہی رہی ہوں۔ کل تھوڑی دیر کے لیے بازار گئی تھی۔“

”بازار؟“

”ہاں کچھ شاپنگ کی تھی۔“ حجاب نے کہا اور اٹھ کر الماری سے کامدار جوڑوں والے ڈبے اٹھالائی۔

”یہ کیا ہے؟“

”کپڑے۔“ حجاب نے جواب دیا اور ڈبے کھول کر جلال کو دکھانے لگی۔ جلال نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور حجاب کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بتاؤ، کیا چاہتی ہو تم؟“ اس کا انداز دیکھ کر وہ پوری جان سے لرز گئی۔

”م..... میں سمجھی نہیں جلال۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارے سوا اس دنیا میں

نرے احق اور گدھے بھرے ہوئے ہیں۔“

”جلال..... پلیز..... مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کریں۔ م..... میں جانتی ہوں، میرے بارے میں باتیں بنائی جا رہی ہیں اور.....“

”تیرے بارے میں باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ تجھ پر الزام لگ رہے ہیں۔ سارے دشمن ہو گئے ہیں تیرے، بس ایک تو ہی پاک صاف رہ گئی ہے یہاں پر۔“

”آپ کل سے میری بات سنیں جلال۔“

وہ پھٹکارا۔ ”میں نے جو سنا تھا سن لیا ہے اور جو دیکھا تھا وہ بھی دیکھ لیا ہے۔ یہ کیا کرتی پھر رہی ہے تو..... یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”میں نے کچھ نہیں کیا جلال!“

”کیا تو اس حرامزادے سے مل نہیں رہی؟ اس کے ساتھ وینس میں سیر سپانے نہیں کرتی رہی؟ تم دونوں کے انٹرنیٹ پر رابلے نہیں رہے ہیں؟“

”یہ غلط ہے جلال! یہ جھوٹ ہے۔“ وہ لرز کر بولی۔

ایک زمانے کا تھپڑ حجاب کے گال پر بڑا اور اس کے خوب صورتی سے سنوارے ہوئے بال اچھل کر اس کے چہرے پر آ گئے۔ جلال نے ایک تصویر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ بھی جھوٹ ہے..... یہ بھی فراڈ ہے؟“

حجاب نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کی ریڑھ میں سرد لہر دوڑ گئی یہ پینٹ اور شرٹ میں اس کی تصویر تھی۔ پس منظر میں وینس کا ایک پل دکھائی دے رہا تھا۔

جلال دہاڑا۔ ”یہ اس حرامزادے کے کمرے سے ملی ہے جس کے ساتھ تو نے وینس میں اور پتا نہیں کہاں کہاں مستیاں کی ہیں۔ لعنت ہے تجھ پر اور لعنت ہے ایسے والدین پر جنہوں نے تیرے جیسی بیٹی پیدا کی۔ ڈوب مر شرم سے۔“

ایک طرف یہ پردہ داریاں، یہ دین داریاں ہیں اور دوسری طرف یہ گھبرے..... تو بہر وہن ہے، نا پاک عورت ہے۔“

اس نے بیٹھے بیٹھے زور سے ٹانگ چلائی جو حجاب کے سینے پر لگی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کھانے کی میز پر جا گری۔ کچھ دیر پہلے اس نے بڑی محنت سے جو میز سجائی تھی وہ درہم برہم ہو گئی۔ پلیٹیں گر کر ٹوٹ گئیں۔ گلاس فرش پر لڑکھکتے نظر آئے۔ وہ اسے بے دردی سے مارنے لگا۔ وہ پکار رہی تھی۔

”جلال..... میں نے کچھ نہیں کیا۔ جلال میری بات سنیں۔“

یقیناً مار دھاڑا اور رونے چلانے کی یہ ساری آوازیں ملازمین تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان میں سے کون اندر آنے اور مداخلت کرنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ وہ بکسر جلال کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے ایک واکنگ اسٹک اٹھائی اور اس سے حجاب کو پینٹے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے اس کے ماں باپ اور اس کے خاندان کو بدترین القابات سے نواز رہا تھا۔ یہ لمحے حجاب کے لیے قیامت سے کم نہیں تھے۔ کوئی اس کے جسم کو جیسے دکھی ہوئی سلاخوں سے داغ رہا تھا۔ وہ چلاتی رہی مگر آواز جیسے اس کے سینے کے اندر ہی گونج رہی تھی۔ آخر چھڑی ٹوٹ گئی۔ جلال نے اسے گردن سے دبوچا اور دھکا دے کر دیوار سے دے مارا وہ لہراتی ہوئی کامدار جوڑوں کے ڈبوں پر جا گری۔ زرق برق لباس بکھرتے نظر آئے۔

وہ گر جا ”حرامزادی! شاہنگیں کرتی پھر رہی ہے، اس یار کو دکھانے کے لیے۔ اس کو سمجھانے کے لیے.....“

تیری جیسی عورت کو تو چوراہے میں سنگسار کرنا چاہیے۔“

حجاب کا گلا خشک ہو کر بند ہو چکا تھا۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ یہ شاہنگ اس نے اپنے لیے نہیں اس کی ہونے والی بیوی کے لیے کی ہے، اس کے حکم کے مطابق۔ وہ نیم جان سی

اونٹھے منہ پڑی تھی۔ اس کی پشت پر انگارے دھک رہے تھے۔ جلال نے ایک اور ٹھوک اس کے پہلو میں رسید کی اور چلیاں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔

وہ تصویر چند منٹ کے فاصلے پر ٹوٹی ہوئی پلیٹوں اور گلاسوں کے پاس پڑی تھی۔ حجاب نے اشک بار نظروں سے تصویر کو دیکھا۔ یہ اسی کی تھی۔ وینس کی کسی گلی میں اتاری گئی تھی۔ اگر یہ ہادی کے کمرے سے نکلی تھی تو یقیناً اس نے چوری چھپے ہی ایسا کیا تھا۔ ہادی کے لیے اس کا رنج اور طش کچھ اور بڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے سامنے ہو اور وہ اس کا منہ لوچ لے۔

☆☆☆

ہادی ہوٹل واسکوڈے کے کمرے میں تھا۔ اس کی بے چینی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ حجاب سے اس کی آخری ملاقات تب ہوئی تھی جب جلال اسے کافی ہاؤس سے لے کر گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اس کی شکل دیکھ سکا تھا نہ آوازیں سکا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ ہادی کے ذہن میں آتا تھا کہ شاید صورت حال اتنی خراب نہ ہو جتنی وہ سوچ رہا ہے۔ دو روز پہلے ارم اور اس کی کزنز وغیرہ یہاں آئی تھیں۔ وہ بھی بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں باتیں کرتی رہی تھیں۔ ان کے رویے سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ حجاب کی طرف کسی طرح کی ناخوشگوار صورت حال موجود ہے۔ ظہیر کی طرف سے بھی کوئی ”ایسا دیا“ رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ہادی اپنے ذہن میں اس خوش فہمی کو جگہ دے رہا تھا کہ شاید اس دن جلال واقعی اتفاق سے کافی ہاؤس آ پہنچا ہو اور یہ کہ شاید آج حجاب خود ہی اس سے رابطہ کر لے، یا کیا پتا خود ہی یہاں آن پہنچے۔ حجاب کو بھی پتا تھا کہ آج روم میں اس کا آخری دن ہے۔ کل اس نے فلورنس یا پیرا کا رخ کرنا ہے۔ سابقہ پروگرام کے مطابق آج حجاب نے آنا تھا اور ہادی کو الوداع بھی کہنا تھا۔ وہ صبح ہی نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ حجاب اس سے ملنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی نکالے گی اور کچھ نہیں تو فون تو ضرور ہی کرے گی۔

ابھی تک اس نے روم سے جانے یا نہ جانے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ چلا گیا تو اس کا دل و دماغ نہیں رہ جائے گا۔ وہ اپنا خالی، مٹی کا جسم لے کر جائے گا، جس میں زندگی کی کوئی امنگ ترک نہیں ہوگی، بلکہ شاید زندگی ہی نہ ہوگی۔ کوئی اتنی جلدی کسی کے جسم و جان پر قبضہ کر سکتا ہے، ہادی نے بھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے عشق

و محبت کے گداز جذبے کے بارے میں سیکڑوں شعر کہے تھے، ہزاروں صفحات بھر دیے تھے مگر عملی طور پر اس جذبے سے اس کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا اور اتنی شدت سے کہ وہ دنگ تھا۔ اسے اپنے سامنے ایک بند گلی بالکل صاف نظر آرہی تھی۔ اس کا دماغ چلا کر کہہ رہا تھا کہ سفر نامہ ممکن ہے، آگے بڑھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ رک جاؤ..... پلٹ جاؤ۔ دم گھٹ جائے گا، مر جاؤ گے۔ بند گلی راستہ نہیں دے گی، مگر سب جانتے بوجھتے بھی وہ بے ساختہ قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا، کسی انہونی کی خواہش نے دل کے اندر کہیں گہرائی میں گھات لگا رکھی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی چلتے رہو، تم نے سنا نہیں کبھی کبھی دیواریں راستہ دیتی ہیں۔ تم نے سنا نہیں کبھی پتھر پھسلتے ہیں اور کیا تم نے سنا نہیں کبھی پانیوں میں دیے جل اٹھتے ہیں۔

اجانک اس کا جسم سننا اٹھا۔ دروازے پر دم دستک ہوئی تھی۔ ”حجاب..... حجاب“ اس کے دل نے دیوانہ وار پکارا اور دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ اس نے دروازے کے Peep Hole میں آنکھ لگائی اور مایوسی ایک لہر بن کر اس کے سینے میں دوڑ گئی۔ وہاں حجاب کا دیور ظہیر نظر آ رہا تھا۔

اس نے خود کو کچھ کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ ”السلام علیکم ظہیر بھائی۔“

”وعلیکم السلام!“ ظہیر نے کہا۔ آج پہلی بار ہادی اس کے فرہ چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ رہا تھا۔ دونوں صوفوں پر آ بیٹھے۔ ظہیر نے سفید رومال نکال کر پیشانی سے پینا پونچھا۔

”کیا حال ہے ظہیر بھائی؟“

”بس ٹھیک ہوں۔ ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں تم سے۔“

”کہیے جناب!“

”پہلی بات تو یہ ہے ہادی..... کہ میں تمہاری طرف سے بے حد مایوس ہوا ہوں۔ تم ایک فن کار ہو۔ فن کار تو اتنا سخت دل اور بے حس نہیں ہوتا۔“

”میں سمجھا نہیں ظہیر بھائی؟“

”میرے خیال میں اب تم یہ ”بھائی“ کا لفظ بھی نہ ہی کہو تو بہتر ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد اس کی محبت کس کم ہی نکلتی ہے۔“ ظہیر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ جلال صاحب نے تمہیں کچھ بتایا ہے۔“

وہ بھڑک کر بولا۔ ”جلال صاحب نے نہیں بتایا..... پورا خاندان بتا رہا ہے۔ تو تھوڑی سی ہے تم پر..... اور ساتھ ہی مجھ پر بھی۔ میں تمہیں مہمان بنا کر گھر لے گیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اندر خانے کیا چکر چلے ہوئے ہیں یہاں۔“

”تم غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو ظہیر۔“

”پلیز خاموش ہو جاؤ۔ پلیز..... میرا منہ نہ کھلاؤ۔ ورنہ بات بہت بڑھ جائے گی۔“ وہ بلند آواز میں بولا۔

”مگر..... کچھ پتا تو چلے۔“

”تمہیں سب پتا ہے..... اور مجھے بھی پتا ہے۔ بس ان باتوں کو ڈھکا ہی رہنے دو تو بہتر ہے۔“ ظہیر نے بہت کمبیر لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بھائی جلال سخت غصے میں ہیں..... اگر غصے میں ان سے کوئی التماسید حاصل ہو گیا تو مزید بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تمہارے حق میں اور شاید ہمارے حق میں بھی بہتر یہی ہے کہ تم فوراً روم سے چلے جاؤ۔ میں..... تمہیں کوئی دھمکی نہیں دے رہا۔ سمجھو، تمہارے خیر خواہ کی حیثیت سے تمہاری منت کر رہا ہوں..... اگر کہتے ہو تو..... تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں..... یہ دیکھو۔“

آخر میں ظہیر کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا اور اس میں گزارش کی جھلک آگئی۔

ہادی کے اندر بھی ابال آتے آتے رہ گیا۔ وہ بھی ذرا سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ظہیر بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ جو کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ آپ اس طرح مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ مجھے صفائی کا موقع نہیں دینا چاہتے نہ دیں، مگر میں اتنا ضرور کہوں گا۔“

”تم جو کہنا چاہتے ہو ہادی! میں سب سمجھ رہا ہوں۔ بس حالات اس وقت اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ غلطی چھوٹی ہے یا بڑی، میں نہیں کہہ سکتا مگر اس کا جو نتیجہ نکلا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ میری ”ریکونسٹ“ ہے تم سے کہ تم چلے جاؤ۔“

ہادی نے ایک بار پھر طویل سانس لی اور بولا۔ ”میں تو پہلے ہی سامان باندھ کے بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ سامنے ایچی اور بیگ پڑا ہے۔ کل صبح دس بجے میں نے نکل جانا ہے پوسا کے لیے۔“

ظہیر نے ایک بار پھر سفید رومال سے اپنے چہرے کا پینا پونچھا۔ ہادی کے بیک سامان کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے ہادی! میں چلتا ہوں، امید ہے کہ تم اپنے وعدے کا پاس کرو گے۔“

”آپ بے فکر ہو۔“

ظہیر خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ ایک بکولا آئے اور چلا جائے۔

ہادی اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اسے اپنی پیشانی پر بیسے کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں سلی فون کا میوزک بج اٹھا۔ ہادی نے فون اٹھایا، یہ شریفان کا نمبر تھا۔ ”ہیلو۔“ شریفان کی دہلی دہلی آواز سنائی دی۔

”ہیلو، شریفان! کیا بات ہے؟“

شریفان کچھ دیر خاموش رہی، پھر سرگوشی جیسی گھوکی آواز میں بولی۔ ”صیب جی! یہ کیا ہو گیا ہے۔ میرا تو دل روتا رہا ہے۔ باجی کی حالت میرے تو دل دیکھی نہیں جا سکتی۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“

”صیب جی، یہ کچھ کیا نہیں ہوا۔“

”کچھ پتا تو چلے۔“

وہ توقف سے بولی۔ ”وڈے بھائی جان نے باجی سے بہت زیادہ جھگڑا کیا ہے مارا ہے ان کو۔ وہ کل سے بھوکی بھاسی بس روندی جا رہی ہیں۔ یہ سب کیوں ہوا صیب جی؟ ایسا نہیں ہونا چاہی داسی۔ چھوٹے منہ سے وڈی گل نہیں کرنا چاہندی۔ پر آپ کو کچھ سوچ لینا چاہی داسی۔“

”شریفان! مجھے لگتا ہے کہ بات کا جھگڑا بنایا جا رہا ہے۔“

”بات ہے تو جھگڑا بنا ہے نا جی۔ پوری برادری وچ باتیں ہو رہی ہیں۔ باجی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں۔ آپ پڑھ لکھے ہیں۔ جانتے ہی ہوں گے، عورت و چاری کی عزت شیشے سے زیادہ مچی ہوتی ہے اور یہ شیشہ ٹٹ گیا ہے باجی جی کے لیے۔“

ہادی نے کہا۔ ”شریفان! مجھے نہیں پتا کہ تم لوگ کیا سوچ رہے ہو۔ سچ صرف اتنا ہے کہ حجاب میرے ساتھ تین چار دفعہ گھومنے کے لیے نکلے۔ میں شہر دیکھنا چاہتا تھا اور وہ شہر کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہے اور اس کے بارے میں کچھ لکھ بھی رہی تھی، اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ میں حجاب کے گھر والوں کے سامنے بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔“

”آپ کے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا صیب جی! گل بہت آگے نکل گئی ہے۔ یہ لوک کہہ رہے ہیں کہ آپ دونوں میں بہت پہلے سے جان بچھان ہے۔ آپ کمپیوٹر پر گل بات کرتے رہے ہیں اور آپ صرف باجی حجاب سے ملنے کے لیے ہی پاکستان سے آئے تھے۔“

پیس زندان

لگ گئے تھے۔ اس دوران میں ارم نے یا اس کی کسی ساتھی نے کام دکھایا تھا۔ کمرے میں اس تصویر کو دیکھ کر کسی سلی فون وغیرہ میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ یہ سارے خیالات بس دو چار سیکنڈ میں اس کے ذہن سے گزر گئے۔ شریفان ناراض لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”صیب جی..... وڈے بھائی جان غصے کے بڑے تیز ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے لیے چنگا بکی ہے کہ اب یہاں سے چلے جائیں۔“

ہادی نے کہا۔ ”شریفان! تم اس وقت درس والے گھر میں ہو؟“

”ہاں جی ادھر ہی ہوں۔“

”کیا تم ایک دفعہ..... صرف ایک دفعہ میری بات اپنی باجی سے کر سکتی ہو؟“

”توہ کرس جی! کیسی گل کر رہے ہیں آپ؟ میری چڑی ادھر جائے گی۔ ویسے بھی میں آپ کو بتا دوں۔ باجی سے گل نہ کر کے آپ فائدے میں رہیں گے۔ وہ بھی بہت غصے میں ہیں۔ آپ سے بڑی سخت گل کریں گی۔“

”چلو سخت ہی کرے لیکن.....“

”نہیں صیب جی۔“ اس نے تیزی سے بات کاٹی۔

کہانے دو جے شہر مئی تھی تو آپ سے ملنے گئی تھی۔ انہوں نے کہیں سے باجی کی ایک فونو بھی ڈھونڈ لی ہے۔ یہ فونو آپ نے ہی اتاری ہوئی ہے۔“

”میں نے اتاری ہوئی ہے؟“

”ہاں جی، آپ کے کمرے سے نکلے ہے وہ فونو۔ اس میں باجی کے سر پر چادر ہے نہ دوپٹا۔ انہوں نے پتلون پہنی ہوئی ہے۔ یہ سب بہت بھیڑا ہوا ہے صیب جی! پتا نہیں اب کیا بنے گا۔“

ہادی کے کان میں سائیں سائیں کر رہے تھے۔ حجاب کی ایک تصویر تو اس کے کمرے میں موجود تھی۔ سیکڑوں دوسری تصویروں کے درمیان کہیں پڑی تھی۔ یہ تصویر حجاب کے گھر والوں تک کیسے پہنچی؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا..... پھر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی پورے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ تین چار دن پہلے ارم اور اس کی ساتھی لڑکیاں اس سے ملنے یہاں کمرے میں آئی تھیں۔ کہیں انہوں نے تو کمرے سے چھینٹ چھاڑ نہیں کی تھی؟ اس نے تھوڑا سا سوچا اور اسے یقین ہونے لگا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اس دن لاہور سے والدہ کی کال آگئی تھی۔ وہ کال سننا ہوا باہر بالکونی میں چلا گیا تھا۔ شاید آٹھ دس منٹ

اپریل 2014ء کے

شمارے کی ایک جھلک

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



نغمۂ مرگ • افریقا کی فضاؤں میں جاری سیاست کے سودا گروں کا خوف ناک کھیل..... امجد رفیس کے قلم سے

گرداب • دلت اور عداوت کی گوشوں میں انقلاب کی جانب گامزن گلوبل کاسٹل سفر

جواہری • احمد اقبال کے شہرِ بزم سے لیکہ جواہری کے کھیل کے نئے انداز

مغرب کے نالے انتہا • مغرب کی تہذیب و ماحول کی تہ کا سچ اور حجت کی ناقابل فراموش کہانیاں

سرورق کی کھانیاں

بطی کھانی • زندگی کی باری بار کے سب کچھ باریک بینی سے..... روبینہ رشید کی نثر کی کہانی

دوسری کھانی • جگ..... اور حجت کی فیصلے کا غماز نہیں کرتے..... کاشف زبیر کی کاش

آپ کے تہرے... شمس... شمس... شمس... اور نئی دلچسپ باتیں... کھانیں

”یہ اب نہیں ہو سکتا۔ میں تو بس اتنا کہتا چاہندی ہوں۔ آپ ساڑھے علاقے کے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر اپنا پنڈا اپنے لوگ یاد آتے تھے۔ پر جو ہوا بہت برا ہوا۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ چلے جائیں یہاں سے۔“

اس سے پہلے کہ ہادی مزید کچھ کہتا، شریفان تیزی سے بولی۔ ”اچھا کوئی اس پاسے آ رہا ہے۔ میں بند کرتی ہوں۔ رب را کھا۔“

فون بند ہو گیا۔ ہادی سکتہ زدہ سا بیٹھا رہا۔ حالات اس کی توقع سے کہیں زیادہ خراب تھے اور یقیناً اس خرابی میں اس کا اپنا کردار بہت زیادہ تھا۔ حجاب کے بار بار کے انکار کے باوجود وہ اس سے ملنے پر اصرار کرتا رہا اور ایک طرح سے اس کو جذباتی و اخلاقی دباؤ کا شکار کیا۔ تصویر والی غلطی بھی سراسر اس کی اپنی ہی تھی۔ اس نے چوری چھپے تصویر اتاری اور مزید غلطی یہ کی کہ..... کئی ہفتے گزرنے کے باوجود اسے کمرے میں ہی رہنے دیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس طرح تصویر تک پہنچے گا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اسے اب جانے کا..... بھاگنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔ مگر وہ کیسے بھاگ سکتا تھا۔ وہ تو زنجیروں میں جکڑا گیا تھا۔ یہ زنجیریں عشق صادق کی ایسی دھات سے بنی تھیں جنہیں بھی کوئی پھٹلا سکا ہے نہ توڑ سکا ہے۔ یہ دکھائی نہ دینے والی زنجیریں بہ ظاہر دھاگے سے کمزور ہوتی ہیں مگر اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ اپنے قیدی کو کھینچ کر موت کے منہ میں بھی لے جائیں تو وہ کسمسا نہیں سکتا۔ ہادی بھی یہاں سے جانے کا نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ صرف اور صرف حجاب کی مصیبت کے بارے میں سوچ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت کو کیسے کم کیا جاسکتا ہے۔ وہ کئی گھنٹے تک شدید قسم کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ذہن پر بھاری بوجھ تھا جو بڑھتا جا رہا تھا۔ شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ کمرے میں بیٹھے بیٹھے دل گھبرانے لگا۔ اس کے سر میں بھی ختم تھے، وہ ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ یہی ساڑھے دس گیارہ کا وقت ہوگا۔ اس نے سگریٹس لیے اور چہل قدمی کرتا ہوا آگے تک نکل گیا۔ ہوٹل کا عقبی علاقہ قدرے گنجان تھا۔ تنگ سڑکیں تھیں، چھوٹے چھوٹے ریسٹوران اور مساجد گھر تھے۔ جہاں سیاحوں کی مٹھی چانی کر کے انہیں ہلکا پھلکا کیا جاتا تھا اور ان کی جیب کو بھی۔ نو جوان اور کم سن اطالوی لڑکیاں اس کام میں ماہر تھیں۔

واپسی پر ہادی ذرا رستہ بھول گیا۔ وہ ایک تنگ نیم

تاریک سڑک سے گزر کر ایک جانی پہچانی بلڈنگ کی طرف جا رہا تھا۔ جب ایک ایجنٹ نما شخص نے اس کے قریب آکر پوچھا۔ ”رات گزارنے کے لیے کوئی ساہمی درکار ہے بالکل جوان، 1-2 شہین؟“ ہادی نے نفی میں سر ہلایا۔

اسی دوران میں عقب سے کسی جان دار شخص نے ہادی کی گردن کو اپنے بازو میں دبوچا اور گھما کر ایک دیوار کے دے مارا۔ وہ الٹ کر پتھروں کی سڑک پر گرا۔ دو شخص ٹائپ اس پر چھپے۔ ہادی نے ٹانگ چلا کر ایک تو دور ہٹ کر دیا۔ دوسرے نے اسے چھاپ لیا، پھر دو اور افراد اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ انہوں نے ہادی کو زوردار کے اور ٹھوکریں رسید کیں۔ اس کی گھڑی کھینچ لی۔ جیب سے نقدی اور ٹریول چیک نکال لیے موبائل اندرونی جیب میں ہوئی۔ اس کی وجہ سے بچ گیا۔ ان میں سے ایک انڈین یا پاکستانی لگ رہا تھا۔ ایک بڑے کئے اطالوی نے لبا جاتو نکالا اور ہادی کی گردن پر رکھتے ہوئے خوفناک لہجے میں کچھ کہا۔ پھر نیکار انہوں نے ہادی کو چھوڑا اور قریبی ٹیڈوں میں گم ہو گئے۔ سارا واقعہ بہ مشکل تین سیکنڈ کے اندر ہو گیا۔ خالی

میں بس دو تین افراد نے دور ہی سے یہ منظر دیکھا۔ ہادی خود ہی اٹھا۔ خود ہی کپڑے جھاڑے اور رومال سے اپنے ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے چل دیا۔ ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ سیدھا ہوٹل پہنچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ فرسٹ ایڈ کا کچھ سامان اس کے بیگ میں موجود تھا۔ اس نے خود چہرے کی چونٹوں کو ٹریٹ کیا اور کپڑے بدلے۔ بہ ظاہر روم کے کوچوں میں ہونے والی راہزنی کی ایک علامت واردات لگ رہی تھی مگر..... یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ بھی ہو سکتا تھا۔ غنڈوں میں موجود ایشیائی باشندے کا چہرہ ہادی کی نگاہوں میں گھومتا لگا۔ پہلے اس نے ڈپٹی ہاشم کو فون کرنے کا سوچا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ بہر حال اگر اسے ڈرانے کی کوشش کی گئی تھی تو یہ پوری طرح ناکام ہوئی تھی۔ جہاں تک اس کے یہاں سے جانے کا تعلق تھا وہ یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔

بہر حال وہ رات اس نے جیسے زہریلے کاتھوں لوٹے ہوئے گزاری۔ اگلے روز صبح پانچ بجے وہ اپنے دوست احباب کو آگاہ کیے بغیر ہوٹل سے چیک آؤٹ کر گیا۔ اس نے اپنا سیل فون بھی آف کر دیا تھا۔ بہ ظاہر اس شہر کو چھوڑ رہا تھا لیکن اصل میں صرف علاقہ بدل رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے مسلسل رسنے والا خون اب بند ہو گیا تھا۔ دن تو بجے تک وہ روم سینٹر کے گنجان علاقے میں ایک

”آپ محبت سے بول لیتے ہیں بس یہ فیس ہی فیس ہے جی۔ یقین کریں آج کل مجھے کھانا پینا بھولا ہوا ہے۔ اب بھی آپ ہی کے کام پر نکلا ہوا ہوں۔ ایک کافی مہنگا کلب ہے۔ وہاں گھستا پڑا ہے۔ وہ اطالوی لڑکا اسٹیل آیا ہوا ہے یہاں، جو یونیورسٹی میں ارم کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ اس کا پورا نام اسٹیل کی وڈ ہے۔“

”خرچے وغیرہ کی فکر نہ کرو گزاری، بس رزلٹ اچھا نکلتا چاہیے اور جلدی۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں جناب عالی۔“ گزاری نے سراپا عجز و انکسار بن کر کہا۔ وہ صحیح معنوں میں کرایے کا ٹٹو تھا۔ جتنا زیادہ بھاڑا، اتنی زیادہ وقاداری اور محنت۔

ہادی نے فون بند کر دیا اور صوفے پر نیم جان سا ہو کر دراز ہو گیا۔ ارم کے بارے میں کئی سوال ذہن میں ابھر رہے تھے، لیکن یہ سارے سوال ایک گھبر پریشانی کے نیچے دب گئے۔ یہ حجاب کی پریشانی تھی، وہ سوچ رہا تھا۔ حجاب کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی۔ کیا گزر رہی ہوگی اس پر؟

☆☆☆

حجاب دو تین دن سے درس والے گھر میں خاموش پڑی ہوئی تھی۔ شریفان بہت اصرار کر کے اسے ایک دو لقمے کھلا دیتی تھی۔ دوبارہ جلال کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ بس اس نے اتنا کیا تھا کہ مار پیٹ کے اگلے روز شریفان کو فون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ فلاں الماری میں فرسٹ ایڈ کی چیزیں پڑی ہیں، اگر حجاب کو کہیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے تو کر دے۔

حجاب کو ہر گز خواہش نہیں تھی کہ جلال خود یہاں آئے۔ بلکہ وہ تو گیسٹ کے قریب کسی گاڑی کا ہارن سن کر بھی ڈر جاتی تھی کہ کہیں یہ جلال کی گاڑی نہ ہو۔ یہ کیسی قسم ظریفی تھی۔ ایک بیوی جس کو اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ کا انتظار ہونا چاہیے، اس آہٹ سے دہشت زدہ تھی۔ یہ بات اب اچھی طرح حجاب کی سمجھ میں آرہی تھی کہ اس گھر میں اس کی زندگی بدتر بلکہ بدترین ہو جائے گی۔ اگر وہ یہاں رہے گی تو بے حد حقیر صورت میں۔ تو پھر وہ کیا کرے؟ کس طرف جائے؟ نہ جائے مائدن نہ پائے رقتن۔ ناقابل برداشت جس بڑھتا جا رہا تھا، اور تازہ ہوا کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر اپنی جان لینا حرام نہ ہوتا تو شاید وہ اس بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیتی۔ ان تین دنوں میں اس کے ابوائی کی طرف سے بھی کوئی خبر نہیں تھی، کوئی رابطہ نہیں

غرابے نامی ہوٹل میں منتقل ہو چکا تھا۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل صاف ستھرا تھا۔ کسی اپنی باشندے کا تھا۔ عملہ بھی زیادہ تر اسپیشل ہی تھا۔ ہادی کے دل و دماغ میں آگ سی بھڑکی ہوئی تھی۔ ارم کا چہرہ بار بار اس کے تصور میں آتا تھا اور نفرت کی ایک بلند لہر اٹھتی تھی۔ یہ عورت حجاب کی دشمنی میں بہت آگے نکل گئی تھی۔

دفعتاً گزاری کا خیال ہادی کے ذہن میں آیا۔ اس نے سیل فون آن کیا۔ اس پر پہلے ہی گزاری کا پیج آیا ہوا تھا۔ ”کالی۔“

ہادی نے اس کا نمبر ملایا۔ فوراً ہی گزاری کی باریک آواز سنائی دی۔ ”ہیلو ہادی صاحب! آپ کہاں تھے۔ میں نے کافی فون کیے۔ آپ کے ہوٹل کے نمبر پر بھی کال کی۔ پتا چلا کہ آپ صبح سویرے نکل گئے ہیں۔ آپ کو تو دس گیارہ بجے جانا تھا شاید۔“

”ہاں، پروگرام تبدیل ہوا ہے۔“

”اب کہاں ہیں آپ؟“

”سمجھو روم کے آس پاس ہی ہوں۔ بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم بتاؤ۔ کیوں کال کر رہے تھے؟“

”گنگری میوز ہے جی، ارم کے بارے میں۔ پچھلے سال ارم سے میری بہت کم ملاقات ہوئی ہے۔ اس دوران میں وہ کیا کرتی رہی ہے، اس کا کچھ کچھ کھوج اب مل رہا ہے۔ پچھلے سال وہ ایک آرٹس یونیورسٹی سے ایف آئی اے کر رہی تھی۔ لیکن پتا چلا ہے کہ اس نے اپنا آخری سمسٹر فریز کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی بیماری تھی، کم از کم یونیورسٹی کے ریکارڈ میں تو یہی بات بتائی گئی ہے۔ لگتا ہے کہ بیماری والی بات ٹھیک ہی ہے۔ کیونکہ ارم کی ایک دوست سے بھی اس کی تصدیق ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ چار پانچ ماہ یونیورسٹی سے غیر حاضر رہی۔ اس دوران میں ایک دوبار فون پر اس سے بات ہوئی تو وہ کافی کمزور محسوس ہو رہی تھی۔ اسے سینے یا گلے کا کوئی انفیکشن تھا جس کے بارے میں اس نے کھل کر کچھ نہیں بتایا۔“

”تم سے بھی اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی؟“ ہادی نے گزاری سے پوچھا۔

”نہیں جی اور اسی سے مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ کوئی گڑبڑ معاملہ تھا۔ میں اس کی پوری ٹوہ لگا رہا ہوں جی۔ بس ایک دو دن میں، میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔“

”ایک دو دن کا مطلب ایک دو دن ہی ہو تو اچھا ہے..... سمجھو کہ ارجنٹ فیس کا کام ہے۔“

ہوا تھا۔ پتا نہیں ان پر کیا گزر رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ ٹوٹی ہوئی بائیس گردن کی طرف ہی آتی ہیں۔ حجاب بھی تم کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اسے انہوں کی ضرورت تھی۔ وہ انہیں اپنے دل کا حال بتانا چاہتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اب چھانے کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ان کے سامنے اپنے سارے زخموں سے پردہ اٹھا دے اور پھر ان کے کندھوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

پہلے اس نے فون کرنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ صورت حال اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ فون کرنا بے معنی سمجھوس ہوا۔ اس نے شریفان کو بتایا کہ وہ امی کے گھر جا رہی ہے۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔

”کب تک آ جاؤ گی باقی؟“

”ابھی کچھ پتا نہیں۔“

ملازم نکلی لے کر آیا۔ حجاب اس گھر کی طرف روانہ ہوئی جو مصیبتوں سے بھری اس دنیا میں اس کا آخری سہارا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ امی، ابو اور بھائی تک کیا باتیں پہنچی ہیں اور ان کے احساسات و خیالات کیا ہیں۔ وہ بس یہی دعا کر رہی تھی کہ امی ان سارے حالات سے بے خبر ہوں۔ ان کی طبیعت پہلے ہی بگڑی ہوئی تھی۔

دن کے گیارہ بجے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئی۔ ملازم نے سلام کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ ”سب خیریت تو ہے نا؟“ حجاب نے ہم کر پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”امی کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں ہیں جی۔ شاید سو رہی ہیں۔“

حجاب اندرونی حصے میں داخل ہوئی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ تپائی پر ایک شولڈر بیگ پڑا ہوا تھا، جس سے حجاب کو اندازہ ہوا کہ اس کی پھوپھی آئی ہوئی ہیں۔ ان کا نام زیادہ تھا۔ حجاب دھڑکتے دل سے امی والے کمرے کی طرف گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازہ کھولنا مناسب نہیں سمجھا۔ یقیناً پھوپھی اندر ہی موجود تھیں۔ وہ گھر کے ڈرائنگ روم میں سے گزر کر اسٹڈی والے کمرے کی طرف آگئی۔ ”فیصل..... فیصل کہاں ہو بھی؟“ اس نے چھوٹے بھائی کو پکارا۔

وہ تو نہیں آیا لیکن واش روم کی طرف سے ابو نمودار ہو گئے۔ حجاب نے ان کا چہرہ دیکھا اور دل گئی۔ وہاں دنیا بھر کی سنجیدگی سمٹ آئی تھی۔ آنکھوں میں ایک ایسی بیگانگی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ٹھکے ہوئے انداز

میں ان کی جانب دیکھ رہی تھی جب وہ اچانک مڑے اور چہرہ قدموں سے اسٹڈی روم میں داخل ہو گئے۔ اپنے پیچھے انہوں نے دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ لگا، اس کے بالائی حصے کا شیشہ ٹوٹ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اندر سے کٹدی چڑھادی۔ جس طرح لوہا متناطیس کی طرف کھینچا ہے وہ اپنے ابو کی طرف لگی۔ ”ابو جی..... ابو جی!“ اس نے کرب میں ڈوب کر کہا اور دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بولٹ تھا۔ وہ رو دی۔ کسی ایسی بچی کی طرح جو چوٹ کھا کر آئی ہو اور اپنے باپ سے اپنا درد بیان کرنا چاہتی ہو۔ ”ابو جان دروازہ کھولیں۔ پلیز ابو جان۔“ اس نے کہا اور دستک دینے لگی۔

اندر بیکسر خاموشی تھی۔ وہ ہولے ہولے دستک دیتی رہی اور پکارتی رہی۔ ”ابو جی! دروازہ کھولیں۔ میری بات سنیں۔ ایک بار میری بات سن لیں۔“ کوئی جواب نہیں آیا۔ آہ، ایسا تو بھی نہیں ہوا تھا، جب جب اسے چوٹ لگی تھی، جب جب کوئی کھلونا ٹوٹا تھا، جب جب اسے کسی دکھ نے گھیرا تھا، اس نے اپنے ابو کو پکارا تھا۔ وہ تڑپ کر اس کی طرف آئے تھے، کبھی گود میں اٹھایا، کبھی سینے سے لگا یا اور کبھی ماتھا چومنا تھا۔ آج وہ ابو دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی بن جائے۔ ایسی معصوم زبان میں پکارے کہ اس کے ابو دروازہ کھول دیں۔

وہ ان کی ٹانگوں سے چٹ جائے۔ ان سے کہے۔ ”ابو میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر بھی مجھے مارا گیا ہے۔ ابو مجھے چوٹ لگی ہے..... مجھے درد ہو رہا ہے۔“

وہ اسے گود میں اٹھا لیں، اسے پککاریں۔ ان کے سینے سے لگ کر وہ سب کچھ بھول جائے۔ یکا یک اسے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے فیصل کھڑا تھا۔ وہ تیز سرگوشی میں بولا۔ ”یہ کیا کر رہی ہیں باجی! ادھر امی کے کمرے تک آوازیں جا رہی ہیں، وہ ابھی ابھی سوئی ہیں۔“

حجاب دروازے کے سامنے سے اٹھی اور سسکتی ہوئی اپنے چھوٹے بھائی کے گلے لگ گئی۔ فیصل کے انداز میں گرجوٹی نہیں تھی۔ اس کے بازو بے جان سے رہے۔ وہ کراہی۔ ”فیصل! میں بے قصور ہوں۔ مجھ پر الزام لگاتے جا رہے ہیں۔ تم تو جانتے ہو تمہاری بہن کسی ہے۔ کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟ بتاؤ کیا وہ کر سکتی ہے؟“

فیصل خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر

رہے تھے۔ اس نے یہ مشکل اتنا ہی کہا۔ ”آپ کو ابھی یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے امی کی طبیعت کتنی خراب ہے۔“ تو میں کہاں جاؤں فیصل! تم ہی بتاؤ کہاں جاؤں۔“

”میں آپ کو کیا بتاؤں، لیکن اگر امی کو ان حالات کی ہچک بھی پڑ گئی تو وہ زندہ نہیں رہ سکیں گی۔“

”اچھا، مجھے بتاؤ فیصل! کیا تم بھی ان باتوں پر یقین کرتے ہو جو میرے بارے میں کہی جا رہی ہیں.....؟“

اس سے پہلے کہ فیصل جواب میں کچھ کہتا۔ سامنے دروازے میں پھوپھو زیادہ کی صورت نظر آئی۔ حجاب کو دیکھ کر ان کے چہرے پر لکیروں کا جال سا پھیل گیا۔ بچپن میں جب وہ اپنی بڑی بڑی سفید آنکھوں سے حجاب اور فیصل وغیرہ کو گھورتی تھیں اور کسی بات پر جھڑکتی تھیں تو وہ بالکل سہم جایا کرتے تھے، آج بھی حجاب کی کچھ یہی کیفیت ہوئی۔ انہوں نے سرسراہٹ آواز میں کہا۔ ”کب آئی ہو تم؟“

فیصل نے کہا۔ ”ابھی پانچ دس منٹ پہلے۔“ انہوں نے عینک کے پیچھے سے ایک تیز نگاہ حجاب پر ڈالی اور جھک کر بولیں۔ ”ادھر آؤ میرے ساتھ۔“ اس کے بعد وہ فیصل سے مخاطب ہوئیں۔ ”تم امی کے پاس جاؤ۔“

حجاب نے ایک نظر اسٹڈی کے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کسی معمول کی طرح پیچھو کے پیچھے چل دی۔ وہ اسے لے کر چھوٹی سیڑھیوں کی طرف آئیں۔ میڑھیوں کا دروازہ لاک تھا وہ اسے کھولنے لگیں۔ اسی دوران میں حجاب کی نگاہ سامنے کمرے میں گئی۔ یہ وہی،

بینش کی دیوار گیر تصویر والا کمرہ تھا۔ حجاب کی نگاہ تصویر پر پڑی۔ بینش جیسے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج اس کی آنکھوں میں حجاب کو دکھ کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں حجاب سے کہا۔ ”تم نے اب سب کچھ دیکھ لیا نا جب! یہاں چھوٹی سی جبارت کو بھی بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ تم سے بھی شاید وہی غلطی ہوئی جو مجھ سے ہوئی تھی۔ تم نے بھی مار کھا کر پیچھے ہٹتے ہٹتے کہیں ذرا سے قدم جماتے چاہے اور یہی تمہارا ناقابل معافی گناہ بن گیا۔“

پھوپھو اسے لے کر بالائی منزل کے ایک کمرے میں آگئیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ گرجیں۔ ”اب کیا کرنے آئی ہو یہاں؟ ماں کی جان لینے آئی ہو؟ کوئی کسر رہ گئی تھی جواب پوری کرتی ہے؟“

وہ بلک پڑی۔ ”پھوپھو! میں بے قصور ہوں۔ مجھ پر

الزام لگائے جا رہے ہیں۔ آپ جانتی ہیں میں کیسی ہوں۔“

”ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ تمہیں جانتے ہیں۔ لیکن جو کچھ سامنے آرہا ہے اسے کیسے جھٹلائیں، کس منہ سے انکار کریں۔ تو نے کاکل ملی ہے ہم سب کے منہ پر۔ تیرا باپ مسلسل رو رہا ہے تین دن سے۔ تیری ماں تیرے دکھ میں پہلے ہی پڑی ہوئی ہے بستر پر۔ اب اور کیا چاہتی ہے تو..... اور کیا چاہتی ہے؟“ انہوں نے آخری الفاظ اتنے زور سے کہے کہ پورے کمرے میں گونج سنائی دی۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”پھوپھو! اگر آپ بھی مجھے گناہ گار سمجھتی ہیں تو پھر اپنے ہاتھوں سے مجھے ختم کر دیں۔ میری جان لے لیں۔ میں آپ سب کو اپنا خون معاف کرتی ہوں، پلیز پھوپھو بار دیں مجھے۔“

”رونے چلانے سے جھوٹ بچ نہیں بن جائے گا۔ مجھے بتاؤ تم، کیا تم ویش میں اس لڑکے سے ملتی نہیں رہی ہو۔ کیا تم چوری جیسے یہاں ہوئیں اس کے پاس نہیں جاتی رہی ہو؟ تم نے نئی چادر خریدی، نئے جوتے اور بیگ لیا تاکہ کوئی تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر پہچان نہ سکے۔ تم نے اپنے شوہر کو دھوکا دیا، ہم سب کو دھوکا دیا۔ یہاں ماں سے کہہ کر جاتی تھیں کہ شاپنگ کے لیے جا رہی ہوں اور وہاں اس کے ساتھ ہوٹلوں میں کھانے کھاتی تھیں۔ کیا تم نے ویش میں ساری شرم جاتا کر پتلون اور شرٹ میں تصویریں نہیں بنوائی ہیں؟ کس کس بات کو جھٹلاؤ گی تم..... تمہاری کس کس بات پر پردہ ڈالیں گے ہم۔ تم نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھا۔“

وہ صوفے سے اٹھ کر قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے پھوپھو کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”پھوپھو، مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اتنی بڑی نہیں جتنی مجھے سزا دی جا رہی ہے۔ کسی نے میری بات سنی ہی نہیں۔ کسی نے مجھے صفائی کا موقع ہی نہیں دیا۔“

”کیا صفائی پیش کرے گی تو۔ کیا وہ گیا ہے تیرے پاس کہنے کو۔“ پھوپھو نے اپنے گھٹنے جھٹک کر اسے دور ہٹانے کی کوشش کی۔

وہ ان کے گھٹنوں سے چپے چپے بولی۔ ”پھوپھو! میں نے اس گھر میں بہت کچھ سہا ہے، جتنا آپ لوگوں کو پتا ہے اس سے دس گنا زیادہ جھٹلائے۔ کبھی آف نہیں کی۔ لیکن پھوپھو! میں کیا کروں۔ جو آخری ظلم مجھ پر ڈھایا جا رہا تھا وہ مجھ سے نہیں جھٹلایا گیا۔ مجھے خود اپنی ہی سمجھ نہیں آتی تھی کہ

مجھے کیا ہو رہا ہے۔ شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن یہ مجھ سے ہوا ہے پھوپھو، میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔ لیکن مجھے اس غلطی پر مجبور کر دیا گیا۔ اس بندے نے مجھے دھکیل دھکیل کر دیوار کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ اپنی سوچوں پر میرا اختیار ہی نہ رہا۔ آپ اسے جرات کہہ لیں، مزاحمت کہہ لیں یا بغاوت..... مگر یہ ہوا مجھ سے۔ لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں، میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ میں ہادی صاحب کے ساتھ گھومی پھری ضرور ہوں لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے میں فیصل کے ساتھ گھوموں یا آپ کے ساتھ گھوموں۔ مرد تو سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے کیا عورت کے لیے اتنی سی رعایت بھی نہیں۔“

”لیکن تو کیوں گھومی پھری۔ کیا بین گئی تھی تیری جان پر؟ کیا ہمارے خاندان میں پہلے بھی ایسا ہوا ہے۔ بغیر کسی کی اجازت کے تو ایک غیر مرد کے ساتھ خود کو نقاب میں چھپا کر پارکوں اور ہوٹلوں میں پھرتی رہی، کون قبول کرے گا اسے۔“

”پھوپھو! جن دنوں میں دبش گئی، ان دنوں مجھے پہلی بار پتا چلا تھا کہ جلال اور ارم میں تعلق ہے، مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے لیے دنیا میں سب کچھ ختم ہو گیا ہے، اتنی گھٹن تھی پھوپھو، اتنی گھٹن تھی کہ کیا بتاؤں۔ مجھے لگتا تھا کہ میری سانس رک گئی ہے اور میں تڑپ رہی ہوں، میرا دل چاہا کہ میں کچھ دنوں کے لیے سب کچھ بھول بھال جاؤں۔ کوئی اور لڑکی بن جاؤں کچھ اور ہو جاؤں۔ کھلی ہوا میں کھل کر سانس لوں۔ شاید بے موت مرنے سے بچ جاؤں۔ وہ جو تصور آپ نے میری دیکھی ہے ان ہی دو تین دنوں میں اتاری گئی ہے۔ میں مانتی ہوں یہ میری غلطی تھی، میں کیا بتاؤں پھوپھو! مجھے جب جب ارم اور جلال کے بارے میں کوئی بات پتا چلتی تھی، مجھے کچھ ہو جاتا تھا۔ میں جلال سے تو کچھ نہیں کہہ پاتی تھی مگر میرے اندر ایک شدید گھٹن پیدا ہو جاتی تھی۔ اس گھٹن سے نکلنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں چلاتی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے، شاید یہ بھی ایک رد عمل ہی تھا کہ میں چند بار ہادی صاحب کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے نکلی۔ وہ بہت شریف بندے ہیں، میں امی ابو کی قسم کھاتی ہوں پھوپھو! میرے اور ان کے درمیان کچھ نہیں ہے۔“

”کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے دادیلا کرنے سے وہ داغ دھل جائے گا جو تمہارے اور ہم سب کے چہروں پر لگا

ہے۔ عورت کی عزت کتنی جلدی برباد ہوتی ہے یہ سب کو یاد ہے اور تمہاری عزت برباد ہو چکی ہے۔“

”کیوں برباد ہو چکی ہے پھوپھو۔“ وہ ہنسی۔ ”مجھے سزا دیں جتنی میں نے غلطی کی ہے۔ میں نے چوری کی ہے میرا ہاتھ کاٹ دیں، مجھے پھانسی تو نہ چڑھا لیں۔“

”تو نے چوری نہیں کی۔ تو نے ڈاکا ڈالا ہے اور اس ڈاکے میں تجھ سے ہم سب کی عزت کا خون ہوا ہے۔“ پھوپھو نے بے حد دکھ سے کہا۔ ”کیا تو سچی سی بچی تھی۔ کیا تجھے نہیں تھا کہ یہ مردوں کی دنیا ہے۔ یہاں عورتوں کی غلطیوں کو معاف کرنے کا رواج نہیں ہے۔ ان کو سزا دینے کے لیے بھانے ڈھونڈے جاتے ہیں اور تو نے تو ایک ایسا بھانہ دیا کہ جس سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا۔ جب تجھے پتا تھا کہ تو جلال کو اس کے ارادے سے نہیں روک سکتی، پھر اپنے اندر بغاوت کے جراثیم کیوں پیدا ہونے دیے تو نے؟ جب تیرے پر ہی کئے ہوئے تھے تو پھر کیوں پھڑ پھڑائی؟ خود کو لہو لہان کیا اور ہم سب کو بھی۔ تجھے پرلے درجے کا بے وقوف اور احمق نہ کہیں تو کیا کہیں ہم۔“

”میں جانتی ہوں، مجھ سے بہت برا ہوا پھوپھو، لیکن اب بتائیں میں کیا کروں۔ میں پھر کہتی ہوں، اگر میرے مرنے سے کچھ بہتر ہو سکتا ہے تو میں اسی وقت جان دینے کو تیار ہوں۔“

”جان دینا آسان ہوتا ہے، زندگی جیتنا مشکل۔ اب یہ زندگی جیتی بھی ہے اس کا سامنا کر۔“

”مجھے راستہ بتائیں پھوپھو۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا۔ اب اس گھر میں میرے لیے تکلیف اور ذلت کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہے۔ جلال اب شادی بھی کرے گا اور مجھے جوئے کی ٹوک پر بھی رکھے گا۔ وہاں میرے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔ میں ان دیواروں میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ مرنا آسان ہوتا ہے زندگی رہنا مشکل۔“

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون؟“ پھوپھو نے پوچھا۔

”میں ہوں فیصل۔“ باہر سے مدھم آواز سنائی دی۔

پھوپھو زاہدہ نے دروازہ کھولا۔ فیصل نے دھیمے لہجے میں کچھ کہا۔ پھوپھو زاہدہ حجاب سے مخاطب ہو کر بولیں۔

”تیرے ابو بلا رہے ہیں مجھے۔ ابھی آتی ہوں، تو نیچے نہ

پیس زنداں

آ جانا دادیلا کرنے کے لیے۔“

دروازہ زور سے بند کر کے وہ نیچے چلی گئیں۔ حجاب کو لگ رہا تھا کہ وہ آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہے۔ بالکل بے سہارا..... بے خانماں۔ سینے میں اس کا دل چڑیا کی طرح پھڑک رہا تھا۔ یہ درود یوار جو بچپن سے اس کے سامنے تھے ایک دم اجنبی لگنے لگے تھے۔ جیسے وہ بھی اس سے خفا ہو چکے ہوں۔ اس کا جی چاہا کہ نیچے چلی جائے۔ ابو کی ہانگوں سے لپٹ جائے۔ مگر پھوپھو حکم دے گئی تھیں یہیں رہنے کا۔

پھوپھو کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ ان کی سفید آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں پہلے سے گہری تھیں اور پردہ چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے دروازہ دوبارہ اندر سے بند کیا۔ ٹھہری آواز میں بولیں۔

”حجاب! کل شام جلال آیا تھا یہاں..... گھٹنا ڈیڑھ گھٹنا تمہارے ابو کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے بہت کچھ کہا جو ہمیں سننا پڑا۔ ہم اس کے سامنے بولنے کے قابل کہاں ہیں۔ قرضے کی وجہ سے پہلے بھی نہیں تھے، اب تو کوئی کسری نہیں رہ گئی۔ تیرے ابو کے دل پر بڑا بوجھ ہے۔ مجھے تو ڈر ہے انہیں کچھ ہونہ جائے۔“

”میرے ابو ای کو کچھ نہ ہونے دیجیے پھوپھو۔ وہ پہلے ہی دکھوں کے مارے ہوئے ہیں۔“ وہ ان کے گھٹنے پکڑ کر سسکتے لگی۔

اس نے پھوپھو کے چہرے پر پہلی بار قدرے نرمی کے آثار دیکھے۔ ان کی سفید آنکھوں میں کمی سی تیر گئی۔ وہ بولیں۔

”بینی! میں تیری منت کرتی ہوں جو کچھ بھی ہے لیکن تو واپس اپنے گھر چلی جا۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے ہماری رہی سہی عزت بچ سکتی ہے۔ میں جانتی ہوں تیرے لیے بہت مشکل ہوگا لیکن اگر ہم سب کی بھلائی چاہتی ہے تو یہ کر گزر۔“

”پھوپھو لیکن.....“

”لیکن سے آگے انکار شروع ہوتا ہے بینی! انکار نہ کر۔ یہ دیکھ..... میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد شوہر بیویوں کے منہ پر فوراً طلاق کے تین طمانچے مار دیتے ہیں۔ لیکن جلال تجھے اب بھی رکھنے کو تیار ہے۔ یہ موقع گنوا دیا تو بہت بچھٹانا پڑے گا۔ جا کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگا لے اور اس کی سمجھت کی پناہ لے۔ یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔“

حجاب نے سر اٹھا کر پھوپھو کی طرف دیکھا۔ ان کی

آنکھیں ابھک رہی تھیں..... وہ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ”پھوپھو، میرے ابو جی کیا کہتے ہیں؟“

”وہ بھی یہی کہتے ہیں بینی۔“

آنسو دھاروں کی طرح حجاب کی آنکھوں سے نکلے اور نکلے زدہ رخساروں پر پھسلنے لگے۔ کچھ دیر کمرے میں کنبھیر خاموشی طاری رہی۔ پھر حجاب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پھوپھو نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ آہستہ آہستہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ وہ خاموشی سے ان کا کندھا جھگوٹی رہی۔ کچھ دیر بعد فکست خوردہ آواز میں بولی۔ ”ابو جی سے کہیں، ایک بار مجھ سے مل لیں۔“

”ابھی نہیں حب! ابھی وہ بہت پریشان ہیں۔ کچھ دن بعد میں خود ملواؤں گی تمہیں ان سے۔“

وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ پھر ہولے سے گویا ہوئی۔

”اچھا، مجھے ایک بار امی کی صورت تو دیکھ لینے دیں۔“

وہ ذرا تذبذب کے بعد بولیں۔ ”چل تو ادھر بیٹھ۔ میں نیچے سے ہو کر آتی ہوں، پھر تجھے بتاتی ہوں۔“

وہ نیچے چلی گئیں۔ حجاب اپنے ہی گھر میں غیروں کی طرح سکڑی سٹی بیٹھی رہی۔ اس کا گھر کون سا تھا؟ یہ والا؟ درس والا؟ یا کوئی بھی نہیں۔ کیا عورت کا اپنا گھر کوئی بھی نہیں ہوتا۔ کیا وہ زندگی کا بیشتر حصہ ”اپنے گھر“ کے بغیر ہی گزار دیتی ہے۔

چند منٹ بعد پھوپھو آئیں اور اسے لے کر نیچے آگئیں۔ ایک بار پھر کہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ”وہ دوا کھا کر سوئی ہوئی ہیں۔ بس دروازے سے ہی دیکھ لو۔“ پھوپھو نے سرگوئی کی۔

کمرے کے دروازے کو نیم وا کر کے اس نے امی کو دیکھا۔ وہ کروٹ لے کر لیٹی تھیں۔ برسوں کی بیمار نظر آتی تھیں۔ گلو کوڑکی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر دو آؤں کی پھر مار تھی۔ اس نے اپنی سسکی پہ مشکل روکی۔ آنکھوں آنکھوں میں ماں کی پیشانی چوی اور پلٹ آئی۔

☆☆☆

درس والا گھریا پرانا گھراب ایک زنداں تھا اور وہ اس کی قیدی تھی۔ اس زنداں کا داروغہ کون تھا۔ شاید وہی شخص جو تین برس پہلے اسے بڑی شان سے بیاہ کر لایا تھا۔ زنداں تو بہر حال زنداں ہوتا ہے لیکن جب قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے اور پکڑ کر دوبارہ زنداں میں ڈالا جاتا ہے تو اس کی سزا میں مزید کڑی ہو جاتی ہیں۔ حجاب سے

بھی تو یہی قصور ہوا تھا۔

حجاب نے خود کو درس والے گھر کی دیواروں تک محدود کر لیا۔ اس نے سفل فون مستقل طور پر بند کر دیا تھا، لینڈ لائن فون کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھائی تھی۔ سات آٹھ روز تک اسے کچھ خبر نہیں ہوئی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ جلال کے قدم بھی گھر میں نہیں پڑے تھے۔ نویں روز جلال گھر میں آیا۔ اس کے پاس کچھ کاغذات تھے۔ سپاٹ لہجے میں اس نے کچھ رسمی کلمات ادا کیے اور پھر کاغذات حجاب کے سامنے رکھ دیے۔ حجاب نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ یہ دوسری شادی کا اجازت نامہ تھا۔ وہ قارح تھا۔۔۔۔۔ وہ مفتوح تھی۔ لڑائی ہار چکی تھی۔ اسے اپنا شہر قارح کے حوالے کرنا تھا۔ اس نے خاموشی سے دستخط کر دیے۔

تین روز بعد شریفاں ہی کی زبانی اسے پتا چلا کہ جلال نے ارم سے نکاح کر لیا ہے اور اب وہ اس گھر میں سسر جلال ہے۔ نکاح میں دونوں طرف کے بیس تیس افراد ہی شریک ہوئے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ بعد میں کسی وقت ویسے کی دعوت کی جائے گی۔ ارم نے اس گھر میں اپنے لیے وہی کمر چننا تھا۔ جس کا چناؤ پہلے بھی حجاب کے دل کا خون کرتا رہا تھا۔ وہ شکست کے آداب جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا اسے اب بہت کچھ جھیلنا پڑے گا۔

آٹھ دس روز بعد جب جلال کا کچھ ذاتی سامان درس والے گھر میں آیا تو حجاب حیران ہوئی۔ یہ جلال کے کپڑے تھے، اس کے جوتوں کے چند جوڑے، واش روم کا سامان اور اس طرح کی دیگر اشیا۔ سامان لانے والے ملازمین نے بتایا کہ رات کو جلال صاحب تشریف لائیں گے، کھانا بھی ادھر ہی کھائیں گے۔

نوبے کے لگ بھگ جلال آگیا۔ اس کے موڈ کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہر حال وہ آگ بگولا یا سب یا نہیں تھا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں کچھ دیر باہیچے میں چہل قدمی کرتے رہے۔ حجاب نے لرزتی آواز میں اسے شادی کی مبارک باد دی۔ جلال کی باتوں سے پتا چلا کہ اس نے ہفتے میں تین دن یہاں اور تین دن نئے گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔

وہ اس پر اعتراض کرنا چاہتی تھی۔ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے وہ اپنی نوبیاہتا بیوی کو وقت دے۔ لیکن اعتراض کرنے، بلکہ شاید بولنے کا حق بھی وہ کھو چکی تھی۔

جلال پورے تین دن درس والے گھر میں رہا، لیکن

اس سے حجاب کو کوئی خوشی نہیں ملی۔ خوشی تو دور کی بات ہے۔ وہ ایک عجیب سے درد بھرے تباؤ کا شکار رہی۔ وہ خود کو ایک بیوی سے زیادہ قیدی سمجھ رہی تھی۔۔۔۔۔ ایک ایسی قیدی جسے کسی شرمناک جرم میں سزا ملی ہو اور جس کی نگاہیں جیل حکام کے سامنے ہر وقت جھکی رہتی ہوں۔ یہ کیا احساس تھا؟ یہ کیا سوچیں تھیں۔ وہ اپنے اندر ہی جیسے لہو لہان ہوئی رہتی تھی۔ اس نے ویش میں ہادی سے ملاقات کے حوالے سے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا تھا وہ جلال نے خاموشی سے سن لیا تھا لیکن کیا اعتبار کیا تھا اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

باہر کے حالات کی اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ ایک دن جلال کے دو تین خشک جملوں سے بس اسے اتنا پتا چلا تھا کہ اس کی امی کی طبیعت اب بہتر ہے۔ ان کے ٹیٹ بھی ٹھیک آئے ہیں۔

تین دن کے بعد جلال کی آمد بند ہوگئی۔ اب ایک بار پھر وہ تھی اور شریفاں تھی۔ حجاب نے شریفاں کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ باہر کی کوئی خبر اسے نہیں دے گی۔ اس نے شریفاں کا سفل فون بھی اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اسے شک تھا کہ شاید ہادی کے پاس شریفاں کا نمبر موجود ہے اور وہ اس نمبر پر رابطے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اب وہ ہادی کا خیال بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے نفرت سی ہوگئی تھی اس کے تصور سے۔ نماز کے بعد بھی وہ باقاعدگی سے یہ دعا کرتی تھی کہ وہ یہاں سے جا چکا ہو اور اب بھی پلٹ کر اپنی صورت نہ دکھائے۔ وہ اپنے آپ کو بھی کوئی تھی کہ ایک بیچانی کیفیت کے زیر اثر وہ اپنی حدود کو بھول گئی۔ ہادی کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی اور فراموش کر گئی کہ دل میں سچائی بھی ہو تو ظاہری عمل لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع دیتا ہے اور مرد و زن کی بے جا قربت میں شر کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہادی کا اس سے بار بار رابطہ کرنا، اس کے گھر تک پہنچ جانا اور فونو گراف کے حوالے سے اس کی غفلت یہ سب چیزیں حجاب کو دکھ دیتی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی کہ شاید عورت کے معاملے میں سب مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کسی وقت وہ خود بھی اپنا تجزیہ کرنے بیٹھ جاتی۔ اسے لگتا کہ اس کے دل و دماغ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں ایک اہم کردار بینش والے دردناک واقعہ کا بھی ہے۔ اس بے انصافی کے اثرات نے اندر ہی اندر اس میں جڑ پکڑی اور جب باہر کے حالات بھی دگرگوں ہوئے تو اس کے اندر

حراحت کی چنگاریاں چمک اٹھیں۔ وہی حقیقت کہ انسان کے اندر کے جذبے بھی نہ کسی نہ کسی طور اپنا اظہار ضرور کرتے ہیں۔

چوتھے روز جلال نے دوبارہ درس والے گھر آنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ اس مرتبہ بھی تین دن اس کے پاس رہ کر وہ واپس نہ گھر چلا گیا۔ یہ سب دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت تھی۔ لیکن دھوپ بھی جلانے والی اور چھاؤں بھی۔ حسب توقع تین دن گزرنے کے بعد جلال کی آمد پھر شروع ہوگئی۔ وہ ہر وقت ڈری رہتی تھی کہ کہیں باتوں باتوں میں پھر کوئی نازک موضوع نہ چھڑ جائے۔ مگر شکر تھا کہ جلال ماضی قریب کی کسی بات کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ اس مرتبہ وہ اس کے لیے کچھ چیزیں بھی لایا تھا۔ کچھ جوڑے کپڑوں کے تھے۔ ایک راڈ گھڑی تھی۔ اس مرتبہ وہ ہوٹل میں کھانا کھانے بھی گئے۔ یہ ساری دلکش باتیں تھیں، لیکن ان کے پیچھے جو وجہ تھی وہ بھی حجاب اچھی طرح جانتی تھی اور اس وجہ نے جلال کی ان مہربانیوں کو بالکل بے معنی کر دیا تھا۔ وہ اپنے قبضے کے مطابق اپنی دونوں بیویوں میں ”عدل“ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے شک اسے ایسا کرنا چاہیے تھا اور خدا کا حکم بھی یہی تھا مگر اس عدل کی بنیادی شرط ”محبت“ اس سارے عمل میں سے اوجھل تھی، اور یہی کی اس سارے عمل کو کھوکھلا دے دیتی تھی۔ ایک دن حجاب نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ ”آپ کہیں گھومنے پھرنے نہیں جائیں گے؟ میرا مطلب ہے، شادی کے بعد ارم کی خواہش ہوگی چند دن کہیں گزارنے کی۔“

”کیا مطلب؟“

”اسے لے جائیں کہیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں، ایسی بات تو نہیں۔“

”تو پھر کیا وجہ ہے؟“

وہ کہنا چاہتی تھی، وجہ یہی ہے کہ دل مر گیا ہے، لیکن ایسا کہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں ابھی پہن کر آتی ہوں۔“

”نہیں، اب ضرورت نہیں۔“ وہ جلتے بھنے لہجے میں بولا اور اٹھ کر لان کی طرف چلا گیا۔

چوتیس بجیں روز بعد ہی وہ کھچاؤ نمایاں ہونے لگا جس کا ہونا بالکل متعلق تھا۔ جب حجاب والے تین دن شروع ہوتے تھے تو پہلا دن تو قدرے بہتر گزرتا تھا، گھر میں اور بیڈروم میں بھی جلال کا موڈ قدرے بہتر رہتا تھا۔ لیکن دوسرے دن شام ہوتے ہوئے ایک طرح کی بیزاری جلال کے انداز میں نمایاں ہونے لگتی تھی۔۔۔۔۔ وہ جیسے واپسی کی گھڑیاں گنتے لگتا تھا۔ طبیعت میں جھنجھلاہٹ سی آ جاتی تھی۔ تیسرا دن وہ یکسر خراب موڈ میں گزرتا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے اسے نکلنے کی بہت جلدی ہوتی تھی۔

وہ روم کا ایک خوشگوار دن تھا۔ پہلی بارش کے بعد موسم نکھرا ہوا تھا۔ حجاب کے تین دن آج شروع ہوئے تھے۔ جلال رات کو بچے پہنچ گیا مگر آتے ہی اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ وہ فون۔۔۔۔۔ سنتے ہوئے اوپر چھت پر چلا گیا۔ حجاب جانتی تھی یہ ارم کی کال ہوگی۔ یہ کال دس پندرہ منٹ سے پہلے ختم نہیں ہوئی۔ وہ پہلے بھی فون کر لیتی تھی مگر اب اس کی کالیں لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ حجاب کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا بھی تو، وہ کرنے کے قابل کہاں تھی۔۔۔۔۔ ہاں، وہ آداب شکست جانتی تھی اور مانتی بھی تھی۔

جلال کا ”حکم“ تھا کہ آج کھانا باہر کھائیں گے، وہ تیار ہو جائے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب وہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی۔ جلال کا لایا ہوا ایک نیا سوٹ بڑی دیر تک ہاتھوں میں پکڑے کھڑی رہی۔ اسے لگا کہ یہ لوہے کا لباس ہے اور آگ کی طرح تباہ ہوا ہے۔ خود پر جبر کر کے اس نے اسے پہنا پھر ڈریسنگ فیمیل کی طرف آئی۔ اس نے سوچا کاش کوئی ایسا میک اپ ہو جو اس کے چہرے کو چھپالے۔ خاص طور سے اس تاثر کو چھپالے جو زنداں کے دारوغہ کو دیکھ کر نادم قیدی کے چہرے پر آتا تھا۔

وہ تیار ہو کر کمرے میں پہنچی تو جلال بستر پر نیم دراز تھا۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے وہ سو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ”پچھلے تین دن“ نے اسے کافی تھکا دیا ہے۔ وہ کافی دیر تک اس کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اسے کندھے سے ہلایا۔ ”جلال۔۔۔۔۔ جلال!“

اس نے نیند میں بیزاری سے کچھ کہا اور کروٹ بدل لی۔ وہ دیر تک صوفے پر بیٹھی رہی، پھر کمرے میں جا کر شریفاں سے باتیں کرنے لگی۔

شریفاں نے کہا۔ ”بھائی جان کے سر میں درد تھا، گولی بھی کھائی ہے انہوں نے۔ بارہ بجے کے قریب حجاب بھی ناکی پہن کر بیڈروم میں چلی گئی اور بہت ہولے سے

جلال کے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ اسے جگانا نہیں چاہتی تھی۔
صبح جلال کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ حجاب سے پہلے
ہی جاگ گیا تھا۔ جونہی حجاب اٹھی اور بازو اوپر اٹھا کر اپنے
بالوں کو باندھنا شروع کیا، وہ اندر آ گیا۔ ہاتھ میں چائے کا
کپ تھا۔ غصے سے بولا۔ ”کیا ہو گیا تھا رات کو۔ تم نے جگانا
ہی نہیں۔“

”میں نے جگانا تھا جلال، آپ اٹھے نہیں۔“

”غلط کہہ رہی ہوں تم۔“ وہ پھنکارا۔ ”سو ہی رہا تھا، مروتو
نہیں کیا تھا۔ تمہارا ویسے ہی ارادہ نہیں تھا جانے کا۔ بہانے
ڈھونڈتی ہو تم۔ سوگ منار ہی ہو تم، پتا نہیں کس کس پیارے
کا۔“

”جلال! میں قسم کھاتی ہوں کہ.....“

”قسم مت کھا.....“ وہ گرجا۔ ”جھوٹی ہے تو، ہمیشہ
جھوٹ ہی بولے ہیں تو نے۔ اب بھی جھوٹ بول رہی ہے۔
میں اندھا نہیں ہوں، سب دیکھتا ہوں، پرانے یار انے
لہو لہان کر رہے ہیں تیرے دل کو۔“

”خدا کے لیے جلال! الزام مت لگائیں مجھ پر۔“

”اچھا۔ الزام ہے..... بہتان ہے۔“ وہ دانت پیس
کر بولا پھر طیش میں آکر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اُلو کی پٹھی،
حرامزادی! یہ بہتان ہے؟“ اس کا پہلا تھپڑ اتنا زوردار تھا
کہ حجاب لڑھک کر قالین پر جا گری۔ اس کے بعد جیسے اسے
کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ لائیں، تھپڑ، گھونے، اتنے تو اتر سے
اس کے جسم پر پڑے کہ وہ بھول گئی، جسم کے کون سے حصے کا
دفاع کرے اور کون سا اس کی بے رحمی کے سامنے کھلا چھوڑ
دے۔ اس کی ناکئی سامنے سے پھٹ گئی۔ زیریں لباس نظر
آنے لگا، وہ گری ہوئی تھی۔ جلال نے اس کی گردن پر
پاؤں رکھ دیا۔ اس کو لگا کہ سانس رک جائے گا اور وہ مر
جائے گی۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا اور وہ سانس کے لیے
تڑپنے لگی۔ یہی وقت تھا جب شریفاں روتی چلاتی اندر آئی
اور جلال کے قدموں میں گر پڑی۔ اس کی ”دور افتادہ“
آواز حجاب کے کانوں میں پڑی۔ ”وڈے بھائی جان!
ماف کرویں، مرجائے گی..... ختم ہو جائے گی۔“

اس کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں، بس اتنا پتا تھا کہ وہ
سانس کے لیے تڑپ رہی ہے اور اس کی گردن پر ایک بے
رحم پاؤں ہے۔ پھر وہ موت کے منہ سے پلٹ آئی۔ گردن
پر سے دباؤ ختم ہو گیا۔ پھٹری ہوئی ہوا دیوانہ وار سینے میں
داخل ہو گئی اور اسے زندگی کی طرف واپس کھینچنے لگی۔ وہ بے
تحاشا کھانستے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ اسے ابکائیاں آئیں۔ معدہ

توکل دوپہر سے خالی تھا اور نہ وہ سب کچھ الٹ دیتی۔ جلال
کی گرجتی آواز اس کے کانوں کو مجروح کر رہی تھی۔ ”تو ان
چیزوں کے لائق ہی نہیں ہے۔ تجھے راس ہی نہیں ہے، یہ
عزت اور یہ آرام۔ تو بس ماتم کر، سوگ منا اپنے ہوتوں
سوتوں کا۔“ اس نے زور سے ہاتھ مارا اور ڈریسنگ ٹیبل پر
رکھی آرائش کی اشیا چاروں طرف بکھر گئیں۔ پھر اس نے
دار ڈروپ کھولی۔ اس میں سے نئے سوٹ نکال نکال کر
قریبی برآمدے میں ڈھیر کر دیے۔ وہ جیسے غصے سے دیوانہ
ہو رہا تھا۔ اس نے پرفیوم کی ایک بڑی بوتل توڑ کر ان
کپڑوں پر چھڑکی اور لائٹر سے آگ دکھا دی۔ دیکھتے ہی
دیکھتے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس نے لیڈ یز راڈ و گھڑی، حجاب
کا موبائل، چارجر اور اس طرح کی کئی چیزیں آگ میں
پھینک دیں۔

شریفاں، چوکیدار طارق، ڈرائیور عثمان بٹ ڈرے
سب کھڑے تھے۔ جلال نے ایک الماری میں سے کچھ
پرانے کپڑے نکالے اور حجاب کے سامنے پھینکتے ہوئے
دھاڑا۔ ”یہ پہن۔ اور اپنے منہ پر لعنت برسا کر بیٹھی رہ
کمرے کے اندر۔ تو اسی لائق ہے..... تو اس قابل ہی نہیں
ہے کہ تجھے کمرے سے نکالا جائے۔ تیرے جیسی بے
اعتباری عورتوں کے لیے ہی حکم ہے کہ ان کو کمروں میں بند
رکھا جائے۔ وہ پیار سے نہیں، مار سے سیدھی ہونے والی
ہوتی ہیں اور اب میں تجھے کروں گا سیدھا..... میں کروں
گا۔“

وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ برآمدے
میں قیمتی کپڑوں میں ابھی تک چھوٹے بڑے شعلے حرکت کر
رہے تھے۔

☆☆☆

ہادی غرابے ہوٹل میں تھا۔ اسے ارم اور جلال کے
نکاح کا علم ہو چکا تھا۔ اس کے دل کی حالت عجیب تھی۔
ملازمہ شریفاں سے حجاب کی حالت زار کا سن کر اس کا چین
سکون غارت ہو گیا تھا۔ حجاب کا خیال تو پہلے بھی ایک مل
اس سے جدا نہیں ہوتا تھا لیکن اب تو اسے حجاب کے سوا کچھ
سوچتا ہی نہیں تھا۔ یہ دیوانہ کر دینے والی سوچیں تھیں۔ وہ
کہاں ہوگی، کیا کر رہی ہوگی، اس کے بارے میں کیا سوچ
رہی ہوگی؟ کیمریے میں رہ جانے والی تصویر بھی اس کے
ذہن سے نکلتی نہیں تھی۔ یہ بڑی غلطی کی تھی اس نے۔ (ہوٹل
واسکوڈے میں آخری رات پیش آنے والے سنگین واقعے
کے بارے میں بھی اس نے ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا)

وہ یہاں سیر و تفریح کے لیے آیا تھا۔ جبکہ جگہ گھومنا چاہتا تھا۔ دنیا کے عجائبات دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ہوا کیا تھا۔ وینس کی اس رات میں اس نے ایک لڑکی کو دیکھا تھا اور باقی سب کچھ بھول گیا تھا، اب اس کا دیر ختم ہونے میں بہ مشکل دس دن بچے تھے۔ شیخو بھائی کے کہنے پر ڈپٹی انسپکٹر ہاشم کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ویزے کی ایکس فینشن ہو جائے۔ اس کے لیے سفری کاغذات کم ہو جانے کو جواز بنایا جا رہا تھا۔ ابھی تک کوشش کے باوجود اسے حجاب کی کوئی خبر خبر نہیں ملی تھی۔ شریفیوں کا سیل فون بھی مسلسل بند جا رہا تھا۔ حجاب کے والدین کے گھر جانا اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ پچھلی دفعہ بھی حجاب بہت ناراض ہوئی تھی۔ یہ بے خبری اور دوری ہادی کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا رہی تھی۔ اسے ایک ایسے کرب کا احساس ہوتا تھا جس کا اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ تاہم ایک بات تھی۔ کرب کی اس بدترین صورت حال میں سے ایک چیز اچھی برآمد ہو رہی تھی۔ اور یہ شاعری تھی۔ وہی شاعری جو کافی عرصے سے روٹھ چکی تھی، اب بڑے تواتر سے اس کے زخمی دل پر دستک دے رہی تھی۔ اس نے پچھلے دو تین مہینوں میں کوئی ڈیڑھ درجن گیت لکھے تھے اور شیخو بھائی کو ارسال کیے تھے۔ شیخو بھائی اس صورت حال پر بے انتہا خوش تھے۔ وہ ایک البم کی ریکارڈنگ شروع کرانے والے تھے اور دوسرے کی کاغذی تیاری کر رہے تھے۔ ویسٹرن یونین کے ذریعے دو بھاری بھر کم رقم بھی انہوں نے ہادی کو ارسال کر دی تھیں۔ اب بھی ہادی کے ہاتھ میں حجاب کا دیا ہوا پارکٹم تھا۔ وہ ایک قلم عمل کر رہا تھا۔ اس طویل قلم کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو وہ نہروں کا شہر تھا۔ وہ ایک طلسمی رات تھی۔ مجھے یہی لگا کہ میں ہزاروں برس سے اسے جانتا ہوں۔

ہزاروں سال سے میں اس کی روشن پیشانی پر۔ اور سحر انگیز مسکراہٹ پر گیت لکھ رہا ہوں۔ ہزاروں سال گزر رہے ہیں جب سے وہ میرے سنہری سپنوں میں آ رہی ہے۔ محبت سے مسکرا رہی ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا اس زندگی سے پہلے بھی کوئی زندگی موجود تھی؟

اگر تھی تو کیا میں وہاں پلٹ سکتا ہوں؟ جہاں میری طرح اس کے دل میں بھی پیار کا سحر موجزن تھا۔ یہ بے خبری نہ تھی؟ یہ دوریاں نہ تھیں۔ ہادی جب بھی قلم، غزل یا گیت وغیرہ لکھتا تھا اس کے اندر وہی تڑپ کچھ کم ہو جاتی تھی لیکن آج یہ قلم لکھ کر کچھ اور بڑھ گئی۔ کیا مرض میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے کمرے کے دروازے پر ہانک سی دستک ہوئی۔ ”میں ان۔“ اس نے کہا۔ ایک اطالوی لڑکی نہایت چست مٹی اسکرٹ میں دروازے پر نظر آئی۔ وہ کافی حسین تھی۔ ”اے آئی کم“ ”سرس“ وہ دربار انداز میں بولی۔ ”نیں۔“ ہادی نے کہا۔ وہ حریف اندر آگئی اور سراپا دعوت بن کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ وہ چپ تھی مگر اس کا سارا جسم بیکار کر رہا تھا کہ اس شب میں اور اس کمرے میں میری ساری رعنائیاں برائے فروخت ہیں۔ ان ہونٹوں میں ”سچویشن“ سے اکثر پالا پڑتا تھا۔ ”کسی چیز کی ضرورت سر؟“ ”نو تھینک یو، میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ ”اوکے۔“ اس نے خوش دلی سے کہا اور اسے قدموں پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ ہادی نے نیا سگریٹ سلگا یا مگر اب سگریٹ سے کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ پتا نہیں دل و دماغ کی کیفیت تھی کہ اس نے وہ کام کیا جو شاذ و نادر ہی کرتا تھا۔ اس کے روم سروس کے ذریعے الکحل کا آرڈر دے دیا۔ چند من بعد با دروی ملازم سپین کی سفید بوتل لیے آن موجود ہوا۔ ساتھ میں روسٹ چکن کے پیس تھے۔ ہادی نے بوتل کھلی، آتشیں سیال گلاس میں انڈیلا۔ لیکن پتا نہیں کیسے اسے ہونٹوں تک نہیں لے جا پایا۔ اسے یہ سب کچھ بھی اچھا نہیں لگا تھا اور اب تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ اس ذہن میں رہ رہ کر حجاب کا چہرہ آ رہا تھا۔ جب وہ دینی کے ایک پارک میں اسے اپنی دوست بینش کی غم انگیز سناری سن رہی تھی۔ اس نے شراب کا ذکر بڑے نفرت انگیز انداز میں کیا تھا۔ فیروز کی شراب نوشی کا بتاتے ہوئے اس نے پیاری سی ناک پر کراہیت کی بہت سی سلوٹیں ابھرائیں۔

ہادی کچھ دیر سوچنے کے بعد بستر سے اٹھا اور وہ

روم میں جا کر بوتل واش بیسن میں الٹ دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بے دم سا پھر بستر پر لیٹا تھا۔ بات صرف الکحل کی ہی نہیں تھی۔ پچھلے ایک دو ماہ میں بہت حد بلایاں آئی تھیں اس میں۔ ہر وہ چیز جو حجاب کو بری لگتی تھی اسے بری لگنے لگی تھی۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں مثلاً بوتلے مسکرانے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں بھی حجاب کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے لگا ہے۔ اس کا وجود جیسے غیر محسوس طور پر اس کے وجود میں کم ہو رہا تھا۔ یہ عشق کی پتا نہیں کون سی پرت تھی۔ شاید وہی جب میں..... میں نہیں رہتا تو بننا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ وہی بے مثال، روشن پیشانی، وہی جادوئی مسکراہٹ جو اسے ہر طرف سے گھیر لیتی تھی..... اور وہ ہزار سال سے اس مسکراہٹ کو جانتا تھا۔ یہ کیسا انوکھا جذبہ تھا۔ یہ کتنا طاقتور تھا۔ پوری کائنات کو اپنے مدار پر حرکت دے سکتا تھا۔ دیکھا جاتا تو ہادی کو کیا حاصل نہیں تھا۔ وہ ابھی دس منٹ کے اندر دنیا کی بہترین آسائشیں اور رنگینیاں اس کمرے میں موجود کر سکتا تھا۔ لیکن وہ لڑکی جو اس کی بھی نہیں..... جو پتا نہیں کہاں بیٹھی تھی، اس کی تمام ڈوریاں اپنے ہاتھوں میں لے چکی تھی۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کچے دھاگے سے بھی جی یہ ڈوریاں، دنیا کے مضبوط ترین بندھن کا روپ دھار چکی تھیں۔ یہ وہ ہادی رہا ہی نہیں تھا جولاہور سے چل کر یہاں آیا تھا۔

ہادی کے ذہن میں جب جب حجاب کی بے بسی کا خیال آتا تھا، تب تب ارم کی ”کامرائیوں“ کا خیال بھی آتا تھا۔ حجاب کی محبت کے ساتھ ارم سے نفرت بھی اتنی ہی شدت سے ابھرتی تھی۔ اس کی عیار چمکی آکھیں، ہادی کے سینے میں شعلے سے بھڑکا دیتی تھیں۔

اس وقت اس کی سوچ کا دھارا ارم کی طرف تھا جب فون کی بیل ہوئی۔ یہ اس کا نیا نمبر تھا جو صرف شیخو صاحب اور اس کے گھر والوں کو معلوم تھا یا پھر اٹلی میں گزاری کو معلوم تھا۔ یہ گزاری ہی کی کال تھی۔ اس کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔ ”ہادی صاحب! بڑی کڑا کے دارا اطلاع ہے۔ ارم کے سلسلے میں مکمل بریکنگ نیوز مل گئی ہے۔“ ”زبردست..... کیا معلوم ہوا؟“ ”ایسے نہیں سر! ملاقات کا شرف بخینے۔ کہاں ٹھہرے ہیں آپ؟“

گزاری کے منہ سے جیسے رال ٹپک رہی تھی۔ ظاہر ہے محزنی خبر کے بدلے وہ محزنی کے انعام کی توقع کر رہا تھا اور

انعام فون پر تو نہیں مل سکتا تھا۔ ہادی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے گزاری، تم روم میں برائٹ اسکوائر پر پہنچ جاؤ۔ جانتے ہو؟“ گزاری نے اثبات میں جواب دیا۔ ہادی بولا۔ ”میں روڈ پر کافی بڑا آئس کریم پارلر ہے..... سوزے کے نام سے۔“ ”نیں سر..... میں سر..... میں سمجھ گیا۔“ ”میں وہاں کھڑا ہوں گا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں میں بھیجیں منٹ لگیں گے۔“ ”ٹھیک ہے جناب! میں آ رہا ہوں۔“ گزاری نے کہا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں لب سڑک آئس کریم پارلر میں بیٹھے تھے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ یہ ہفتے کی رات تھی، اس لیے روم چنچل حسین کی طرح چمک رہا تھا، تھرک رہا تھا اور جھوم رہا تھا۔

تمہید کے بعد گزارنے انکشاف انگیز آواز میں کہا۔ ”ہادی صاحب! ارم نے قریباً ایک سال پہلے ایک پرائیویٹ کلینک ”ڈکٹوریہ فورٹا“ سے اپارشن کرائی ہے۔ وہ پچھلے سال تمبر کی چوبیس سے اٹھائیس تاریخ تک کلینک میں باقاعدہ داخل رہی ہے۔ میرے پاس ڈاکو میٹری ٹیوٹ موجود ہیں۔“

اس نے دو تین پیچہ زلکال کر ہادی کے سامنے رکھ دیے۔

ہادی نے پیچہ ز دیکھے۔ یہ واقعی زبردست انکشاف تھا۔ پیچہ ز انگلش میں تھے اس لیے ہادی کو سمجھنے میں وقت نہیں ہوئی۔ یہاں باقاعدہ ارم چودھری کا نام اور اس کے دیگر کوائف لکھے تھے۔ پری اور پوسٹ آپریشن ٹریٹمنٹ کا ریکارڈ بھی تھا۔ ان پیچہ ز کے مطابق ارم قریباً چار ماہ کی حاملہ تھی اور کئی ڈوٹائی اطالوی بوائے فرینڈ کے ساتھ کلینک میں آئی تھی۔

گزاری نے واقعی کارکردگی دکھائی تھی۔ مختلف کلیوز کا سہارا لے کر اس گمنام کلینک تک جا پہنچا تھا جہاں ایک سال پہلے اپارشن کرایا گیا تھا۔ درحقیقت یہی وہ بیماری تھی جس کا ذکر یونیورسٹی کے ریکارڈ میں بھی تھا۔ لیکن وہاں چھاتی اور گلے کے انفیکشن وغیرہ کی بات کی گئی تھی۔

ہادی نے ایک گہری سانس لی۔ پیچہ ز پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا ”اوکے مسز ارم جلال! تم سے حساب کتاب کرنے کا وقت آ گیا ہے۔“

ارم کو دل کی مراد مل گئی تھی۔ ایک طرح سے اس نے حجاب کو شکست فاش دی تھی لیکن ابھی وہ سمجھتی تھی کہ فتح مکمل نہیں۔ فتح مکمل تو تب ہوتی جب جلال اسے اپنی زندگی سے بھی نکال دیتا، اسے طلاق دے دیتا۔ لگتا تھا کہ وہ اس حد تک جانے کو تیار نہیں۔ شاید وہی عورت کی ملکیت والا جذبہ..... زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اپنے دائرہ اختیار اور ”حق استعمال“ میں رکھنا، کئی کئی عورتوں کا حرم بنالینا۔

خیر موجودہ صورت حال بھی کچھ ایسی بری نہیں تھی۔ ارم جانتی تھی کہ حجاب کی زندگی پھولوں کا نہیں، کانٹوں کا بستر ہے، کپڑوں کو آگ لگانے والے تازہ واقعات کے بعد تو حجاب کی زندگی مزید مشکل ہونے والی تھی۔ وہ جلال کی جوتی کی نوک پر آچکی تھی اور اب اس سے باغی لوٹنے والا سلوک متوقع تھا۔ ارم کو گزاری پر بھی بہت غصہ تھا۔ نجانے کیوں اسے شک تھا کہ ہوٹل واسکوڈے میں ہادی کی موجودگی والی بات گزاری نے جان بوجھ کر چھپائی تھی۔ شاید وہ کسی لالچ میں آگیا تھا یا پھر ویسے ہی ڈر گیا تھا۔ پچھلے تین چار ہفتوں میں گزاری سے ٹیلی فون پر بس ایک دفعہ اس کا رابطہ ہوا تھا اور وہ گزاری کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ سبز جلال بن جانے کے بعد وہ اپنے ارد گرد کے جن لوگوں کو فکس کرنے کا ارادہ رکھتی تھی ان میں یہ گزاری بھی شامل تھا۔

نوج چکے تھے۔ جلال کے آنے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ وہ نہا دھو کر کپڑے بدل چکی تھی۔ سرخ بناری ساڑی۔ طلائی بندے، ڈائننگ کاوڈرٹی ہار اور کلائیوں میں پھولوں کے گجرے۔ سبز حیاں چڑھتے ہوئے اس کی نظر سنگ مرمر کے بڑے گل دان پر پڑی۔ چند ماہ پہلے حجاب یہ ونس سے لائی تھی اور بڑے اہتمام سے یہاں سبز حیاوں کے پاس سنبھالیا تھا۔ اب ارم اسے یہاں سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے گھر میں سے ایسی بہت سی اشیاء اٹھوا دی تھیں جو خاص حجاب نے رکھی تھیں۔ ایک خم دار صوفہ، کا من روم کا سنہری فون سیٹ اور وہاں خاندان کے کسی استاد کار نگار کی بنائی ہوئی نقش تپائی جوتی وی لاؤنج میں بڑی شان سے رکھی گئی تھی۔ یہ گل دان بھی ارم کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا، مگر اس کا خیال تھا کہ یہ جلال کو بھی اچھا لگتا ہے اور اگر اس نے ہٹانا چاہا تو شاید جلال روکے گا۔

سبز حیاں چڑھتے چڑھتے جیسے نفرت کی ایک بلند لہر ارم کے سینے سے اٹھی۔ شاید وہ اپنے آپ کو روک لیتی مگر کچھ غلطی ”بے چارے گل دان“ سے بھی ہوئی ارم کی ساڑی

کا پلو گل دان میں رکھے ”آرٹی فیشل“ پلانٹ سے الجھ گیا۔ ارم کو تو جیسے بہانہ درکار تھا۔ اس نے پلو کو اتنی جھنجھلاہٹ سے چھڑایا کہ گل دان کا گرنا لازم ٹھہرا۔ وہ چھ سات زینے تک لڑھکا اور پھر کھڑے ہو گیا۔

ملازمہ کلثوم اور آبا خانم تیزی سے اندر آئیں۔ اس وقت ارم بیٹھی گل دان کے کھڑے اکٹھے کر رہی تھی۔ ”ہائے اللہ، چوٹ تو نہیں لگی میری بچی کو۔“ آپا خانم نے دلار سے کہا۔ ارم نے نفی میں سر ہلایا۔ یہی وقت تھا جب جلال بھی آگیا۔ چند لمبے سبز حیاوں کے نچلے سرے پر ساکت کھڑا رہا پھر چڑھ کر اوپر آگیا۔ ”اچھا چھوڑو ارم! ٹوٹنے والی چیز کی نوٹ لگنی۔ اب ہاتھ زخمی نہ کر لینا۔“ وہ بولا۔

ملازمہ بھی فوکری لے کر آگئی تھی۔ وہ کھڑے سینے لگی۔ ارم نے افسردہ لہجے میں بتایا کہ کس طرح اس کا پلو اٹا اور گل دان گر گیا۔

جلال اسے لے کر کمرے میں آگیا۔ ”تم نے غلام پڑھ لی؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ وہ سر پر پلو درست کر کے بولی۔ جب اس نے مصنوعی حیرت سے دیوار پر آویزاں کلیئڈر پر نظر ڈالی..... اور جلال کو دیکھ کر بولی۔ ”آج تو آپ کو باغی حجاب کی طرف جانا تھا؟“

”نہیں، ادھر ہی رہوں گا۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”لیکن کیوں جلال؟“ وہ پیشانی پر سلوٹس ڈالے ہوئے بولی (حالانکہ درس والی کوشی میں جو کچھ ہوا وہ سب اسے ڈرائیور عثمان کی زبانی معلوم ہو چکا تھا) ”بس کہہ دیا نا، نہیں جانا۔“

ارم نے شیروانی کے جن کھولنے میں اس کی مدد کی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ عقب میں کھڑی ہو کر اس کے کندھے دبائے لگی۔ وہ اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اپنے جسم کا بیشتر ہیجان خیز گداز جلال کے جسم میں منتقل کر رہی تھی۔ ”ایک بات کہوں، برائے مانے گا۔“ وہ بولی۔

”کہو۔“

”آپ باجی کو اس طرح تنہا نہ چھوڑیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔ وہ ٹوٹی ہوئی ہیں اور بندہ اندر سے ٹوٹا پھوٹا ہو تو کوئی غلطی بھی کر سکتا ہے۔“

”کیا خود پر تیل چھڑک لے گی وہ؟“ جلال نے جھنجھلا کر کہا۔

”نہیں جلال! میں اور بات کر رہی ہوں۔“

مطلب ہے کہ.....“ وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گئی۔ جلال نے پلٹ کر ذرا غصے سے دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو..... تمہیں پتا ہے، مجھے ادھوری بات پسند نہیں۔

وہ اس کے سینے کے بالوں پر ہاتھ چلاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں سے گیا نہیں ہے۔ یہیں کہیں منڈلا رہا ہوگا۔ وہ کہیں، باجی سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم اس کی دیدہ دلیری دیکھ ہی چکے ہیں۔ یہاں ہمارے گھر تک پہنچ گیا اور مہمان بن کر خد میں گرا تا رہا، پھر باجی کے ماں باپ کے گھر پہنچ گیا..... مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑے گا۔ ایسے بندے اچھی بھلی عورت کی مت مار دیتے ہیں۔ مجھے پتا ہے پہلے بھی باجی کا اتنا قصور نہیں ہوگا۔ اسی نے انہیں ورغلا یا..... اور اتنی بڑی مصیبت میں ڈالا ہم سب کو۔“

جلال بے چین سا اٹھ کھڑا ہوا۔ ارم کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ظہیر کہہ رہا تھا وہ جا چکا ہے یہاں سے۔ شاید ”پیسا“ گیا تھا۔ اب تو اٹلی سے بھی دفع ہو چکا ہوگا۔“

پتا نہیں کیوں جلال! مجھے ایسا نہیں لگتا اور میں آپ کو ایک دوسری بات بھی بتا دوں۔ یہ جو شریقاں ہے نا یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی بھی تو مجھے لگتا ہے کہ یہ جاتی ہے سب کچھ۔ باجی کی رازدار کی طرح ہے۔ ڈرائیور عثمان کل بتا رہا تھا کہ شریقاں کا فون آج کل اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ اس نے باجی کو دیا ہوا ہے۔“

جلال نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ اس کے ساتھ ہی ارم نے دراز میں سے ایک پرانا سیل فون نکالا۔ اس میں ایک پرانی سم تھی۔ اس نے جلال کے سامنے ہی شریقاں کا نمبر پریس کیا۔ بتل جاتی رہی، مگر کسی نے اٹھا یا نہیں۔ تیسری چوٹی کوشش پر دوسری طرف سے پھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو کون؟“ یہ حجاب کی آواز تھی۔ ابیکر چونکہ آن تھا اس لیے یہ آواز جلال نے بھی سنی۔ ارم نے فون بند کر دیا۔ جلال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اس نے ارم سے فون لے کر دوبارہ نمبر پریس کیا۔ مگر اب فون بند ہو چکا تھا۔

ارم نے کہا۔ ”میں آپ کو یقین سے کہتی ہوں جلال! یہ شریقاں ٹھیک نہیں ہے۔ باجی حجاب نے تو اسے بعد میں درس والی کوشی میں بلایا ہے یہ پہلے ہی وہاں جانے کے لیے

پھر پھڑا رہی تھی۔ بڑا دل لگتا ہے اس کا باجی کے آس پاس۔“

جلال کا موڈ بری طرح غارت ہو چکا تھا۔ چائے پی کر وہ اسٹڈی میں چلا گیا۔ وہاں سے چند ہی منٹ بعد لگتا تو کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ ”ہائے اللہ۔ ابھی تو آئے ہیں اب کہاں جائیں گے۔“ ارم سینے پر بناری پلو درست کر کے ادا سے بولی۔

”ذرا کام ہے۔“ جلال نے مختصر جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

”دیکھیں، میری بات سنیں۔ باجی سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کیجیے گا۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چند قدم پیچھے گئی ”کھانا تو گھر میں کھائیں گے نا جلال۔“

”شاید“ اس نے کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ بہنا یا ہوا تھا۔

اس کے جانے کے بعد ارم نے ایک لمبی سانس لی اور لکڑی صوفے پر نیم دراز ہو گئی اس کے ہونٹوں پر مسی خیز ہسکراہٹ تھی۔

قریب ہی پلیٹ میں سیب اور سیاہ انگور پڑے تھے۔ اس نے انگور کا ایک چھوٹا سا ٹکھا اٹھایا اور لپٹے لپٹے ہی انگور کے دانے منہ میں گرانے لگی۔ دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کے فون کی بیل ہوئی۔ نامعلوم نمبر تھا۔ ڈرائیور عثمان کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو کون؟“ اس نے پوچھا۔

جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ”آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے حق میں بہت بہتر ہوگا کہ آپ فون بند نہ کریں اور نہ اپنے ارد گرد کسی کو اس کال کے بارے میں بتائیں۔“

”آپ..... ہیں کون؟“ وہ ذرا غصے سے بولی۔ اسے آواز کچھ پہچانی سی لگ رہی تھی۔

”آپ کے آس پاس کوئی موجود تو نہیں؟“

”نہیں۔“

”میں محمد ہادی بول رہا ہوں..... مجھے افسوس ہے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہاں آپ کے لیے ایک مسئلہ ہے..... کافی سیریس مسئلہ۔“

ارم کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

جواب درس والے گھر میں تھی۔ وہ بس ایک دو کمرے تک ہی محدود رہتی تھی۔ اپنی سخت تذلیل کے بعد نوکروں چاکروں سے آنکھ ملانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ صرف ایک شریفانہ جی جواس کی دیکھ بھال کر رہی تھی اور اس کے درو کو محسوس بھی کرتی تھی۔ چند روز پہلے شریفان کا سوبائل فون جاب نے اپنی تحویل میں لے کر بند کر دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ہادی اس نمبر پر رابطے کی کوشش نہ کرے۔ مگر اس سے شریفان کے لیے بڑی مشکل ہو گئی تھی۔ پاکستان سے اس کی کال آتی رہتی تھی۔ گجرات میں اس کی بہن کے ہاں بچہ ہوا تھا اور بہن بیمار تھی۔ وہ گاہے بگاہے شریفان سے رابطہ کرتی رہتی تھی۔ شریفان کی درخواست پر جاب شام کے وقت ایک دو گھنٹے کے لیے اس کا فون کھول دیتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی فون کھلا ہوا تھا جب اس پر کسی نامعلوم نمبر سے کال آئی تھی۔ شریفان نہانے کے لیے ہادی روم میں گئی ہوئی تھی۔ تیسری چوکی کال پر جاب نے فون اٹھایا اور ایک دو بار ہیلو کہا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی بات کے بغیر فون بند کر دیا گیا۔

کہیں یہ ہادی تو نہیں تھا؟ یہ سوچ کر جاب کا دل دھل گیا۔ نفرت آمیز پیش کی ایک لہر اس کے سینے میں بلند ہوئی۔ اس نے تہہ کیا کہ اب وہ بھی کوئی کال ریسیو ہی نہیں کرے گی۔

اچانک شریفان گھبرائی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ ”وڈی باجی! بھائی جان آئے ہیں۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں اطلاع دی۔

جواب کے ہاتھ پاؤں میں چیونٹیاں سی رہ چکی گئیں۔ آج کل جلال کی آمد سے اس کی بھی کیفیت ہوتی تھی۔ میاں بیوی کا محبت اور احترام کا رشتہ، خوف اور تذلیل کے رشتے میں بدل چکا تھا۔ جاب نے کمزری میں سے دیکھا۔ جلال کی ”بھر“ جیب پورچ میں کھڑی تھی۔ جلال اگلا دروازہ کھول رہا تھا۔ پچھلے دروازے سے ہٹی کئی ملازمہ کلثوم نکلی اور ادب سے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ یہ پتا نہیں کیوں آئی تھی جلال کے ساتھ؟

شریفان نے یونہی وقت گزاری کے لیے ٹی وی لگا رکھا تھا۔ جاب نے کہا۔ ”شریفان! الٹی وی بند کرو اور دیکھو کہ کمروں میں کوئی فالتو لائٹ آن نہ ہو۔“

”لائٹیں تو میں نے بند کر دی ہیں جی۔“ شریفان نے کہا۔

”ایک نظر بچن میں دیکھ لو۔ کوئی چولہا کھلا نہ ہو۔“

جواب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ جلال کو ایسی بے پروائیاں سخت ناپسند تھیں۔

شریفان ٹی وی آف کر کے جلدی سے بچن کی طرف چلی گئی۔ دو تین منٹ بعد جلال آن وارد ہوا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی جاب سمجھ گئی کہ آج پھر موڈ ابتر ہے۔ وہ بغیر کسی حمید کے بولا۔ ”شریفان کہاں ہے؟“

”بچن میں ہے شاید۔“ جاب نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

”شریفان..... او شریفان۔“ جلال نے گرج کر آواز دی۔

وہ دو سیکنڈ بعد ہانپتی کانپتی ہوئی سامنے تھی۔ بد قسمتی سے قرعہ ہاتھ روم کی کوئی ٹوٹی کٹی مٹی اور پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ جلال گرجا۔ ”یہ پانی کیوں گر رہا ہے؟“

”میں میں بھول گئی تھی صیب جی۔“ شریفان بوکھلا کر بولی اور پھر لپک کر ہاتھ روم کی ٹوٹی بند کر آئی۔ جلال اسی طرح تباہ تھا۔ ”کہاں رہتا ہے تمہارا دماغ آج کل۔“

وہ گرجا۔

”میں بچن میں تھی صیب جی.....“

”بچن میں تھی یا اپنی کھلی صاحبہ کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی پر کوئی لچر ڈراما دیکھ رہی تھی۔“

”سبکی..... کون سبکی جی؟“

”بھئی جو تیرے سامنے کھڑی ہے۔ تیری ہم راز تیری لنگوٹن۔“ جلال کا اشارہ جاب کی طرف تھا۔

”جی.....“ وہ ہکا بکا کر رہ گئی۔

وہ جاب سے مخاطب ہوا۔ ”اس کا فون تم نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے؟“

”فون.....؟ ہاں جی..... وہ میں نے.....“

ابھی جاب کی بات ادھوری تھی کہ وہ پھر شریفان سے مخاطب ہو کر گرجا۔ ”کیوں فون دے رکھا ہے تو نے اسے؟“

”میں نے تو نہیں دتا جی۔ اصل وجہ..... اصل وجہ.....“

”اصل وجہ تو شیطان کی بچی ہے۔ حرامزادی ہے تو۔ پوری حرامزادی ہے۔“ جلال گرجا۔

شریفان سرتاپا لرز رہی تھی۔ مگر گالی اس سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پہلے کی طرح زرد نہ رہا۔ اس نے ہمت کر کے جلال کی طرف دیکھا۔

”صیب جی! میں بے قصور ہوں۔ آپ ماں بیوی گالی تو نہ

دیں۔“ بولتی ہے۔ آگے سے بولتی ہے۔ بد نسل، کتے کی بچی..... جلال اس کی طرف بڑھا اور مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ مگر پھر رک گیا۔ اس نے دائیں طرف جا کر ایک وردازہ کھولا اور دھاڑتے ہوئے ڈرائیور عثمان بٹ کو آواز دی۔ ”عثمان..... عثمان!“

چند سیکنڈ بعد عثمان بٹ ہاتھ باندھے سامنے کھڑا تھا۔ جلال نے شریفان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ واپس جا رہی ہے نئے گھر۔ ابھی جا رہی ہے۔ اس کا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔ جلدی کرو۔“

ڈرائیور عثمان بٹ نے ادب سے اثبات میں سر ہلایا اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں شریفان کا مختصر سامان رکھا تھا۔ شریفان سر جھکائے کھڑی تھی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر شاید سمجھ گئی کہ بولنے کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ وہ مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

اسی دوران میں حسب معمول جلال کے سل فون پر کوئی کال آ گئی۔ وہ کال ریسیو کرتا اور برہم لہجے میں کاروباری باتیں کرتا ہوا نمبرس کی طرف چلا گیا۔ جاب پتھر کابٹ بنی کھڑی تھی۔ اس کی چھٹی حس، نئے حوادث کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ ابھی کچھ دیر پہلے شریفان کے نمبر پر جو کال آئی تھی، یہ سارا اسی کا شاخسانہ ہے۔

صرف دس منٹ بعد شریفان سر جھکائے درس والے گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مسلسل اٹکلار تھیں۔

جواب جانتی تھی کہ شریفان کے بغیر اس گھر میں اس کا دم گھٹ جائے گا مگر وہ اسے روک نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے حکم جاری ہو چکا تھا اور اس حکم کو بدل نہیں جاسکتا تھا۔

”رب راکھا باجی۔“ جاب کے پاس سے گزرتے ہوئے شریفان نے ہولے سے کہا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر مردہ قدموں سے سیڑھیاں اتر گئی۔

ابھی کچھ دیر پہلے شریفان، جلال کے چھپر کی زد میں آنے والی تھی۔ بلکہ یہ ایک چھپر نہ ہوتا۔ یقیناً اس پر چھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش ہو جاتی۔ مگر عین وقت پر جلال نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ پاکستان نہیں یورپ ہے۔ یہاں ملازم کو مارنا بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔ مار کھانے کے بعد شریفان پولیس کو کال کر دیتی تو جلال کو لینے کے

دینے پڑ جاتے۔ وہ اپنی ملازمہ کو تو نہیں مار سکتا تھا لیکن اپنی بیوی کو مارنے میں اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ اسے بے دریغ پیٹ لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے گلے میں ہے۔ کہیں اس کی شکایت نہیں کرے گی۔ وہ از روایتی رشتے کے ساتھ ساتھ معاشی پھندے میں بھی پھنسی ہوئی تھی۔

اور تھوڑی دیر بعد یہ بات ثابت بھی ہو گئی کہ جاب کو مارنے اور اس کی تذلیل کرنے میں جلال کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ فون پر اپنی بات چیت وہ ختم کر چکا تھا اور اب غصے میں بھرا کھڑا تھا۔ جاب اسے بتانا چاہتی تھی کہ شریفان کا فون اس نے کیوں اپنے پاس رکھا تھا۔ لیکن بہت سی دیگر باتوں کی طرح یہ بات بھی اس کے گلے میں ایک کر رہ گئی۔ اس کیفیت کی وجہ یقیناً جلال کا غیظ و غضب ہی ہوا کرتا تھا۔ جونہی شریفان اور ڈرائیور عثمان بٹ رخصت ہو گئے، جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ”حکیمہ! از میں جاب سے بولا۔“ چلو نیچے آؤ۔“

اس کے ساتھ ہی وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔

جاب کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی، پھر بھی جلال کے پیچھے جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ وہ اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں اترنے لگی..... پتا نہیں، وہ اسے کہاں لے جا رہا تھا۔

سیڑھیاں اتر کر وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچے۔ یہاں سے ایک کوریڈور نکلتا تھا۔ وہ چند قدم کوریڈور میں گئے۔ پھر جاب کی رگوں میں خون جم سا گیا۔ وہ اسے سمٹ میں لے جا رہا تھا۔ پر کیوں؟

”چلو۔“ اس نے کہا اور نیچے جاتی سیڑھیوں کا دروازہ کھول دیا۔

”کیا بات ہے جلال.....“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”بتاتا ہوں..... نیچے چلو۔“ وہ پھنکارا۔

وہ لرز کر رہ گئی۔ مگر قدم آگے بڑھانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ اسے سیڑھیاں اتار کر بیسٹ میں لے آیا۔

یہاں ٹانگوں کا فرش تھا۔ درمیانے درجے کی آرائش بھی تھی گئی تھی۔ فرنیچر ”پردے“ اسے سی وغیرہ سب کچھ مہیا تھا۔

ہوا کی آمدورفت کا برا بھلا انتظام بھی موجود تھا۔

”اب تم یہاں رہو گی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

وہ پوری جان سے لرز گئی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جلال؟“

”تم ایک بے اعتباری عورت ہو۔ میں تمہیں آزاد

رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ بہت بے عزتی سہہ چکا ہوں اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوگا۔“ وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔

حجاب تڑپ کر بولی۔ ”لیکن اب نیا کیا ہو گیا ہے جلال..... آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ.....؟“ وہ جاتے جاتے رک گیا۔ گھوم کر کہنے لگا۔ ”کنکھی کا ایک دندانہ ٹوٹے تو باقی دندانے ٹوٹتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ تم اب بے حیائی کی ہر حد تک چا سکتی ہو۔“

وہ سسک بڑی۔ ”جلال! ایسے الزام نہ لگائیں مجھ پر۔ مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے پر انکی سزا تو نہ دیں۔ اس سے تو..... بہتر ہے کہ اپنے ہاتھوں سے مجھے مار دیں، میری جان لے لیں۔“

”چپ رہو۔“ وہ اتنے زور سے دھاڑا کہ ہیمنسٹ کی دیواریں لرز گئیں۔ ”پھر وہی بات..... میں الزام لگا رہا ہوں تجھ پر۔ بہتان باندھ رہا ہوں تیری نیک سیرتی پر۔ بے حیابے غیرت۔“ وہ شیر کی طرح اس پر چھٹ پڑا۔

ایک بار پھر وہی کچھ ہوا جو چند دن پہلے اوپر کمرے میں ہوا تھا۔ اس پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش ہو گئی۔

”جلال!“ وہ خوف اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں چلائی۔

اس کے چلانے نے جلال کو مزید بھڑکا دیا۔ اس نے حجاب کو اس کے بالوں سے پکڑا اور گھما کر دیوار پر دے مارا۔ وہ نیم جان ہو کر بستر پر گر گئی۔ وہ دھاڑا۔ ”تو ان آسائشوں ان نعمتوں کے قابل ہی نہیں ہے۔ بد قسمت ہے تو اور وہ بھی بد بخت ہیں جنہوں نے تجھے جنا ہے۔ سچ ذات کے ہو۔ سچ خون ہے تم لوگوں کا۔ بچی پیٹنے اور گھاس کاٹنے والوں کی اولاد میں سے ہو۔ میں جانتا ہوں تیرے بڑوں کو اور اب تجھے بھی اچھی طرح جان گیا ہوں۔ تجھے آرام کی گرائی ہو رہی ہے۔ پیسے کی ریل ٹیل نے تیرے پنڈے کو گرم کیا ہوا ہے، اس لیے عاشق ڈھونڈ رہی ہے۔ تیر کی طرح سیدھا کروں گا تجھے، تیر کی طرح۔“ وہ پھنکارا۔

اس نے کمرے میں رکھا ہوا فریج کھولا۔ اس میں کھانے پینے کی کئی اشیا رکھی تھیں۔ جوسز، فروٹس، اسٹیکس وغیرہ۔ اس نے یہ چیزیں نکال نکال کر فرش پر پھینک دیں۔ بے کار کر دیں۔ پھر وہ پھرا ہوا ٹیلی فون سیٹ کی طرف گیا۔ اس کو نیچے کر توڑ دیا۔ اس نے ساری درازیں کھول کر الٹ پلٹ کر دیں۔ غالباً دیکھ رہا تھا کہ کوئی موبائل فون یہاں موجود نہ ہو۔ تب وہ حجاب کی طرف آیا۔ اس پر چڑھ دوڑا۔

اس کے قیمتی کپڑے بھاڑ دیے۔ ایک ایک تار جسم سے جدا کر دیا۔ وہ عریاں ہو گئی اور رونے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ اس نے اس کے گلے سے ہار اور کانوں سے بندے بھی نیچے کر پھینک دیے۔ اور..... اس کے عریاں جسم پر تھوک کر باہر نکل گیا۔ زمین و آسمان حجاب کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ جیسے نہر ناک ہواؤں میں محسوس ہو رہی تھی۔ جلال کا لعاب دہن اس کے کندھے پر گر رہا تھا۔ اور اب رہنمائی ہوا سینے کی طرف آ رہا تھا۔ اسے لگا یہ رقیق، لیس دار مادہ، ایک تیزاب ہے جو اس کو جھلساتا چلا جا رہا ہے۔ اس نے عریانی چھپانے کے لیے بستر کی چادر اپنے گرد لپیٹ لی۔

چار پانچ منٹ بعد وہ پھر دندانہ ہوا ہیمنسٹ میں داخل ہوا۔ اس نے کسی ملازمہ کا بوسیدہ جوڑا حجاب کے منہ پر مارا اور پھنکارا۔ ”تو اس کے قابل ہے..... بلکہ شاید اس کے قابل بھی نہیں ہے..... اب تو وہی پہننے کی جو میں پہناؤں گا اور وہی کھائے گی جو میں کھلاؤں گا۔ میں تیرے پنڈے کی گرمی کم کروں گا۔ بالکل ٹھنڈی ٹھنڈا اور نرم ہو جائے گی۔ کان میں ڈالنے کے قابل۔“

وہ غیظ و غضب میں کھولا ہوا باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد حجاب نے باہر سے دروازہ پلٹ ہونے کی آواز سنی۔ اسے یں لگا جیسے سینے میں اس کی سانس پھنس گئی ہے۔ وہ جلال کو پکارنا چاہتی تھی مگر پکار بھی نہ سکی۔ اسی طرح ”بیڈ شیٹ“ میں لپٹی کروٹ لیے پڑی رہی۔ گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر انگارے سے دھک رہے تھے۔ یہ ان طمانچوں کے انگارے تھے جو جلال نے اس پر برسائے تھے۔ عریاں جسم پر انگاروں کی جلن کم نہیں ہوتی، مگر تیزاب کی جلن تو بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور حجاب کے کوئل بدن پر تیزاب بھی لعاب دہن کی صورت میں سرک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد حجاب نے محسوس کیا کہ ہیمنسٹ کے دروازے سے باہر جلال کسی سے باتوں میں مصروف ہے۔ غالباً یہ ملازمہ کلثوم ہی تھی۔ وہ درشت لہجے میں اسے حجاب کے متعلق کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر آہنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہدایات بہت سخت ہیں۔

تو کیا وہ اسے یہاں بند کر کے چلا جائے گا۔ دو تین دن کے لیے یا چار پانچ دن کے لیے؟ ”اودہ خدا یا!“ وہ کیسے رہ جائے گی۔ بند کمروں سے اسے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اپنے گرد بستر کی چادر درست کی اور لڑکھاتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی۔ اس نے

دونوں ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا اور فریادی لہجے میں پکاری۔ ”دروازہ کھول دیں جلال۔ دروازہ کھول دیں۔“ وہ پکارتی رہی اور دروازہ کھٹکھٹاتی رہی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کی سانس واقعی رکنے لگی۔ وہ کھڑکی کی طرف لپٹی۔ لیکن کھڑکی نام کی کوئی چیز یہاں نہیں تھی۔ وہ پھر دروازے کی طرف آئی۔ جلال اور کلثوم کو پکارنے لگی۔ مگر یہ سب بے سود رہا۔ وہ وہیں دروازے کے سامنے بیٹھ گئی۔ وقفے وقفے سے آواز دیتی رہی، دروازہ بجاتی رہی۔ اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ بے دم سی ہو کر وہیں پھولدار ٹانگوں کے فرش پر لیٹ گئی۔ دروازے کے قریب لیٹنا اسے نسبتاً بہتر لگا۔ شاید دروازے کی درزوں میں سے تازہ ہوا اندر آرہی تھی۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ وہ کس دلدل میں پھنسی جا رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی جسارت کی اتنی بڑی مزا؟ ☆☆☆

ہادی شانزا کے علاقے میں ایک گناہ گینے میں بیٹھا تھا۔ وہ ارم کا انتظار کر رہا تھا اور اسے یقین تھا، وہ ضرور آئے گی۔ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کے آخر میں اس نے ارم کو ایک ایسا اشارہ دیا تھا جس نے اس کی سنی گم کر دی تھی۔ وہ یہ ہائی بھرے پر مجبور ہو گئی تھی کہ کل دوپہر اس سے اس کینے میں ملے گی۔

ہادی نے ایک بار پھر رسٹ وایچ پر نگاہ دوڑائی۔ 12 بجے کا وقت تھا اب 12 بج کر 20 منٹ ہو چکے تھے۔ ہادی ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار تھا۔ اس کی درخواست پر ڈپٹی انسپکٹر ہاشم نے اپنے ایک ماتحت تھامس کو بھی اس کینے میں بھیج دیا تھا۔ وہ سادہ لباس میں ہادی سے تیسری چوٹی میز پر موجود تھا اور چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے ہادی نے شیخو صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں اوپر سے دو اچھی خبریں دیں۔ پہلی یہ کہ اٹالین سفارت خانے کی طرف سے ہادی کو ”ایمر جنسی اسٹے“ مل گیا تھا۔ دوسری اہم خبر یہ تھی کہ ہادی کے کانوں کے نئے لالچ ہونے والے البم نے سیل کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ شیخو صاحب بہت خوش تھے اور مسلسل فون کا اظہار کر رہے تھے۔

قریباً ساڑھے بارہ بجے تھے جب ارم تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک نیلے رنگ کا اسکارف اوڑھ رکھا تھا جس میں سے بس چہرے کی نکلیا نظر آتی تھی۔ ایک مثال نے اس کے بالائی جسم اور لباس کو ڈھانپ رکھا تھا۔

پاؤں میں جو گر شوز تھے۔ ہال میں نگاہ دوڑانے کے بعد وہ سیدھی اس گوشے میں پہنچ گئی جہاں ہادی موجود تھا۔ دونوں میں رکی کلمات کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ آٹنے سامنے بیٹھ گئے۔ آج پہلی بار ہادی کو ارم کی آنکھوں کی چمک ماند نظر آئی۔ رنگ بھی کچھ پھیکا سا تھا۔ یہ آثار دیکھ کر اسے راحت محسوس ہوئی۔

”کیا نہیں گی؟“ ہادی نے پوچھا۔

”ہادی صاحب، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ وہ کڑے لہجے میں بولی۔

”ہاں، مجھے بھی لگتا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، آپ کو جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔ ورنہ آپ ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گی۔“ ہادی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ ہادی نے اطمینان سے چٹلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ ارم کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں ان تین عدد پرنٹس آؤٹ کی کاپیاں تھیں جو گزاری نے پرائیویٹ کلینک وکٹوریہ فورٹ سے حاصل کیے تھے۔ پرنٹ آؤٹ دیکھنے کے بعد ارم کی حالت بتلی ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں میں واضح طور پر کپکپاہٹ دکھائی دینے لگی۔ رنگ بھی مزید پھیکا پڑ گیا۔

”یہ..... سب کیا ہے؟“ وہ ہکلائی۔

”دیکھیں مسز ارم! آپ نے خود کہا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ پھر اسے فضول باتوں میں ضائع مت کریں۔ میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ آپ کی وہ ازدواجی زندگی چند روز میں ختم ہو سکتی ہے جو آپ نے بڑی چالاکی سے تھیکیائی ہے۔“

”تو تم مجھے بلک میل کرنا چاہتے ہو؟“ وہ آپ سے تم پر اتر آئی۔

”میں بلک میل کرنا چاہتا“ نہیں ہوں، کر رہا ہوں اور یہ اوجھے ہٹھکنڈے تم نے خود شروع کیے ہیں ارم چودھری! اس لڑائی میں تمہیں ہر اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ لڑنے کا خیال دماغ سے نکال دو۔ کچھ اور سوچو۔“ ہادی نے زہم لے لہجے میں کہا۔

وہ یکنک ہادی کی طرف دیکھتی رہی پھر شاید سمجھ گئی کہ ہادی نہ شاعری نہیں۔ ان لوگوں میں سے ہے جو بات کرتے ہیں تو اسے عملی جامہ بھی پہنا دیتے ہیں۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”تو تم یہ سب حجاب کے لیے کر رہے ہو۔ اس کے کہنے پر..... اس کی

خواہش کے مطابق؟

”اس بے چاری کو ان باتوں کا پتا بھی نہیں۔ وہ ایسی ہوشیار چالاک ہوتی تو تمہارے پھندوں میں پھنسی ہی نہیں۔ جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا ہے، کسی اور کے ساتھ کیا ہوتا تو وہ تمہاری جان لے لیتا۔“ ہادی کے لیے میں آگ لگی اور تپش پورے جسم میں پھلتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے لب و لہجے نے ارم کو ہلا دیا۔ اس نے اسکارف درست کرتے ہوئے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ چند سیکنڈ تک الفاظ منتخب کرنے کے بعد بولی۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“ ہادی نے اس کے ہاتھ سے کاغذات واپس لیے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلے تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حجاب کے خلاف ہر طرح کی سازشیں بالکل بند کر دو۔ ایک دم فل اسٹاپ ورنہ پچھتا نے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“

”میں نے کوئی سازش نہیں کی۔“

”میرے کمرے سے حجاب کی تصویر نکال کر پورے خاندان میں پھیلاؤ، تمہاری سازش نہیں محبت تھی اور اس طرح کی ”محبتیں“ تم نے بہت کی ہیں حجاب سے۔ اب ان کا بدلہ چکانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں پھر کہوں گا تم سے۔ اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ تم سب کچھ جانتی ہو اور میں بھی۔ اب میرے اور تمہارے درمیان ایک نیارشتہ وجود میں آیا ہے۔ تمہیں وہ کچھ کرنا پڑے گا جو میں کہوں گا۔“

وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ”میں اس کے لیے زیادہ دور تک نہیں جاسکتی مسٹر ہادی! اگر مجھے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگاؤ گے تو پھر بہت کچھ تم ہو جائے گا۔“

اس نے دلیری سے بات کی تھی مگر اس کی آواز کا کھوکھلا پن ہادی کو صاف محسوس ہوا۔ وہ اتنی بڑی بازی نہیں کھیل سکتی تھی جس کی پہلی چال میں ہی اسے جلال الدین کو کھونا پڑتا۔

ہادی سگریٹ سلکا کر زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ”میں تمہیں دھکیل کر دیوار سے لگاؤں گا ارم چودھری! اور اگر ضرورت پڑی تو تمہیں دیوار سمیت گرا بھی دوں گا۔ میں بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ اگر یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لو۔“ ہادی کے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے اور رگوں میں لہو کی جگہ آگ حرکت کرنے لگی تھی۔ اسے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ساری توانائی حجاب کی بے پناہ محبت کی بخشی ہوئی ہے۔ بے پناہ اور انوکھی محبت۔ جو کسی رکاوٹ کو نہیں مان رہی تھی۔ جو آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزرنے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتی تھی اور

اس سے بھی بڑا حوصلہ اس ”محبت“ میں یہ تھا کہ وہ قربان کر کے بھی حجاب کا بھلا چاہتی تھی۔

اس محبت سے پیدا ہونے والی غیر معمولی توانائی نے ارم چودھری جیسی خزانہ لڑکی کو وہ چار منٹ میں ہی مسکرا کر دیا۔ بالآخر وہ مری مری آواز میں بولی۔ ”دیکھو صاحب! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا کوئی بدخواہ نہیں ہے۔ مجھے ذرا دیر کے لیے مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہر حال میں خواہ مخواہ کی ٹین شن اور جھگڑے سے بچنا چاہتی ہوں۔ آپ..... مجھ سے کیا چاہ رہے ہیں؟“

”نی الحال تو کچھ زیادہ نہیں چاہ رہا۔“

وہ بات کاٹنے والے انداز میں کہنے لگی۔ ”میں بار کسی تناؤ کا شکار ہونا نہیں چاہتی، نہ ہی بار بار آپ سے رابطہ کر سکتی ہوں۔ آپ..... کیا چاہتے ہیں، مجھے ایک ہی بات بتادیں۔ اور..... اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ان پچھروں وغیرہ کو بنیاد بنا کر میرے لیے پھر کوئی پریشانی پیدا نہیں کریں گے۔“

”کوئی ضمانت نہیں۔“ ہادی نے بے لگب لہجے میں کہا۔ ”اگر کوئی ضمانت ہے تو وہ میں خود ہوں۔ تمہیں میری زبان پر یقین کرنا پڑے گا۔ ہاں اتنا میں بتا دیتا ہوں کہ یقین کی وجہ سے تم بھی بچھتاؤ کی نہیں اور ایک دوسری بات۔ کوئی شرط میرے سامنے نہ رکھو۔ تم شروط بات کرتی ہو تو میسر گھومنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی طریقے سے ہو گا جس طریقے سے میں چاہوں گا۔ میری سب سے پہلی اور اہم ترین ڈیمانڈ یہی ہے جو میں نے ابھی تمہیں بتائی ہے۔ حجاب کے خلاف اب کوئی اور کہیں نہ دکھانا۔“ ہادی نے آٹھویں الفاظ ادا کیے تو اس کی انگلی ارم کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اس کے ہونٹ بے ساختہ کپکپائے لیکن وہ کچھ نہیں مانتے۔ مانتے پر پینا تھا اور پوری طرح نزو نظر آ رہی تھی۔ ہادی نے دو کولڈ ڈرنکس منگوائے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کپکپاہٹ کو کنٹرول کرتے ہوئے چشکیاں لینے لگی۔ اس کے دروازے پر ایک شخص میز جیوں پر بیٹھا گناہ بجا رہا تھا۔ اس کی خوب صورت دھن سے متاثر ہو کر ایک لڑکی اور لڑکے نے رقص شروع کر دیا۔ وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھ رہے۔ دھن ختم ہوئی تو لوگوں نے گناہ سٹ کے ہیٹ کے بغیرہ پھینکے۔

ہادی نے نیا سگریٹ سلکاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ ارم چودھری..... جہاں تک میں سمجھتا ہوں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہو۔ جلال اور حجاب

پیس زندگی

ہیک ٹھاک دوری پیدا ہو گئی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تو اس گھر میں رہتا اب حجاب کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ شاید حجاب کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہے۔ مگر پھر بھی وہ برداشت کر رہی ہے۔ اس کے والدین کی طرف سے بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہو رہا۔ وہ اتنا کیوں ڈر رہے ہیں جلال سے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی بات ہے۔ کوئی خاص وجہ؟“

”وجہ تو سب کے سامنے ہے۔ اگر میں کہوں گی تو تمہیں غصہ لگے گا۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے۔“

”جی بات کہوں..... برائہ ماننا..... حجاب نے جلال کا اعتماد ہی مجروح نہیں کیا ان کو مالی طور پر بھی لوٹا ہے۔“

”جی ہاں..... ان کے ابو بالکل فیاض نے بہت پیسا کھایا ہے جلال سے۔ شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ واپسی کے لیے مسلسل جھوٹے وعدے کرتے رہے ہیں۔ جلال قانونی کارروائی کا ارادہ کر لیں تو چاروں کے اندر بالکل فیاض پولیس کی کسڑی میں نظر آئیں گے۔“

ہادی کو ارم کی بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے تفصیل جانتا چاہی۔ پہلے تو وہ ادھر ادھر کی ہانپی رہی، شاید اسے اندیشہ تھا کہ یہ راز افشانی اس کے لیے کوئی مشکل پیدا کرے گی۔ لیکن ہادی کے اصرار پر وہ بتانے پر آمادہ ہو گئی۔ اس کی باتوں سے ہادی پر انکشاف ہوا کہ نہ صرف حجاب کے والدین کا گھر گروہی ہے بلکہ اس کے والد..... جلال کے پونے تین لاکھ یورو سے زیادہ کے مقروض ہیں اور مارک اپ ڈال کر یہ رقم اور بڑھ جاتی ہے۔

کسی کتاب میں پڑھا ہوا یہ فقرہ ہادی کے ذہن میں گھومنے لگا..... ”داماد کے سامنے تو بیٹی والوں کے سرویسے ہی جھکے ہوتے ہیں لیکن اگر بیٹی والے داماد کے مقروض بھی ہوں تو سر جھکانے والا یہ بوجھ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔“

اس کے دل و دماغ میں الجھل تھی۔ اب اسے اس سارے ”دباؤ اور خوف“ کی وجہ کچھ زیادہ اچھے طریقے سے آنے لگی تھی جو جلال کے حوالے سے حجاب کے ٹیکے میں موجود تھا..... وہ ابھی ارم سے کچھ اور سوال بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر اس انکشاف کے بعد باقی سوال غیر اہم لگ رہے تھے۔

اس نے ویٹر کو بل کے لیے کہنے کے بعد ارم سے پوچھا۔ ”مجھے ابھی تم سے کچھ اور ضروری باتیں کرنی ہیں۔ جلال آج کل کتنے بچے گھر لوٹتا ہے۔“

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”تو بچے کے قریب۔“

”اور جاتا کتنے بچے؟“

”آٹھ بچے صبح۔“ اس کے لہجے میں شک کی تھی۔

”میں پرسوں صبح آٹھ اور رات نو بجے کے درمیان کسی بھی وقت تم سے فون پر رابطہ کروں گا۔ مجھے کوئی ایسا نمبر بتاؤ جو بالکل محفوظ ہو تمہارے لیے۔“

☆☆☆

حجاب کا برا حال تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس نے کچھ کھایا یا پینا نہیں تھا۔ رورو کر اور پکار پکار کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کسی نوکرانی کا وہی بوسیدہ لباس پہن رکھا تھا جو جلال نے اسے مہیا کیا تھا۔ آج صبح اسے ناشا دیا گیا تھا۔ یہ ناشا لانے والی بیٹی کئی کلثوم ہی تھی، تاہم اس نے ”ہیسمنٹ“ کا دروازہ پوری طرح نہیں کھولا تھا۔ دروازے میں اندر کی طرح باہر کی طرف بھی ”دروازے“ سے جھانکنے والی زنجیر لگی ہوئی تھی۔ اس زنجیر کی وجہ سے دروازہ بہ مشکل چھ سات انچ تک ہی کھل سکتا تھا۔ اس خلا میں سے کلثوم نے سوچی روٹی، انڈے کا آلیٹ اور چائے کا کپ اندر کھسکا دیا تھا اور حجاب کی منت ساجت کی پروا کیے بغیر دروازہ فوراً بند کر دیا تھا۔ یہ ناشا بارہ گھنٹے بعد بھی جوں کا توں پڑا تھا۔

”میں کیا کروں میرے اللہ..... یہ مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے معاف کر دے میرے مالک۔ مجھ پر رحم فرما۔ میرے ماں باپ پر رحم فرما۔“ وہ ٹیکے میں سر دے کر گڑ گڑاتی۔

اسی دوران میں دروازے پر پھر آٹھیں ستائی دیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ اس بار بھی دروازہ پورا نہیں کھلا تھا۔ دوسری طرف کلثوم کا کرخت چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے غصے میں اپنی ہوئی روٹی، پانی کی بوتل اور سالن کی پلیٹ اندر کھسکا دی۔ اس میں آلو گو بھی کا سالن تھا۔ حجاب، کلثوم کے سامنے ہاتھ جوڑ کر نکلی۔ ”خدا کے لیے کلثوم! مجھے یہاں سے نکال لو۔ میری سانس بند ہو جائے گی۔ مجھ پر رحم کرو کلثوم۔“

وہ روٹھے پن سے بولی۔ ”میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر مجھے گناہ گار کیوں کرتی ہو باجی، ہاتھ جوڑنے میں تو ان کے سامنے جوڑ و جن کی عزت خراب ہوئی ہے آپ کی وجہ سے۔ جو لوگوں کے طعنے سن رہے ہیں۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا کلثوم۔ میں بے گناہ ہوں۔ مجھ پر بہتان باندھے جا رہے ہیں۔ تم تو ایک عورت ہو۔ عورت

بولی۔ ”لیکن پہلے اس شخص کو اسٹیج سے اتاریں اور اس شخص کے برابر بٹھائیں جو اگلی صف میں دائیں طرف بیٹھا ہے۔“

”کیا مطلب؟ یہ تو جلال الدین ہیں۔ روم کی مسلم کمیونٹی کے ایک معزز شخص۔“

”لیکن میری شرط یہی ہے محترم بزرگ۔ میں تب ہی کچھ بولوں گی جب یہ اسٹیج سے اتر کر اپنے بھائی کے پاس بیٹھے گا۔“

کچھ بحث و تضحیح کے بعد جلال کو اسٹیج سے نیچے اترنا اور بھائی کے پہلو میں بیٹھنا پڑا۔

حجاب بلند آواز میں بولی۔ ”محترم بزرگ! میرے شوہر جلال کو دوسری شادی کا حق تھا مگر عیاشی کا حق نہیں تھا۔ اس نے شادی کی رعایت کو صرف اور صرف اپنی عیش و عشرت کے لیے استعمال کیا ہے اور اس سلسلے میں ہر اسلامی ہدایت کو نظر انداز کیا ہے۔“

محترم بزرگ بولے۔ ”لیکن بیٹی! اگر یہ شخص شادی کرنے کے بعد دونوں بیویوں میں مساوات برقرار رکھ رہا ہے تو پھر اعتراض کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔“

”یہی تو بات ہے محترم بزرگ۔“ وہ دلیری سے بولی۔ ”اس نے جن ہدایات کو نظر انداز کیا ہے ان میں یہ مساوات اور انصاف والی شرط بھی ہے۔ اس سے پوچھیں یہ دونوں بیویوں میں صرف برائے نام مساوات بھی کتنے دن قائم رکھ سکا ہے۔ اس سے پوچھیں میرے محترم۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس نے اس مساوات کا حلیہ بگاڑ دیا۔ تین دن میری طرف تین دن دوسری بیوی کی طرف۔ یہ کتنے روز اس طریقے پر چل سکا ہے۔ بس اس کا طرف ہی اتنا تھا۔ اس نے اس مساوات کی ایک جانب تھپڑ اور ٹھوکریں رکھ دیں اور دوسری طرف محبتیں اور نوازشیں۔“

”کیا ایسا ہوا جلال الدین؟“ محترم بزرگ نے پوچھا۔

جلال نے کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز پھنس گئی۔ اس کے گلے میں کھانسی کا پھندا سا لگ گیا۔ وہ بولے بغیر بیٹھ گیا۔

حجاب بے باکی سے بولی۔ ”یہ جھوٹا ہے محترم بزرگ، ہر لحاظ سے جھوٹا ہے۔ اس نے اپنی تفریح و تہنیت کے لیے دوسری شادی کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ تیسری بھی کرے، جس طرح اس کے پیر طریقت صاحب نے تین شادیاں کر رکھی ہیں۔ یہ منافق لوگ ہیں محترم بزرگ۔ ان کی زبان پر کچھ دل میں کچھ ہوتا ہے۔ میرے شوہر جلال کو ہی لیں۔ یہ

وہ غنودگی اور بیداری کی کوئی درمیانی کیفیت تھی۔ یہ خواب نہیں تھا۔ یا شاید جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ اس کے غنودہ تصورات نے اسے ایک عجیب منظر دکھایا۔ اسے لگا کہ دروازے کا قفل کھلا ہے۔ پٹ واہوئے۔ اس کے ابو اندر داخل ہو گئے۔ سفید براق لباس میں۔ سفیدی مائل بال سلیقے سے پیچھے کی طرف جتے ہوئے، آنکھوں پر عینک کی چمک، دبلا پتلا سینہ مگر تانا ہوا اور شانے سیدھے۔ وہ مستحکم قدموں سے چلتے اس کے پاس آئے۔ جبکہ اس کا ماتھا چوہا اور بڑی آسانی سے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اسے اسی طرح اٹھائے اٹھائے وہ باہر نکلے۔ کٹھوم دم یہ خود کھڑی رہی۔ جلال کے گارڈز نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے لے کر گھر کے وسیع لان کی طرف بڑھے۔ وہاں سے لوگوں کی آوازوں کی جھنجھٹا ہٹ سنائی دے رہی تھی۔ شاید سیکورڈ لوگ جمع تھے۔ ابو نے اس کے کان میں کہا۔ ”جو کچھ دل میں ہے کہہ دو۔ بلند آواز سے کہہ دو۔ کسی سے ڈرنا نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بوڑھا ہوں مگر بے ہمت نہیں ہوں میری بیٹی۔“

اور واقعی اس میں ایک عجیب توانائی بھری تھی۔ اس کے سینے میں مدتوں سے جکڑی ہوئی صدائیں اس کی آواز بن کر اس کے ہونٹوں سے نکلنے کے لیے بے تاب ہو گئیں۔ ابو نے اسے اتارا اور وہ اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ وسیع لان کچھ بچا بچا بھرا تھا۔ ایک بہت بڑے سنہری اسٹیج پر ایک نورانی صورت والے بزرگ منتقل کر رہے تھے۔ ان کی سیدھی سفید ڈاڑھی ان کے سینے پر لہرا رہی تھی، ان کے پہلو میں جلال بھی ایک شاندار کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل سیج تھی۔ حجاب کی نظر ہجوم کی اگلی صف پر پڑی۔ یہاں اس کے ابو جلال کے کئی عزیز و اقارب موجود تھے۔ دائیں طرف جلال کا بڑا بھائی فیروز بیٹھا تھا۔ سرخ و سپید مفاہٹ چہرہ، ٹیکر اور بنیان پہنے ہوئے، ہاتھ میں دھکی کا جام تھا، دونوں اطراف میں نیم عریاں لڑکیاں تھیں۔

ہجوم دیکھ کر حجاب ذرا سا جھکی۔ ابو نے اس کے کندھے پر ہلکی دی۔ ”میں یہاں ہوں، تمہارے ساتھ ہوں۔ جاؤ۔“

اس کے قدموں کی لرزش جاتی رہی۔ وہ سیزہاں چڑھ کر چوڑے پر آگئی۔ سفید براق ڈاڑھی والے بزرگ نے کہا۔ ”ہاں بیٹی! تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

”ہاں محترم بزرگ۔“ وہ صاف توانا آواز میں

انہوں نے اسے ہاتھ روم سے نکالا تھا۔ گود میں اٹھایا تھا اس واقعے کے بعد اب کوئی دن ای سے سخت خفا رہے تھے۔ آج ان جاں مسل لمحوں میں اسے نجانے کیوں پھر ہی یاد آئے۔ وہ دل ہی دل میں انہیں پکارنے لگی۔ ”ابو جی..... میری مدد کو کوئی نہیں آ رہا۔ کوئی مجھے اس تاریکی سے نہیں نکال رہا۔ آج پھر میری جان پر بین گئی ہے۔ ابو جی..... مجھے یہاں سے نکال لیں۔ ورنہ پھر بھی میری صورت نہ دیکھ سکیں گے۔ آپ نے بھی مجھے اتار دینے کی بات دیا تھا۔ آج کیوں میرا رونا نہیں سن رہے۔ کیوں آپ بھی منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے ہیں؟ اپنی بیٹی پر اعتماد نہیں رہا؟ اپنے خون پر رشک کرنے لگے ہیں؟ ایسا نہ کیجیے ابو جی۔ آپ ہی نے تو کہا تھا آپ کبھی میری انگلی نہیں چھوڑیں گے۔ میں دادی اماں بن جاؤں گی تب بھی نہیں۔ میں ابھی دادی اماں نہیں بنی۔ ابھی ماں بھی نہیں بنی۔ ابھی میں نے جینا بھی شروع نہیں کیا۔ میں مر رہی ہوں۔ کیا آپ مجھے مرنے دیں گے۔ اسی طرح بے بسی سے.....؟“

اچانک اسے محسوس ہوا کہ دروازے کی طرف آئے والے زینوں پر پھر آہٹ ہوئی ہے کوئی نیچے اتر رہا ہے شاید۔ کون ہو سکتا تھا۔ اس کے ابو جی؟ جو اپنے ناتواں جسم کو کھینچے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کا بھائی فیصل جسے اپنی بیماری باجی کی پکار سمجھ لائی تھی، یا پھر ڈاکٹر اکل عطا جو اسے بیٹیوں کی طرح ہی چاہتے تھے..... یا پھر ماموں جو بیمار رہے تھے۔ وہ سر تا پا ساعت بن گئی۔ وہیں لیٹی لیٹی امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ کوئی دروازے پر پہنچا۔ آہٹ ہوئی۔ پھر اندازہ ہوا کہ دروازے کو باہر سے مقفل کیا جا رہا ہے۔ تالا لگائے جانے کی آوازیں بڑی بے رحم تھیں۔ وہ ایک بار پھر دروازے پر پہنچ گئی۔ آہ دہکا کر گئی۔ مگر سننے والے کان تو شاید بہرے ہو چکے تھے۔ آئے والا سڑھیاں چڑھ کر وہاں چلا گیا۔

وہ گھڑی سی بن کر کروٹ کے بل پھر دروازے کے پاس ہی لیٹ گئی۔ سانس کی آمد و رفت مشکل سے مشکل ہوئی جا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں بن ہو رہے تھے۔ شاید وہ مر رہی ہے، اس نے سوچا۔ دماغ پر دھند چھانے لگی۔ اسے لگا کہ وہ فرش سے اٹھ کر آہستہ آہستہ ہوا میں منتقل ہو رہی ہے۔ ایک تاریک اور سرد ہوا میں۔ اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ پتا نہیں وہ کب تک اسی طرح پڑی رہی۔ دل کے کسی دور دراز گوشے سے صدا آرہی تھی، اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔

کو پچھانتی ہو۔ کیا تمہیں لگتا ہے، میں کچھ ایسا کر سکتی ہوں؟“

”کسی کے ماتھے پر کچھ نہیں لکھا ہوتا باجی..... آپ اس بندے سے ہونٹوں میں ملتی رہی ہیں۔ اس کے کمرے میں سے آپ کی غلط تصویریں نکلی ہیں۔“

”کوئی غلط تصویریں نہیں ہیں کٹھوم۔ صرف بازار میں اتاری ہوئی ایک تصویر ہے، جو اس نے مجھے بتائے بغیر اتاری تھی اور کچھ نہیں ہے کٹھوم..... کچھ بھی نہیں ہے۔“

آخری تین چار الفاظ وہ اتنے زور سے بولی کہ اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ اتنی کوشش کے باوجود اس کی بیٹھی ہوئی آواز پہ مشکل کٹھوم کے کانوں تک پہنچی ہوگی۔

”ماں باپ سے سگا اور کوئی نہیں ہوتا باجی! جب تمہارے ماں باپ کے پاس تمہاری صفائی نہیں ہے تو اور کسی کے پاس کیا ہوگی۔ سب کہہ رہے ہیں کہ تمہارے میکے والوں نے تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔“

”یہ سب غلط ہے..... سب جھوٹ ہے۔ رانی کے پہاڑ بنائے جا رہے ہیں۔ مجھے کسی نے دھکے نہیں دیے۔ اور..... میں نے کوئی گناہ بھی نہیں کیا۔“

”باجی! تمہاری گناہ گاری یا بے گناہی کا فیصلہ تو تمہارے سر کے سامنے کرنے ہے۔ مجھے بتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں تو حکم کی بندی ہوں۔ میں تو بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ کھانا کھا لو اور حوصلہ رکھو۔ پہلے بھی تو ”حوصلے والے کام“ کیے ہی ہیں نام نہ نہ۔“

”خدا کے لیے کٹھوم! مجھے کوئی فون لا دو۔ میں جلال سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے ویسے مار دیں..... اس طرح کمرے میں بند نہ کریں۔ میں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے جب آنا ہے خود ہی آتا ہے۔“ اس نے خشکیں انداز میں کہا اور حجاب کے چہرے کے سامنے دروازہ جھکے سے بند کر دیا۔ حجاب ہڈیانی انداز میں پھر چلانے لگی۔ دروازے پر دو ہتھو مارنے لگی۔ اس کی ہنسی کچی چوڑیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ یہ کراہی جیسے جگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی دیواریں موت کی برچھائیوں کی طرح حجاب کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ کھینچ کر سانس لینے لگی۔ وہ ہمیشہ بند جگہوں سے خوف کھاتی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ والدہ نے کسی بات پر سرزنش کے طور پر اسے ہاتھ روم میں بند کر دیا تھا اور خود اپنے کام سے چھت پر چلی گئی تھیں۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی تھی۔ اس کی زبان پر صرف ایک ہی نام تھا۔ ”ابو جی..... ابو جی۔“ اور ابو جی نے اس کی پکار سن لی تھی۔

حجاب کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی۔ وہ گرج کر بولی۔
 ”یہ کہتا رہا ہے محترم بزرگ اور ایسی اور بھی بہت سی باتیں
 کہتا ہے جن پر عمل نہیں کرتا۔ اس کا دنیا دار بھائی فیروز بدنام
 ہے لیکن حقیقت میں شاید فیروز میں اور اس میں کچھ زیادہ
 فرق نہیں۔ فیروز شراب پیتا ہے، یہ شراب نہیں پیتا لیکن
 اسے دولت اور اختیار کا نشہ ہے۔ فیروز دنیا کے بہترین
 کھانے کھا کر کام و دہن کی لذت حاصل کرتا ہے، یہ بھی اس
 میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ بہ ظاہر یہ حرام حلال کی تمیز رکھتا
 ہے لیکن گھر کی سے دیکھا جائے تو اسے بھی کوئی تمیز نہیں۔
 فیروز جدید فیشن کے کپڑوں پر ماہانہ ہزاروں خرچ کر ڈالتا
 ہے۔ یہ شلوار میس اور شیر دانی ہی اتنی مہنگی بنواتا ہے کہ
 حساب برابر ہو جاتا ہے۔ فیروز نت نئی عورتوں کے ساتھ
 وقت گزارتا ہے، اس نے ایک خاص دائرے میں رہ کر یہ
 سہولت حاصل کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے، مجھے کہنے دیجیے کہ یہ
 اور اس جیسے لوگ نکاح کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ فیروز دنیا میں
 گھومتا پھرتا ہے، سیر پانے پر لاکھوں خرچ کرتا ہے۔ اس
 نے اور اس کے پیر صاحب نے تبلیغی دوروں کی آڑ میں یہ
 شوق پورا کیا ہوا ہے۔ آپ غور سے دیکھتے چلے جائیں
 میرے محترم بزرگ! آپ کو ان دونوں میں کوئی خاص فرق
 نظر نہیں آئے گا اور دنیا..... دنیا پھر بھی اس بے چارے کے
 لیے ایک قید خانہ ہے..... یہ قیدی نہیں ہے بزرگوار! قیدی تو
 میں ہوں۔ یہ تو داروغہ ہے۔“
 ”داروغہ ہے؟ کیا مطلب؟“
 ”یہ اس قید خانے کا داروغہ ہے جس کو یہ گھر کہتا ہے

☆☆☆

ہادی سخت بے چین تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ حجاب کہاں اور کس حال میں ہے۔ کوشش کے باوجود وہ شریقاں سے رابطہ نہیں کر سکا تھا۔ حجاب کے والدین کے گھر میں بھی اس کا فون سنائے نہیں گیا تھا۔ فیصل نے کال ریسیور کی بجلی اور اس کی آواز سننے ہی فون بند کر دیا تھا۔ گھڑاری کی زبانی

تھامس نے اپنا نیم گجاسر اثبات میں بلایا اور ڈانس وہیں روک دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک محفوظ فاصلہ رکھ کر "ہمز" جیب کے پیچھے جا رہے تھے۔ قریب آدھ گھنٹے بعد وہ ایک قریبی ساحل پر موجود تھے۔ آفس ٹائم ختم ہو چکا تھا سمندر کے کنارے ریش تھا۔ نیلی جلی چھتریوں تلے لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ یہاں زیادہ تر فیملیاں ہی تھیں۔ باوی اور تھامس پارکنگ کے قریب گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ جلال اور ارم گاڑی سے نکل کر ریت پر چہل قدمی کرنے لگے۔ بحیرہ روم کا نیلگوں مانی ڈوبتے سورج کی

ہادی نے بھی وضو کر کے فرض ادا کیے۔ اسی دوران میں جلال باہر جانے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ اس نے ابھی

تک ہادی کو دیکھا نہیں تھا۔ ہادی قالین پر اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر ہادی کو دیکھا۔ جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہ ہادی ہی ہے۔ ”السلام علیکم جلال صاحب۔“ ہادی نے مستحکم لہجے میں کہا۔

وہ سلام کا جواب دیتا بھی بھول گیا۔ شیروانی کے براؤن کالر کے اوپر اس کا بھرا بھرا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ عجیب انداز میں بولا۔ ”تم..... ابھی تک گئے نہیں ہو یہاں سے؟“

”بس جانے ہی والا ہوں جلال صاحب! آپ سے ایک ملاقات کے لیے رکا ہوا تھا۔“

”ملاقات؟ کس لیے ملاقات؟“ جلال کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

”میں جانتا ہوں، میری اس طرح کی بے وقت مداخلت آپ کو بری لگی ہے۔ میں اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا۔“

جلال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ آنکھوں میں ہيجانی سی کیفیت تھی۔ اس نے آلتی پالتی مار رکھی تھی۔ ہادی نے اس کے سامنے دوڑا نو بیٹھے بیٹھے کہا۔ ”جلال صاحب! میں اللہ کے گھر میں بیٹھا ہوں، اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں آپ کی بیوی بالکل بے قصور ہیں۔ ان کی عزت پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا داغ بھی نہیں ہے۔ ہاں اتنی غلطی ان سے ضرور ہوئی ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ چند مونو میٹس کو وزٹ کیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جلال صاحب..... کچھ بھی نہیں۔ میں..... آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں ان پر کوئی شک نہ کیجیے گا۔ میں ان کی صفائی میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

ہادی کے جسم میں لرزش تھی۔ جلال پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔

ہادی نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں جلال صاحب! ایک تصویر کی بات کو آپ کے سامنے بہت بڑھا چڑھا کر بتایا گیا ہے۔ وہ تصویر میں نے ان کی بے خبری میں اتاری تھی۔ انہیں اس کی بالکل خبر نہیں تھی۔ یہ میری غلطی ہے میں اس کو تسلیم کرتا ہوں۔ آپ اس کے لیے مجھے جو سزا دینا چاہیں مجھے قبول ہے۔ لیکن خدارا! اس حوالے سے ان کو مورد الزام نہ ٹھہرایئے گا۔ میں بس ایک دو روز میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ کبھی میری صورت نہیں دیکھیں گے۔ اس

حوالے سے تسلی رکھیے۔“

جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجبوراً ہادی کو بھی ہونا پڑا۔ جلال کے تیور اچھے نہیں تھے۔ اس نے کبھی نہیں کہا۔ ”تم کتنی بار یہاں سے جاؤ گے اور کتنی بار آؤ گے دوسری بات مجھے یہ بتاؤ کہ میری بیوی کی صفائی دینے کے لیے تم سے کس نے کہا ہے۔“

”کسی نے نہیں کہا جلال صاحب! یہ میرے اندر سچائی ہے جو مجھے کھینچ کر.....“

”بکواس بند کرو۔“ جلال اتنے زور سے دہاڑا کہ مسجد کے درود پوار لرز گئے۔ اِکاد کا نمازی اب بھی مسجد میں موجود تھے، وہ چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ ”حرا حرا دے..... شیطان..... تیری جرأت کیسے ہوئی، مجھ سے بات کرنے کی۔ تیری جرأت کیسے ہوئی۔“ وہ دہاڑا اور نتائج سے بے پروا ہو کر ہادی پر پل پڑا۔ اس کا زور دار دھکا لگنے سے ہادی ایک ستون سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ اس نے ہادی پر تھپڑ اور کے برسائے کی کوشش کی۔ ہادی نے اپنا سر نیچے جھکا لیا۔ پھر بھی چند ضربات اس کو سہتا پڑیں۔ اس کا گریبان پھٹ گیا۔ لوگ بیچ میں کود پڑے۔ پھرے ہوئے جلال کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ کسی نے پکار کر کہا۔ ”یہ مسجد ہے بھائی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

جلال، ہادی کی طرف انگلی اٹھا کر گر جا۔ ”جھے کہا تھا چلا جا یہاں سے۔ جھے کہا تھا۔ میں تیری جان لے لوں گا۔ میں تیری سانس کھینچ لوں گا۔“

مٹی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ ”یہ مسجد ہے، ایسا مت کریں یہاں۔“

جلال لپک لپک کر ہادی کی طرف آ رہا تھا۔ نمازیوں نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔ اسی دوران میں ڈھپٹی کا ماتحت تھامس بھی اندر آ گیا۔ اس نے ہادی کی طرف دیکھا، جیسے جلال کی طرف بڑھنے کی اجازت چاہ رہا ہو۔ ”نہیں تھامس۔“ ہادی نے کہا۔

کچھ لوگ ہادی کو گھیرے میں لے کر مسجد سے باہر لے آئے۔ ہادی کے منہ میں خون کا ٹمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا۔ مسجد کے دروازے کے پاس اب بھی جلال کی دہاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بالکل ”ہائپر“ ہو رہا تھا۔ ہادی نے تھامس کو اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ڈائسن گاڑی کی طرف آ گیا۔ ارد گرد موجود لوگوں کا بھی ہادی کے لیے یہ مشورہ تھا کہ گاڑی میں بیٹھ جائے۔ جھگڑے کی وجہ تو کسی کی سمجھ میں نہیں

بٹ کا کہنا ہے کہ کل رات درس والے گھر میں ایک اور گارڈ بھیج دیا گیا ہے۔ اب وہاں ایک چوکیدار اور دو گارڈز ہیں۔ شاید جلال صاحب کو کوئی خطرہ ہے۔“

ہادی سمجھ گیا کہ یہ اضافی گارڈ کل شام مسجد میں بیٹھ آنے والے واقعے کے زوہل کے طور پر بھیجا گیا ہے۔ حالات سنگین شکل اختیار کر رہے تھے۔

اب کوئی راست اقدام اٹھانے کی ضرورت مزید شدید ہو گئی تھی۔ اگلی صبح ہادی نے ڈاکٹر عطا سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر عطا صاحب، حجاب کے گھروالوں کے فیملی ڈاکٹر تھے اور حجاب فیصل وغیرہ انہیں ڈاکٹر انگل کہہ کر پکارتے تھے۔ چند دن پہلے ڈاکٹر عطا کے کلینک میں ہادی ان سے مل چکا تھا۔ اس نے ان سے نزلے بخار کی دوا لی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ انگل فیاض نے اسے ان کا پتا بتایا ہے۔

ڈاکٹر عطا ہر لحاظ سے ہادی کو ایک نرم خو اور دانا چنا شخص لگے تھے۔ وہ ہادی کے ادبی ذوق سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ آج ہادی ایک پروگرام لے کر ان کی طرف جارہا تھا اور نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر عطا اس کو اہمیت دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کا گھر کلینک کے ساتھ ہی واقع تھا۔ اتوار کے روز وہ صبح کے وقت چھٹی کرتے تھے۔ ہادی کو بچا تھا کہ وہ گھر میں ہی ہوں گے۔ ہادی نے ملازم کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ قریباً دس منٹ بعد وہ عطا صاحب کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا گرین ٹی پی رہا تھا۔ ان کی اطالوی وائف کو دس گیارہ بجے تک سونا تھا۔ عطا صاحب اکہرے بدن کے پچیس سالہ شخص تھے، عمر کے مقابلے میں صحت بہت اچھی تھی۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں نرم خوئی اور معاملہ فہمی کی جھلک بہت نمایاں نظر آتی تھی۔ اسے طور اطوار سے وہ روشن خیال بھی لگتے تھے۔

چار ماچھ مٹ کے اندر ہی ان کی باتوں سے ہادی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ دہلہ فیملی کی حالیہ مشکل سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ حجاب کس صورت حال سے گزر رہی ہے اور اس صورت حال میں ہادی کا جو کردار بیان کیا جا رہا ہے وہ اس سے بھی باخبر ہیں۔

اس سب کے باوجود وہ ان کے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ہادی کے حوالے سے وہ بدگمانیاں اور طیش و اکثر عطا کے ذہن میں نہیں تھا جو انگل فیاض اور فیصل وغیرہ کے ہاں پایا جا رہا تھا۔ یا کم از کم یہ اس درجے کا نہیں تھا۔

آئی تھی مگر یہ ضرور پتا چل گیا تھا کہ یہ مزید خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہادی اور تھامس وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ ”بھر“ چیپ کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اور اس کے کھڑکیاں دروازے بند تھیں۔ ہادی کے اندازے کے مطابق ارم اس جھگڑے سے بے خبری رہی تھی۔

☆☆☆
رات کے دس بجے تھے۔ ہادی اپنے ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ اس کے سینے میں ہلچل تھی۔ وہ جوابی طور پر جلال پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا اور ایسا کرنے کی ہمت بھی رکھتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے ایسا کیا نہیں تھا۔ اسے یہ سب کچھ جمیلنا اچھا لگا تھا۔ حجاب کے حوالے سے لگنے والی ہر جوٹ اس کے تصورات میں ایک سنہری ستارے کی طرح چمکنے لگتی تھی۔

جلال سے ہونے والی اس سنگین ملاقات کے بعد یہ بات اچھی طرح ہادی کی سمجھ میں آگئی تھی کہ جلال اور حجاب کے معاملات ”پوائنٹ آف ٹوریزم“ پر آگئے ہیں۔ جلال میں کوئی معمولی سے معمولی چمک بھی ہادی کو دکھائی نہیں دی۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید وہ اپنی ”عزت بے عزتی“ کو ایک طرف رکھ کر جلال کے شبہات دور کرنے کی ایک اور کوشش کرتا۔ جلال اس کی توقع سے زیادہ سنگناخ اور کرخ ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بہ ظاہر تو حجاب کو طلاق دینے پر آمادہ تھا مگر حقیقت میں اسے اپنی مجلس نے حائل رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

ہادی کے ان خیالات کو اس وقت مزید تقویت ملی جب اگلی صبح اسے گزرا ری نے فون کیا۔ اس نے بتایا کہ کل اس کی ملاقات جلال کے ڈرائیور عثمان بٹ سے ہوئی ہے۔ بٹ کا کہنا ہے کہ درس والے گھر میں حجاب پر بڑی سختی ہو رہی ہے۔ دو مین دن پہلے اس سے ملازمہ شریفاں کا قانون برآمد ہو گیا تھا۔ جلال نے بتا نہیں اس سے کیا مطلب لیا اور اس سے سخت مار پیٹ کی۔ ایک ملازمہ نے حجاب کے پھٹے ہوئے خون آلود کپڑے گھر کے غسل خانے میں دیکھے ہیں۔ کلثوم دن رات اس کی نگرانی کرتی ہے اور کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں۔

”اس کے گھر والوں کو بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے
میکے والوں کو؟“ ہادی نے گلزار سے پوچھا۔

”وہ تو شاید ملنا ہی نہیں چاہتے۔ یا پھر ڈرتے ہیں۔
 لگتا ہے کہ انہوں نے حجاب کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔
 اس کی والدہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔ پھر بھی کسی نے
 اسے اس کی اطلاع نہیں دی۔ دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔

ہادی نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں لمبی تمہید باندھنا نہیں چاہتا۔ آپ کے سامنے حلفیہ یہ بیان دیتا ہوں کہ میرے اور حجاب کے حوالے سے جو باتیں پھیلائی گئی ہیں ان میں ایک رانگی کے دانے برابر بھی سچائی نہیں ہے۔ ہم دونوں اچھے دوستوں کی طرح چند بار ملے ضرور ہیں لیکن وہ بھی ایک فاصلے اور کھڑکھاؤ کے ساتھ۔“

وہ بڑی گہری نظروں سے ہادی کو دیکھتے رہے۔ ان کی نگاہیں جیسے ہادی کے اندر تک جا رہی تھیں۔ بہر حال حسب معمول دھیمے لہجے میں بولے۔ ”کیا دونوں طرف ہی ایسا تھا؟“

”مم..... میں سمجھا نہیں تھی۔“
 ”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تم حجاب کے متعلق جو کہہ رہے ہو وہ بالکل درست ہے لیکن کیا تم اپنے بارے میں درست کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے تمہارے دل میں حجاب کے لیے بس دوستی ہے؟“
 ایک لمحے کے لیے وہ شٹا کیا مگر پھر سنبھل کر بولا۔
 ”ڈاکٹر صاحب! حجاب میرے لیے ہمیشہ محترم رہی ہیں اور رہیں گی۔ میرے ذہن میں ان کے لیے کوئی نامناسب حوالہ آئی نہیں سکتا۔ ناممکن ہے جناب۔“

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر پھر خاموش رہے۔ بس اسے دیکھتے رہے۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہے ہوں..... تم نے بات کو الفاظ کے غلاف میں لپیٹا ہے مسٹر ہادی! بہر حال آگے کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

ہادی نے چائے ختم کرنے کے بعد کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! مجھے پتا نہیں کہ آپ میری اس بات کو کس انداز سے لیں گے، مگر میں پورے غلوں دل کے ساتھ اس مصیبت میں انکل فیاض کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہوں۔“

”مالی تعاون ڈاکٹر صاحب۔ اور ایک بار پھر کہوں گا کہ پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ۔ مجھے معلوم ہے کہ انکل فیاض اس وقت سخت مالی مشکلات میں ہیں۔ انہوں نے خالہ صوفیہ کے علاج اور فیصل کی شاپ کے لیے ایک بھاری قرض اٹھایا تھا، جو تاحال اتر نہیں سکا اور یہی قرض ہے جس کے سبب حجاب کی مصیبت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔“

انہوں نے پھر اپنی آنکھیں ہادی کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ وہ گہرائی تک دیکھ رہے تھے۔ یہ فیصلے کالج تھا۔ آخر یوں لگا کہ ہادی کے اندر کی سچائی نے ان پر فرار واقعی اثر کیا ہے۔ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ”حل کر کہو، کیا کہنا

چاہتے ہو؟“ وہ بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب..... پلیز..... میری بے لوثی پر شبہ نہ کیجیے گا۔ میں انکل فیاض کو قرض حسنہ کے طور پر کچھ رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے حوالے سے بہت بدگمان ہیں۔ میری ایسی کوئی پیشکش انہیں قبول نہ ہوگی۔“

”ہوں۔“ ڈاکٹر صاحب نے پُرسوج انداز میں ہنکارا بھرا۔

”میں جانتا ہوں ڈاکٹر صاحب کہ انکل فیاض کے لیے رقم کا بندوبست کرنے کے سلسلے میں آپ بھی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کے ایک دوستوں نے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ آپ مجھے بھی ان میں شامل کر لیجیے۔ میں چاہتا ہوں کہ رقم کی فراہمی کے سلسلے میں میں سامنے نہ آؤں۔ یہ کام آپ کے توسط سے ہو جائے۔ آپ اس میں میرا کوئی ذکر نہ کریں اور میں اپنی بات دہراؤں گا۔ یہ قرض حسنہ ہوگا۔ وہ جیسے اور جب چاہیں اپنی سہولت کے مطابق لوٹا سکیں گے۔“

اگلے آدھ ہون گھنٹے ڈاکٹر عطا اور ہادی کے درمیان اس معاملے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہادی نے کہا کہ وہ اگلے پندرہ بیس روز کے اندر انہیں اپنے ذرائع سے قریباً 80 لاکھ روپیہ فراہم کر سکتا ہے۔

یوں لگتا تھا کہ ڈاکٹر عطا کی ”معاذ بھی“ نے ہادی کے دل و دماغ کو ٹول لیا ہے، وہ اس کی شرافت کے ساتھ ساتھ اس کے جذبے کی شدت اور سچائی کے بھی قائل ہو رہے ہیں۔ ان دونوں میں جلد ہی اعتماد کی فضا قائم ہو گئی۔ ڈاکٹر عطا نے ہادی کو قرعے کی مکمل تفصیل فراہم کی اور یہ بھی بتایا کہ کتنی رقم کا انتظام ہو چکا ہے۔ یہ دراصل پہلی قسط کا انتظام تھا جو تقریباً 102800 یورو یعنی ایک کروڑ دس لاکھ روپے کے لگ بھگ بنتی تھی۔ لیکن اس میں بھی ابھی پینتیس چالیس لاکھ روپے کم تھے۔

ہادی نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں چاہتا ہوں کہ قسط کے بجائے پوری رقم ہی ان لوگوں کے منہ پر ماری جائے اور یہ معاملہ ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد سب کچھ حجاب پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جلال سے Divorce چاہتی ہیں یا نہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہادی مگر یہ کہنا آسان ہے، اس پر عمل خاصا مشکل ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے یہ مارک اپ وغیرہ ڈال کر سوا تین کروڑ روپے کے قریب بن جاتے ہیں۔ بہت کوشش کر کے ہم جو جمع کر سکے ہیں وہ پینسٹھ ہزار روپے یعنی ستر لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ اب اگر

تمہارے 80 لاکھ بھی جمع ہو جائیں تو یہ ڈیڑھ کروڑ کے قریب بن جائے گا۔ اس کے بعد بھی ہمیں لگ بھگ مزید ایک کروڑ اسی لاکھ کی ضرورت ہوگی۔

ہادی نے ٹھوڑی کھجائے ہوئے کہا۔ ”عطا صاحب! مجھے ایک بات بتائیں۔ یہ فیاض صاحب کا ذاتی معاملہ ہے لیکن اس حوالے سے ذہن میں سوال ضرور اٹھتا ہے۔ وہ جس مکان میں رہ رہے ہیں، میرے اندازے کے مطابق پاکستانی کرنسی میں چار، ساڑھے چار کروڑ کا تو ضرور ہے۔ کیا اسے بچ کر کسی نسبتاً چھوٹے گھر میں رہنے کا خیال ان کے ذہن میں نہیں آتا؟“

ڈاکٹر عطا نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”دراصل یہ مکان اکیلے فیاض کا نہیں ہے۔ اس میں پچاس فیصد حصہ فیاض کی بڑی بھانجی کا ہے اور وہ بڑی سخت گیر عورت ہے۔ وہ مکان فروخت کرنے پر راضی نہیں ہوگی۔ جب فیاض نے گھر کو گروی رکھا تھا تب بھی وہ بڑی مشکل سے تیار ہوئی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ تب اسے ”رشتے داری“ ہو جانے کی امید تھی۔ اس وقت تک فیاض کے بڑے بھائی بھی زندہ تھے۔“

”رشتے داری سے آپ کا کیا مطلب ہے؟“

”دراصل فیاض کی بڑی بھانجی خواہش رکھتی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی فیاض کے بیٹے فیصل سے ہو جائے۔ یہ فیاض کے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی شاید فیصل کے لیے۔ لڑکی عمر میں بڑی ہے قریباً اٹھائیس اسیس سال کی۔ ڈیڑھ ڈول کی وجہ سے اس سے بھی زیادہ کی لگتی ہے۔ فیصل کو تو تم نے دیکھا ہی ہوگا۔ دونوں کا کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔ اس تنازعے کی وجہ سے دونوں گھرانوں میں کافی کھچاؤ ہے۔“

ہادی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے جناب! یہ بات تو سمجھ میں آرہی ہے لیکن اب جلال والے معاملے کا کیا کیا جائے۔ یہ بات تو اب تقریباً کلیئر ہے کہ حجاب اور جلال اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ حجاب علیحدہ ہو جانا چاہتی ہیں۔ یہ حقیقت بھی اب ہم سب جانتے ہیں کہ وہاں درس والے گھر میں حجاب بہت سختی کے دن گزار رہی ہیں۔ جلال انہیں کہہ چکا ہے کہ اگر وہ زیادہ تنگ ہے تو اس سے طلاق لے لے۔ اور یقیناً اب حجاب بھی یہی چاہتی ہوں گی۔ مگر انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے بعد ان کے گھر والے سخت معصیت میں آجائیں گے۔ بات تو بالکل واضح ہے۔ حجاب کو آزادی اسی صورت میں مل سکتی ہے جب یہ قرض والا معاملہ ختم ہوگا۔“

”مگر کیسے؟ ہم سوال تو یہی ہے۔“

ہادی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پُرسوج لہجے میں بولا۔ ”آپ نے ابھی بتایا ہے کہ گجرات میں فیاض صاحب کی کچھ زمین ہے جو وہ بیٹا چاہ رہے ہیں۔ اگر ہم کسی طرح اس کا کوئی گاہک پیدا کر سکیں تو صورت حال بہتر ہو سکتی ہے۔ آپ کا کیا اندازہ ہے، کتنے تک میں بک جائے گی وہ جگہ؟“

ڈاکٹر عطا بولے۔ ”قیمت تو اس کی اتنی پچاسی لاکھ سے کم نہیں ہے، مگر فیاض ساٹھ ستر تک بھی بیچنے کو تیار ہے۔ مسئلہ تو حقیقی خریدار کا ہے۔“

”عطا صاحب! آپ مجھے چھ سات روز کی مہلت دیں۔ میں اس سلسلے میں کوشش کرتا ہوں، آج کل میں جن کے لیے کام کر رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ وہ یہ رقبہ خریدنے پر آمادہ ہو جائیں۔ یا کسی اور کو آمادہ کر لیں۔“

”وہ بک بھی جائے گی ہادی، تو ہم زیادہ سے زیادہ 2 کروڑ دس بیس لاکھ تک پہنچ جائیں گے۔ میرا اندازہ تو یہی ہے کہ جلال کو اتنی بڑی رقم یکمشت ادا کرنا کافی مشکل کام ہے۔“

”مگر ہم ایک بھر پور کوشش تو کر سکتے ہیں عطا صاحب۔ آپ..... آپ مجھے ایک ہفتے کا ٹائم دیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں کچھ نہ کچھ کر سکوں گا۔ آپ بھی اپنے طور پر کوشش جاری رکھیے۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ فنڈ تو فیاض صاحب اور فیصل کے پاس بھی ہوگا۔ انشاء اللہ کوئی اچھی صورت حال سامنے آئے گی۔ مگر وہی پہلے والی گزارش میں ایک بار پھر آپ کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میرا نام کہیں نہ آئے۔“

ڈاکٹر عطا اثنائی انداز میں خاموش رہے۔ یہ بات وہ بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ جلال کے گھر میں حجاب کے لیے حالات دن بہ دن دگرگوں ہوتے جا رہے ہیں اور اسے اس صورت حال سے نکالے جانے کی فوری اشد ضرورت ہے۔ اسے زبردستی نکالنا بے کار تھا اور اس نے لکنا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کو مزید مشکلات میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کی سلامتی و آسودگی کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو چکی تھی۔ اب ایک ہی راستہ تھا۔ اسے اور اس کے والدین کو معاشی خانگی سے نکالا جاتا۔

وہیں ڈاکٹر عطا صاحب کے پاس بیٹھے بیٹھے ہادی نے شیخو صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے چھوٹے ہی کہا۔ ”اوئے قربان جانو! تیرے تے ہادی پیارے! ہلا کے رکھ دتا ہے تو نے مارکیٹ کو۔ مزہ آگیا تیری قسم۔ بس اب جلدی سے

پیس زنداں

ایک اہم کامیٹر مل اور سٹ دے (سچیک دے) ہوائی ڈاک کے ذریعے۔ کوئی چودہ کے نیڑے گانے ہو جائیں۔“

”چلو شیخو بھائی! وہ بھی سٹ دیتا ہوں۔ پر آپ کو بھی کچھ پیسے اور سٹے پڑیں گے۔ ضرورت آن پڑی ہے۔“

”اوئے کتنے پیسے..... پر فرمائش اتنی ہی کرنا جتنی میری پہلی ہے۔“

”آپ کی پہلی کافی بڑی ہے شیخو بھائی..... اور کافی سخت بھی ہے۔“

”اوئے اتنی سخت بھی نہیں ہے۔ پر میں کر لوں گا کچھ نہ کچھ۔ تو بس کوئی نئی چیز بھیج دے قفاٹ۔ وہ کیا گا نا لکھا تھا تو نے..... اک آخری فون کر لیں یارا..... ذرا ساجی اور مر لیں یارا۔ بس اس ٹاپ کی کوئی سپر ہٹ چیز لکھ بھیجتی ہے۔“

”ہو جائے گا شیخو بھائی! اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ گجرات کے علاقے میں زمین کا ایک ٹوٹا ہے۔ بڑی مناسب جگہ ہے۔ جلد ہی کسی نہ کسی اسکیم میں آجائے گی۔ ستے داموں مل رہی ہے۔ الو۔ سٹوٹ کر لیں۔ قائمے میں رہیں گے۔“

”یار ہادی! تو شاعر ہی رہ، پر اپنی ڈیلر نہ بن۔ ورنہ مرادے گا کہیں۔“

”شیخو بھائی! شاعر اور زمین کا گہرا تعلق ہے۔ ہر گیت غزل کی ایک زمین ہوتی ہے۔“

”ایک تو یار! تو مذاق یہ بڑا ہے۔ اچھا کس تھاں پر ہے یہ پلاٹ؟“

”یہ میں آپ کو شام کو بتاؤں گا۔ اور تھوڑی بہت ایڈوانس کی رقم بھی اپنے لیے۔“

”چلو پھر ٹھیک ہے، شام کو بات کریں گے۔“ شیخو بھائی نے کہا۔

شیخو بھائی سے بات ختم کر کے ہادی پاکستان میں اپنے واقف پر اپنی ڈیلر کا نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایل ڈی اے اسکیم میں ہادی کا اپنا دس مرے لے پلاٹ بھی تو تھا۔

☆☆☆

حجاب گھر کے نیم چار ایک بیسٹ میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر صبح یہ امید بندھتی تھی کہ وہ آج شام تک یہاں سے نکال لی جائے گی اور ہر شام یہ امید ٹوٹ جاتی تھی۔ یہاں اب اسے چھ دن تھا۔ یہ چھ دن چھ برسوں سے کم نہیں تھے۔ اس دوران میں اسے ایک بار بھی جلال کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ باہر کی دنیا سے اس کا واحد راستہ کلثوم ہی تھی۔

اب وہ بے بسی کی انتہا کو چھونے لگی تھی۔ یہ چھٹے روز کی شام کی بات ہے۔ حجاب وہیں دروازے کے پاس فرش پر ایک غالیچہ بچھائے لیٹی ہوئی تھی۔ اسے قافلے سے گاڑی کا دم مارن سنائی دیا۔ وہ چونک گئی۔ یقیناً یہ جلال کی ”بھر“ چپ ہی تھی۔ وہ یہاں آیا تھا۔ وہ ایک دم بے قرار ہو گئی۔ کچھ دیر اٹھ کر کمرے میں گھومتی رہی پھر دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ کلثوم کو آوازیں دے رہی تھی۔ کلثوم تو جیسے بالکل بہری ہی ہو چکی تھی۔ اس کی کوئی منت سماجت سنی ہی نہیں تھی۔ ”کلثوم! ایک بار میری بات سن لو، صرف ایک بار..... کلثوم.....“

اس کے ارد گرد وہی ساٹا رہا جو آج کل دن رات اس کی جان کھا رہا تھا۔ وہ بے چینی اور ڈپریشن کی انتہا پر پہنچ گئی۔ وہ جلال کو آوازیں دینے لگی۔ ”جلال..... جلال، میری بات سنیں۔ ایک بار میری بات سنیں۔“ ساتھ ساتھ وہ دروازے پر دو ہنر بھی مار رہی تھی۔ اس کے رونے چلانے کی آوازیں بیسٹ کی سنگلاخ دیواروں میں گونجنے لگیں۔ اور پھر بیسٹ کی سیز جیوں پر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ نیچے آ رہا تھا۔ وہ بہ دستور اسے پکارتی رہی۔ دروازے کا لاک کھولا گیا۔ حسب معمول دروازہ چھ سات انچ تک کھلا اور دوسری طرف جلال کی صورت دکھائی دی۔ وہ شلوار قمیض اور ویسٹ کوٹ میں تھا۔ ہمیشہ کی طرح سیل فون اس کے ہاتھ میں تھا۔

وہ بے دم سی ہو کر گر پڑی۔ گھٹنوں کے ٹل بیٹھ گئی۔ ”جلال! مجھے یہاں سے نکالیں۔ مجھے یہاں کیوں بند کر دیا ہے..... کیوں کر دیا ہے؟“ وہ ہلکی سی آواز میں بولی۔

”اپنے سوال کا جواب ابھی تم نے خود ہی دے دیا ہے۔“ جلال پھنکارا۔ ”اس طرح چلاؤ گی تو پھر..... تمہارے منہ میں کپڑا بھی ٹھونسا پڑے گا۔“

”میں کچھ نہیں کہوں گی جلال! اپنے ہونٹ سی لوں گی۔ لیکن پلیز مجھے اس طرح بند نہ کریں۔ میں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں۔“

”کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں جانتا ہوں بڑی سخت جان ہو اور اتنی ہی سخت دل بھی ہو۔ تمہاری جیسی عورتیں بہت کچھ جھیل سکتی ہیں۔“

”میں کیسی عورت ہوں۔ جلال! مجھے بتائیں..... میں نے کیا کر دیا ہے۔ کیا آپ بھی دنیا کی باتوں میں.....“

”کیوں بند کر۔“ وہ اتنے زور سے دھاڑا کہ دیواریں مل گئیں۔ ”اس بارے میں ایک لفظ منہ سے نہ

نکالنا۔ تمہیں پتا ہے..... تمہیں پتا ہے مجھ سے یہ جھوٹ برداشت نہیں ہوتا۔“

وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ دروازے سے سرٹکا کر سسکیاں لینے لگی۔ پھر آنسوؤں سے ترچہ اٹھا کر بولی۔ ”پلیز..... مجھے اتنا تو بتادیں، امی کا کیا حال ہے۔ کہاں ہیں وہ؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”آنٹی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ مگر اب بہتر ہیں..... ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن میں گھر آجائیں۔“

”پلیز جلال..... مجھے ایک بار ان سے ملا دیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ ایک لفظ زبان سے نہیں نکالوں گی۔ آ..... آپ میرے ساتھ رہے گا۔ میں بس پانچ منٹ ان کے پاس بیٹھ کر واپس آ جاؤں گی۔“

”ابھی ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ تم جہاں ہو بالکل ٹھیک ہو۔ تمہارے گوشت کی گرمی ذرا ٹھنڈی ہو جائے گی تو پھر دیکھیں گے۔“

اسے لگا اس کی سانس رک جائے گی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے دروازے کی درز میں سے ہاتھ گزارا اور جلال کا پاؤں پکڑ لیا۔ سیاہ رنگ کی چھمچاتی جوتی کو اپنے نازک ہاتھ میں تھامتے ہوئے بولی۔ ”خدا کے لیے ایسا نہ کریں جلال! آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی۔ لیکن مجھے یہاں سے نکال لیں جلال۔“

وہ اپنی جگہ تکا کھڑا رہا۔ چہرے پر نرمی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کٹیلے انداز میں بولا۔ ”اسی لمحے میں بات کرونا جیسے کیا کرتی تھیں۔ تمہارے اندر چنگاری تھی نابغہ دوست کی۔ جو رہ کر تمہارے اندر چمک رہی تھی۔ اب چمکاؤ نا اسے۔ اب وہ کیوں نہیں بھڑک رہی، بتاؤ نا۔“

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ریشمی بال مٹھی میں جکڑ لیے اور جھٹکا دے کر اس کا چہرہ اوپر اپنی طرف اٹھا دیا۔ وہ رونے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔ جلال کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کے بالوں کی جڑیں اکھڑنے لگیں۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ ”اف جلال! مجھے درد ہو رہا ہے۔ پلیز چھوڑ دیں۔“

وہ اور زور سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ”میرے سوال کا جواب دو۔ اس چنگاری کا ذکر تم نے خود ہی کیا تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ چنگاری تم جھنجھ میں اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ اب کہاں ہے وہ؟“

وہ تکلیف کی شدت سے بری طرح کرائے گئی۔ اس کی گردن ایک طرف مڑی ہوئی تھی۔ اس کے لرزاں ہاتھ جلال کی کلائی پر تھے۔ جیسے وہ خود کو چھڑانے کی کمزوری کوشش کر رہی ہو۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ جواب میں کچھ کہہ سکے۔ جلال نے ایک جھٹکا دے کر اس کے بال چھوڑ دیے اور پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ حجاب نے تڑپ کر دروازے کا پٹ تھام لیا۔ ”اے بند نہ کریں۔ اے کھلا رہنے دیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔“ وہ دل فگار آواز میں بولی۔

جلال ماننے والا کہاں تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ حجاب کا ہاتھ دونوں پٹ کے درمیان آ گیا۔ وہ پٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی مگر جب جلال نے دباؤ بڑھایا اور اسے اپنی پھٹلی کی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں تو اس نے تڑپ کر ہاتھ اندر کر لیا۔ اس کی کراہیں دلدوز تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر اسی طرح کراہتی اور سسکتی رہی، پھر نڈھال سی ہو گئی اور دروازے کے پاس ہی غالیچے پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنا منہ دروازے کی پٹلی درز سے بالکل قریب کر لیا۔ ایسا کرنے سے اسے کچھ سکون ملا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ باہر کی روشنی اور ہوا کو محسوس کر رہی ہے۔

☆☆☆

درحقیقت ہادی کے نئے گیتوں کے البم نے تھلکہ بجا دیا تھا۔ گلوکار بھی نیا تھا۔ موسیقار کے پچھلے ایک دو البم فلاب گئے تھے۔ اس نئے البم کی اصل جان ہادی کے لکھے ہوئے بول ہی تھے۔ وہی بول جو اس نے کسی کے دیے ہوئے قلم سے لکھے تھے۔ وہ گیت تو خاص طور سے خاص و عام میں مقبول ہو رہا تھا جس میں وٹس کی ایک رات کا ذکر تھا؟ اور نہایت تابندہ پیشانی والی ایک لڑکی کا ذکر تھا جو نہانے کہاں سے آئی تھی اور صدیوں کا سفر طے کر کے اس تک پہنچی تھی اور وہ بھی زمانوں سے اس کا انتظار کر رہا تھا، اس کی سحر انگیز مسکراہٹ پر گیت لکھ رہا تھا۔ دونوں روشنیوں سے جھللاتے ایک رواں پانی کے کنارے ملے تھے۔ وہ اسے پہچان گیا تھا لیکن وہ اسے نہیں پہچانی تھی، یہ کیسا ملن تھا..... یہ کیسی بے خبری تھی؟

ہادی ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ آڈیو سسٹم پر یہی گیت دھمی آواز میں ملے ہوئے تھا۔ ہادی کے سامنے کچھ کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں کیلکولیٹر تھا۔ وہ حساب کتاب جوڑ رہا تھا۔ وہ لاہور سے روانہ ہوا تھا تو اس کے بینک اکاؤنٹ میں گیارہ لاکھ کے قریب موجود تھے۔ گھر میں

سیونگ سرٹیکٹس اور بانڈز وغیرہ کی شکل میں بارہ چودہ لاکھ روپیہ رکھا تھا۔ البم کی مقبولیت کے بعد اس کے بینک اکاؤنٹ میں تیزی سے رقم کا اضافہ ہوا تھا۔ وہ تین "البم" کے گیت لکھ چکا تھا۔ پہلا البم لائیو ہو گیا تھا اور معاہدے کے مطابق اس کی رائلٹی کی مد میں بھی کچھ رقم اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئی تھی۔ قریباً دس لاکھ شیخو صاحب ایڈوانس دینے والے تھے۔ یہ کل ملا کر 61 لاکھ کے قریب بن رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں ہادی کو لگ رہا تھا کہ جو پینتیس چھپیں لاکھ روپیہ پاکستان سے آنے کے بعد ڈپازٹ ہوا ہے وہ اس کا ہے ہی نہیں۔ یہ حجاب کی امانت ہے۔ اس کی اصل حقدار وہی ہے۔ کیونکہ اس کی دی ہوئی توانائی سے اس کی تخلیقی قوت کے بند سوتے کھلے ہیں اور اسی کے دیے ہوئے قلم سے اس نے وہ الفاظ کاغذ پر اتارے ہیں جنہوں نے اس کے لیے آسانیوں اور کشائش کے دروازے کھولے ہیں۔

اس نے ساری جمع تفریق کر لی۔ اب اگر وہ لاہور میں اپنی ہنڈا گاڑی فروخت کر دیتا تو وہ 80 لاکھ روپیہ تو قریباً پورا ہو جاتا تھا جس کا وعدہ اس نے ڈاکٹر عطا سے کیا تھا۔ مگر گاڑی فروخت کرنے سے لاہور میں والدہ اور بھائی کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ وہ ان کو ذرا سی پریشانی بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔

اس سے بہتر تو یہی تھا کہ وہ اپنا ایل ڈی اے اسکیم والا پلاٹ بیچ دیتا۔ کوئی ایسا گاہک جو پوری رقم یکمشت ادا کر دیتا۔ یوں اسے تیس تیس لاکھ روپے مزید مل جاتے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گاڑی کے بجائے پلاٹ فروخت کر دے گا۔

پتا نہیں، یہ کیسا جذبہ تھا۔ ہادی کو اپنا سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ کر رہا تھا۔ بس اس کے دل میں ایک ہی بات سانی ہوئی تھی۔ حجاب کو کسی طرح معاشی شعبے سے آزاد کرانا ہے۔ اس نے فون اٹھایا اور شیخو صاحب کا نمبر پرہیں کیا۔ وہ غالباً دوپہر کے بھاری بھر کم کھانے کے بعد دو گلاس ٹی ڈکار چکے تھے اور اب دفتر میں ہی کچھ دیر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ "ہیلو! ان کی پاٹ دار آواز سنائی دی۔

"کیا بتاؤ بھائی؟"

نے ٹرانسفر کر دیا ہے تمہارے اکاؤنٹ میں۔ دس لاکھ۔" اور وہ جوانو۔ بسٹ کا مشورہ دیا تھا آپ کو؟" "اوئے جگر گوشے! تم اس مسکین کو کہیں انو۔ بسٹ کرنے جو گا چھوڑو گے تو انو۔ بسٹ کرے گا نا۔" "چھوڑیں شیخو بھائی! آپ تو اپنا کرتا اتار کر چھوڑیں تو آٹھ دس لاکھ ٹپک پڑتا ہے۔" "تو آٹھ دس لاکھ میں تو نہیں ملے گا نا وہ گھبراتا رہے۔"

"چلیں کچھ اور ڈال لیں اس میں۔ مجھے لگتا ہے ساتھ بیٹھ تک یہ سودا "ڈن" ہو جائے گا۔ زیادہ نہیں تو چکیں تیس پر سنٹ تو آپ خرید میں ہی کار ہے ہیں۔" "اچھا یار۔" شیخو بھائی نے جھکی جھکی آواز میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اب تو نے یہ ڈھول میرے گلے میں ڈال کے ہی چھوڑنا ہے۔۔۔۔۔ مگر مجھے یہ دس کہ تیرے اروا سے کیا ہیں۔ اس کڑی کو طلاق ہو جی جاتی ہے اور وہ اپنے ماں بچہ کے گھر آ جی جاتی ہے تو پھر کیا ہوگا۔ کیا وہ ویاہ شیاہ کر لے گی تجھ سے؟"

ہادی نے ایک گہری سانس لی۔ "شیخو بھائی! سب کچھ ویاہ شیاہ ہی تو نہیں ہوتا۔ میں نے پہلے ہی آپ کو بتایا تھا۔ حجاب کے سلسلے میں میرے دل پر بہت بھاری بوجھ ہے۔ میں اس کو ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔" "یعنی عشق و شوق کوئی نہیں ہے تجھے۔" شیخو بھائی نے ذرا طنز یہ انداز میں کہا۔

"وہ تو جو ہے۔۔۔۔۔ سو ہے۔ لیکن اس کے لیے ویاہ شیاہ اور شادی وادی ضروری نہیں ہوتی شیخو بھائی۔ پر آپ ٹھہرے کے لیے پوری سیٹھ۔ آپ کو یہ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی۔" شیخو بھائی نے ٹھنڈی سانس لی "آہو یار! اگر یہ کل سمجھ میں آتی ہوتی تو خود ہی آٹھ دس سطریں لکھ کر دی ہزار کا چیک وصول نہ کر لیتا۔"

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ نے لسی پی ہے۔ کیونکہ لسی پی کر ہی آپ ایسی باتیں کرتے ہیں۔" ہادی نے ہلکے پھلکے انداز میں ہنسنے لگا۔ "اچھا چل چھوڑو اس گل کو۔ لیکن جو کچھ بھی کر رہے ہو ہاتھ پیر بجا کر کرنا۔ میں پھر کہہ رہا ہوں۔ یہ اٹلی ہے بڑے عجیب لوگ ہوتے ہیں یہاں۔ ہاشم ایک حد تک ہی تمہارا ساتھ دے سکتا ہے۔"

☆☆☆

دروازے میں آنے کے بعد حجاب کا ہاتھ نیلا ہو گیا۔

اور کچھ سوچ بھی کیا تھا۔ لیکن جسمانی چوٹوں کے بجائے کہیں زیادہ تکلیف اس کے دل و دماغ میں تھی۔ وہ جو کچھ سن رہی تھی، جو کچھ سہہ رہی تھی، وہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ اڑتے اڑتے سے فحش اس کی سماعت میں گونجنے پر جتے تھے جن میں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور جو راؤ فیملی میں بہت سے لوگوں کی زبان پر تھے۔۔۔۔۔ اس کی پرانی دوستی ہے ہادی سے۔ یہ انٹرنیٹ پر اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتی تھی۔ وہ اس سے ملنے ہی آئی آیا تھا۔ یہ اس کے ساتھ ہوٹلوں میں وقت گزارتی رہی ہے۔ حجاب کو لگتا تھا کہ اس کے کانوں میں دیکے انگارے ٹھونسنے جا رہے ہیں۔

اس کے ارد گرد مناظر جیسے ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ بس تقریباً بارہ فٹ ضرب چودہ فٹ کا ایک کمر، ایک انچ ہاتھ روم، ہاتھ روم والی دیوار کے ساتھ ایک آف وائٹ الماری اور الماری کے ساتھ ڈبل بیڈ۔ خاکستری رنگ کا ایک قد آدم ریفریجریٹر اور شیشے کی ایک مستطیل میز۔ یہ چیزیں دیکھ دیکھ کر اب اسے ابکائی سی آنے لگی تھی۔ دیواریں اور ان کے رنگ کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ وہ اندھیرے سے گھبراتی تو بلب آن کر لیتی۔ بلب کی مدھم روشنی سے دم گھٹنے لگتا تو پھر اندھیرا کر لیتی۔ اس نے قید خانہ کی اذیت کے بارے میں بہت سنا تھا مگر اس کا تجربہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔

بے بسی کی انتہا کو چھو کر وہ سوچنے لگتی۔ کیا کوئی اس کے لیے کچھ کرے گا؟ کیا کوئی ایسی بات ہو جائے گی کہ جلال کے دل میں اس کے لیے اور اس کے بیمار والدین کے لیے رحم آجائے۔ بھی بھی اس کے ذہن میں ہادی کا خیال آتا اور اس کے اندر غم و غصے کی لہر بلند ہوتی۔ دانستہ یا نادانستہ اس شخص نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا اس کی زندگی کو۔ رات بھر حجاب کے ہاتھ میں درد ہوتا رہا۔ صبح تک وہ زیادہ سوچ گیا۔ حسب معمول نو بجے کے قریب دروازہ کھلا۔ چھ سات انچ کی درز پیدا ہوئی اور کلثوم نے سالن اور چائے پر مشتعل روکھا سوکھا ناشا اندر پہنچا دیا۔ حجاب کراہتے ہوئے بولی۔ "کلثوم مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ کہیں ہڈی کو کچھ نہ ہو گیا ہو۔ پلیز جلال کو بلا دو۔ وہ دیکھ لیں۔"

"وہ چلے گئے ہیں۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔ اسی دوران میں حجاب کو کھانسی کی دو رافادہ آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی بالائی کمرے سے آئی تھی اور یقیناً جلال ہی کی تھی۔ وہ دروازے کے خلا سے منہ لگا کر پکارنے لگی۔

"جلال۔۔۔۔۔ جلال۔۔۔۔۔ میری بات سن لیں۔" اس کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔ کلثوم نے جھکے سے دروازہ بند کر دیا۔ حجاب نے اپنا چہرہ بہ مشکل بچایا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد بھی وہ پکارتی رہی اور دستک دیتی رہی۔ چند منٹ بعد دروازے سے باہر پھر آہٹیں ہوئیں۔ دروازہ کھلا اور دوسری طرف جلال کی صورت نظر آئی۔ اس بار وہ دروازہ پورا کھول کر اندر آ گیا۔ "کیا قیامت چار کھی ہے تم نے۔" اس نے پوچھا۔

وہ اپنے معزوب ہاتھ کو تھامے ہوئے بولی۔ "جلال! مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ رات بھر ہوتا رہا ہے۔ کہیں کوئی فریکچر نہ ہو گیا ہو۔"

اس نے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ حجاب کو انگلیاں ہلانے کا کہا۔ انگلیاں حرکت کر رہی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر تھوڑا سا دباؤ ڈال کر چیک کیا۔ وہ بری طرح کراہنے لگی۔ "کچھ نہیں ہوا۔" وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ "بس ذرا دبا آئی ہے۔"

کلثوم عقب میں کھڑی تھی۔ جلال کے کہنے پر وہ الماری میں سے فرسٹ ایڈ کا باکس نکال لائی۔ جلال نے اس کے ہاتھ پر آئیوڈکس ٹائپ کی کوئی آئینٹ لگائی اور روٹی رکھ کر پٹی باندھ دی۔ اس عمل کے دوران میں وہ درد سے کراہتی رہی مگر جلال جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ "اب اسے لٹکا کر نہ رکھنا۔" وہ بولا۔

"پورے بازو میں درد ہو رہا ہے۔" وہ سسکی۔ اس نے باکس میں سے ڈیٹا لکڑی کا پین کھینچ لیا۔

نکالا اور حجاب کے بازو میں ٹھونک دیا۔ کلثوم باہر جا چکی تھی۔ وہ روٹھائی آواز میں بولی۔ "جلال! پلیز میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی، نہ ہی میں نے پہلے کیا ہے۔ شریفاں والا فون میں نے صرف اس لیے اپنے پاس رکھا تھا کہ۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔"

"اس پر اس شاعر صاحب کی کال آئے گی۔" وہ بات کاٹ کر بچسکا رہا۔

"نہیں جلال۔۔۔۔۔ نہیں۔" وہ ہلکی۔ "مجھے ڈر تھا کہ ایسا ہوگا۔ اس کے پاس شریفاں کا نمبر تھا۔ میں قسم کھاتی ہوں جلال۔۔۔۔۔" اس کا گلارندہ گیا۔ وہ کوشش کے باوجود آگے نہ بول سکی اور گھٹنوں میں سر دے کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بستر پر بیٹھی تھی۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس نے التجا آمیز انداز میں اس

انوکھا انتقام

سلیم انور

بے وقوف مگر ایک سچے انسان کے ہاتھوں رسوا ہونے والوں کا انجام

والدین ہمیشہ بچوں کی تربیت درست انداز میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر... یہ ضروری نہیں کہ ان کے تمام انداز اور اندازے درست بھی ثابت ہوں..... اکثر ایسے بچے خود کو بڑے چالباز سمجھتے ہیں مگر کبھی کبھی چالبازوں کی ساری بازی پلٹ جاتی ہے، جو خود کو دنیا سے بہت اگے سمجھتے ہیں وہی زمانے سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ بھی اس قافلے میں اتنا پیچھے رہ گیا تھا کہ اڑنے والی دھول نے اس کے تمام نقش تک چھپا دیے۔



تھی جو دل کو بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میرے اور کرٹس کے درمیان چھائی طویل خاموشی مجھے بے چین کیے ہوئے تھی۔ بالآخر یہ خاموشی کرٹس نے توڑی۔ وہ بولا۔ ”جانتے ہو ڈیڈی تمہیں نہیں بخشیں گے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے وہ اس کا بدلہ ضرور چکا کریں گے۔“ میں نے ایک اپنی نگاہ اپنے بھائی پر ڈالی۔ اس کے درشت لہجے نے میرے وجود کو جھجھوڑ دیا۔ میں تو اسے تسلی دینے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس کام میں، میں خود کو بہتر تصور کرتا تھا لیکن اس کے الفاظ میرے لیے کسی سانپ کی پھنکار

میرے باپ کی تدفین کے دن تک میں نے اس بات پر کبھی یقین نہیں کیا تھا کہ مرنے کے بعد بھی کوئی انتقام لے سکتا ہے۔ وہ چار جیا کا ایک مخصوص مرطوب دن تھا جب ڈیڈی کی تدفین کی گئی تھی۔ تدفین کے بعد میں اپنے بھائی کے ہمراہ اس تجزیہ گاہ کے پورج کی میز میوں پر بیٹھا ہوا تھا جو اب ہماری ملکیت بن چکا تھا۔ اس وقت افق پر گرمیوں کا سورج ڈوب رہا تھا اور آسمان پر سرخ، بخشنی اور نارنجی رنگ کی روشنیوں کی دھاریاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہوا میں صوبور کے درختوں، جنگلی پھولوں، سمندری پانی اور تھپی ہوئی زمین کی ملی جلی خوشبو شامل

بات بھی کر رہا تھا جو اس کے والدین کی سانس روک سکتا تھا۔ وہی بھاری بھر کم قرصہ جسے جلال ایک مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اس قرصے کے ٹکڑے میں اس کے بوڑھے والد اور جواں سال بھائی کو عدالتوں میں گھسیٹ سکتا تھا اور وہ اس مصیبت کو جھیلنے کی سکت ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

”جاؤ..... اب جاتی کیوں نہیں۔ کیا سوچ رہی ہو؟“ جلال کی پھنکار اس کے کانوں میں پڑی۔ ”پلیز جلال۔“ اس نے روتے ہوئے دوبارہ جلال کا تونا کندھا تھا مٹا چاہا۔ اس نے دھکا دے کر اسے پیٹک دیا۔ دانت نہیں کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کیوں جانا چاہتی ہے تو باہر۔ کیوں کھلی ہوا میں سانس لینے کے شوق چڑھے ہوئے ہیں تجھے۔ سب جانتا ہوں، وہ حرام زادہ ابھی یہیں ہے۔ انہی گلیوں میں گھوم رہا ہے آوارہ کتے کی طرح لیکن..... لیکن میں اب تجھے منع نہیں کروں گا۔ جانا چاہتی ہے تو چلی جا۔ دروازہ پورا کھلا ہے تیرے سامنے۔ چلی جا اگر جانا ہے تو۔“

وہ بستر پر اونگھی پڑی پچکیوں سے روتی رہی۔ اس کا جسم بالکل بے جان ہو گیا تھا۔ دروازے کی طرف جانا تو کھلا دروازے کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی اس میں نہیں رہی تھی۔ اپنی ماں کا بیمار لاچار چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ جلال کچھ دیر تاغیں چوڑی کر کے کھڑا رہا اور اس کے رد عمل کا انتظار کرتا رہا۔ ”اب جاتی کیوں نہیں؟“ وہ چٹکھاڑا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ پھر اس پر پل پڑے گا اور اس کو ادھیڑ کر رکھ دے گا لیکن پھر شاید اسے اس کے ذہنی ہاتھ کا خیال آ گیا۔ کوئی باریک سافر پکچر ڈی ٹوٹنے کا بہانہ بھی بن سکتا تھا۔ اس نے اس بیڈ کو زوردار لات رسید کی جس پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ پھر کسی گولے کی طرح پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اسے اور اس کے والدین کو بے نقطہ سناٹی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد کلثوم نے غصیلے انداز میں دروازہ باہر سے بند کر دیا اور حسب معمول لاک لگا دیا۔ ایک دم حجاب کا سارا جسم سرد ہو گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی ٹھنڈی ٹھار قبر میں اترتی جا رہی ہے۔ اپنی امی کا چہرہ اس کے تصور میں آیا، پھر ابو کا، پھر بھائی فیصل کا۔ کہاں ہیں وہ سب؟ کچھ دہاے دوبارہ زندہ دیکھ سکیں گے؟

زندگی کے نشیب و فراز گھٹن زدہ ماحول اور حدود قیود سے نبرد آزما بہت حسینہ کی داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

کا کندھا تھا مٹا چاہا۔ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”منہ سے بولو، کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ اپنے اندر کی ساری لجاجت اپنے لفظوں میں سمیٹ کر بولی۔ ”جلال! آپ کو پتا ہے مجھے بند جگہوں سے کتنا ڈر آتا ہے۔ میں یہاں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں۔ مم..... مجھے کہیں بھی لے جائیں لیکن اس کمرے سے اب نکال لیں۔“

”یعنی میں ظالم ہوں، میں نے تمہیں بے گناہ یہاں بند کیا ہوا ہے۔ جس بے جا میں رکھا ہوا ہے تمہیں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ مجھے بھی اب احساس ہو رہا ہے کہ شاید میں زیادتی کر رہا ہوں تم سے۔ مجھے اس کی تلافی کرنی چاہیے بلکہ معافی مانگ کر تلافی کرنی چاہیے۔ بتاؤ کس طرح معافی مانگوں تم سے؟ بتاؤ۔“

”آپ ایسا مت کہیں۔ آپ شوہر ہیں میرے..... میرے مجازی خدا کی حیثیت رکھتے ہیں۔“

”مت استعمال کرو ایسے الفاظ۔ یہ مقدس لفظ تمہارے منہ میں آکر بد چلتی کا طعنہ بن جاتے ہیں۔ میں تمہارے لیے جو کر سکتا ہوں وہ کر دیتا ہوں۔ تمہیں اس ”ظلم“ سے نجات دے دیتا ہوں۔ اگر جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے تمہارے سامنے۔“

حجاب حیرت زدہ سی کھڑی ہو گئی۔ وہ جلال کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ ہو۔ وہ اس کا لب و لہجہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سک کر بولی۔ ”میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں جلال! میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔ اگر کروں تو بے شک میری جان لے لیجے گا۔ ٹکڑے کر دیجیے گا میرے۔“

”وہ تو بعد کی بات ہے۔ لیکن میری ایک بات ابھی اچھی طرح سن لو۔ جس وقت تم اس دروازے سے باہر نکلو گی، میں اسی وقت تمہاری طلاق کے کاغذوں پر دستخط کروں گا۔ اسی وقت بالکل آزاد کروں گا تمہیں۔“

یہ ایک حجاب کے سینے میں امید کے سارے چراغ، تیز ہوا کے جھونکے سے بجھ گئے۔ ایک سرد لہر ریزہ کی ہڈی سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ طلاق لینے اور دینے والی بات ان کے درمیان پہلے بھی ہو چکی تھی اور جس پس منظر میں ہوئی تھی وہ بھی حجاب کو معلوم تھا۔ بات اب طلاق کی نہیں تھی۔ بات تو اس معاشی شکنجے کی تھی جو جلال نے اس پر کس رکھا تھا اور اس کے والدین پر بھی۔ وہ طلاق کی بات کر رہا تھا تو ساتھ ہی اس ”معاشی شکنجے“ کو بے دریغ کسے کی

سے کم نہیں تھے۔
 ”ہم نے ابھی تو ان کی تدفین کی ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”یہ کریک دل کی تاریخ کی سب سے بڑی تدفین تھی۔ وہ اب ممکنہ طور پر میرے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟“
 ”اس بات کی اہمیت نہیں کہ وہ مر چکے ہیں، جبکہ تم نے برسوں تک انہیں جس طرح ذلیل و رسوا کیا ہے۔ وہ قبر کے اندر رہ کر بھی تم سے اسی بات کا انتقام لیں گے۔ ڈیڈی بھی کسی کو مزہ سے فحش نکلنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔“ کرٹس نے کہا۔
 میں دھیرے دھیرے سر ہلانے لگا۔ میں اور کرٹس اس وقت سے ہماری خاندانی تجویز گاہ میں کام کر رہے تھے جب ہم چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ یہ تجویز گاہ ڈیڈی کو اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ اب یہ ہماری ملکیت تھی۔
 میں نے ہائی اسکول کے زمانے میں اپنا بیشتر وقت بد معاشوں کے خلاف کرٹس کے دفاع میں گزارا تھا جو اس کی وجہ سے انداز گنگو اور منکسر المذاق پر اشتعال میں آ جاتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا انداز ہمیشہ پریشان کن ہوتا تھا اور جب لڑکے ہمارے فیملی برنس کے بارے میں ظریفانہ لطیفے بیان کرتے تھے تو وہ بخیرہ ہو جاتا تھا۔
 میں اسے کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن یہی وقت تھا کہ اسے اس حقیقت کا علم ہو جائے جس کی میں نے پلاننگ کی ہوئی تھی۔ شاید ہماری یہ بحث اس سلسلے میں اچھی ثابت ہو سکتی تھی۔
 ”میں نے کس طرح ڈیڈی کی تدفین کی تھی؟“ میں نے جاننا چاہا۔
 ”انہیں علم تھا کہ تم مردوں کی دیکھ بھال کے لیے لوگوں سے پیسے ایشیا کرتے تھے۔“ کرٹس نے کہا۔
 ”وہ تو میں صرف اپنا جیب خرچ نکالنے کے لیے کرتا تھا۔“ میں نے اعتراف کیا۔
 یہ سن کر کرٹس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے تیزی سے پلکیں جھپکاتا شروع کر دیں۔ پھر میرے سینے پر اپنی انگلی کھمبوتے ہوئے بولا۔ ”لیکن تم نے لوگوں کے ساتھ دھوکا دہی کی ہے۔ انہیں چکمدے کر ڈم اتھنی ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“ میں نے اس سے اصل بات اگوانے کے لیے پوچھا۔
 ”تم لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ لاشوں کو حوطہ کرنے والے مانع کو سمجھنے سے ان کی زندگی کی مدت طویل ہو جائے گی اور ایک بار اس خوشبودار مانع کو سمجھنے کے تم ان سے پانچ ڈالر وصول کرتے تھے۔“

”یہ تو میں ان کے ساتھ مذاق کرتا تھا، کرٹس اور ڈیڈی تو ہر دور کے سب سے بڑے عملی مذاق کرنے والے تھے اور میں جو کچھ کر رہا تھا اس پر وہ خوب ہنستے تھے۔“
 ”تم گزشتہ چند برسوں میں بہت بدل چکے ہو، جبکہ اب میں تمہیں بالکل بھی نہیں جانتا۔ کسی روز تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا اور تم سے یہ حساب ڈیڈی لیں گے۔“ کرٹس نے کہا۔
 ہم چند سیکنڈ تک خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر یہ خاموشی کرٹس نے توڑی۔ وہ بولا۔ ”میں تو بھول ہی گیا تھا۔“ اس نے اپنے اسپورٹ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سفید رنگ کا ایک لفافہ باہر نکالا۔ ”یہ ڈیڈی کی خانے دار الماری میں رکھا ہوا تھا۔ یہ ہم دونوں کے نام ہے اور اس پر ”ارجنٹ“ لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں ہم دونوں کے لیے ہدایات ہوں گی کہ ان کے جانے کے بعد ہمیں تجویز گاہ کو کس طرح سے چلانا ہے اور اب وہ جا چکے ہیں۔“
 ”کرٹس، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں اور میرے خیال سے یہ اس بات کا سب سے مناسب اور بہتر موقع ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔
 کرٹس نے استغناء پر نظروں سے میری طرف دیکھا۔
 ”میں اتالیس برس سے اس قصبے میں رہ رہا ہوں لیکن اب مزید نہیں رہ سکتا۔ کل میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور میں تمہارا جا رہا ہوں۔“ میں نے انکشاف کیا۔
 ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو، جبکہ! تم تو ڈیڈی سے ہمیشہ بھی کہا کرتے تھے کہ جب ان کا انتقال ہو جائے گا تو تم یہیں قیام کرو گے اور یہ کاروبار جاری رکھو گے۔“ کرٹس نے قدرے حیرانی سے کہا۔
 ”تو پھر؟ اب وہ اس بارے میں شکایت کرنے کے لیے یہاں موجود نہیں ہیں۔ مجھے گزشتہ چند برسوں سے اس قصبے سے نفرت ہو گئی ہے۔ ڈیڈی نے می کے مرنے کے بعد ہم دونوں کو ہمیشہ خفقان میں مبتلا رکھا۔ ہم جو کچھ بھی کرتے تھے وہ ان کی نظروں میں کبھی درست نہیں ہوتا تھا۔“ میں نے اپنی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔
 ”تم نہیں جانتے۔“
 ”دیکھو بھائی۔ تم تو جانتے ہو کہ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں لیکن یہاں اب میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ میرے پاس 8057.35 ڈالر ہیں جو میں نے کاروبار کے کھاتے سے لیے تھے۔ یہ زیادہ رقم تو نہیں لیکن آغاز کے لیے مناسب ہے۔“
 ”تم نے یہ رقم ڈیڈی کی رقم سے چرائی ہے؟“

”مجھے اپنے مستقبل کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ میں نے یہ رقم ایک بڑے خاکی رنگ کے تھیلے میں رکھی ہے اور اس پر ہسٹنگ شپ لپٹا ہوا ہے۔ جب میں یہاں سے جاؤں گا تو وہ رقم میرے ساتھ ہوگی۔“ میں نے جواب دیا۔
 پھر میں نے کرٹس کے ہاتھ سے وہ سفید لفافہ لے لیا جس پر ارجنٹ لکھا ہوا تھا۔ ”چلو یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ بڑے میاں کیا کہنا چاہتے تھے۔“ میں نے کہا۔
 ”میں شرطیہ کہتا ہوں انہیں اس بات کا علم تھا کہ تم رقم چوری کر رہے ہو اور وہ تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کرنے والے تھے۔“
 میں نے لفافہ جاک کیا اور اس میں سے کیا ہوا کاغذ باہر نکال لیا پھر میں نے یہ کھول کر کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنا شروع کی جو ایک قطعہ تھا۔ پہلے تو یہ قطعہ بالکل بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ قطعہ یہ تھا۔
 بوڑھا گھوڑا اپنی کور میں گیا
 چار سو ہزار اس نے تھما لیا
 خزانے کی تلاش کے لیے تمہیں چاہیے اک اشارہ
 ایسی جگہ کا سوچو جہاں سے ہوتا ہے نظارہ
 میں چند سیکنڈ تک سڑک پار پتھر ملی پارکنگ لائٹ پر نظریں جمائے رہا اور پھر قطعہ کے تمام اشارے کیجوا ہو کر میری سمجھ میں آ گئے۔
 کرٹس نے وہ خط میرے ہاتھ سے لے لیا۔ خط پڑھنے کے دوران اس کی انگلیاں الفاظ پر گردش کرنے لگیں اور اس کے ہونٹ حرکت کرتے رہے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“
 میں اپنے بے بی بھائی پر مسکرا دیا۔ ”یاد ہے جب گزشتہ برس اولڈ من گھوڑا کا انتقال ہوا تھا تو ہر طرف اس کے وصیت نامے کے نہ ہونے کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوئی تھیں اور کچھ لوگوں نے شور و غل بھی مچایا تھا؟“
 کرٹس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”لوگ اندازہ ہی نہیں لگا سکے کہ اس نے اپنی دولت کا کیا کیا۔ وہ اس نصف قصبے کا مالک تھا اس لیے ایک بڑی شے سمجھا جاتا تھا۔“
 میں نے خط کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہ دولت کے لحاظ سے ایک بڑی شے تھا اور ہم اس دولت کو حاصل کرنے والے ہیں۔ تمام کی تمام دولت..... چار سو ہزار ڈالر!“
 کرٹس بھونچکا میرا منہ جھنکنے لگا۔
 ”میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ ڈیڈی کا میاں ہو کر رہیں گے۔ کرٹس، ہم امیر آدمی بننے والے ہیں۔“
 قبرستان قصبے سے باہر لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر

تھا۔ میں نے پک اپ سڑک پر سے اتار کر درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے روک دی۔ پھر پک اپ کے عقبی حصے میں رکھے ہوئے دو بیچے اور ایک اور ساڑھ ساڑھ اسپاٹ لائٹ اٹھا کر قبروں کی جانب چل پڑا۔ فضا میں تازہ تراشیدہ گھاس اور صنوبر کی خوشبو سوجی ہوئی تھی۔ ہم قبروں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے گھوڑی جانب بڑھ رہے تھے۔ چاند کی روشنی میں ہمیں راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ قصبے سے لے کر قبرستان پہنچنے تک کرٹس نے تمام راستے کوئی بات نہیں کی تھی اور اس کی یہ خاموشی میرے اعصاب پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔
 ”گھوڑی کوئی نہیں سمجھتی تھی۔“ میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کتنی حرج اسے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ وہ اپنی دولت کسی کو نہیں دینا چاہتا؟ کہتا تھا کہ وہ اس دولت کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔“
 ”تو پھر؟“
 ”تو میرے خیال سے اس نے ڈیڈی سے یہ وعدہ لیا ہوگا کہ مرنے کے بعد وہ اس کی دولت اس کے ساتھ اس کے تابوت میں دفن دیں۔“ میں نے کہا۔
 یہ سن کر کرٹس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلاتے ہوئے صاف دیکھ لیے۔
 ”میں اس کی قبر نہیں کھودوں گا، جبکہ!“
 ”یقیناً تم کھودو گے۔ اس نے اپنی قسمت قصبے کے ہر ایک فرد سے دھوکا دہی کر کے بنائی تھی۔ اب یہی وقت ہے کہ کوئی اس کی دولت بھلائی کے کاموں کے لیے استعمال میں لائے۔“ میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔
 گھوڑی قبر ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھی جہاں سے اونچی نیچی چراگاہ کا دلکش نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ قبر کا پتھر سادہ اور چپٹا تھا۔ وہ بوڑھا نما بھی نہیں تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بھی ایک دھیلا بھی قالو خرچ نہیں کرتا تھا۔
 میں نے اپنی اسپاٹ لائٹ روشن کر دی اور وادی کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ ڈیڈی ہمیشہ یہی کیا کرتے تھے کہ قبرستان کا یہ مقام سب سے عمدہ ہے۔ مجھے علم تھا کہ ڈیڈی نے اندازہ لگا لیا تھا، میں ان کے قطعے کے اشارے سمجھ جاؤں گا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔
 میں نے ایک بیچہ کرٹس کو تھما دیا اور اسپاٹ لائٹ زمین پر رکھ دی تاکہ قبر اور اس کے آس پاس کا حصہ روشنی کی زد میں رہے۔ رات کے ستارے میں جھنجھٹائی آوازوں اور تیز ہوا کے باعث درختوں کی شاخوں کی سرسراہٹ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سیکڑوں مرتبہ یہاں

آچکا تھا لیکن رات کے وقت یہاں مجھے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے بیلچہ زمین میں گاڑا اور کھودنا شروع کر دیا۔
کرٹس کھڑا دیکھنے لگا۔ ”اگر شریف آگیا تو پھر ہم کیا کریں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ کاؤنٹی شریف اس قصبے میں مہینے میں صرف ایک بار آتا ہے۔ وہ گزشتہ ہفتے ہی یہاں آیا تھا۔ ابھی کچھ عرصے تک نہیں آئے گا۔“ میں نے جواب دیا۔
”لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ کسی نے کھمور کی قبر کھودی ہے۔“ کرٹس نے خدشہ ظاہر کیا۔

”یقیناً پتا چل جائے گا لیکن انہیں یہ علم نہیں ہو سکے گا کہ قبر کس نے کھودی ہے اور یقیناً وہ یہ بھی نہیں جان پائیں گے کہ کیوں کھودی ہے۔ اب سوچنا بند کرو اور کام میں لگ جاؤ۔ ہم جتنی جلدی رقم پالیں گے اتنی ہی جلدی یہاں سے نکل چکیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

میں چند منٹ تک کھودتا رہا۔ پھر سستانے کے لیے گھاس پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔ زندگی اب بھی ٹھیک ٹھاک گزر رہی تھی۔ لیکن دولت ہاتھ آنے کے بعد تو ہماری زندگی اور بھی بہت زیادہ بہتر ہو جائے گی۔

آسمان پر موجود چند بادلوں کی رنگت ہلکی گلابی ہو رہی تھی کہ پو پھٹ رہی ہے اور صبح ہونے میں لگ بھگ نصف گھنٹا باقی ہے۔ میں نے کرٹس کی طرف دیکھا۔ اس نے قبر خاصی کھودی تھی اور گڑھے میں سے صرف اس کا سر باہر دکھائی دے رہا تھا۔

تب مجھے فاصلے پر ایک روشنی دکھائی دی جو سڑک پر تیزی سے لہراتی ہوئی قبرستان کی سمت بڑھ رہی تھی۔
میں نے اپنی اسپاٹ لائٹ آف کر دی اور لپک کر کرٹس کے پاس پہنچ گیا۔ ”کوئی آ رہا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”اوہ شٹ!“ کرٹس نے کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ ہم پکڑے جائیں گے۔“ وہ اچھل کر گڑھے سے باہر آ گیا اور اس روشنی کو تنکے لگا جو قبرستان میں داخل ہو رہی تھی۔

”شاید بچے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”جاؤ انہیں ڈرا کر بھگا دو۔ بیلچے کو زور زور سے قبر کے کسی پتھر پر بجانا تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوں۔“

کرٹس نے بیلچہ اپنے کاندھے پر رکھا اور آتی ہوئی روشنی کی جانب چل پڑا۔ کرٹس کے اندر یہ بات بہت اچھی تھی کہ اسے جو عظم دیا جاتا وہ اس کی جیل میں کسی قسم کی پس و پیش نہیں کرتا تھا۔ چند منٹ گزر گئے۔ اب خاموشی مجھے گراں گزر رہی تھی۔ تب مجھے دہلی دہلی آوازیں سنائی دیں۔

”خیس کرٹس!“ میں نے خود سے سرگوشی کے لہجے میں

کہا۔ ”ان سے بات مت کرو۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرو۔“
پھر فاصلے پر قدموں کی آوازیں سنائی دیں جو قریب آنے پر بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ میں چوکنا ہو گیا۔ اسے میں دھب کی آواز گونجی جیسے کسی نے تربوز پر ڈنڈے سے ضرب لگائی ہو۔ چند سیکنڈ بعد قدموں کی آواز پھر ابھرنے لگی اور کرٹس نزدیک آتا دکھائی دیا۔

وہ مجھے سے چند انچ کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی، شانے لٹکے ہوئے تھے اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

”وہ شریف تھا۔“ کرٹس نے ہانپتے ہوئے بتایا۔ پھر تیزی سے چند مختصر سانس کھینچتے ہوئے اپنی کیفیت کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ ”کہہ رہا تھا اسے معلوم تھا کہ ہم ادھر آئے ہوئے ہیں۔ وہ ہم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ ہم ادھر آئے ہوئے ہیں، جیک؟“

”یقیناً اس نے ہماری پک اپ کو ادھر آتے دیکھا ہوگا۔“ میں نے سڑک کی سمت نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اسے ٹال دیا؟“

”میں گھبرا گیا تھا اور میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میرا بیلچہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شریف میرے عین عقب میں آ رہا تھا۔ اس کا پھر بیلچے کے کنارے پر پڑا اور بیلچے کے پھل نے اچھل کر اس کی کپٹی پر ضرب لگا دی۔ ضرب پڑتے ہی شریف گر پڑا۔ اس کا سر ایک قبر کے بھاری کتبے سے ٹکرا گیا اور اس کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ وہ مر چکا ہے، جیک! میں نے اس کی بجائے شریف کو قتل کر دیا ہے۔ اب ہم کیا کریں؟“

”تمہیں یقین ہے کہ وہ مر چکا ہے؟“
کرٹس نے کئی بار اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ”وہ لوگ مجھے بجلی کی کرسی پر بھیج دیں گے جیک۔ ہے نا؟“

”اول تو یہ ایک حادثہ تھا اور دوسرا یہ کہ ہم ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے کا بچاؤ کریں گے۔ بھائی بھائی ایسا ہی تو کرتے ہیں۔ سمجھ گئے؟“ میں نے اسے دلاسا دیا۔

میں نے وادی کی سمت نظریں جمادیں اور سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے کھمور کی قبر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کرٹس سے کہا۔ ”رقم نکالنے کے بعد ہم شریف کو اس قبر کے اندر ڈال دیں گے۔ بہت کم لوگ قبرستان کے اس حصے کی طرف آتے ہیں۔ لوگوں کو یہ جاننے میں وقت لگ جائے گا کہ کسی نے کھمور کی قبر میں ادل بدل کی ہے۔ ہم پر کوئی بھی شبہ نہیں کرے گا۔ کم آن، ہمیں تیزی سے اپنا کام نمٹانا ہوگا۔“

کرٹس دوبارہ گڑھے میں اتر گیا اور ایک بار پھر کھودنا

شروع کر دیا۔
چند منٹ بعد اس کا بچہ کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا۔ وہ ٹکڑوں کے بل جھک گیا اور اپنے ہاتھوں سے مٹی ہٹانے لگا۔
چند سیکنڈ بعد گھور کے تابوت کا اوپر کی حصہ ظاہر ہو گیا۔
میں چلا گیا لگا کر گڑھے میں اتر گیا اور بیلچے کی مدد سے تابوت کے بند ڈھکن کو کھولنے لگا۔ کرٹس نے روشنی کا حلقہ تابوت کے اندر مرکوز کر دیا۔ میں نے تابوت کا ڈھکن اٹھا دیا۔
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گھور کی کھوپڑی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ میں توقع کر رہا تھا کہ رقم صین سامنے موجود ہوگی لیکن رقم موجود نہیں تھی۔
میں نے کرٹس سے روشنی لے لی۔ ”اسے اوپر اٹھاؤ!“
”اوہ جیسس، جیک۔ کیا مجھے یہ کرنا ہوگا؟“
”جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو!“
کرٹس نے گھور کے ڈھانچے کو دونوں پہلو الٹ پلٹ کیا اور میں روشنی کی مدد سے تابوت کے ہر گوشے کو چیک کرنے لگا۔
”تم کہیں بھی موجود نہیں تھی۔“
”تم غلط تھے، جیک۔ وہ کینت رقم کہاں ہے؟“
کرٹس نے قدرے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔
صین اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ ڈیڈی نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ ”انہوں نے ہم سے اپنا آخری عملی مذاق کیا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہم گھور کی قبر ضرور کھودیں گے۔ وہ اس وقت غالباً اوپر جنت میں بیٹھے ہم پر قہقہہ لگا رہے ہوں گے اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے ہوں گے۔ ہم ان کی داستان کے جھانسنے میں آکر حق بن گئے۔“ میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔ ”کم آن۔ اب چل کر شریف کو ٹھکانے لگاتے ہیں۔“
شریف کی لاش گھاس پر منہ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی جس کتبے کے بھاری پتھر سے ٹکرائی تھی اس پر خون صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کرٹس نے اس کے شانوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور میں نے اس کے دونوں ہیر پکڑ لیے۔
چھ منٹ ہم نے اسے گھور کی لاش کے اوپر لٹا دیا اور تابوت کا ڈھکن بند کر دیا۔ پھر بیلچے کی مدد سے تابوت کے اوپر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔
ابھی تھوڑی سی مٹی ڈالی ہی تھی کہ مجھے شریف کی مٹی پولیس کار کا خیال آ گیا۔ ”ہمیں شریف کی گاڑی کی چابیاں چاہیے ہوں گی تاکہ اس کی کار کو یہاں سے ہٹا دیا جائے۔“

”شاید اس نے چابی انجین میں لگی چھوڑ دی ہو۔“
کرٹس نے خیال ظاہر کیا۔
میں نے مٹی میں سر ہلا دیا۔ ”جب ہم اسے اٹھا کر یہاں سے رہے تھے تو مجھے اس کی جیب سے چابیوں کی جھنکار سنائی دی تھی۔“
پھر میں نے بیلچے بھر کر تابوت پر سے مٹی ہٹا دی۔ لیکن ایک ہلکی سی دستک کی آواز نے میرا خون جم کر دیا۔ یہ آواز تابوت کے اندر سے آرہی تھی۔
”جیسس کرٹس! میرا خیال ہے تم نے کہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔“ میں نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔
کرٹس نے بے چارگی کے انداز میں شانے اچکا دیے۔
”شاید میں غلط تھا لیکن یہ بہتر ہو گیا۔“ پھر اس نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”شریف، اپنی چابیاں باہر اچھا دو!“
”کیا تم بالکل بے عقل اور گاؤدی ہو؟“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بعض اوقات مجھے یقین نہیں آتا کہ تم میرے بھائی ہو۔ لگتا ہے کہ اسپتال میں شناخت میں کسی قسم کی گڑبڑ ہو گئی تھی اور تمہیں میرے اصلی بھائی سے بدل دیا گیا تھا۔“
”مجھے اس حق مت کہو، جیک۔“
”بعض اوقات مجھے تم پر حیرانی ہوتی ہے۔ میں بس یہی کہہ رہا ہوں۔“
”تم میرے ساتھ بہتر سلوک روا رکھنا شروع کرو ورنہ کسی روز میں۔۔۔۔۔“
میں نے گڑھے میں دوبارہ مٹی ڈالنا شروع کر دی۔
کرٹس نے میرے شانے کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟ شریف ابھی زندہ ہے۔“
”ہم اسے باہر نہیں نکال سکتے۔ وہ ہمیں شناخت کر لے گا۔ ہم دھریے جائیں گے۔“ میں نے جواز پیش کیا۔
”ڈیڈی سے رقم چرانا ایک الگ بات تھی۔ لیکن یہ تو سراسر قتل ہوگا۔ تم میرے بھائی نہیں ہو۔ اب میں تمہیں بالکل بھی نہیں جانتا۔“ کرٹس کے منہ سے تھوک اڑنے لگا۔ ”تم بہت خطرناک ہو۔“
”پیچھے ہٹ جاؤ۔“ میں نے کہا۔
اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور میرے چہرے کے قریب آ گیا۔ ”خیر اس کی آنکھوں میں بھرا ہوا تھا۔ کرٹس نے اس سے پہلے کبھی مجھے چیتچ نہیں کیا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں اس کی بات سننے اور ماننے پر رضامند ہو گیا تھا۔“
”جاؤ ڈاکٹر جینسن کو لے کر آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”کہا کما سے فوری چلنا ہے۔“

کرٹس دوڑ پڑا۔ اس کا رخ قبرستان کے باہر کھڑی ہماری سڑک کی سمت تھا۔ پھر پک اپ کا انجن اسٹارٹ ہونے اور سڑک پر تیزوں کی چڑچڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔
میں ایک بار پھر گڑھے میں کود گیا اور تابوت کا ڈھکن اٹھا دیا۔ شریف کی سانسیں معمولی چل رہی تھیں۔ ”حوصلہ رکھو!“ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر آ رہا ہے۔“
سورج اب مکمل نمودار ہو چکا تھا اور نارنجی رنگ کا ایک بھرپور گولا دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان پر موجود بادلوں کی رنگت گلابی اور بنفشی ہو رہی تھی۔ میں گھاس پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ میں اور کرٹس اس اتھری سے اب کس طرح اپنی جان بچا سکتے ہیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے قبے کو چھوڑنے کا پلان تو پہلے ہی بنایا ہوا تھا اور یہ اس پر عمل کرنے کا بہترین وقت لگ رہا تھا۔ میں نے سڑک کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ ایک کار کے انجن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔
پھر ایک پولیس کسٹی کار میرے برابر میں آ کر رک گئی۔ ایک ڈپٹی نے اپنی جانب کی کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ڈیڈی کی تدفین کے موقع پر وہاں موجود تھا۔
”ہے، جیک۔“ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ہمیں ایک عجیب سی فون کال موصول ہوئی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ شریف بوڑھے گھور کی قبر کے پاس زخمی پڑا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ تم یہاں موجود ہو اور اس بارے میں مجھے سب کچھ تفصیل سے بتا سکتے ہو۔“
میں نے سر ہلا دیا۔ کرٹس اتنا احمق نہیں تھا جتنا کہ میں اسے سمجھتا تھا۔

☆☆☆

جیل کی کٹھری میں پیشاب، پسینے اور باسی تہا کو کی بدبو رہتی ہوئی تھی۔ میں لکڑی کی بیچ پر بیٹھ گیا اور میں نے اپنا سر سینٹ کی دیوار سے ٹکا دیا۔ کچھ دیر بعد میرے ڈیڈی کے وکیل جم رائز نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ ”کیا تم آج مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو؟“
میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔
”اگر تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ کیا ہوا تھا تو میں تمہارا دفاع نہیں کر سکتا۔ تم پر قبر میں چوری کرنے اور اقدام قتل کے الزامات ہیں۔ تم جانتے ہو کہ یہ کتنے سنگین الزامات ہیں۔ ہے نا؟“ وکیل جم رائز نے کہا۔
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
”تو پھر تم اپنی مرضی چلاؤ۔ کرٹس کے خلاف تمام الزامات واپس لے لیے گئے ہیں کیونکہ وہ تمہارے خلاف

گوای دینے پر رضامند ہو گیا ہے۔ اس نے تمہارے خلاف الزامات کی فہرست میں اس کا دوبارہ رقم کی خورد برد کو بھی شامل کرنے کی درخواست کی ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ میں نے اسے اتنے غصے میں پہلے بھی نہیں دیکھا۔ وہاں تم دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی تھی جو وہ اتنے اشتعال میں ہے؟“
میں نے شانے اچکا دیے۔
اگر میں مکمل داستان بیان کر دیتا تو کرٹس دوبارہ اس معاملے میں پھنس سکتا تھا اور میں اپنے بھائی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اپنی سزا بھگت لوں گا اور جیل سے رہائی پانے کے بعد اپنی زندگی سنوارنے کی کوشش کروں گا۔ شاید ڈیڈی کے ذہن میں بھی یہی بات تھی اور وہ مجھ سے یہی چاہتے تھے۔
”یہاں آتے ہوئے میں نے ایک عجیب کہانی سنی!“
وکیل جم رائز نے کہا۔ ”تمہارے ڈیڈی نے اپنے مرنے سے قبل شریف کو فون کیا تھا۔ انہوں نے شریف سے کہا تھا کہ ان کے خیال میں کوئی بوڑھے گھور کی قبر کو کھودنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ انہوں نے شریف سے نگاہ رکھنے کو کہا تھا۔“
”بین کر میرا منہ لٹک گیا۔“
”تمہیں کم از کم وکیل کی فیس کے بارے میں فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ تمہارے ڈیڈی نے میرے پاس ایک بڑا سا خاکی رنگ کا لفافہ رکھوایا تھا جس میں 8057.35 ڈالر کی رقم موجود ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر تم کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ تو میں اس رقم کو استعمال میں لے آؤں۔“ وکیل جم رائز نے بتایا۔
”میرا بوڑھا باپ ہمیشہ ہمارے بارے میں ہی سوچتا تھا۔“ میں نے قدرے طنز یہ لہجے میں کہا۔
”ایک اور بات۔ اب تمہاری خاندانی جھجک گاہ کے تمام معاملات کرٹس چلائے گا اور اسے کسی قسم کی مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تمہارے ڈیڈی چار سو ہزار ڈالر سے زیادہ رقم کا ایک ٹرسٹ فنڈ چھوڑ کر گئے ہیں جس کی خاص ہدایات یہ ہیں کہ یہ فنڈ صرف اور صرف فیملی بزنس کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ کیا تمہیں کوئی آئیڈیا ہے کہ انہوں نے اتنی ڈیجیٹل ساری رقم کہاں سے حاصل کی تھی؟“
تب میں نے اس بارے میں مکمل چپ سادھنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر بھی اس بارے میں زبان نہیں کھولی۔ کچھ بھی ہو، آخر کو وہ میرا باپ تھا اور اس نے میری نہ سبھی میرے بھائی کی زندگی تو سنواری دی تھی۔



درست آید

مرزا امجد بیگ

دیر ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا مگر کچھ بھی غلط ہو جانے سے زندگی کے معنی بدل جاتے ہیں اور کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ زن کی بدولت زیادہ جرائم پیدا ہوتے ہیں یا زر کی وجہ سے... جو بھی ہے بہت برا ہے۔ کیونکہ سچ کو سچ ثابت ہونے میں جب سالوں کا عرصہ حائل ہو جائے تو شرافت بھی جرم کا چولا بدل کر تمام تر مفہمتوں سے دامن بچا لیتی ہے... اور یہ صورت حال انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔ لہذا قانون کی اب آنکھیں بھی ہونی چاہئیں اور کان بھی... تب ہی اس کے لمبے ہاتھ مجرم کی گردن تک پہنچ پائیں گے ورنہ سہاروں کا محتاج قانون ہو یا کوئی انسان لڑکھڑاہٹ قدموں سے جان نکال دیتی ہے... اس کیس میں بھی اگرچہ جھوٹ سے جان پر بن گئی تھی لیکن مرزا امجد بیگ نے تمام لڑکھڑاتی چالوں کو بالائے طاق رکھ کر اصل مجرم کے چہرے سے نقاب اٹھا ہی دیا... اسی میں قانون کی معراج اور قانون کے رکھوالوں کی لاج تھی۔

عدالت کے کٹہرے میں ایک جھوٹے کیس کا سچا فیصلہ

نا کامی کام نہ دیکھنا پڑا اور اس کا بنیادی سبب میرے موکل کی کوئی غلط بیانی ہی رہا ہے۔ یہاں پر یہ مثال صادق آتی ہے کہ ڈاکٹر اور وکیل سے بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے ورنہ جھوٹ اور جیت کہنا جاتی ہے۔

جہاں تک کیس کی تعداد کا تعلق ہے تو ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ عدالتوں میں بعض اوقات ایک ساتھ کئی کیس لگے ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ تعداد بھی ایک دو تک محدود ہو جاتی ہے اور بعض اوقات درجن سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے۔ یہاں پر میں ایک دو اور باتوں کی بھی وضاحت کرتا چلوں۔ اکثر لوگ مجھے کوئی رائٹر قسم کی چیز سمجھتے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اپنے کیس کی فائلز اور دیگر اہم پوائنٹس ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ اپنے اسٹاف رائٹرز سے کہانی کی شکل میں لکھوا کر آپ کی نذر کرتے ہیں۔ یہ تمام تر کہانیاں اس زمانے کی ہیں جب میں سٹی کورٹ میں باقاعدہ وکالت

میرا نام جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مرزا امجد بیگ اور کام وکالت ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ ہر کیس جیت کیسے لیتا ہوں اور میں آج تک جتنے کیسوں کی کہانی آپ کو پڑھوا چکا ہوں، اس حساب سے تو میری عمر دو، سوا دو سو سال تو ہونا ہی چاہیے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، سسٹمز میں یہ سلسلہ سن اتنی یا اکیاسی میں شروع ہوا تھا اور اب دو ہزار چودہ بھی اختتام کی جانب گامزن ہے۔ مونا سا حساب بھی لگایا جائے تو تینتیس چوبیس سال بنتے ہیں۔

آپ کے پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی شخص نہیں جس کی زندگی میں کامیابی کے ساتھ ناکامیابی نہ جڑی ہو۔ بس، کم یا زیادہ کا فرق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے میں بہت خوش قسمت واقع ہوا ہوں کہ میری پیشہ وارانہ زندگی میں ناکامی کا تناسب اتنا کم ہے کہ کسی قطار شمار میں نہیں آتا۔ اکاؤنٹ کیسز میں کبھی جزدی اور کبھی کلی طور پر مجھے

کیا کرتا تھا۔ اب وقت کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ اس وقت جب آپ یہ کہانی پڑھ رہے ہیں، میں آپ سے کوسوں دور ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ مارچ قریب الختم تھا۔ میں ایک شام حسب معمول اپنے آفس میں بیٹھا اپنے پاس آنے والے افراد کے مسائل سن رہا تھا کہ ایک پریشان حال خاتون میرے چیمبر میں داخل ہوئی۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پیشہ دارانہ مسکراہٹ کے ساتھ استفسار کیا۔ ”جی، فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میرا نام فوزیہ ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔“

میں نے رِف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔ فوزیہ کی عمر تیس سال رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور بھرے بھرے بدن کی مالک ایک سائولی اور خوش شکل عورت تھی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا آپ کو اپنے اسکول والوں سے کسی قسم کی شکایت ہے؟“

”نہیں وکیل صاحب۔“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں اپنے نہیں بلکہ داؤد کے مسئلے کے سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔“

”داؤد.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ کون صاحب ہیں؟“

”داؤد میرے شوہر کا نام ہے۔“ اس نے دکی لہجے میں بتایا۔

”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”داؤد کے ساتھ ایسا کیا ہو گیا ہے جو آپ کو میرے پاس آنا پڑا؟“

”داؤد کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”کس جرم میں؟“

”اس نے کوئی جرم نہیں کیا وکیل صاحب۔“ وہ زخمی لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میرے سوال کو اس طرح کہیں کہ پولیس نے آپ کے شوہر کو کس الزام میں گرفتار کیا ہے؟“

”اس پر قتل کا الزام ہے۔“ فوزیہ نے جواب دیا۔

”کس کے قتل کا؟“ میرا قلم رِف پیڈ پر بھسنے لگا۔

”مقتول کا نام اسلم فاروقی ہے۔“

”مقتول سے آپ کے شوہر کا کیا تعلق تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ عرصہ پہلے تک ہم اسلم فاروقی کے کرایہ دار تھے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اب ہم نے گھر بدل لیا ہے۔“

”اسلم فاروقی کو کب اور کہاں قتل کیا گیا ہے؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی فیکٹری میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ کل سپر کا واقعہ ہے۔“

گزشتہ روز بچپیں مارچ تھا۔ میں نے سوال کیا۔

”اور آپ کے شوہر کو کب گرفتار کیا گیا ہے؟“

”کل رات کو گھر سے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس وقت رات کے نو بجے تھے۔“

”کل رات کو گرفتاری ہوئی۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، آج صبح پولیس نے آپ کے شوہر کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا؟“

”جی ہاں..... ایسا ہو چکا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”فوزیہ صاحبہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ فاروقی کے قتل کے الزام میں آپ ہی کے شوہر کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب ہے؟“

”پچھلے چند روز سے داؤد اور اسلم فاروقی کے درمیان ٹین شرن چل رہی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور آج سپر میں بھی اچھی خاصی تلخ کلامی ہو گئی تھی۔“

”ٹین شرن اور تلخ کلامی کی وجہ؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور جھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وکیل صاحب، یہ خاصی طویل کہانی ہے۔ اگر آپ بورنہ ہوں تو میں آپ کو سناتی ہوں۔“

”بوریت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں کہ جب تک میں مقتول اور آپ کے شوہر کے درمیان ہونے والی چپقلش اور ٹین شرن سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو جاؤں گا، آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔“

”ٹھیک ہے، وکیل صاحب۔“ وہ غصہ سے بھری لہجے میں بولی۔ ”میں آپ کو تفصیل سے سارے حالات بتاتی ہوں۔“

آئندہ آدمے گھنٹے میں فوزیہ نے مجھے جو معلومات فراہم کیں۔ میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میں نے انہیں بھی بیان کر دیا ہے۔ اسی طرح بعض باتیں میں نے دانستہ حذف کر دی ہیں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

یہ بھی بتا دوں کہ فوزیہ کی فراہم کردہ تفصیلات کی روشنی میں، اسی رات میں نے متعلقہ تھانے جا کر طرم داؤد سے ایک تفصیلی ملاقات بھی کر لی تھی۔ داؤد سے بھی کافی کارآمد باتیں پتا چلی تھیں۔ چنانچہ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں نے یہ کہیں اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فیس کے حوالے سے فوزیہ نے مجھ سے ایک درخواست کی اور میں نے اس کی بات مان لی۔ میں فیس کی تنگدستی وصولی کے اصول پر سختی سے کاربند رہتا ہوں لیکن پتا نہیں، فوزیہ کی درخواست میں ایسی کیا بات تھی کہ میں دو قسطوں میں فیس لینے پر راضی ہو گیا۔

آدھی ایڈوائس اور آدھی کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہونے پر۔ بعض اوقات انسان کو اپنے اصولوں میں چلک پیدا کرنا پڑتی ہے۔

☆ ☆ ☆

داؤد اور فوزیہ کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے تاہم ابھی تک وہ دو سے تین نہیں ہوئے تھے۔ داؤد پولٹن مارکیٹ میں ایک دکان پر سیکڑ مین کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ مذکورہ دکان پر الیکٹریک کی، گھریلو استعمال کی اشیا فروخت ہوتی تھیں مثلاً بجلی، ٹیوب لائٹس، استریاں وغیرہ۔ داؤد کی ڈیوٹی آٹھ سے دس گھنٹے کی تھی جس کی اسے دو ہزار تنخواہ ملتی تھی۔ وہ سستازمانہ تھا۔ دو ہزار روپے کو خاصی معقول تنخواہ سمجھا جاتا تھا۔

فوزیہ ایک اسکول ٹیچر تھی اور اسے پندرہ سو تنخواہ ملتی تھی۔ دونوں کی آمدنی کل ملا کر اتنی ہو جاتی تھی کہ وہ بہ آسانی گزارہ کر لیتے تھے۔ انہیں کبھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ان پانچ سالوں میں انہوں نے چار گھر بدلے تھے۔ فاروقی والا گھر پانچواں تھا اور جب یہ کیس میرے پاس آیا، وہ فاروقی والے گھر کو بھی خیر باد کہہ چکے تھے۔

اسلم فاروقی ناظم آباد کے علاقے میں رہتا تھا اور گھر کے قریب ہی دو چار گھیاں چھوڑ کر اس نے ایک چھوٹا سا

کارخانہ کھول رکھا تھا جہاں وہ ماسٹنگ شپ تیار کرتا تھا۔ ماسٹنگ شپ بیکنگ وغیرہ کے کام آتی تھی۔ علاوہ ازیں مختلف نوعیت کے فرنیچر پر ڈیزائن وغیرہ بنانے کے لیے بھی اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسپرے پینٹ کرنے والے بھی مختلف مقاصد کے لیے ماسٹنگ شپ کا سہارا لیتے تھے۔ اسلم فاروقی کا یہ چھوٹا سا کارخانہ ایک گھر کے اندر ہی کھلا ہوا تھا جہاں وہ محدود عملے کے ساتھ ماسٹنگ شپ کی تیاری کا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کا بزنس ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔

کارخانے کے علاوہ فاروقی کا ایک اور ذریعہ آمدنی بھی تھا۔ اس کا گھر ایک سو چالیس گز پر بنا ہوا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ بالائی منزل پر وہ خود اپنی ٹیلی کے ساتھ رہتا تھا۔ جبکہ زیریں منزل کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے اس نے دو کرایے دار بسا رکھے تھے۔ ان دو پور مشر سے اسے اتنا کرایہ مل جاتا تھا کہ اس میں اس کی پوری ٹیلی کا مہینے بھر کا راشن ڈل جاتا تھا۔ دونوں میاں بیوی کے علاوہ ان کی کل سات اولادیں تھیں جن میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شامل تھے۔ فاروقی کے بچوں کی عمریں تین سے سولہ سال کے درمیان تھیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق فاروقی کے بچے بدتمیزی اور شیطانی میں پورے محلے میں اپنا جانی نہیں رکھتے تھے اور دلچسپ بات یہ کہ فاروقی اور اس کی بیوی زبیدہ کو اپنی اولاد میں کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کہیں بھی لڑائی پھڑا ہو، وہ اپنے بچوں کی حمایت میں بولتے تھے۔ بعض والدین اسی طرح کے ہوتے ہیں۔

زبیدہ ایک مولی اور بیمار عورت تھی جس کا زیادہ تر وقت بستر پر گزرتا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے میں بہتر قسم کی دوا کھیتی کھاتی تھی۔ اسے درجنوں بیماریاں لاحق تھیں۔ واقفان حال بتاتے تھے کہ شادی کے وقت زبیدہ بہت خوب صورت اور اسارٹ ہوا کرتی تھی۔ اسلم فاروقی کے روپے اور اوپر تلے سات بچوں کی پیدائش نے زبیدہ کو اتنی من کی دھوبن بنا کر رکھ دیا تھا۔

میرا موکل داؤد بھی چند روز پہلے تک فاروقی کا کرایہ دار تھا۔ وہ لگ بھگ دو سال تک فاروقی والے گھر میں رہا تھا پھر فاروقی کے نامناسب رویے کو دیکھتے ہوئے وہ اس گھر کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے برابر میں دوسرے پورشن میں ایک کرچین چلی آباد تھی۔ اگرچہ یہ دونوں پورشن سیکورٹی کے لحاظ سے انتہائی محفوظ، روشن اور ہوادار تھے لیکن فاروقی کی شاطرانہ ہوشیاری داؤد اور فوزیہ کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔

فائل میں لگا لیتا ہوں۔“ فائل میں گئے بلز کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد اس نے دو بلز نکال لیے اور داؤد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”دیکھ لیں۔ یہ گیس اور بجلی کے تازہ ترین بلز ہیں۔ میں نے بل کی رقم کو تین پر برابر تقسیم کرنے کے بعد ایک حصے کی پرچی آپ کو بھجوائی تھی۔ میں نے یہ دونوں بلز بینک میں بھر دیے ہیں۔“

”تم تین پر برابر تقسیم.....“ داؤد نے سوالیہ نظر سے فاروقی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی؟“

”بھئی، اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس مکان میں تین فیملیز آباد ہیں۔ ایک میری فیملی، ایک آپ کی فیملی اور ایک آپ کے پڑوسی ساؤل کی فیملی۔ بجلی اور گیس کا جو بھی بل آئے گا وہ ہم تینوں پر ہی تقسیم ہو گا.....!“

”تقسیم کا یہ فارمولا تو اپنی جگہ درست ہے فاروقی صاحب۔“ داؤد نے غمی سے کہا۔ ”لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ تینوں فیملیز کا استعمال ایک جیسا نہیں۔ جب وہ بجلی اور گیس ایک جتنی استعمال نہیں کرتے تو بلز میں برابر شیئر کیوں کریں.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”فاروقی صاحب! آپ کے گھر میں ماشا اللہ! نو افراد آباد ہیں اور رہائشی پورشن بھی ہم سے دگنا ہے۔ ساؤل کی فیملی میں چار افراد ہیں۔ میاں بیوی اور دو بچے اور ہم تو صرف دونوں میاں بیوی ہیں جو دن بھر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ہم دونوں جاب والے ہیں۔ سب سے کم ہم بجلی اور گیس استعمال کرتے ہیں۔“

”آپ نے جو اعداد و شمار بیان کیے ہیں میں ان سے اختلاف نہیں کروں گا۔“ فاروقی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے تو آپ کوئی اور گھر دیکھ لیں۔“

داؤد نے دو تین ماہ کی تلاش کے بعد یہ گھر پسند کیا تھا۔ وہ فوری طور پر کوئی نیا تجربہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ گھر سیکورٹی کے لحاظ سے انتہائی محفوظ تھا۔ ویسٹ اوپن ہونے کی وجہ سے ہوا کی آمد و شد بہت زیادہ تھی۔ پورشن کے عقی حصے یعنی مکن سے آسمان نظر آتا تھا لہذا صوبہ بھی گھر میں بہ آسانی داخل ہو جاتی تھی۔ وہ ایک آئیڈیل رہائش تھی۔ بس، یہ بلز کا مسئلہ آن کھڑا ہوا تھا اور وہ بھی اس

جب وہ لوگ کرایے پر یہاں رہنے آئے تھے تو فاروقی کے حسن اخلاق اور اصول پسندی نے انہیں بہت متاثر کیا تھا لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ اسلم فاروقی کی اصول پسندی صرف اسی کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہے۔

لگ بھگ ایک ماہ کے بعد جب بجلی اور گیس کے بلز آئے تو ان کے بیچ پہلا پھٹا ہوا۔

فوزیہ، داؤد کی بہ نسبت جلدی گھر آ جایا کرتی تھی۔ رات کو جب داؤد گھر پہنچا تو فوزیہ نے اس کے سامنے ایک پرچی رکھ دی۔ داؤد نے سوالیہ نظر سے بیوی کو دیکھا اور پوچھا۔

”یہ کیا ہے.....؟“

”بجلی اور گیس کا بل ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”یہ کس قسم کا بل ہے.....!“ داؤد نے اس پرچی کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”یہ تو تم فاروقی صاحب سے پوچھو۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”یہ پرچی ان کا بچہ دے گیا ہے۔“

داؤد ہاتھ منہ دھو کر فریش ہوا پھر کھانا کھانے کے بعد وہ اوپر اسلم فاروقی کے پاس چلا گیا۔ فاروقی نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا اور اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد چائے پانی کے بارے میں پوچھا۔

”کسی تکلف کی ضرورت نہیں فاروقی صاحب!“

داؤد نے جلدی سے کہا۔ ”میں ابھی کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔“

”چائے تو چلے گی.....!“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ داؤد نے غمی میں گردن ہلائی۔

”میں اس پرچی کے بارے میں آپ سے پوچھنے آیا تھا۔“

”یہ آپ کا پچھلے مہینے کا بجلی اور گیس کا بل ہے۔“

فاروقی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے دونوں اماؤنٹ کو اوپر نیچے لکھ کر ٹوٹل کر دیا ہے۔“

”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے جناب۔“ داؤد نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ تو بہت زیادہ ہے۔ ہم تو پہلے بھی دوسرے گھروں میں کرایے پر رہے ہیں.....“

”ٹھہریں..... میں آپ کو کچھ دکھاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اسلم فاروقی اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور گھر کے اندرونی حصے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

ٹھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ وہ داؤد کے قریب ہی بیٹھ گیا اور بولا۔

”میں اپنے گھر کے تمام یوٹیلیٹی بلز نہایت ہی پابندی کے ساتھ بھرتا ہوں اور جمع شدہ بلز سنبھال کر اس

لیے کہ بجلی اور گیس کے میٹرز مشترک تھے۔ اگر یہ بلز تینوں فیملیز پر برابر تقسیم کیے جاتے تو اصولی طور پر یہ ایک غیر منصفانہ تقسیم تھی کیونکہ تینوں فیملیز کے حجم میں زمین آسمان کا فرق تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ لوگ بجلی اور گیس بھی ایک دوسرے کی بہ نسبت کم اور زیادہ استعمال کرتے تھے۔

”بات دوسرا گھر دیکھنے کی نہیں ہے فاروقی صاحب!“ داؤد نے قدرے نرمی سے کہا۔ ”آپ خود بھی تو دیکھ رہے ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی پورا دن گھر میں نہیں ہوتے۔ رات کو ایک پکھا چلتا ہے یا دو گھنٹے کے لیے دو ٹیوب لائٹس جلتی ہیں۔ اسی طرح گیس کا سب سے کم استعمال بھی ہمارے ہی گھر میں ہے۔ اس صورت حال میں بلز میں برابر شیئر زیادتی والی بات نہیں؟“

”آپ کی بات میں وزن تو ہے داؤد صاحب!“

اسلم فاروقی نے سمجھ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ ہی بتائیں، اس مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے۔ آپ کے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہو تو سامنے لائیں؟“

”کیوں نہ کرایے داروں کے لیے بجلی اور گیس کے سب میٹرز لگا لیے جائیں۔“ داؤد نے گہری سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ سب میٹرز کی ریڈنگ کے مطابق آپ مجھ سے بل لے لیا کریں۔ اگر کم استعمال ہو گا تو کم اور زیادہ استعمال ہو گا تو زیادہ۔“

”ہوں.....“ فاروقی سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تجویز تو آپ کی خاصی معقول ہے۔“

”فاروقی صاحب!“ داؤد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”گیس کی تو پھر بھی خیر ہے۔ یہ مہینی بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بہت ہی معقول بلز ہوتے ہیں ان کے۔ اگر آپ صرف بجلی کے ہی سب میٹرز لگوا دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، تین سب میٹرز لگوا لیتے ہیں۔“ فاروقی نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”تین کیوں فاروقی صاحب؟“ داؤد نے پوچھا۔

”آپ کے کرایے دار تو صرف دو ہی ہیں.....“

”پانی والی موٹر کو کیوں فراموش کر رہے ہیں آپ!“

فاروقی نے جیسے ہوئے انداز میں کہا۔ ”سب سے زیادہ بجلی تو وہی کھاتی ہے۔ لائن کا پانی کھینچنے کے لیے رات کو چار پانچ گھنٹے موٹر چلانا پڑتی ہے پھر انڈر گراؤنڈ ٹینک کا پانی چھت والی ٹینک میں منتقل کرنے کے لیے بھی ایک آدھ گھنٹا موٹر چلتی ہے۔ پانی تو ہر گھر کی ضرورت ہے۔ کوئی کم استعمال

کرے یا زیادہ لیکن آپ نے یہ تو دیکھا ہو گا کہ چوبیس گھنٹے پانی لائن کے اندر موجود رہتا ہے۔“

”یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں فاروقی صاحب۔“ داؤد نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”یہاں پر پانی کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ فاروقی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”تین سب میٹرز لگوا لیتے ہیں۔ دو آپ دونوں کرایے داروں کے اور ایک موٹر کا۔ موٹر والی ریڈنگ کو تین پر برابر تقسیم کر لیں گے۔“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”داؤد صاحب! بجلی کے ٹکے میں آپ کا کوئی جاننے والا ہے؟“

”نہیں جناب۔“ داؤد نے غمی میں گردن ہلا دی۔

”ٹھیک ہے، میں ہی کسی سے بات کرتا ہوں۔“

داؤد نے اسلم فاروقی کا شکریہ ادا کیا اور واپس اپنے گھر آ گیا۔ فوزیہ کو اس نے اس گفتگو کی تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ بھی مطمئن ہو گئی۔ آئندہ چند روز میں اسی موضوع پر

داؤد کی ساؤل سے بھی بات ہوئی۔ ساؤل نے بھی اس آئیڈیا کو سراہا۔ وہ بھی اس بات سے سخت پریشان تھا کہ مالک مکان یعنی اسلم فاروقی کا بجلی اور گیس کا استعمال ان سے دو گنا تھا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اور وہ شاطر آدمی بلز کا زیادہ تر بوجھ اپنے کرایے داروں کے کندھوں پر منتقل کر دیتا تھا۔

دو ماہ گزر گئے لیکن اسلم فاروقی سب میٹرز لگوانے کی مہم میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جب داؤد اور ساؤل کا اصرار بڑھا تو ایک روز اس نے ان دونوں کو ایک خطرناک خوشخبری سنائی۔

”بھئی! میں نے بجلی کے ٹکے میں ایک بندے سے سب میٹرز کے سلسلے میں بات کر لی ہے۔“ فاروقی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میٹر تو لگ جائیں گے لیکن ایک مسئلہ ہے.....!“

”کیسا مسئلہ فاروقی صاحب؟“ ساؤل نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔

”وہ بندہ فی میٹر تین ہزار روپے کا خرچہ بتا رہا ہے۔“

فاروقی نے کہا۔ ”یعنی تین میٹرز کے نو ہزار روپے اور ایک ہزار روپے اس کے چائے پانی کے لیے۔ کل ملا کر دس ہزار کا خرچہ ہے جناب۔“

”تو.....؟“ داؤد نے سوالیہ نظر سے فاروقی کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”چار چار ہزار روپے

آپ دونوں کو دیتا ہوں گے اور دو ہزار میں دے دوں گا۔ ایک ہزار اپنا اور ایک ہزار اس بندے کا جیب خرچ۔“

”یہ کس قسم کا حساب ہے فاروقی صاحب؟“ ساؤل نے استفسار کیا۔

”بھئی! حساب تو بہت سیدھا ہے۔ چنانچہ، آپ لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا۔“ فاروقی نے جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”بھئی کے ٹکے والے بندے کو میں اپنی جیب سے ایک ہزار دوں گا۔ اس کا بوجھ آپ لوگوں پر نہیں ڈال رہا۔ باقی اپنے میٹر کے تین ہزار اور ایک ہزار موٹر والے میٹر کا شیئر تو آپ کو ہی دینا ہوگا۔“

”یہ تو سراسر ظلم ہے فاروقی صاحب!“ داؤد نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”ہم تو کرایے دار ہیں۔ اس نوعیت کے اخراجات کا بوجھ آپ ہم پر تو نہیں ڈال سکتے۔“

”بھئی! جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے۔“ وہ روکے لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ کو سب میٹر لگوانے کا شوق ہے تو یہ بوجھ تو برداشت کرنا ہی ہوگا۔ آپ اگر یہ کام کسی بندے سے مفت میں کروا سکتے ہیں تو کروائیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ لختی توقف کر کے اس نے باری باری دونوں کو گہری نظر سے دیکھا اور سپاٹ آواز میں بولا۔

”میں اس سے زیادہ آپ لوگوں کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر آپ ان حالات میں یہاں رہنا نہ چاہتے ہوں تو میری طرف سے کوئی پابندی یا زبردستی نہیں ہے۔ آپ کو کرایے کے گھر بہت مل جائیں گے اور مجھے کرایے دار۔۔۔۔۔!“

فاروقی کے یہ جملے کرایے دار کے غبارے کی ساری ہوا نکال دیتے تھے۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ مکانت اور تحفظ کے لحاظ سے فاروقی کا گھر بہت ہی آئیڈیل رہائش گاہ تھی جہاں آپ کی عزت، جان اور مال کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا لہذا قدرے زیادہ بلز کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر حلق سے اتاراجا سکتا تھا۔

ساؤل نے بھی فاروقی سے بلز کا شکوہ نہیں کیا تھا اور اس کا ایک بڑا سبب تھا۔ اس کی آٹھ سالہ بیٹی میری اور دس سالہ بیٹا ایوریٹ گھر سے نزدیک ہی ایک اسکول میں پڑھتے تھے۔ اگر وہ گھر تبدیل کرتا تو بچوں کا اسکول بھی تبدیل کرنا پڑتا جو خاصا خرچے والا کام تھا، پھر اس کے دونوں بچے اس اسکول میں بہت اچھے جارہے تھے۔ نئے اسکول میں جا کر ان کا کیا حشر ہوتا، قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ علاوہ ازیں، سب سے اہم بات یہ تھی کہ

ساؤل کو اپنی جاب کے سلسلے میں کبھی ایک دو روز کے لیے شہر سے باہر بھی جانا پڑتا تھا۔ فاروقی کا گھر ایسا تھا کہ وہ اپنی فیملی کی سیکورٹی کے حوالے سے بے فکر ہو کر دو چار دن گھر سے باہر گزرا سکتا تھا۔

داؤد کے ساتھ اگرچہ شہر سے باہر جا کر وقت گزارنے کا کوئی معاملہ نہیں تھا لیکن یہ بات وہ بھی مانتا تھا کہ بلز کی مدد میں دو تین سو زیادہ تو جارہے تھے لیکن یہاں اطمینان اور سکون دوسرے گھروں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا چنانچہ اس نے بھی حالات سے سمجھوتا کرنے ہی میں بھلائی جانی۔

وقت تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ سال کے اختتام پر فاروقی نے کرایے میں دو سو روپے اضافے کا مطالبہ کر دیا۔ داؤد آٹھ سو روپے کرایے پر یہاں آیا تھا اور اب فاروقی یہ کرایہ ایک ہزار کرنا چاہتا تھا۔ ان دنوں شہر کے مختلف علاقوں میں چوریوں اور ڈکیتیوں کی ایک وبا سی پھوٹ پڑی تھی۔ ہر روز دو چار ایسی خبریں سننے کو مل جاتی تھیں کہ قلاں علاقے میں قلاں واردات ہو گئی۔ اس صورت حال میں داؤد نے شفقت کارسک لینے کے بارے میں سوچا بھی نہیں اور بڑی شرافت کے ساتھ فاروقی کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے کرایے میں دو سو روپے کا اضافہ کر دیا۔

حزید ایک سال گزر گیا۔ اس سال کے اختتام پر حالات ایسے واہیات ہو گئے کہ داؤد کو وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اچانک لائن میں پانی غائب ہو گیا تھا۔ جب دو دو، تین تین دن کے وقفے سے پانی آنے لگا تو گھر پر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ٹینکر ڈلوانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پانی کا ٹینکر جتنے میں آتا وہ رقم تینوں گھروں پر تقسیم کر دی جاتی تھی۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب ٹینکر کی قیمت میں برابر شیئر کرنے کے باوجود بھی داؤد اور فوزیہ کو پانی بے محرومی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ انتہائی ناقابل برداشت پھوٹیشن تھی۔

پانی کا ٹینکر عموماً صبح دس گیارہ بجے ڈلتا تھا اور اس وقت داؤد اور فوزیہ گھر میں موجود نہیں ہوتے تھے۔ جب وہ اپنی اپنی جاب سے واپس آتے تو پانی ختم ہو چکا ہوتا تھا۔ وہ لوگ جیسے تیسے گزارہ کرتے اور اگلے روز صبح منہ دھو کر گھر سے نکل جاتے۔ یہ سلسلہ نا انصافی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا تھا پھر فوزیہ کے انکشاف نے جاتی پرنسپل کا کام کیا۔

”مجھے یہ خبر ملی ہے کہ فاروقی نے اپنے گھر کے اندر بھی پانی کی ایک ٹینگی لگا رکھی ہے۔“ فوزیہ نے ایک رات داؤد کو بتایا۔ ”اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو اس کے

گھر کے اندر جھانک کر خود تصدیق کر لو۔۔۔۔۔!“

”تو ٹینگی کی انتہا ہے۔“ داؤد نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”میں کسی تصدیق کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم بھلا مجھ سے جھوٹ کیوں کہو گی۔“

”ہمیں دو دو، تین تین دن کے بعد نہانا نصیب ہوتا ہے۔ میلے کپڑوں کا ایک انبار جمع ہو گیا ہے۔“ فوزیہ نے فکارتی لہجے میں کہا۔ ”جب پانی کا ٹینکر ڈلتا ہے تو ہم دونوں گھر میں موجود نہیں ہوتے۔ میں واپس آ کر دیکھتی ہوں تو فاروقی کے سارے بچے نہائے دھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے بدن پر اجلا لباس موجود ہوتا ہے۔ ہمارے پورشن کے صحن سے ان کے گھر کی دونوں انگلیاں نظر آتی ہیں جن پر درجنوں کپڑے سوکھنے کے لیے لٹکے دکھائی دیتے ہیں اور یہ سب دیکھ کر دل کڑھتا ہے داؤد۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو فوزیہ۔“ داؤد گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”پانی کی شارنج کا ایسا معاملہ آن پڑا ہے کہ یہ مسئلہ دنوں میں تو حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ جب تک لائن میں مناسب پانی آنا شروع نہیں ہوتا، ٹینکرز تو ڈلیں گے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم دونوں کام کاج چھوڑ کر دن بھر گھر میں بیٹھے رہیں اور جیسے ہی پانی کا ٹینکر ڈلے، اس سے کما حقہ استفادہ کریں۔“

”ایک کام ہو سکتا ہے داؤد۔۔۔۔۔!“ فوزیہ نے صلاح دینے والے انداز میں کہا۔

”ہاں بولو۔۔۔۔۔ کون سا کام؟“ داؤد نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم فاروقی سے کہو کہ ہمارے پورشن میں جست کی ایک چھوٹی سی ٹینگی لگوا دے۔“ فوزیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم اپنی اپنی ڈبونی پر جاتے ہوئے اس کا والو کھول جایا کریں گے۔ جب ٹینکر والا پانی ملے گا تو ہماری ٹینگی میں بھی آ جائے گا۔ پھر ہم اپنی سہولت سے اسے استعمال کر لیا کریں گے۔“

”تجویز تو تمہاری اچھی ہے۔“ وہ تعریفی نظر سے فوزیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن پچھلے دو سال میں فاروقی کو میں جتنا سمجھ سکا ہوں اس کی روشنی میں بڑے دھوکے کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ٹینگی لگوا کر دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوگا۔ وہ یہی کہے گا کہ۔۔۔۔۔ اپنی جیب سے لگوا لو!“

”تم اس سے بات تو کرو۔“ فوزیہ نے کہا۔

”دیکھیں، وہ کیا جواب دیتا ہے۔“

اگلے روز داؤد نے پانی کی غیر متعافانہ تقسیم پر اسلم

فاروقی سے بات کی تو اس نے کھرے لہجے میں کہا۔

”داؤد دھیماں! اگر تم لوگ دن بھر گھر میں نہیں ہوتے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”آپ کا کوئی قصور نہیں ہے فاروقی صاحب!“ داؤد نے معتدل انداز میں کہا۔ ”لیکن آپ میرے مسئلے کو بہ آسانی حل کر سکتے ہیں۔“

”وہ کس طرح؟“ فاروقی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ ہمیں چھوٹی سی جستی ٹینگی لگوا دیں۔“ داؤد

قارئین متوجہ ہوں

پرچہ

نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **بک اسٹال کا نام جہاں پرچہ دستیاب نہ ہو۔**

☆ **شہر اور علاقے کا نام۔**

☆ **ملکن ہوسٹل بک اسٹال PTCL یا سولائل فون نمبر۔**

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 فیز 111، سینیٹیشن ڈسٹریکٹ، تھانہ کورنگی روڈ، کراچی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

نے اپنی بیوی کی تجویز کو مالک مکان کی سماعت میں انڈیلے ہوئے کہا۔ ”ٹینگی میں پانی جمع رہے گا تو ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ فاروقی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آپ اپنی مدد آپ کے تحت ٹینگی لگوا لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”بات اعتراض کی نہیں گنجائش کی ہے فاروقی صاحب۔“ داؤد خود پر جبر کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی میری جیب اس خرچے کی اجازت نہیں دیتی۔“

”میری جیب کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے داؤد صاحب۔“ فاروقی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”آپ دو ماہ تک رک جائیں تو شاید کوئی ٹینگی نکل آئے۔“

داؤد کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ فاروقی اپنی مالی حالت کے حوالے سے قصداً دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ اس کا ٹیپ کا بزنس ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور دوپور شر کا کرایہ بھی ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ اس کی جیب میں جا رہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ فاروقی کے ذہن میں کیا ہے، داؤد نے پوچھ لیا۔

”فاروقی صاحب! دو ماہ کے بعد ایسا کیا ہونے والا ہے؟“

”دو ماہ کے بعد آپ کا سال پورا ہو جائے گا۔“

فاروقی نے داؤد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کا کرایہ بڑھانا ہے۔ ساؤل کا اگلے مہینے بڑھاؤں گا۔ پھر ہاتھ میں تھوڑی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ میں دونوں پور شرز میں جست کی چھوٹی ٹینگیاں لگوا دوں گا لیکن اسی شرط پر۔۔۔۔۔۔“

”کون سی شرط فاروقی صاحب؟“ داؤد نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

فاروقی نے جواب دیا۔ ”آدھے آدھے پر۔۔۔۔۔۔ یعنی ٹینگی کے آدھے پیسے میں دوں گا، آدھے آپ۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔۔۔۔۔۔!“

فاروقی کی چالاکی اور کینٹکی کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ داؤد دل ہی دل میں کھول کر رہ گیا۔ فاروقی سے کسی بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ٹینگی کے معاملے پر اصرار کیا تو وہ قطعاً جھاڑنے لگے گا جس کے نتیجے میں داؤد کو غصہ آ جائے گا اور پھر کوئی بھی بد مزگی ہو سکتی تھی۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے گھر آ گیا۔ فوزیہ نے جب پوچھا کہ کیا رہا تو اس نے فوزیہ کو فاروقی کے ساتھ ہونے والی

ملاقات کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ فوزیہ نے پوری بات سنی اور ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”اب تو صرف ایک ہی صورت باقی رہی ہے۔۔۔۔۔۔!“

”کون سی صورت؟“ داؤد نے پوچھا۔

”پانی کے بغیر گزارہ ممکن نہیں ہے۔“ فوزیہ نے جھجھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہمیں اپنی جیب سے ہی ٹینگی لگوانا پڑے گی۔“

”ایک اور صورت بھی ہے۔“ داؤد نے زہر خندانہ انداز میں کہا۔ ”جو تمہاری پیش کردہ صورت سے زیادہ موثر ہے۔“

”میں بھی تو سنوں۔۔۔۔۔۔؟“ فوزیہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر ہم اپنی جیب سے ٹینگی لگوا بھی لیں تو فاروقی کی ذلت کا سلسلہ ہمیں پر رکنے والا نہیں۔“ داؤد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ ذلیل انسان کل کوئی نیا ایشو کر کے دے گا۔“

”پھر۔۔۔۔۔۔؟“ فوزیہ کی سوالیہ نگاہ داؤد پر پڑی تھی۔

”پھر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ۔۔۔۔۔۔“ داؤد نے مضبوطی سے کہا۔ ”ہم بہت جلد اس گھنیا انسان کا گھر چھوڑ دیں گے۔“

”داؤد! کیا نیا گھر آسانی سے مل جائے گا۔“ فوزیہ نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”آسانی سے نہیں تو مشکل سے مل جائے گا۔“

گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”فاروقی دو ماہ کے بعد گھر بڑھانے کی بات کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے، اس سے پہلے میں کوئی اور مناسب سا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

اگلے ہی روز سے داؤد نے گھر کی تلاش شروع کر دی اور دو ماہ سے ایک ہفتہ قبل اس نے جہانگیر روڈ پر ایک چھوٹا سا مکان ڈھونڈ نکالا۔ اس نے فوزیہ کو بھی مذکورہ مکان دکھایا۔ فوزیہ نے بھی مکان پسند کر لیا پھر باہمی رضامندی سے انہوں نے اسلم فاروقی کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوبیس فروری کو داؤد نے فاروقی سے ملاقات کی اور اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

”یہ کون سا طریقہ ہے داؤد صاحب!“ فاروقی نے برہمی سے کہا۔ ”آپ کو ایک ماہ پہلے بتانا چاہیے تھا جو کہ ایک اصول بھی ہے۔ اگر مجھے آپ سے گھر خالی کرانا ہوتا تو ایک ماہ پہلے نوٹس دیتا۔“

”میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کروں گا کیونکہ آپ نے ایک اصولی بات کی ہے۔“ داؤد نے نرمی سے

کہا۔ ”لیکن آپ میری مجبوری کو بھی تو سمجھنے کی کوشش کریں، میرا خیال ہے، اب ہم مزید ایک ساتھ نہیں چل سکیں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں آپ کی مجبوری کا احساس کر لیتا ہوں۔“ فاروقی نے چالاکی سے کہا۔ ”لیکن میں ایڈوانس کی رقم فوری طور پر رائج نہیں کر سکوں گا۔ چند دن اور پرچے ہو سکتا ہے۔“

”جناب! میں نے وہاں نوکن (بیٹانہ) دے دیا ہے۔“ داؤد نے نرمی سے کہا۔ ”ہم لوگ کیم مارچ کو شفٹنگ کریں گے۔ آج چوبیس تاریخ ہے۔ آپ کوشش کریں گے تو رائج ہو ہی جائے گا۔“

”نزدوری ویسے بھی اٹھائیں کا مہینہ ہے۔“ فاروقی نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال، میں کوشش کرتا ہوں۔“

داؤد مطمئن ہو گیا لیکن جب کیم مارچ تک بھی داؤد نے ایڈوانس کی رقم واپس نہ کی تو پریشانی نے اسے گھیر لیا۔ نئے مکان میں سامان رکھنے سے پہلے ایک ماہ کا کرایہ اور ایڈوانس کی رقم مالک مکان کو ادا کرنا ضروری تھا۔ کرایہ تو اس کے پاس تھا لیکن ایڈوانس کی رقم فاروقی سے لے کر ہی نئے مالک مکان کو دنیا بھی اور فاروقی لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔

کیم سے دو مارچ ہوا تو داؤد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ نئے مالک مکان نے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر وہ چوبیس گھنٹے کے اندر ایڈوانس کی رقم ادا نہیں کرے گا تو وہ مکان کسی اور پارٹی کو کرایے پر اٹھا دے گا۔ دو تین اور فیملیز بھی وہ مکان دیکھنے آرہی تھیں۔ داؤد نے جا کر فاروقی کی منت کی۔

”فاروقی صاحب! آپ صبح مجھے ایڈوانس کی رقم واپس کر دیں ورنہ وہ مکان میرے ہاتھ سے نکل جائے گا اور میں نے جو نوکن وہاں دیا ہے وہ بھی واپس نہیں ملے گا۔“

”صبح تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ فاروقی نے بڑی سفاکی سے کہا۔ ”چند دن اور لگ جائیں گے۔“

”کتنے چند دن اور۔۔۔۔۔۔؟“ داؤد نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

داؤد اچھی طرح جانتا تھا کہ فاروقی جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہا تھا ورنہ دس ہزار روپے کوئی اتنی بڑی رقم نہیں تھی جو وہ رائج نہ کر سکتا۔ فاروقی اپنی کمینی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھا اور داؤد کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ داؤد کے سوال کے جواب میں فاروقی نے کہا۔

”دیکھیں داؤد صاحب! آپ دس مارچ کو رات میں

مشورہ

ایک آدمی آدمی رات کو اپنی موٹی بیوی سے بولا کہ ”سک سک کے مرنا ٹھیک ہے یا ایک دم؟“

بیوی۔ ”ایک دم۔“

آدمی۔ ”تو اپنی دوسری ٹانگ بس مجھ پر رکھ دو۔“

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

میرے پاس آ جائیں، آپ کی رقم میں تیار رکھوں گا۔“

”دس مارچ میں تو ابھی کافی دن باقی ہیں۔“ داؤد نے جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”مالک مکان اتنے دن انتظار نہیں کر سکے گا۔“

”آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے۔“ فاروقی نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ”چند دنوں کے لیے آپ اپنے سیٹھ سے دس ہزار ادھار لے کر نئے مالک مکان کو ایڈوانس ادا کر کے شفٹنگ کر لیں۔ میں آپ کو دس مارچ کو دوں گا تو آپ وہ رقم اپنے سیٹھ کو واپس کر دیجیے گا۔“

یہ ترکیب داؤد کے ذہن میں بھی آئی تھی کیونکہ ”مرتا کیا نہ کرتا“ کے مصداق اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا لیکن وہ پہلے فاروقی کو کھس کر دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے دس ہزار روپے بیٹھا تھا۔

”ٹھیک ہے فاروقی صاحب! میں دس مارچ ہی کو آپ کے پاس آؤں گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”امید ہے، آپ اپنا وعدہ پورا کریں گے۔“

”انشاء اللہ۔۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔۔!“ اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

اگلے روز داؤد نے اپنے سیٹھ سے بات کی۔ سیٹھ نے اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے دس ہزار روپے ادھار دے دیے اور ساتھ ہی کسلی آمیز انداز میں یہ بھی کہہ دیا۔

”یہ رقم فوری طور پر واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب بھی ہاتھ آسان ہو تو دے دینا اور اگر تم کہو گے تو میں تمہاری تنخواہ میں سے ہر ماہ تھوڑے تھوڑے کاٹا رہوں گا۔ اس طرح تم پر دباؤ بھی نہیں پڑے گا اور رفتہ رفتہ قرض بھی ادا ہو جائے گا۔“

داؤد نے اپنے سیٹھ کے مشورے پر فوراً عمل کر ڈالا اور پانچ مارچ کو گھر شفٹ کر لیا۔ اس کی بیوی فوزیہ بہت خوش تھی۔ اس کی نظر فاروقی سے ملنے والے دس ہزار روپے

پر لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں بڑی بھرپور منصوبہ بندی بھی کر لی تھی کہ وہ اس رقم کو کہاں کہاں خرچ کرے گی۔ حسن اتفاق سے دس ہزار روپے اس کے ہاتھ لگنے والے تھے۔ گھر کی ایک ایک محرومی اور ضرورت اسے رہ رہ کر یاد آنے لگی تھی مگر کسی نے ایسے ہی موقع کے لیے کیا خوب کہا ہے کہ..... جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔

دس مارچ کو داؤد فاروقی کے پاس پہنچا اور اپنی رقم کا تقاضا کیا۔ آگے سے فاروقی نے چند روز کی مزید مہلت مانگ لی۔ داؤد کو اس کی بہانہ بازی پر غصہ تو بہت آیا لیکن غصے کے عملی اظہار سے کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ کسی حکمت عملی کے ذریعے ہی فاروقی سے رقم نکلائی جاسکتی تھی۔ جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

دس مارچ کے بعد داؤد ابھی فاروقی کے گھر اور بھی اس کے کارخانے کے چکر لگانے لگا۔ فاروقی ہر بار اسے کوئی نئی کہانی سنا دیتا تھا بالآخر اس نے فاروقی سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پچیس مارچ کو وہ دکان سے جلدی چھٹی کر کے فاروقی کے کارخانے پہنچ گیا۔

اس وقت کارخانے کے اندر بہت کم لوگ کام کر رہے تھے۔ ویسے بھی فاروقی نے اپنا اسٹاف بہت محدود رکھا ہوا تھا۔ فاروقی اپنے آفس نما کمرے میں موجود تھا۔ داؤد اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔

فاروقی نے کمال مکاری سے کہا۔ ”داؤد صاحب! آپ کے لیے ٹھنڈا منگواؤں یا گرم؟“

داؤد نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”آپ برائے مہربانی میری رقم واپس کر دیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔“

”آپ مجھے پانچ دن کا اور ٹائم دیں داؤد صاحب!“ فاروقی نے مکاری بھرے لہجے میں کہا۔

”انشا اللہ! یکم اپریل کو میں آپ کی رقم ادا کروں گا۔“

”کہیں مجھے اپریل فول بنانے کا ارادہ تو نہیں!“

داؤد نے جیکسی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کمال ہے.....“ فاروقی برہمی سے بولا۔ ”آپ میری نیت پر شک کر رہے ہیں؟“

”فاروقی صاحب!“ داؤد نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ ایک ماہ سے ”آج کل، آج کل“ کر رہے ہیں۔ آپ کے اس روپے کے پیش نظر میں آپ کی نیت کے بارے میں کیا رائے قائم کروں؟“

”آج کل کاروبار خاصا ڈاؤن جا رہا ہے۔“ فاروقی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کو کچھ اندازہ نہیں

ہے داؤد صاحب۔ آپ تو تنخواہ دار ہیں، ہر ماہ آپ کو تنخواہ مل جاتی ہے۔ اپنے سیٹھ سے پوچھیں، بزنس کی پوزیشن چل رہی ہے۔“

”میں ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ آپ کے بزنس کی کیا پوزیشن ہے۔“ داؤد نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے میری رقم چاہیے۔ میں نے آپ کے بھروسے پر اپنے سیٹھ سے دس ہزار روپے ادھار کئے تھے۔ آپ نے مجھ سے دس مارچ کو رقم لوٹانے کا وعدہ کیا تھا اور آج پچیس تاریخ ہو گئی ہے۔ وعدہ خلافی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سیٹھ ہر روز مجھ سے رقم کا تقاضا کرتا ہے۔ میری نوکری داؤد پر لگی ہوئی ہے اور آپ کو کوئی فکر ہی نہیں۔ میں جانتا ہوں، آپ کی مالی حالت اتنی بھی پتلی نہیں کہ جب سے دس ہزار نہ نکال سکیں۔“

”میری بات مان لیں داؤد صاحب۔“ فاروقی نے بڑی رसान سے کہا۔ ”اپنے سیٹھ سے کہیں، پانچ دن اور رک جائے۔ میں یکم کو آپ کی رقم لوٹا دوں گا۔“

”مجھے آج اور ابھی اپنی رقم چاہیے۔“ داؤد نے ضدی لہجے میں کہا۔

”آج میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“ فاروقی نے رکھائی سے کہا۔ ”آپ خواہ مخواہ ضد کر رہے ہیں۔“

”آپ چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ داؤد نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”لیکن آپ کی پیسے دینے کی نیت ہی نہیں ہے۔“

”جب آپ کو میری نیت پر ہی بھروسہ نہیں تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔“ داؤد نے تڑپ سے کہا۔ ”بس، آپ شرافت سے میری رقم واپس کر دیں۔“

”کیا میں اب تک آپ کے ساتھ بد معاشری کر رہا ہوں جو آپ مجھے شرافت کا درس دے رہے ہیں؟“ فاروقی اچانک ہتھے سے اکھڑ گیا۔

”آپ کا رویہ شرافت کے زمرے میں تو ہرگز نہیں آتا فاروقی صاحب۔“ داؤد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو کسی بھی شخص کو چالٹ مقرر کر کے فیصلہ لے لیں۔ آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ آپ اب تک میرے ساتھ کتنی زیادتی کر چکے ہیں۔“

”مجھے کسی سے چالٹی کرانے کی ضرورت نہیں۔“ فاروقی نے برہمی سے کہا۔ ”ابھی تو میرے پاس پیسے

ہیں، جب ہوں گے، میں آپ کو فون کروں گا۔ آکر لے جائیے گا۔ جب تک میں آپ کو فون نہ کروں، میرے گھریا کارخانے میں چکر لگانے کی ضرورت نہیں۔“

”یہ تو مکمل بد معاشری ہے فاروقی صاحب!“ داؤد نے فیصلے لہجے میں کہا۔

”آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔“ فاروقی ڈھٹائی سے بولا۔

”اب آپ یہاں سے جاسکتے ہیں۔ مجھے اور بھی بہت سے ضروری کام ہیں۔“

”فاروقی صاحب! یہ آپ ٹھیک نہیں کر رہے۔“

داؤد نے بیٹھائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ مجھے کسی اور طریقے پر مجبور نہ کریں۔ آپ میری شرافت کا امتحان نہ لیں۔“

”کیا کر لیں گے آپ.....“ فاروقی نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ ”بتائیں، آپ کیا کریں گے؟“

”اگر کبھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا تو مجھے مجبوراً انگلی کو بیڑھا کرنا پڑے گا۔“ داؤد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”تو یہ شوق بھی پورا کر کے دیکھ لیں۔“ فاروقی نے حقارت بھری نظر سے داؤد کی طرف دیکھا۔ ”میں ڈرتا نہیں ہوں کسی سے بھی۔“

اس کے بعد ان دونوں میں تلخ و ترش جملوں کا تبادلہ ہوا اور داؤد یہ کہتے ہوئے، پاؤں پیچ کر اس کے کارخانے سے نکل آیا۔

”میں نے اپنی رقم نہ نکلائی تو میرا نام بھی داؤد نہیں.....“

داؤد جھلٹلے اور جھنجھلائے ہوئے ذہن کے ساتھ گھر پہنچا اور بیوی کو سارا واقعہ کہہ سنایا۔ یہ حالات سن کر فوزیہ کو غصہ بھی آیا اور شدید افسوس بھی ہوا۔ دونوں نے رات کا کھانا زہر مار کیا اور فی صبح کو کھول کر بیٹھ گئے۔

پھر ٹھیک نو بجے پولیس ان کے دروازے پر پہنچی اور داؤد کو اسلم فاروقی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم داؤد کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ وکیل استغاثہ نے ضمانت کے خلاف اور میں نے ضمانت کے حق میں دلائل

دینا شروع کیے۔ ہمارے بیچ لگ بھگ پندرہ منٹ تک بحثی جاری رہی جس کے اختتام پر جج نے درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے باقاعدہ سماعت کے لیے اگلی تاریخ دے دی۔

جیسا کہ پہلے بھی میں کئی بار اس امر کی وضاحت کر چکا ہوں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے۔ اس بیٹھی کے اختتام کے ساتھ ہی میرے موکل اور اس کیس کے ملزم داؤد کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ اب اس کیس کے فیصلے تک اسے جیل ہی میں رہنا تھا۔ اگر فیصلہ اس کے حق میں آ جاتا تو رہائی اس کا مقدر ٹھہرتی اور اگر فیصلہ اس کے برخلاف چلا جاتا تو پھر اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے گزرنا تھا لیکن مجھے قوی امید تھی کہ میں اپنے موکل کو باعزت رہا کرانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو فوزیہ خاصی بھیجی نظر آئی۔ اس کیس کی وجہ سے وہ خاصی الجھ گئی تھی کیونکہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی زندگی کا سہارا تھے۔ ان کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ ایک سوچ پر فوزیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں ضرورت محسوس کروں تو وہ اسکول سے ایک دو ماہ کی چھٹی لے لیتی ہے لیکن میں نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ بس اس روز چھٹی کر لیا کرے جب اس کیس کی تاریخ ہو۔ ایک دو ماہ کی چھٹی کی واقعتاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔

جیل کی دین جب داؤد کو لے کر عدالت کے احاطے سے نکل گئی تو فوزیہ کافی دیر تک حسرت بھری نگاہ سے جاتی ہوئی دین کو دیکھتی رہی۔ اس کی تحویت میں خلل آیا تو میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”فوزیہ صاحب! آپ کچھ زیادہ ہی پریشان تو نہیں ہو رہی ہیں؟“

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھی سے پوچھ لیا۔ ”بیگ صاحب! داؤد کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی نا؟“

”سو فیصد یقین ہے مجھے!“ میں نے پراگماتہ لہجے میں کہا۔ ”آپ حوصلہ مضبوط رکھیں اور میری ہدایات پر عمل کرتی جائیں۔ پھر کامیابی ہم سے زیادہ دور نہیں رہے گی۔“

”انشا اللہ!“ وہ خامسے توانا لہجے میں بولی۔

میں نے تسلی بخشی دے کر فوزیہ کو رخصت کر دیا اور

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو استغاثہ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں بتانا چلوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول فاروقی کی موت پچیس مارچ کی سہ پہر چار اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب سر کے عقبی حصے میں شدید ترین چوٹ بتایا گیا تھا۔ ایک آہنی راڈ کی مدد سے اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو چٹا دیا گیا تھا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ موقع پر ہی مقتول کی موت واقع ہو گئی تھی۔ مذکورہ آہنی راڈ کو آلہ قتل کی حیثیت حاصل تھی اور پولیس نے یہ آسانی جائے وقوعہ سے آلہ قتل کو بازیاب کر لیا تھا۔ آہنی راڈ کے ایک سرے سے چھ بال بھی چپکے ہوئے ملے تھے۔ لیبارٹری ٹیسٹ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ بال مقتول کے سر کے بالوں ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

استغاثہ نے میرے موکل کو سخت ترین سزا دلوانے کے لیے بڑی خطرناک رپورٹ تیار کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق ملزم داؤد نے مقتول اسلم فاروقی کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ بھی اس کے گھر اور بھی کارخانے پہنچ جاتا تھا۔ وہ جب بھی فاروقی سے ملنے کے بعد رخصت ہوتا، فاروقی کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی۔ وہ ملزم کی حرکتوں سے عاجز آچکا تھا پھر وقوعہ کے روز تو حد ہی ہو گئی۔ ملزم سہ پہر میں مقتول کے کارخانے پہنچ گیا اور ملزم کا مطالبہ کر دیا۔ دونوں کے درمیان تلخ کلامی اس قدر بڑھ گئی کہ ملزم کو خود پر قابو نہ رہا اور اس نے پیش کے عالم میں آہنی راڈ سے مقتول کے سر پر حملہ کر دیا اور ایک ہی کاری ضرب سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

استغاثہ کی رپورٹ میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ مقتول کو قتل کرنے کے بعد طرم اس کی میز کی دراز میں سے ایک بھاری رقم بھی چالے گیا تھا۔ استغاثہ کے دعوے کے مطابق وہ رقم پچاس ہزار روپے بتائی گئی تھی۔ یہ واقعی ایک انکشاف انگیز نکتہ تھا۔

میں نے بڑی توجہ اور باریک بینی سے تمام رپورٹس کا مطالعہ کیا اور اپنے طور پر ایک لائحہ عمل تیار کر لیا کہ مجھے اس کیس کے ساتھ کس نوعیت کا برتاؤ کرنا ہے۔ میں اپنی منصوبہ بندی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

بہو زبیدہ ہی کر رہی تھی تاہم وہ اپنی دائمی بیماری کی وجہ سے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کی سات اولادوں میں تین بڑی بیٹیاں تھیں۔ اس کے بعد بیٹے کا نمبر آتا تھا جس کی عمر کم و بیش دس سال تھی یعنی وہ بھی خاطر خواہ اس کیس کی پیروی کرنے کے قابل نہیں تھا لہذا اس سلسلے کی ساری ذمہ داری وکیل استغاثہ کے کندھوں پر آگئی تھی۔ ابتدائی چند پیشیاں تھیں کی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔

☆☆☆

دو ماہ کے بعد عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ طرم نے میری ہدایت کے عین مطابق صحت جرم سے انکار کر دیا۔ پولیس کسٹڈی میں، ریماڈ کی مدت کے دوران میں لیے گئے طرم کے بیان کو عدالت نے زیادہ اہمیت نہیں دتی۔ اکثر طرم پولیس کی معروف زمانہ تفتیشی سختیوں سے محفوظ رہنے کے لیے بڑی شرافت سے اقبال جرم کر لیتے ہیں۔ اس طرح پولیس کا کام آسان ہو جاتا ہے اور وہ طرم کے ساتھ زیادہ طبع آزمائی نہیں کرتے۔

اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ وکیل استغاثہ نے ملزم پر کڑی جرح کی لیکن میرے موکل نے نہایت ہی تحمل اور حوصلے کے ساتھ وکیل سرکار کے سوالات کا سامنا کیا اور میری ہدایات کے عین مطابق جوابات دے کر وکیل استغاثہ کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ پھر استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے کل چھ گواہوں کی فہرست عدالت میں دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف ان گواہوں کے بیانات اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح کا احوال بیان کروں گا جس میں آپ کی دلچسپی کا دائرہ مواد موجود ہوگا۔ اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ اپنا کوئی گواہ سامنے لاتا، میں نے سچ کی جانب دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

”جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“ میری یہ درخواست کسی بھی طور پر اعتراض کے زمرے میں نہیں آتی تھی لیکن وکیل استغاثہ نے پہلی بال ہی جو کا لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

چاہیے۔ میرے فاضل دوست زورِ خطابت میں اتنا آگے

بڑھ جاتے ہیں کہ انہیں عدالت کے قیمتی وقت کا ذرا بھی خیال نہیں رہتا۔۔۔۔۔“

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس ”نظر“ کا واضح مطلب یہی تھا کہ مجھے خود ہی وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دینا چاہیے۔ میں جج کا اشارہ پا کر اپنے حریف وکیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور وکیل استفسار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”میرے فاضل دوست! ابھی آپ نے میری جس
 ”مصلحت“ کا ذکر کیا ہے وہ سنی سنائی تنگ مہدو ہے یا اس
 سلسلے میں آپ کو کوئی ذاتی تجربہ بھی ہے؟“

میں نے تو روادی میں یہ بات پوچھ لی تھی لیکن وکیل
استغاثہ کی طرف سے جو جواب آیا اس نے مجھے چونکنے پر
مجبور کر دیا تھا۔ وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔
”جناب! میں سنی ستانی پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتا
ہوں۔ ابھی میں نے آپ کے بارے میں جو کچھ بھی کہا وہ
میرا ذاتی تجربہ ہے۔“

میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے، ہم پہلے بھی کسی کیس میں ایک دوسرے کے مقابل وکالت کرتے ہیں؟“

”جی..... میرا یہی مطلب ہے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔
مذکورہ وکیل کا نام انجم عثمانی تھا۔ میں نے بہت یاد کرنے
کی کوشش کی کہ کب میں نے اس کے مقابلے میں وکالت کے
جوہر دکھائے تھے لیکن میں اس شخص کو اپنی یادداشت میں زندہ
کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگر میں سوال و جواب کے چکر
میں پڑ جاتا تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا سوائے وقت کی
بربادی کے..... لہذا میں نے نارل بال کے بجائے یار کر مار
دیا۔ میں نے نہایت عی شانگی سے کہا۔

”میرے فاضل دوست! جن کیس میں ہم رو بہ رو ہوئے تھے اس کا نتیجہ کیا رہا تھا۔ میرا مطلب ہے، آپ طرم کو جنل بھجوانے میں کامیاب رہے تھے یا میں اسے با عزت بری کرانے میں کامیاب رہا تھا؟“

”کیس جیت گئے تھے۔“

میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اپنی خوش قسمتی سے جیتا یا آپ اپنی بد قسمتی سے وہ کیس ہار گئے تھے اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اگر میں نے کسی گواہ پر بہت زیادہ وقت

مئی 2014ء کے شمارے کی ایک جھلک

ماہنامہ سرگزشت

عقل نشیں

ایک معروف سائنس دان کی داستان حیات جس نے ثابت کرنا چاہا تھا کہ انسان بندر کی اولاد ہے

شهر گزشت

بھولے بسرے کراچی کے ایک دن کا احوال
جب اس شہر میں محبت و اخرویت تھی

تاریخ عکس

تصویر ہماں نے، ترقی کی منزلیں کیسے طے کیں

مفتی

ماہ مئی میں رونما ہونے والے اہم واقعات و سماجیات

دماغی توازن

محبت حد سے بڑھ جائے تو تہی لاتی ہے

الشيخ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل
داستان، سراب، فلمی دنیا کی بھولی بھری
یادوں سے سچی فلمی الف لیلہ تاریخی
واقعات سچے قصے اور انوکھی سچ بیانیاں

اگر آپ علم و دانش بھرے مضامین، ادب، تاریخ اور سبق آموز صحیح بیانیوں پسند کرتے ہیں تو آپ ہی کے لیے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے جس ایک بار پڑھ کر دیکھیں آپ خود ہی گرویدہ ہو جائیں گے

”نمبر ایک.....“ وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ”پولیس اسٹیشن جانے وقوع سے بہت ہی قریب واقع ہے۔ نمبر دو.....“ اس نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کو حکم پولیس سے متعلق بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ ہم لوگ بروقت ریسپانس نہیں کرتے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہمیں جیسے ہی کسی جرم کی اطلاع ملتی ہے، ہم فوری رد عمل کے طور پر جانے واردات کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔“

”یہ گراں قدر معلومات فراہم کرنے کا بے حد شکریہ آئی اے صاحب!“ میں نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”آپ بھی مقتول اسلم فاروقی کے قتل کی اطلاع ملتے ہی فوراً جانے وقوع یعنی مقتول کے کارخانے پہنچ گئے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا منظور حسین صاحب؟“

”نہیں جناب.....“ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”جب آپ جانے وقوع پر پہنچے تو وہاں کتنے افراد موجود تھے۔ میرا مطلب ہے، کارخانے کے اندر؟“

”صرف ایک..... مقتول کا ملازم خاص۔“

”یعنی ارشد محمود؟“

”جی ہاں!“

”آپ نے جانے وقوع پر کیا دیکھا؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”مقتول اپنی کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے جسم کا بالائی حصہ میز پر ڈھیر تھا۔“ آئی اے نے جواب دیا۔

”اس کا سر پچھلی جانب سے بری طرح چٹا ہوا تھا جہاں سے خارج ہونے والا خون میز پر بڑے بے ڈھنگے انداز میں پھیلا ہوا تھا۔ مقتول کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ قید حیات سے آزاد ہو چکا ہے۔“

”آپ کو آلہ قتل تلاش کرنے میں کسی دقت کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں.....“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔

”آلہ قتل تو ادھر میز پر ہی پڑا تھا۔“

میں اس چوبی میز کی سمت بڑھ گیا جو پیش کار کی میز کے قریب ہی رکھی تھی۔ مذکورہ میز پر آلہ قتل سیلو فین تھلی کے اندر موجود تھا۔ آلہ قتل ایک آہنی سلاخ تھی جس کی لمبائی کم و بیش اٹھارہ انچ اور موٹائی ایک انچ تھی۔ میں نے سیلو فین

صرف کر کے اپنے موکل کو اعزت بری کرالیا تھا تو میری نظر میں یہی سب سے اہم ہے لیکن آپ پریشان نہ ہوں.....“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آج میں واقعی گفتیشی افسر کو چند سوالات میں غما دوں گا۔ آپ کو اس سلسلے میں زیادہ فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں.....“

وہ برا سامنے بنا کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے جج کے حکم پر انکوائری آفیسر وینس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا۔ انکوائری آفیسر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

اس کیس کا گفتیشی آفیسر عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس کا نام منظور حسین معلوم ہوا۔ منظور حسین ایک ڈھیلا ڈھالا پولیس آفیسر تھا۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وینس باکس (گواہوں والے کٹھن) کے قریب چلا گیا پھر منظور حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”آئی اے صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی؟“

”پولیس کے روزنامے کے مطابق یہ اطلاع مجھیں مارچ کی سہ پہر لگ بھگ سوا پانچ بجے دی گئی تھی۔“ گفتیشی افسر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”اور یہ اطلاع مقتول کے ایک ملازم خاص نے دی تھی۔“

”اس ملازم خاص کا نام بتانا پسند کریں گے؟“

”ارشد محمود.....!“

”منظور حسین صاحب!“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ جانے وقوع پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”مجھے وہاں پہنچنے میں دس سے پندرہ منٹ لگے ہوں گے۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ ساڑھے پانچ بجے لیں۔“

”حیرت ہے..... ایسی پھرتی کی پولیس سے عموماً توقع نہیں کی جاتی۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اس کی دو وجوہات ہیں.....“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں سمجھ رہا تھا، وہ میری بات پر بھڑک اٹھے گا اور کوئی التماسید حاجواب دے گا لیکن اس نے خلاف معمول جواب دے کر مجھے واقعی حیران کر دیا تھا۔ میں پوچھنے بنا نہ رہ سکا۔

”کون سی دو وجوہات آئی اے صاحب؟“

میں کو اٹھالیا اور واپس آئی اے کے پاس آگیا پھر وہ بیگ منظور حسین کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا اسی راڈ کی مدد سے مقتول اسلم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟“

”جی ہاں..... بالکل۔“ اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اسی راڈ کا ذکر ہے اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس راڈ کے ایک سرے پر مقتول کے سر کے چند بال بھی چپکے ہوئے ہیں اور..... خون خشک ہونے کے بعد سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکا ہے۔“

”جی، آپ کی بیان کردہ تمام خصوصیات مجھے اس آہنی راڈ کے ایک سرے پر یہ خوبی نظر آرہی ہیں۔ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ اور آلہ قتل کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ کو بھی بڑی توجہ سے پڑھا ہے لیکن انہوں..... میں نے ڈرامائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”کہ آپ اس آہنی راڈ کے دوسرے سرے کو یکسر فراموش کیے بیٹھے ہیں.....“

”جی..... کیا مطلب؟“ وہ چونک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سیلو فین بیگ ایک مارجہ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور کہا۔ ”آئی اے صاحب! آلہ قتل کے ایک سرے پر تو آپ کو مقتول کے سر کے چند بال اس کے جے ہوئے خون کے ساتھ چپکے نظر آ رہے ہیں مگر اسی سلاخ کے دوسرے سرے پر بھی تو ایک نہایت ہی اہم شے موجود ہے جس کی طرف آپ کا دھیان ہی نہیں گیا.....“

وہ میری جرح کے انداز سے ٹھہرا کر رہ گیا، الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”کک..... کون سی اہم شے..... مجھے تو وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔“

”یہ تو مانتے ہیں تاکہ آہنی راڈ کے جس سرے پر مقتول کا خون اور سر کے بال چپکے ہوئے ہیں اسی سرے کی خوف ناک ضرب نے مقتول اسلم فاروقی کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو چٹایا تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”جی ہاں..... بالکل مانتا ہوں۔“ اس نے اپنے سر کو اشارتی جنبش دی۔ ”لیبارٹری ٹیسٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہے۔“

”آپ اس بات سے بھی انکار نہیں کریں گے کہ راڈ

کی مدد سے جب قاتل نے مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر قاتلانہ حملہ کیا تو اس نے اس راڈ کو دوسرے سرے سے تمام رکھا تھا؟“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی وکیل صاحب!“ وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا جیسے میں نے کوئی انتہائی احمقانہ بات کر دی ہو۔ ”آپ بھی کیسی بات کر رہے ہیں.....؟“

”میرے نزدیک بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے آئی اے صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نے یہ بات اس لیے کی ہے کہ مجھے آپ کی نگاہ پر شبہ ہونے لگا ہے۔“

میرے آخری جملے پر وہ بھر کر رہ گیا، بکڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مطلب یہ کہ میرے خیال میں آپ کو نظر کا چشمہ استعمال کرنا چاہیے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس سرے پر مجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ آپ کو دکھائی کیوں نہیں دے رہا.....؟“

”آخر وہ ہے کیا.....!“ وہ جج سے مشابہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

”فکر پرش!“ میں نے دھماکا کیا۔ ”جب قاتل نے آہنی راڈ کو اس سرے سے تمام کر مقتول اسلم فاروقی کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا تھا تو راڈ کے گرفت والے سرے پر یقیناً اس کی انگلیوں کے نشان بھی آگئے ہوں گے۔“

”لیکن.....“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ ”آپ کو فکر پرش کیسے نظر آ رہے ہیں.....؟“

”یہی تو میرا پوائنٹ ہے آئی اے صاحب!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”آپ نے آہنی راڈ کے دوسرے سرے پر سے قاتل کے فکر پرش اٹھانے کی زحمت کو ادا کیوں نہیں کی۔ کیس قاتل کے اندر ایسی کوئی رپورٹ موجود نہیں ہے..... یہ سنگین غفلت کیا سمجھتی رہتی ہے؟“

آئی اے کی حالت دیدنی تھی۔ فکر پرش رپورٹ کی غیر موجودگی غیر ذمے داری کا ایک منہ بولا ثبوت تھا۔ میرے کڑے سوالات نے اسے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا لیکن جواب دینا بھی ضروری تھا۔ ہڑبڑائے ہوئے انداز میں اس نے کہا۔

”میں نے فکر پرش اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔“

میں نے اس کی توجہ کی خشک و شبہ کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی وکیل صاحب!“ وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا جیسے میں نے کوئی انتہائی احمقانہ بات کر دی ہو۔ ”آپ بھی کیسی بات کر رہے ہیں.....؟“

”میرے نزدیک بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے آئی اے صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نے یہ بات اس لیے کی ہے کہ مجھے آپ کی نگاہ پر شبہ ہونے لگا ہے۔“

میرے آخری جملے پر وہ بھر کر رہ گیا، بکڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مطلب یہ کہ میرے خیال میں آپ کو نظر کا چشمہ استعمال کرنا چاہیے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس سرے پر مجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ آپ کو دکھائی کیوں نہیں دے رہا.....؟“

”آخر وہ ہے کیا.....!“ وہ جج سے مشابہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

”فکر پرش!“ میں نے دھماکا کیا۔ ”جب قاتل نے آہنی راڈ کو اس سرے سے تمام کر مقتول اسلم فاروقی کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا تھا تو راڈ کے گرفت والے سرے پر یقیناً اس کی انگلیوں کے نشان بھی آگئے ہوں گے۔“

”لیکن.....“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ ”آپ کو فکر پرش کیسے نظر آ رہے ہیں.....؟“

”یہی تو میرا پوائنٹ ہے آئی اے صاحب!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”آپ نے آہنی راڈ کے دوسرے سرے پر سے قاتل کے فکر پرش اٹھانے کی زحمت کو ادا کیوں نہیں کی۔ کیس قاتل کے اندر ایسی کوئی رپورٹ موجود نہیں ہے..... یہ سنگین غفلت کیا سمجھتی رہتی ہے؟“

آئی اے کی حالت دیدنی تھی۔ فکر پرش رپورٹ کی غیر موجودگی غیر ذمے داری کا ایک منہ بولا ثبوت تھا۔ میرے کڑے سوالات نے اسے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا لیکن جواب دینا بھی ضروری تھا۔ ہڑبڑائے ہوئے انداز میں اس نے کہا۔

”میں نے فکر پرش اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔“

میں نے اس کی توجہ کی خشک و شبہ کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی وکیل صاحب!“ وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا جیسے میں نے کوئی انتہائی احمقانہ بات کر دی ہو۔ ”آپ بھی کیسی بات کر رہے ہیں.....؟“

”میرے نزدیک بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے آئی اے صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نے یہ بات اس لیے کی ہے کہ مجھے آپ کی نگاہ پر شبہ ہونے لگا ہے۔“

میرے آخری جملے پر وہ بھر کر رہ گیا، بکڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مطلب یہ کہ میرے خیال میں آپ کو نظر کا چشمہ استعمال کرنا چاہیے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس سرے پر مجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ آپ کو دکھائی کیوں نہیں دے رہا.....؟“

”آخر وہ ہے کیا.....!“ وہ جج سے مشابہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

”فکر پرش!“ میں نے دھماکا کیا۔ ”جب قاتل نے آہنی راڈ کو اس سرے سے تمام کر مقتول اسلم فاروقی کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا تھا تو راڈ کے گرفت والے سرے پر یقیناً اس کی انگلیوں کے نشان بھی آگئے ہوں گے۔“

”لیکن.....“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ ”آپ کو فکر پرش کیسے نظر آ رہے ہیں.....؟“

”یہی تو میرا پوائنٹ ہے آئی اے صاحب!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”آپ نے آہنی راڈ کے دوسرے سرے پر سے قاتل کے فکر پرش اٹھانے کی زحمت کو ادا کیوں نہیں کی۔ کیس قاتل کے اندر ایسی کوئی رپورٹ موجود نہیں ہے..... یہ سنگین غفلت کیا سمجھتی رہتی ہے؟“

آئی اے کی حالت دیدنی تھی۔ فکر پرش رپورٹ کی غیر موجودگی غیر ذمے داری کا ایک منہ بولا ثبوت تھا۔ میرے کڑے سوالات نے اسے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا لیکن جواب دینا بھی ضروری تھا۔ ہڑبڑائے ہوئے انداز میں اس نے کہا۔

”میں نے فکر پرش اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔“

137

اقوال زریں

اچھے لوگ قرض خوش دلی سے ادا کرتے ہیں۔
 ملازم سے اگر اچھا کام لینا چاہے ہو تو تنخواہ بھی اچھی دو۔
 غصہ حماقت سے شروع ہو کر عداوت پر ختم ہوتا ہے۔
 جاہل بے موقع غصہ کرنے سے بچنا جاتا ہے۔
 اگر دنیا ہمیشہ ایک شخص کے پاس رہتی تو اب جن کے پاس موجود ہے ان کو ہرگز نہیں ملتی۔
 جو شخص خود اپنے نفس کی اصلاح نہیں کرتا وہ دوسروں کے حق میں کبھی مصلحت نہیں بن سکتا۔
 بد طبیعت لوگوں سے بچو کہ ان کی صحبت سے سوائے رنج کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔
 جو شخص بروں کی صحبت میں بیٹھتا ہے وہ زندگی میں کبھی سکھ نہیں پاتا۔
 مرسلمہ: بابر عباس۔ گھیا نہ روؤ کھاریاں

نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت درخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنل۔۔۔۔۔!“

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے یکے بعد دیگرے تین گواہ عدالت میں پیش ہوئے اور انہوں نے حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے بعد وکیل استغاثہ کے مختلف سوالات کے جوابات دیے۔ میں نے استغاثہ کے ان گواہوں پر برائے نام ہی جرح کی تھی۔ ان کی گواہی اور بعد ازاں ہونے والی جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ ان سب کا موقف ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا۔ ان کے خیال میں ملزم ایک غصہ ور، جھگڑالو اور بد مزاج شخص تھا اور آئے روز مقتول کو تنگ

نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔
 ”منظور حسین صاحب! فرض کریں، آپ مقتول والی ریوالونگ چیئر پر بیٹھے ہیں اور میں میز کی دوسری جانب ملاقاتیوں والی ایک کرسی پر براجمان ہوں۔ ہمارے درمیان کسی بھی بات پر تلخ کلامی جاری ہے۔ یہ بدحرکی اس انتہا کو پہنچ جاتی ہے کہ میں پیش کے عالم میں ایک آہنی راڈ اٹھا کر آپ کے سر پر دے مارتا ہوں۔ آپ اس ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے میز کے اوپر ڈھے جاتے ہیں اور انا لٹھ ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ۔۔۔۔۔“
 میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”میں آہنی راڈ سے آپ کے سر پر جو خطرناک ضرب لگاؤں گا اس سے آپ کی کھوپڑی کا کون سا حصہ متاثر ہوگا؟“
 ”ظاہر ہے پیشانی۔۔۔۔۔ یا سر کا بالائی حصہ۔ وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور پاٹ دار آواز میں کہا۔ ”جناب عالی! موت ایک سنگین حقیقت ہے اور کوئی بھی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور انکوائری آفیسر کے تازہ ترین جواب نے استغاثہ کی قلعی کھول دی ہے۔ مقتول کی کھوپڑی کا عقبی حصہ چٹا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور یہ اسی صورت ممکن تھا جب اس کے سر پر پیچھے سے آہنی راڈ کا وار کیا جاتا جبکہ مقتول اور ملزم کے بیچ ہونے والی تلخ کلامی کے وقت ملزم، مقتول کے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا تھا جہاں سے وہ مقتول کے سر کے عقبی حصے کو ہرگز نہ لٹکانے نہیں بنا سکتا تھا اور ان لمحات میں ان کے درمیان جو چھ قلعہ قائم ہو چکی تھی اس میں مقتول بھی ملزم کو راڈ بہ دست اپنے پیچھے جا کر ایک خطرناک ضرب لگانے کا موقع فراہم نہیں کر سکتا تھا لہذا۔۔۔۔۔“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر ایک وقفے کے بعد اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لہذا حالات و واقعات کی روشنی میں یہ بات مکمل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اسلم فاروقی کے بیہوشانہ مل میں ملزم کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ میرے موکل کو کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دیش آل یور آزا“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج

حصہ ہے۔ پھر اسے اٹھنے کا موقع نہ مل سکا؟“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ آئی او نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اس امر کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔“
 ”پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی میں یہ بھی درج ہے کہ مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو نشانہ بنایا گیا تھا۔“ میں نے قدرے جارحانہ انداز میں کہا۔

”جی، یہ ایک حقیقت ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔“

میں نے آئی او کو گھمانے کی کوشش کی۔ ”جب ملزم اپنے دس ہزار روپے لینے مقتول کے کارخانے پہنچا تو اس وقت مقتول کی میز کی دراز میں پچاس ہزار روپے رکھے ہوئے تھے؟“

”آپ پہلے بھی مجھ سے یہ سوال کر چکے ہیں۔“ وہ ناگواری سے بولا۔ ”اور میں نے اس کا جواب بھی دے دیا ہے۔“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے اس سوال کا جواب ”ہاں“ میں دیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”یعنی اس وقت مقتول کی میز کی دراز میں پچاس ہزار روپے موجود تھے لیکن اس وقت میں آپ سے کچھ اور پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”یہ کہ۔۔۔۔۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جب مقتول کی میز کی دراز میں پچاس ہزار روپے رکھے ہوئے تھے تو اس نے ملزم کو دس ہزار روپے ادا کیوں نہیں کر دیے تھے؟“

”یہ تو آپ اسی سے جا کر پوچھیں۔“ وہ برہمی سے بولا۔

”اس کے پاس جانے کے لیے مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے اور میں فی الحال ایسا ہرگز نہیں چاہوں گا البتہ۔۔۔۔۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”البتہ آپ یہاں زندہ سلامت موجود ہیں۔ میں آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال پوچھ لیتا ہوں۔“

میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو وہ فتنہ نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا کہ پتا نہیں، میں اس سے کیا پوچھنے والا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ دیر تذبذب میں جلا رکھنا مناسب نہ سمجھا اور

ایڈریس بھی نوٹ کر ادوں گا اور اس کا فون نمبر بھی۔“

”یہ تمام تر معلومات میں آپ سے ضرور لوں گا آئی او صاحب۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہاں سے فارغ ہو جانے کے بعد۔۔۔۔۔ فی الحال آپ مجھے مقتول کے آفس کے بارے میں بتائیں!“

”کیا بتاؤں؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”آفس وہ جگہ ہے جہاں مقتول اسلم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ آپ نے اس مقام کو اچھی طرح دیکھ رکھا ہے۔ اتفاق سے مجھے بھی ایک بار وہاں جھانکنے کا موقع ملا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کمرے میں ایک دروازہ اور ایک کھڑکی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا آئی او صاحب؟“

”جی نہیں، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جائے وقوع کی وہی کیفیت ہے جو آپ نے بیان کی ہے۔“

”دروازے سے اندر داخل ہوں تو سامنے والی دیوار کے ساتھ مقتول اسلم فاروقی کی ریوالونگ چیئر نظر آئے گی۔“ میں نے تصدیقی طلب انداز میں تفتیشی افسر کی جانب دیکھا۔ ”ریوالونگ چیئر کے آگے میز اور میز کے سامنے ملا قادیوں کے لیے دو کرسیاں رکھی دکھائی دیں گی۔ کمرے کی مغربی دیوار میں ایک چابی دار بڑی سی کھڑکی ہے جو کارخانے کے اندرونی حصے میں ملتی ہے جہاں سے دفتر کے اندر بیٹھا ہوا مقتول اپنے کارخانے کے ورکرز کو کام کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ آئی او نے مختصراً کہا۔

”کمرے کی مشرقی دیوار پر ایک شوکیں نما الماری نصب ہے۔“ میں نے استفسار کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس شوکیں کے اندر ماسنگ ٹیپ کے مختلف سیمپلوں رکھے رہتے ہیں؟“

”آپ کا تجزیہ اور مشاہدہ مولد آنے میں ہے وکیل صاحب!“
 ”جب آپ جائے وقوع پر پہنچے تو مقتول اسلم فاروقی اپنی ریوالونگ چیئر پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کا بالائی بدن میز پر ڈھیر تھا اور وہ اس دنیا سے اُس دنیا میں جا چکا تھا۔ میز پر پھیلے ہوئے خون سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے ہی اس کی کھوپڑی پر آہنی راڈ سے کاری دار کیا گیا وہ دھڑام سے میز پر آ رہا۔“ وہ سے یہاں میری مراد اس کے بدن کا بالائی

کرنے اس کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا وغیرہ.....! اگلی پیشی سے پہلے میں نے اچھا خاصا ہوم ورک بھی کر لیا تھا۔ میں نے ذاتی طور پر فضل کریم سے بھی ایک تفصیلی ملاقات کی تھی۔ رقم کی ادائیگی کے حوالے سے اس نے بڑے ٹھوس انداز میں تصدیق کی تھی۔ وہ وقوعہ کے روز دوپہر میں مقتول کے کارخانے جا کر اس سے ملا تھا اور ریکی گفتگو کے بعد مبلغ پچاس ہزار روپے مقتول کو دے کر واپس آ گیا تھا۔ اس کے بعد کارخانے کے اندر کیا واقعات پیش آئے اس بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ فضل کریم ایک دور اندیش، معاملہ فہم کاروباری شخص تھا۔ اس سے کسی قسم کی دروغ گوئی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

یہ سب تو چل ہی رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں مقتول کے ملازم خاص ارشد محمود کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے سے چوکا نہیں تھا۔ ارشد محمود کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل تھا۔ اسی شخص نے پولیس کو اسلم فاروقی کے قتل کی اطلاع دی تھی۔ پولیس نے جو جلالان عدالت میں پیش کیا تھا اس میں درج پیشتر باتیں ارشد محمود سے حاصل ہونے والی معلومات کا نتیجہ تھیں۔ میں نے اپنے مخصوص ذرائع استعمال کر کے ارشد محمود کے حوالے سے اچھی خاصی جانکاری حاصل کر لی تھی۔

آئندہ پیشی پر مقتول کی بیوہ زبیدہ خانم کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہ ایک موٹی تازی اور سانولی عورت تھی۔ اس کی شاہکار بیماری کے بارے میں پیچھے تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے۔ میری نظر میں زبیدہ کو عدالت میں لا کر گواہی دلوانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ وکیل استغاثہ نے اسے محض اس لیے زحمت دی تھی کہ مقتول کے حق میں عدالت کی زیادہ سے زیادہ ہمدردیاں سمیٹ سکے۔ پتا نہیں، وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہا تھا۔

زبیدہ نے بیج بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ اسے کافی دیر تک گھیرے رہا۔ جب اس نے زبیدہ کی جان چھوڑی تو میں مختصری جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”زبیدہ صاحبہ! مجھے آپ کے شوہر کی ناگہانی موت کا بہت افسوس ہے۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں لیکن جب آپ گواہی کے لیے عدالت کے کمرے تک پہنچ ہی گئی ہیں تو میں بھی آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہوں گا.....!“

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اکتا ہٹ بھری نظر سے مجھے ہنسی رہی۔ میں نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے معزز عدالت کے روبرو جو بیان ریکارڈ کرایا ہے اور بعد ازاں وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں جو کچھ بتایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم نے آپ لوگوں خصوصاً مقتول کا جینا حرام کر رکھا تھا۔“ لگائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کہیں آپ کے بیان سے کوئی غلط تاثر نہیں لے لیا؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آپ نے حقیقت بیان کی ہے۔“

”اب میں آپ سے وہ سوال پوچھوں گا جس کا ادب ذکر کیا ہے۔“ میں نے متحمل انداز میں کہا۔ وہ متذبذب انداز میں مجھے گھورنے لگی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ تو ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ مقتول نے ملزم کو گھر والے ایڈوائس کی رقم مبلغ دس ہزار روپے ہر صورت واپس کرنا تھے پھر لگ بھگ ایک ماہ گزر جانے کے بعد بھی مقتول اس سے ٹال مٹول کیوں کر رہا تھا جبکہ ایسا بھی نہیں کہ خدا خواستہ مقتول کے مالی حالات سخت ہوں.....؟“

”بات مالی حالات یا ٹال مٹول کی نہیں ہے وکیل صاحب!“ زبیدہ نے عذر کی آڑ لیتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”دس ہزار کوئی اتنی بڑی رقم نہیں کہ فاروقی ادا نہیں کر سکتا تھا۔“

”پھر اصل بات کیا تھی؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ ملزم نے میرے شوہر کے ساتھ دھوکا کیا تھا جس پر فاروقی سخت غصے میں تھا۔“ وہ براسانہ بناتے ہوئے بولی۔

”کیسا دھوکا؟“ میں پوچھے بناتے رہا۔ ”کرایے پر گھر لینے اور دینے کا ایک اصول ہوتا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اگر کرایے دار کو گھر چھوڑنا ہو تو وہ ایک ماہ پہلے مالک مکان کو اطلاع دینا ہے تاکہ وہ کسی نئے کرایے دار سے بات چیت کر سکے۔ اسی طرح اگر مالک مکان کو گھر خالی کرانا ہو تو وہ کرایے دار کو ایک ماہ پہلے نوٹس دیتا ہے تاکہ کرایے دار اپنے لیے کوئی دوسرا گھر تلاش کر سکے لیکن ملزم نے محض چار دن پہلے فاروقی

کو بتایا کہ وہ گھر خالی کر کے جا رہا ہے۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ ایک ماہ تک وہ گھر خالی پڑا رہا ہے جس سے ہمیں ایک ماہ کے کرایے کا نقصان ہوا ہے.....“

”مجھے آپ کے اس نقصان کا افسوس ہے زبیدہ صاحبہ!“ میں نے اپنا تہمت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ تو ہو گئی ایک بات۔ اب آپ دوسری بات بھی بتادیں؟“

”اسلم فاروقی کو ایک تو اس بے اصولی کا غصہ تھا۔“ وہ جی سے بولی۔ ”اور دوسری بات یہ کہ ملزم کی طرف کچھ حساب لگتا تھا جو وہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ ملزم کی اس ہٹ دھرمی نے فاروقی کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا اور اس نے ملے کر لیا تھا کہ اچھی طرح ناک رگڑوانے کے بعد ہی وہ ملزم کے دس ہزار روپے واپس کرے گا۔“

پتا نہیں، غصے میں یا سادگی میں زبیدہ خانم نے معزز عدالت کے سامنے ایک ایسی حقیقت بیان کر دی تھی جس سے مقتول کی بدعتی کی تصدیق ہوتی تھی اور یہ تصدیق سراسر میرے موکل کے حق میں جاتی تھی۔ میں نے زبیدہ کو نشانے کی غرض سے یہ بھی پوچھ لیا۔

”آپ نے ملزم اور مقتول کے درمیان کسی حساب کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ کیا قصہ ہے زبیدہ صاحبہ؟“

”آپ جانتے ہیں، بھلی اور گیس کے بلز پچھلے مہینے کے استعمال کے حساب سے جاری کیے جاتے ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”فاروقی کو ان بلز کی آمد کا اظہار تھا تاکہ وہ ایڈوائس کی رقم میں سے بلز کی رقم کاٹ سکے پھر ان دو سالوں میں ملزم نے اور اس کی بیوی نے جو ٹوڈ پھوڑ کی تھی اس کی کٹوتی بھی لازمی تھی.....“

اس کے بعد زبیدہ نے ٹوٹ پھوٹ کے بارے میں بھی بتایا مثلاً بکن میں چولہے والی سلیب میں سل بنا لگنے سے ایک دراڑ آ گئی تھی۔ واش بیسن کی ایک سائڈ چیئر گئی تھی اور اسی طرح کی دوسری بہت سی شکایات۔ میں ان ایشوز کی تفصیل میں جا کر آپ کو ہرگز بور نہیں کروں گا۔ اگر آپ کو کرایے دار کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ ان مسائل سے بخوبی آگاہ ہوں گے۔

میں نے جیسے ہی مقتول کی بیوہ زبیدہ خانم کو فارغ کیا، اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت پر حاضری کر دی۔

اس دوران میں ملزم کی بیوی فوزیہ مسلسل میرے دباؤ میں آ رہی تھی اور وہ ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتی تھی۔ اب تک کی عدالتی کارروائی کو دیکھ کر وہ خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔ ابتدا میں اس کے چہرے اور آنکھوں میں ٹھنکری جو گہری پرچھائیاں نظر آتی تھیں وہ اب معدوم ہو گئی تھیں۔

10

”وہ تمہیں جو بھی تنخواہ دیتے تھے تم اس پر مطمئن تھے؟“

”جی، پوری طرح مطمئن تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں، مقتول تمہیں کتنی تنخواہ دیتا تھا؟“

”پندرہ سو روپے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کے علاوہ بھی قارونی صاحب گاہے بگاہے مجھے کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہتے تھے۔“

”گویا اس تنخواہ میں تمہارا ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو رہا تھا؟“

”جی بالکل.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”کچھ بچت وغیرہ بھی ہو جاتی تھی یا سب کھائی کر برابر کر دیتے تھے؟“ میں نے اس کی گردن کے گرد پھندے کوکتے ہوئے پوچھا۔

”بچت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”بس پورا مہینہ ٹھیک گزار جاتا تھا۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔“

”کیا یہ درست ہے کہ تم اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ لیاقت آباد المعروف بہ لا لکھیت میں رہتے ہو؟“

”جی ہاں، یہ درست ہے۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”اور وہ مکان بھی کرایے کا ہے؟“

”جی..... اپنی ساری زندگی کرایے کے مکانوں ہی میں گزری ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”بھی تم نے اپنا ذاتی گھر بنانے کے بارے میں بھی سوچا؟“

”جناب! ذاتی گھر کی سوچ اور خواہش تو ہر وقت دل و دماغ میں رہتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں نے پوچھا۔“ اس خواہش کی تعبیر کے لیے کبھی تم نے عملی کوشش بھی کی؟“

”عملی کوشش کا سوال تو اس وقت پیدا ہو جب جیب میں پیسے ہوں۔“ وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”اللہ عزت و آبرو سے مہینا پورا کر دیتا ہے، یہی بہت ہے۔“

اس نے میرے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھ دیا تھا۔ میں نے اب تک ارشد محمود کے حوالے سے جو تحقیق کی تھی اسے استعمال میں لاتے ہوئے گہری تنجیدگی سے کہا۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو..... تنخواہ دار آدمی کے

لیے ذاتی گھر کے خواب دیکھنا تو ممکن ہے لیکن ان سہائے خوابوں کو تعبیر دینا اس کے بس کی بات نہیں لیکن.....“ کھائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔

”لیکن بعض لوگ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے بی سی (کمپنی) وغیرہ ڈال لیتے ہیں۔ یکمشت ذاتی گھر نہ بھی خرید سکتے تو کہیں پلاٹ بک کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا تمہیں بھی بی سی ڈالنے کا خیال آیا؟“

”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”مگر بی سی ڈالیں تو ہر ماہ ایک مخصوص رقم بھرنا بھی پڑتی ہے اور اپنی اتنی گنجائش نہیں ہے۔“

”بھی تمہارا کوئی پرائز بانڈ نکلا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ”نہیں جناب! میں اتنا خوش قسمت نہیں ہوں۔“

”ارشد محمود!“ میں نے یک لخت اپنی جرح میں جارحیت بھرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم نے بندر روڈ دیکھا رکھا ہے؟“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب.....!“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”کوئی شخص کراچی میں رہتا ہو اور اس نے بندر روڈ نہ دیکھا ہو، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔“

”گویا تم نے بندر روڈ دیکھا ہوا ہے؟“

”جی ہاں..... بالکل!“ وہ پروڈوق لہجے میں بولا۔

”بندر روڈ پر ایک کمپنی ”برہانی ایسوسی ایشن“ کا آفس ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا تم نے یہ آفس دیکھ رکھا ہے؟“

وہ جڑبڑھوتے ہوئے بولا۔ ”میں کسی برہانی ایسوسی ایشن کو نہیں جانتا۔“

”گویا بھی اس دفتر میں تمہیں جاننے کا اتفاق ہوا؟“

”کبھی نہیں!“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے.....!“ میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”ارشد محمود! کیا تم نے نیوکراچی کا علاقہ ”نیو پی موڈ“ دیکھ رکھا ہے؟“

”آہ بیکھن یور آؤ!“ وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا یقین دلاتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

”جج سمیت عدالت کے کمرے میں موجود ہر شخص نے گردن اٹھا کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ جج نے بھی

لہجے میں وکیل استغاثہ سے استفادہ کیا۔

”وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“

”جناب عالی! اس وقت عدالت میں اسلم قارونی مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے قاضی دوست استغاثہ کے معزز گواہ کو کراچی کا نقشہ یاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں.....“

”نقشہ یاد کرانے کی کوشش نہیں کر رہا۔“ میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”بلکہ گواہ کی یادداشت کا امتحان لے رہا ہوں۔“

”آپ کے ان سوالات کا زیر سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟“ وکیل استغاثہ نے جھلجھلاہٹ آمیز انداز میں مجھ سے پوچھا۔

”جو بھی تعلق ہے، ابھی مکمل کر سامنے آ جائے گا۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ہاتھ نکلن کو آرسی کیا ہے.....!“

”یور آؤ.....!“ وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے فریادی لہجے میں کہا۔ ”میرے نزدیک وکیل صفائی غیر متعلقہ جرح کر کے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ عدالت سے میری استدعا ہے کہ انہیں ایسی کوشش سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔ دیش آل یور آؤ!“

وکیل استغاثہ کے اعتراض کو اہمیت دیتے ہوئے جج نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیک صاحب! آپ کے ان سوالات کی عدالت کی نظر میں کیا حیثیت ہے؟“

”جناب عالی! اگر میرے قاضی دوست نے ”آہ بیکھن“ کا نعرہ بلند نہ کیا ہوتا تو اب تک میرے سوالات کی عدالتی اہمیت اور حیثیت مکمل کر سامنے آ چکی ہوتی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے اب تک استغاثہ کے معزز گواہ پر ایک لفظ بھی قائلو یا غیر ضروری خرچ نہیں کیا۔ میں معزز عدالت سے پر زور اپیل کرتا ہوں کہ مجھے اپنی جرح مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور وکیل سرکار کو میری جرح میں مداخلت سے روکا جائے۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔ ”بیک صاحب! پلیز پروسیڈ.....!“

میں دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ارشد محمود!“ میں نے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”کیا تم نے نیوکراچی کا علاقہ ”نیو پی موڈ“ دیکھ رکھا ہے؟“

”جی..... نام سنا ہے۔“ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے

میں بولا۔ ”لیکن کبھی اس طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا.....!“

”اپنا پلاٹ دیکھنے بھی نہیں گئے؟“ میں نے چیختے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے جج سے مشابہ لہجے میں کہا۔ ”وکیل صفائی استغاثہ کے گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب گواہ نے نیو پی موڈ دیکھا ہی نہیں تو پھر وہاں اس کا پلاٹ کیسے نکل آیا؟“

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیک صاحب! یہ پلاٹ کا کیا قصہ ہے؟“

میں نے اپنی قائل میں سے چند نہایت ہی اہم کاغذات کی نقول نکال کر جج کی جانب بڑھا دیں اور کھنکار کر گھاسا کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! ان کاغذات کے مطابق لیاقت آباد، مکان نمبر قلاں قلاں کے رہائشی ارشد محمود نے پندرہ اپریل کو برہانی ایسوسی ایشن کے آفس واقع بندر روڈ جا کر اپنے لیے ایک سوئیں گز کا ایک پلاٹ پینشن ہزار روپے میں خریدا تھا۔ مذکورہ پلاٹ نیوکراچی کے علاقے ”نیو پی موڈ“ کے نزدیک واقع ہے۔ ان کاغذات پر بحث و دستخط اسی ارشد محمود کے ہیں جو اس وقت استغاثہ کے معزز گواہ کی حیثیت سے میری جرح کا سامنا کر رہا ہے۔ اگر.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بے آواز بلند کہا۔

”جناب عالی! استغاثہ کا گواہ ارشد محمود تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ وہ اپنی آمدنی میں بہ مشکل گزارہ کرتا ہے۔ اس کی بچت نہیں ہوتی۔ اس نے زندگی میں کبھی ”بی سی“ نہیں ڈالی اور نہ ہی کبھی اس کا کوئی پرائز بانڈ کھلا ہے پھر..... پھر اس امر کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے کہ اس کے پاس اچانک پینشن ہزار کی رقم کہاں سے آگئی جو اس نے ایک سوئیں گز کا پلاٹ خرید ڈالا اور وہ بھی مقتول اسلم قارونی کی موت کے صرف تین روز بعد.....؟“

جج نے پوری توجہ سے میرے دلائل سننے پھر سوالیہ نظر سے ارشد محمود کی طرف دیکھا۔ اس سے قبل کہ جج اس سے کچھ پوچھتا، وہ چلا اٹھا۔

”مم..... میں نے..... کہیں کوئی پلاٹ نہیں خریدا.....“ وکیل صاحب جھوٹ بول رہے ہیں..... مجھے تنخواہ اس کیس میں کھینچنے کی کوشش کی جارہی ہے..... پپ..... پپ..... پانی.....!“



بیجان

ڈاکٹر شیر شاہ سید

بیجان چاہے جس صورت حال میں ہو ہمیشہ زندگی میں سکون کو غارت کرنے کا سبب بنتا ہے... لیکن تخلیق کا بیجان انسان کو ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ یہی حال کچھ اس کا بھی تھا جب اس کی کانتوں بھری زیست میں کچھ گلاب لمحوں نے جنم لیا تو تمام فضا مہک اٹھی... اور اس کی زندگی کا کل اثاثہ وہی چند لمحات تھے جن کی بدولت اسے ایک نئے جہان سے آشنا ہوئی۔

سگریز رستوں پر قدم اٹھاتی ایک حسینہ کی کاوشوں

کا احوال

آئن اسٹائن نے کہا تھا۔ "I want to know God's thought, the rest are details" شاید ساری زندگی آئن اسٹائن تخلیق کار کی سوچ کی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ تخلیق کار کے گورکھ دھندے کو وہ کتنا سمجھا، مجھے نہیں پتا مگر میں اس گورکھ دھندے میں کیسے الجھ کر سلجھ کر ابھی، اس کا مجھے ابھی

یہ بات تو طے تھی کہ وہ فاروقی کے کارخانے میں ساری زندگی بھی محنت کرتا رہتا تو اپنا ذاتی گھر نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دوپہر میں فضل کریم نامی ایک شخص محفل کو پچاس ہزار روپے دے کر گیا تھا جو اس کی میز کی دروازے میں رکھے تھے۔ اس کے جی میں آئی کہ اگر وہ اپنے سینے پر قتل کر کے پچاس ہزار کی رقم پر ہاتھ صاف کر لے تو سارا الزام میرے موکل داؤد پر ڈالا جاسکتا ہے۔ اسی لیے شیطان نے اس کے دماغ پر قبضہ کر لیا۔

جیسے ہی داؤد، فاروقی سے صلح کلائی کے بعد کارخانے سے رخصت ہوا، ارشد، فاروقی کے کمرے میں داخل ہوا۔ ارشد، فاروقی کے لیے انتہائی قابل بھروسہ شخص تھا۔ ان کے بیچ داؤد کے حوالے سے بات چیت ہونے لگی۔ اسی دوران میں کمال چالاکی سے ارشد، فاروقی کے عقب میں پہنچ گیا۔ فاروقی بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ارشد کی نیت میں کس نوعیت کی خرابی پیدا ہو چکی ہے لہذا اس کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ارشد نے آہنی راڈ کے ایک بھر پور وار سے اسلم فاروقی کو ہمیشہ ہمیش کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔ اس قابل مذمت "کارنامے" کے بعد فاروقی کی میز کی دروازے میں سے پچاس ہزار روپے نکالنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ثابت ہوا تھا۔

جج کے ایک سوال کے جواب میں ارشد محمود نے بڑی ڈھٹائی سے بتایا تھا کہ وہ تو صرف پچاس ہزار کی توقع کر رہا تھا لیکن جب اس نے فاروقی کی میز کی دروازہ کھولی تو وہاں بیسٹھ ہزار رکھے تھے۔ اس نے بیسٹھ ہزار کی رقم کو بال قیمت جان کر پار کیا اور کارخانے ہی کے ایک حصے میں چھپا دیا تاکہ اگر اتفاق سے پولیس اس کی بھی جامہ تلاشی لگے تو وہ شک سے پاک لگتا۔

جس روز عدالت نے داؤد کو بری کیا، فوزیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اپنے شوہر کو آزاد فضا میں سانس لینا دیکھ کر بے حد مطمئن نظر آتی تھی اور میری ممتوں بھی کہ جس کی کوشش نے داؤد کو اس معصیت سے نجات دلانی تھی۔

فرط جذبات سے اس نے میری طرف دیکھا اور تفکرانہ لہجے میں بولی۔ "بیک صاحب! اس کیس سے مجھے ہوئے لگ بھگ ایک سال لگ گیا لیکن..." میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی قطع کلائی کرتے ہوئے زیر لب مسکرا کر کہہ دیا "دیر آید، درست آید..." (تحریر: حسام بٹ)

"سائنس کی ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ جب کوئی شخص دروغ گوئی سے کام لے رہا ہوتا ہے تو اس کے گلے کے اندر پائے جانے والے غدود لعاب بنانا بند کر دیتے ہیں لہذا اس کا حلق ایسا خشک ہو جاتا ہے کہ گھبرا کر پانی مانگنے کی ضرورت پیش آتی ہے جیسا کہ اس وقت استغاثہ کا گواہ ارشد محمود "پپ" پانی کی صدا لگا رہا ہے..." میں نے گوج دار آواز میں کہا۔ "اور اس کے جھوٹ کو ثابت کرنا چداں مشکل نہیں۔ برہانی ایسوسی ایشن کا آفس اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے کہ پندرہ اپریل کو ارشد محمود..." میں نے دیش باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسی ارشد محمود نے بیسٹھ ہزار روپے میں اپنے لیے "یو پی موڈ" کے علاقے میں ایک سوئیں گز کا ایک پلاٹ خریدا تھا..."

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی ارشد محمود کے گھٹنوں سے جان نکل چکی تھی۔ اس نے پہلے کنبھرے کی رینگ کو تھما پھر ہارے ہوئے جواری کے مانند اس نے کنبھرے کے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔

اس کے عمل نے عدالت کو باور کرا دیا تھا کہ اب "برہانی ایسوسی ایشن" کے آفس سے کسی تصدیق کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کر دیا۔

داؤد کی باعزت بریت کے پیچھے ارشد محمود کے اقبال جرم کا ہاتھ تھا۔ اس نے دولت کے لالچ میں اپنے سیٹھ اسلم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ جج کے حکم پر جب پولیس نے "برہانی ایسوسی ایشن" کے آفس سے جا کر میرے دعوے کی تصدیق کی تو پتا چلا کہ استغاثہ کے گواہ ارشد محمود نے پندرہ اپریل کو واقعی کمپنی سے بیسٹھ ہزار کے عوض ایک سوئیں گز کا ایک پلاٹ واقع یو پی موڈ خریدا تھا۔ اس تصدیق کے بعد ارشد محمود کے پاس اقرار جرم کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔

ارشد محمود نے اپنے اقرار کی بیان میں بتایا کہ اپنے گھر کا خواب وہ برسوں سے دیکھ رہا تھا لیکن اس خواہش کی تکمیل کی دور دور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی پھر وہ کہہ کر روز جب اس نے متول اسلم فاروقی کو پیش کے عالم میں میرے موکل کے ساتھ جھگڑا کرتے سنا تو اس کی نیت میں تورا گیا۔

تک اندازہ نہیں ہے۔ میں کامل پولی ٹیکنک یونیورسٹی میں فزکس پڑھاتی تھی۔ یہ پولی ٹیکنک یونیورسٹی، کامل یونیورسٹی سے زیادہ دور نہیں ہے۔ پیدل بھی آیا جاسکتا ہے۔ وہاں سے میں نے فزکس میں ماسٹر کیا جس کے بعد وہیں مجھے لیکچرر کی نوکری مل گئی تھی۔ اب محکمہ تعلیم میں ملازم تھے اور امی اسکول میں پڑھاتی تھیں، ایک بھائی فوج میں پائلٹ تھا، دوسرا بھائی ارجنڈ کامل یونیورسٹی میں قاری ادب پڑھاتا تھا۔ ارجنڈ نے تھران یونیورسٹی سے قاری میں پی ایچ ڈی کی تھی، اسے پڑھنے پڑھانے کا جنون تھا۔ دنیا بھر کی زبانوں کی شاعری کے ترجمے، ہر زبان میں لکھا جانے والا جدید کلاسیکی ادب، دنیا بھر میں ہونے والے مذاکروں، مناظروں کا قاری میں ترجمہ ایران سے ہو کر کامل بھی پہنچ جاتا۔ وہاں مجھے زندگی کا احساس ہوا، وہاں مجھ پر علم کے دروازے کھلے۔ ہماری لائبریری، ہماری لیبز، ہمارے سب کچھ تھا جو ایک ماڈرن لیبز میں ہونا چاہیے۔

یونیورسٹی میں ہی میری ملاقات آریان سے ہوئی، آریان ارجنڈ کا دوست تھا۔ ماسکو سے انگلش میں پی ایچ ڈی کر کے آیا اور یونیورسٹی میں ہی شعبہ انگریزی ادب میں اسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تعینات ہوا۔ میری اس سے پہلی ملاقات ارجنڈ کے کمرے میں ہوئی، میں ارجنڈ کے کمرے میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ آگیا۔ سرخ و سفید چہرہ، گہری ہجیریں۔ بھرے بھرے ہونٹ اور ان کے اوپر گہری سیاہ موچیں، سر پر گھنے بال۔ اس کا قد لانا تھا اور اسے دبلا ہی کہا جاسکتا تھا۔ اس نے نیلا کوٹ، نیلے رنگ کی قمیص اور خاکی چٹون پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں سیاہ جوتا مجھے ایسا لگا جیسے وہ موزے پہننا بھول گیا ہو، اس کی گردن میں نیلے رنگ کا ہی مفلر تھا جو دونوں کانوں سے نیچے لٹک رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھنے کے ساتھ ہی میرے دل میں اس کے لیے ایک شدید قسم کی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جاذب نظر تھا۔ ایک خاص قسم کا مردانہ حسن تھا اس میں۔ میں اسے دیکھتی رہی پھر گہرا کر بولی، ”جی میں ارجنڈ کی بہن ہوں۔ انتظار کر رہی ہوں اس کا۔“

”اوہ! اچھا تو آپ فرشتے ہیں، فزکس پڑھاتی ہیں یہاں پر۔ ارجنڈ نے بتایا تھا مجھے۔ مجھے آریان کہتے ہیں، میں انگلش پڑھاتا ہوں۔ ابھی آیا ہوں ماسکو سے۔“ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

بعض لوگوں سے بار بار نہیں ملتا پڑتا۔ پہلی ہی ملاقات میں ایسا لگتا ہے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ اس

دن بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ آیا، بیٹھا اور بات چیت شروع کر دی تھی۔ ”اچھا تو کیا خیال ہے آپ کا، سماج میں لٹریچر اور فلسفے کی زیادہ اہمیت ہے یا فزکس کیمسٹری کی۔“ اس نے مجھے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

”سماج میں علم کی اہمیت ہونی چاہیے، چاہے کوئی بھی علم ہو۔ علوم تو سارے ہی اہم ہیں، سماج کی بہت ساری ضرورتیں ہیں اور علم اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔“ میں نے جواب میں کہا تھا۔

”کیا بات ہے فرشتے، کیا بات ہے، برا تو نہیں مانو گی اگر میں صرف فرش کہہ کر پکاروں۔ فرشتے تو بہت بڑا نام ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے بہت دور ہو تم اور فرش تو جیسے بہت ہی قریب ہو۔“ اس نے بڑی بے تکلفی سے تکلفات کے پردوں کو اتار پھینکا۔ پھر کہنے لگا۔ ”بات تو تمہاری سچ ہے، مگر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ جب تک سماج میں ادب کی چاشنی نہ ہو، فلسفے کا کھوج نہ ہو، شاعری کی حساسیت نہ ہو، قانون کی گرفت نہ ہو اس وقت تک سماج، سماج نہیں ہوتا، ایک ٹھم ہوتا ہے لوگوں کا، ایک ریوڑ کی طرح۔ ایسے ریوڑ کو فزکس، کیمسٹری، بائیو یا زولوجی کیا دے سکتی ہے، کچھ بھی نہیں کیا غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”نہیں، سچ کہہ رہے ہیں آپ۔ سماج بغیر ادب، فلسفہ و شاعری اور قانون و روایات کے ہوگا تو سماج نہیں ہوگا۔ لیکن تاریخ میں ایسے بہت سارے سماج بنے، ٹوٹے بکھرے اور تحلیل ہو گئے۔ فلسفی نہ روحانی ضروریات پوری کر سکے اور نہ مادی ضروریات کا حصول کرا سکے۔ اگر ان لوگوں کی فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی، ریاضی، موجدیات اور آسمانوں پر بھی نظر ہوئی تو آج کسی دوسری دنیا میں ہوتے ہم لوگ۔ انسان کے اندر کی دنیا کو اگر فلسفوں کی ضرورت ہے تو انسان کے باہر کی کائنات کو بھی انسان کو سمجھنا ہوگا۔“ میرا تو یہ خیال ہے کہ میں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا۔

دروازہ کھلا اور ارجنڈ کمرے میں داخل ہوا۔ ”اوہ! معاف کرنا دیر ہو گئی، میں ذرا دائیں چانسٹر کے پاس چلا گیا تھا۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر آریان کو مخاطب کر کے اس نے بتایا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں۔ روکی فوجی تو واپس چلے گئے ہیں مگر حکومتی کنٹرول آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔ بڑے مشکل حالات ہوتے جا رہے ہیں۔ خبر چلو کہیں کھانا کھاتے ہیں، چلو آریان تم بھی چلو۔

ہم لوگ یونیورسٹی کے سادہ سے ریسٹوران میں کھانا کھانے چلے گئے۔ بڑی دلچسپ باتیں ہوئی تھیں اس دن

روزمرہ کی باتیں، انگریزی و فارسی ادب کی باتیں، سیاسی و سماجی حالات کی باتیں۔ آریان نہ صرف یہ کہ خوب صورت آدمی تھا بلکہ خوب صورت ذہن و دماغ کا بھی مالک تھا۔ ذہن تھا، سمجھدار تھا اور بلا کا رومانی۔ اس دن کے بعد وہ میرے دل میں بیلا کی پھولوں کی خوشبو کی طرح مہکنا رہا۔ اتنی شدید تڑپ، چاہت، کسی کے لیے پہلے بھی میرے دل میں نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک سائے کی طرح میرے وجود پر چھا گیا۔ مجھ میں خواہش تو شدید تھی پر ہمت نہیں تھی کہ میں اس کے سامنے چلی جاتی، بیٹھ جاتی، سر اٹھاتی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی۔ ”آریان صاحب محبت کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا، کیا اچھا ادب اچھی شاعری، اچھا افسانہ، اچھا ناول محبت کے بغیر بھی تخلیق کیا جاسکتا ہے۔“ میں یہ نہیں کر سکی۔ اس کے بارے میں سوچتی رہی، من ہی من میں سلگتی رہی اور اسے تلاش کرتی رہی۔ نہ جانے وہ کہاں کھو گیا تھا۔

ایک ہفتے کا ذکر ہے، میں کلاس ختم کر کے باہر نکلی تو وہ نظر آیا۔ دیوار سے ٹیک لگائے، سفید قمیص، خاکی چٹون، نیلا کوٹ، نیلا مفلر اور کالے جوتوں میں پیر بغیر موزے کے، کھڑا جیسے میرا انتظار کر رہا ہو۔ میں نے بے قرار ہو کر اسے دیکھا، اس نے بھی بڑی بے قرار نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ ”کیا حال ہے تمہارا فرش۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”میں دوسرے دلہن ہی غزنی چلا گیا تھا۔ میری ماں کی طبیعت خراب تھی، انہیں لے کر قندھار کے بڑے اسپتال جانا پڑا، بہر حال اب وہ ٹھیک ہیں۔ تم کیسی ہو، میں نے سوچا تھا کہ دوسرے دن ہی آکر ملوں گا مگر شام کو ماں بی کا فون آگیا پھر میں رک نہیں سکتا تھا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ مسکرا کر جواب دیا تھا میں نے۔ کیسے کہتی کہ ٹھیک نہیں ہوں تمہیں، بے قرار کی سے ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔ بے تاب ہو ہو کر، نظر بھر کے دیکھتی ہوں دور سے آنے والے، نیلا کوٹ پہنے ہر شخص کو اور تمہیں نہ پا کر کتنی اداسی اترتی ہے میرے بدن میں، میری روح میں۔ کاش کہ یہ سب کچھ کہہ سکتی اس سے۔

مگر اس نے سب کچھ کہہ دیا بتا کسی تردید، کسی جھجک اور کسی تکلف کے ”فرش شادی کرو گی مجھ سے۔ ہاں کہہ دو تو ماں بی کو گھر بھیج دوں تمہارے۔“

مجھے ایسا لگا جیسے لمبے سے اس کا ریڈر میں شروع سے آخر تک یکا یک چاندنی چمیل گئی ہو، ساری کلاسنوں کے دروازے یکا یک کھل گئے ہوں اور ہر طرف سے پھولوں

چھ عادتیں

ایک بار آپ ﷺ نے شیطان کو کمزور دیکھا تو وجہ پوچھی۔ شیطان نے کہا کہ آپ ﷺ کی امت کی چھ عادتیں مجھے کمزور کر دیتی ہیں۔

چھ ہر کام کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں۔

چھ جب لٹے ہیں تو ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہیں۔

چھ جب آپس میں لٹے ہیں تو معافی کرتے ہیں۔

چھ جب کبھی کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو انشاء اللہ کہتے ہیں۔

چھ ہمیشہ استغفار کا ورد کرتے ہیں۔

چھ آپ ﷺ کا نام سنتے ہی درود بھیجتے ہیں۔

آئیے ان کاموں کو اپنا کر شیطان کو کمزور سے کمزور بنائیں۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل، ملتان

کی بارش شروع ہو گئی ہو۔

پھر بہت جلد ہی ہم دونوں کی شادی ہو گئی، ہم دونوں کے والدین کی مرضی سے۔ ہم دونوں ہی کی زندگی میں یکا یک جیسے بہار آ گئی۔ میں اس سے خوش تھی اور وہ مجھ سے سیر۔ ہم دونوں کو جیسے ایک دوسرے کے بغیر جین نہیں آتا تھا۔ آریان کہتا تھا اپنی زندگی کی بہترین نظمیں اس نے اسی زمانے میں لکھی تھیں۔ نہ جانے مجھ میں کہاں سے قوت آ گئی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے اڑنا چاہوں تو اڑتی چلی جاؤں، بادلوں سے بھی آگے۔

ہم دونوں نے بہت سا وقت گزارا اور بہت سی جگہیں دیکھیں، نوروز میں مزار شریف گئے، جشن ہرات میں گھومے، غزنی و قندھار کے بازاروں میں چکرائے، کامل کے ہوٹلوں، ریسٹورانوں میں رنگین شاموں میں ہمارے نام کی قدیلیں چلیں۔ میں نے کوئی نظم پڑھی تو اسے سنا دی۔ اس نے کوئی کتاب لی تو مجھے بتایا۔ میں فزکس کے قوانین اور کائنات کے جانے بوجھے راز اسے اس طرح سے بتاتی جیسے میں نے ہی ان کا پتا لگایا ہے۔ آئن اسٹائن، کارل سگان،

اسٹیفن ہاکنز کی زندگی کے قصے، ان کی دریافتیں، بلیک ہول کے بارے میں کائنات اور بگ بینک کا تذکرہ ایسے کرتی جیسے میں خود وہاں موجود تھی۔ ایسا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ کتنے لوگوں کو بتایا تھا میں نے لیکن کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا مجھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کسی نے اتنی توجہ سے سنا کب تھا مجھے، اتنی اہمیت کس نے دی تھی میری باتوں کو۔ آریان مجھے سنا، دیکھا، محسوس کرتا اور ساتھ ساتھ اس طرح چلتا جیسے گزرے سفر میں ساتھ تھا اور آگے بھی ساتھ رہے گا۔ خود اعتمادی انتہا پر پہنچ گئی تھی۔

پھر بہت کچھ بہت تیزی سے ہو گیا ہم لوگوں کے ساتھ۔ نجیب کی حکومت ختم ہوئی، مجاہدین نے افغانستان کے حصے بخرے کر دیے، انار کی ایسی پھیلکی کہ لگتا تھا کہ نہ جانے کتنے کلڑے ہو جائیں گے ملک کے۔ لوگ جیسے جیسے حالات کا سامنا کر رہے تھے کہ ایک سیاسی قوت ٹڈی دل کی طرح یکا یک نمودار ہوئی اور پورے ملک پر تیزی سے قابض ہو گئی۔

ایک رات آریان واپس نہیں آئے۔ بہت کھوج لگائی ہم لوگوں نے۔ یونیورسٹی سے تو میں فارغ کر دی گئی تھی۔ برقعہ پوش ہو کر میں اور میری ماں، میرا بھائی اسے تلاش کرتے رہے۔ گلی گلی، دفتر دفتر، تھانہ تھانہ، کچھ پتا نہیں چلا آریان کا۔ ایک دن بازار میں میرے والد اور بھائی کو گولی مار دی گئی۔ دو دن کے بعد سب شدہ لاش ملی۔ نہ جانے کس طرح دفنایا تھا انہیں۔ وہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح یاد ہے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے آریان بھی مر گئے ہیں۔ ختم ہو گئے ہیں کسی قید خانے میں اپنے وعدوں کو یاد کرتے ہوئے۔

The wood are lovely, dark and deep
But I have promises to keep
And miles to go before I sleep
And miles to go before I sleep

ایک دن یہ لائنیں پڑھی تھیں انہوں نے میرے سامنے۔ میں انہی لائنوں کو دہرائی رہی، یاد کرتی رہی۔ انہی دنوں پتا چلا کہ غزنی میں آریان کے گھر پر ایک بم گرا تھا اور کوئی بھی نہیں بچ سکا۔ دو سال گزرنے کو تھے کہ ماں، ارجمند اور کامل سے نکلے، بس کے ذریعے سرحد پر پہنچے جہاں سے پشاور کا راستہ آسان تھا۔

پشاور میں پورے ایک مہینہ ٹھہر کر ہر مہاجر کیپ میں آریان کی تصویریں لیے ہم تینوں، لوگوں سے پوچھتے

رہے۔ لوگ مجھے دیکھتے، ان کی آنکھوں میں افسوس، کرب ہوتا، درد ہوتا، ہمدردی کے بول ہوتے، حالات کا گلہ ہوتا، اوپر والے کی نا انصافی کی شکایت ہوتی لیکن کوئی بھی اس کے بارے میں خبر نہیں دے سکا۔

پشاور میں ہی ہم تینوں نے امریکا میں پناہ کے لیے درخواستیں دی تھیں۔ پھر کوئٹہ میں جانے والے افغانوں سے آریان کا پتا کیا۔ اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔

☆☆☆

امریکا میں زندگی آسان نہیں تھی۔ وائٹ ہاؤس ایئر پورٹ پر ہمارے پاسپورٹ اور امیگریشن کے مسائل حل ہونے کے بعد ہمیں ٹاؤن ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ ایک ہفتے میں ہمارے کاغذات بن کر آگئے۔ نیشنل سیکورٹی ٹمبر اور ورک پرمٹ مل گیا۔ ابتدائی طور پر مناسب رقم فراہم کر دی گئی اور پھر امریکا کی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

فیروز نے ہم تینوں کی بڑی مدد کی۔ مکان کا حصول، امریکا میں رہنے کا طریقہ، مختلف قوانین کا جاننا، مدد حاصل کرنے کے طریقے، ہماری توانائش اچھی تھی مگر میری فزکس کی ڈگری اور ارجمند کی فارسی میں اہلیت کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی وائٹ ہاؤس میں۔ وطن سے دور فرنگ کے دہار میں قسمت نے کچھ اور ہی گل کھلائے۔

ہم سب نے یہی فیصلہ کیا کہ ماں گھر میں رہیں گی۔ شروع میں مجھے دواؤں کی دکانوں کی ایک کمپنی انکریڈ میں نوکری ملی اور ارجمند ایک شاپنگ سینٹر میں کام کرنے لگا۔ ہم دونوں نے ہی پڑھنے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا جس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ کام کے ساتھ ساتھ میں نے کمپیوٹر کے کورسز لے لیے اور ارجمند نے دو جگہوں پر کام شروع کر دیا۔ جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں اسے ایک امتحان دے کر مشرقی زبانوں کے شعبہ میں داخلہ ملنے کی اُمید ہو گئی جس کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ ان تمام کاموں میں فیروز نے ہماری بڑی مدد کی تھی۔

فیروز کا تعلق پشاور سے تھا۔ وہ بہت پہلے ہی کالج چھوڑ کر امریکا کا ویزا لے کر امریکا آ گیا تھا، پھر واپس نہیں گیا۔ مختلف کام کیے تھے اس نے۔ کمپیوٹر میں مہارت حاصل کر لی اور اب آئی بی ایم میں ایک اچھی ملازمت کر رہا تھا۔ پہلے دن ہی ہماری ملاقات اس سے ایئر پورٹ پر ہوئی تھی جہاں وہ اپنے کسی دوست کو رخصت کرنے آیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر رکا، ہم سے بات کی، پھر شام کو ہمارے ٹھکانے پر

سفنل شہر وسخن

مس زریں نواز..... گوجرانوالہ
وہ جب بھی کہتے تھے کہ ہم جیسا کوئی اور نہیں ہے دنیا میں
انہیں چاند دکھا کر انگلی سے ہم اوپر اشارہ کرتے تھے

مہرین ناز ڈوگر..... حیدرآباد
رہے رات دن یہ لمحے مجھے اچھے لگتے ہیں
تمہیں سوچوں تو سارے سلسلے اچھے لگتے ہیں
بہت دور تک چلنا مگر پھر بھی وہیں رہنا
مجھے تم سے تم ہی تک فاصلے اچھے لگتے ہیں

راجا افتخار علی افقی..... چوآسدن شاہ، موہڑہ
ذرا ٹھہرو کہ بارش ہے یہ تمم جائے تو پھر جانا
کسی کا تجھ کو چھو جانا مجھے اچھا نہیں لگتا



حسب احمد چنائے..... الگڈی، کرک
نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیای نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

وارث علی..... انور کالج، سندھیلیانوالی
نراکت ہے ختم ان پر ہوا ہے مدد سر پیدا
ذرا ملتے کو چوما تھا، پڑے ہیں کل سے سر ہاندھے

متین سلطان..... کراچی
درپردہ رقیبوں سے گلے شکوے نہیں اچھے
تمہیں جو بھی شکایت ہو، ہمارے روبرو کرنا

محمد عقیل چٹھہ..... حافظ آباد
عجب چمک سی میرے آنسوؤں میں رہتی ہے
چراغ حیرتے ہیں پانیوں کے اوپر بھی

اظہر حسین پچار..... ہزاری، چٹوٹی
وقف خوف و ہراس لگتا ہے
دل مصائب شناس لگتا ہے
تو جو اوچھل ہوا نگاہوں سے
شہر سارا اداس لگتا ہے



رمضان پاشا..... کلشن اقبال، کراچی
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

محمد جاوید اختر..... نور پور تھل، ضلع خوشاب
تو مجھ سے دوریاں بڑھانے کا شوق پورا کر
میری بھی ضد ہے تجھے ہر دعا میں مانگوں گا

محمد رشید سیال..... روہڑی، ضلع سکھر
مجھ سے مخلص تھا نہ واقف میرے جذبات سے تھا
اس کا رشتہ تو فقط اپنے مفادات سے تھا

ایم این عمار..... ضلع دیر، اوج
حسن خود بیتاب تھا اپنی نمائش کے لیے
مفت میں اہل نظر بدنام ہو کر رہ گئے

محمد رمضان حسرت الحسنی..... نور پور تھل، خوشاب
قاصد پیام شوق کو اتنا نہ مگر طویل
پوچھیں تو اتنا کہنا آنکھیں ترس گئیں

محمد عثمان انصاری..... نیو سینٹرل جیل ملتان
کوئی موسم ہو دل میں ہے تمہاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں تمہارے بعد کا موسم
نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے یارو کسی کی یاد کا موسم

طالب حسین طلحہ..... نیو سینٹرل جیل ملتان
ان کی آنکھوں میں دیکھ کر آنسو
اپنی بربادیوں کا غم نہ رہا
تیرے ایک بار مسکرانے سے
کوئی شکوہ تیری قسم نہ رہا

رضوان تنولی کریڑوی..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
کسی کے دل میں کیا چھپا ہے، بس خدا ہی جانتا ہے
دل اگر بے نقاب ہوتے، تو سوچو کتنے فساد ہوتے

ساگر لکوکر..... چشمہ بیراج
یاد آتے بلال حبشی ہیں
وہ تڑپ اب کہاں اذانوں میں
چند بوڑھے ملے مساجد میں
بھیڑ دیکھی شراب خانوں میں

اعجاز احمد راجیل..... ساہیوال
آج پھر بچھ گیا جل جل کے امیدوں کا چراغ
آج پھر تاروں بھری رات نے دم توڑ دیا
جس سے فسانہ ہستی میں تسلسل تھا بھی
اس محبت کی روایات نے دم توڑ دیا

اشوک کمار..... میر پور خاص
جوق در جوق تمنائوں کے دھوکے کھا کر
دل اگر اب بھی دھڑکتا ہے تو حد کرتا ہے

مس زریں نواز..... گوجرانوالہ
وہ جب بھی کہتے تھے کہ ہم جیسا کوئی اور نہیں ہے دنیا میں
انہیں چاند دکھا کر انگلی سے ہم اوپر اشارہ کرتے تھے

محمد محسن فاروقی..... نیو سینٹرل جیل ملتان
یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی نچی کتاب ہے، اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

ایم افضل انصاری..... ڈنگہ شہر
تو نے رکھا نہیں خیال مرا
ورنہ ہوتا نہ ایسا حال مرا
تیری خواہش تری طلب کے بغیر
بیت جائے گا یہ بھی سال میرا

محمد اکرام صدیقی..... انک شہ
امت سے کوئی شخص رُلانے نہیں آیا
جلتی ہوئی آنکھوں کو بجھانے نہیں آیا
کہتا تھا کہ ہم ساتھ جئیں ساتھ مریں گے
اب روٹھ گئے ہیں تو منانے نہیں آیا

محمد اسلم..... خانوال
ساری رات سوتے ہوئے
میں نے جنت کی سیر کی
صبح جو آنکھ کھلی تو دیکھا
کہ سر ماں کے قدموں میں ہے

عمران اکرم سلیم کمریڈ..... کھاناں
یہ مشغلہ ہے کسی کا نہ جانے کیا چاہے
نہ فاصلوں کو مٹائے نہ فیصلہ چاہے

قیصر اقبال گچی..... کھول ضلع بکھر
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

محمد واجد علی گچی..... کھول، بکھر
کل امیر شہر نے ریت کے گھر بانٹے ہیں
برسات کے موسم میں بھلا اور کیا سخاوت کرتا

احمد خان توحیدی..... پاکستان اسٹیل، کراچی
مانند سحر محسن گلستان میں قدم رکھ
آئے تیرے پا گوہر جہنم تو نہ ٹوٹے
ہو کہ وہ بیابان سے ہم آغوش ہو لیکن
ہاتھوں سے تیرے دامن افلاک نہ چھوٹے

سید محی الدین اشفاق..... کروڑ، لہہ
اب تیری وضاحت میں صداقت نہیں لگتی
اب اپنی محبت کی صفائی نہ دیا کر

ریاض بٹ..... حسن ابدال
کون سیابی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج ایک ہر جانی کی



اس عرصہ کی ترقی کارا زجے لغزشوں سے سیکھنے کا ہنر آتا تھا

سودا

تنویر ریاض

اچھا سوداگر وہی ہوتا ہے جو کسی بھی نقصان سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے... لیکن اس کے لیے حاضر دماغی اور وسیع النظری کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان دونوں صلاحیتوں سے وہ مالا مال تھی تب ہی تو اس نے اتنا کامیاب سوداگر ڈالا کہ زندگی سنور گئی۔

وہ بھی ایک عام سادہ تھا اور مجھے اس کے حوالے سے کوئی ایسی خاص بات یاد نہیں آرہی جس کا ذکر کیا جائے لیکن تم میری دیکھو اور جاننا چاہتی ہو کہ اس دن کیا واقعات پیش آئے تھے۔ تمہارا اصرار ہے کہ میں صبح بستر سے اٹھنے کے بعد اپنے معمولات کی ایک ایک تفصیل تمہیں بتاؤں جبکہ میرے خیال میں ان سب باتوں کا مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں بتاؤں سب کچھ معمول کے مطابق ہی ہوا تھا پھر کیوں نہ ہم اس مقدمہ کے بارے میں کوئی بات کریں

✽ منشی محمد عزیز مے... لندن و ہاڑی
ایک پیکر وفا کا یہ اعجاز دیکھنا
کچھ گھڑے کی رچ گئی خوشبو چناب میں
✽ زوہیب احمد ملک... گلستان جوہر کراچی
نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں
✽ امداد علی عرف ندیم عباس تنہا... میر پور خاص
تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھیے
ایک بھول اس نے بھیج دیا ہے گلاب کا
✽ انیسلی... کراچی
مجھ میں پیوستہ ہو تم یوں کہ زمانے والے
میری مٹی سے میرے بعد نکالیں گے تمہیں
✽ سید اکبر شاہ... لاہور
یہ جو نظروں سے تم میرے دل کو ٹھہرا کرتے ہو
گرتے تو ظلم ہو صاحب مگر کمال کرتے ہو
✽ احمد حسن عرضی... قبولہ شریف بائی پاس
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احسان کا پاس رہتا ہے
✽ محمد قدرت اللہ نیازی... حکیم پناؤن، خانپور
میری باتوں میں میری یادوں میں
حساب کر کے بتاؤں تو بے حساب ہو تم
✽ مدحت... گلشن اقبال، کراچی
ساتھ لحوں کا اور یاد برسوں کی
اچھے لوگوں کی یہی بات بڑی لگتی ہے
✽ شفیق احمد... سرگودھا
جب بھی آتی ہے موسم کی آوازیں میں تبدیلی
اس شخص کا بدل جانا بہت ہی یاد آ جاتا ہے
✽ محمد اشفاق سیال... شورکوٹ شی
ہم ایسے سادہ دل، واقف کہاں آداب الفت سے
کہ جان پر کھیلتے ہیں اور تم سے پیار کرتے ہیں

محفل شعرو سخن

کوین
برائے
شما
جون
2014

نام:
پتا:

کیونکہ میں ساری عمر جیل میں رہنا نہیں چاہتی۔ وکیل ہونے کے ناطے تم بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو کہ میرے حق میں کیا بہتر ہے۔ جانتی ہوں کہ بعض اوقات یہ ظاہر نظر آنے والی کوئی معمولی اور غیر اہم بات بھی لازم کی رہائی کا سبب بن جاتی ہے اور تمہاری قابلیت کی تو بڑی دھوم ہے۔ تم نے تو اس شخص کو بھی پری کروا دیا جس نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔ کیا کہا۔ اس نے قتل نہیں کیا تھا بلکہ یہ شخص اس پر الزام ہے۔ ٹھیک ہے، تم وکیل ہو۔ اپنے موکل کے دفاع میں یہی کوئی لیکن سب جانتے ہیں۔ خیر چھوڑو ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔

☆☆☆

مجھے صبح سویرے بستر چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کروں تو وقت پر ناشتا تیار نہیں ہو سکتا لیکن اس سے بھی پہلے چند منٹ کے لیے اپنے کتے کو سیر کے لیے باہر لے کر جاتی ہوں۔ یہ عادت اسے میرے شوہر لیو بولڈ نے ڈالی ہے۔ اس نے کسی میگزین میں پڑھ لیا تھا کہ صبح کی سیر صحت کے لیے مفید ہے۔ چنانچہ اس نے بھی اس پر عمل شروع کر دیا اور اپنے ساتھ کتے کو بھی لے جانے لگا لیکن یہ معمول چند روز سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ اس وجہ سے لیو بولڈ کو دفتر جانے کے لیے تیار ہونے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ ناشتا چھوڑ سکتا ہے لیکن بننے سنورنے کے لیے اسے پورا وقت درکار تھا۔ دراصل اس کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اسے بناؤ سنگار کا بہت خیال رکھنا پڑتا تھا۔ لیو بولڈ نے تو صبح کی سیر ترک کر دی لیکن کتا اس کا عادی ہو چکا تھا، چنانچہ یہ ذمہ داری مجھے سنبھالنا پڑی۔

میرے شوہر کو ناشتے میں ہمیشہ گرم چائے اور دلیا چاہیے ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ تو س، دہی اور پھل بھی ضروری تھے اور یہ ڈیوٹی بھی میری تھی کہ سیب چھیل کر اس کی قاشیں بناؤں اور اس کی خدمت میں پیش کروں۔

تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔ شاید تمہارا خیال ہے کہ میں موضوع سے ہٹ رہی ہوں حالانکہ تم نے خود ہی ناشتے کے بارے میں تفصیل جاننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میری ساس کو ناشتے میں تو س اور ایلے ہوئے انڈے پسند تھے اور وہ بھی گرم ہونے چاہتیں لیکن اس کی باری تو بچے کے قریب آتی تھی۔ اس سے پہلے مجھے دوسرے لوگوں کے لیے بھی ناشتا بنانا ہوتا تھا۔ شوہر سے فارغ ہونے کے بعد میں میری کے لیے سینڈویچ تیار کرتی۔ وہ میرے شوہر کی بہن یعنی میری تندہ ہے۔ یہ بات تو میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی وہ ہمارے ساتھ رہنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اپنی محدود آمدنی میں وہ کرایہ کا گھر نہیں لے سکتی۔ اسے آٹھ بچے

کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ سوا سات بجے ناشتا کر لیتی ہے۔ اس کے لیے زیادہ اہتمام نہیں کرنا ہوتا۔ وہ صرف کافی پانی اور جام لگے ٹوسٹ پر ہی گزارہ کر لیتی ہے۔ وہ بیچ کے لیے سینڈویچ لے جاتی ہے۔ لہذا میں اس کے سینڈویچ کے ساتھ ساتھ اسے بیٹے میکس کے لیے بھی اسٹیکس تیار کر لیتی ہوں۔ پھر بچوں کے لیے میز سجاتی ہوں دودھ، دلیا، کارن فلکس وغیرہ وغیرہ۔ چھٹی بیٹی لیزا کو چاکلیٹ ملک بہت پسند ہے۔ میری ڈائمنگ روم میں ناشتا کیا کرتی تھی کیونکہ کچن میں بچوں کا شور اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ صرف بچے ہی نہیں بعض اوقات مجھے بھی زور سے بولنا پڑ جاتا یا انصوم اس وقت جب میکس کی توجہ ناشتے سے ہٹ جاتی تو میں اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتی تاکہ اسے اسکول جانے میں دیر نہ ہو جائے۔ لیزا ناشتے کے دوران میز پر چیزیں گراتی رہتی اور مجھے بار بار کپڑے سے میز صاف کرنا پڑتی تھی، اسی دوران میری اپنا ناشتا ختم کر لیتی تو میں ڈائمنگ روم سے برتن اٹھاتی اور اس کے ساتھ ساتھ میری نظر میکس پر بھی ہوتی کہ وہ وقت پر ناشتا ختم کر کے تیار ہو جائے پھر میں لیزا کو کچن کراسے پیٹ، جیکٹ اور جوتے پہناتی اور ہم گھر سے نکل جاتے۔

جی ہاں، مجھے میکس کو اسکول چھوڑنے جانا ہوتا تھا، وہ بہت چھوٹا ہے۔ اسی طرح میں لیزا کو بھی گھر پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ صرف تین سال کی ہے اور گھر میں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں۔ میرے شوہر کے پاس تو بالکل بھی وقت نہیں کہ وہ اسے دیکھ سکے۔ اسے سکون سے ناشتا کرنے اور تیار ہونے کی عادت تھی، ویسے بھی صبح کے وقت وہ کوئی شور شرابا پسند نہیں کرتا۔ آخر اسے دن بھر دفتر میں کام بھی کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح میری بھی تقریباً اسی وقت گھر سے نکلتی تھی جب بچے اسکول جا رہے ہوتے ہیں جبکہ میری ساس اس وقت سو رہی ہوتی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد لیزا اپنے ڈیڈی کو پیار کر کے خدا حافظ کہتی اور پھر.....

اس جمعرات کو بھی سب کچھ اسی طرح ہوا تھا۔ معمول سے ہٹ کر چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ لیزا نے میز پر رکھی شہد کی بوتل میں انگلی ڈالی اور اسے چائنا شروع کر دیا۔ اس وقت میرا شوہر دفتر جانے کے لیے نکل رہا تھا۔ لیزا دوڑتی ہوئی گئی اور اپنی عادت کے مطابق اس سے لپٹ گئی۔ نہ جانے کس طرح ٹھوڑا سا شہد اس کے چشمے پر لگ گیا۔ میرے شوہر نے نشوونما سے چشمہ صاف کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی جیکٹ پر بھی شہد لگ گیا ہے۔ میں نے گیلیا کپڑا لے کر اس سے شہد صاف کرنے کی

کوشش کی لیکن دھبے اور نمایاں ہو گئے۔ میں دوڑتی ہوئی اور بگنی اور اپنے شوہر کو دوسرا کوٹ لاکر دیا۔ اس دوران لیزا نے شہد کی بوتل فرش پر گرا دی۔ جس گھر میں چھوٹے بچے ہوں وہاں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ شوہر کے جانے کے بعد میں نے لیزا کو ایک اونچی کرسی پر بٹھا دیا کیونکہ وہ بار بار فرش پر گرے ہوئے شہد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جبکہ وہاں بوتل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی پڑے تھے۔ اس نے یہ طور احتجاج زور زور سے رونا شروع کر دیا جس سے میری ساس کی آنکھ کھل گئی اور وہ لیزا کے رونے پر ناراض ہونے لگی۔ اس پر لیزا نے اور بھی اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ ایک طرف میں اسے چپ کرانے کی کوشش کرتی رہی تو اس کے ساتھ ساتھ میں نے ساس کی زبان بند کرنے کے لیے اسے ایک پیالی چائے اور صبح کا اخبار پکڑا دیا۔ پھر میں نے کپڑے سے وہ جگہ صاف کی اور کتے کے بچے بھی دھو دیے۔ میرا خیال تھا کہ کہیں اس نے اپنے آپ کو زخمی نہ کر لیا ہو کیونکہ وہاں کالج کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ کتے کو تو کچھ نہیں ہوا لیکن اس کوشش میں میری انگلیاں ضرور زخمی ہو گئیں، چنانچہ مجھے اپنی مرہم پٹی کرنا پڑی لیکن اس کے باوجود مجھے فرش پر خون کے قطرے نظر آرہے تھے۔ اس کتے نے شہد چائے کی کوشش میں اپنا منہ زخمی کر لیا تھا۔ اب میں اس کے منہ پر پٹی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اسے ہاتھ روم میں بند کر دیا۔

اس کے بعد میں نے کچن کا فرش صاف کیا۔ لیزا کو گود میں اٹھایا اور ایک ہاتھ سے انڈے توڑ کر فرانی پین میں ڈالنا شروع کر دیے۔ پھر انہیں اتار کر پلیٹ میں رکھا۔ لیزا کے کپڑے بدلے اور ساس کو دیکھنے چلی گئی جو مجھے آواز دے رہی تھی۔ اسے گرم چائے چاہیے تھی۔ میں نے لیزا کو ایک جگہ بٹھایا اور ساس کے لیے چائے تیار کرنے لگی۔ اس دوران لیزا ہاتھ روم میں چلی گئی جہاں کتا بیٹھا ہوا تھا۔ لیزا نے اسے گود میں لیا تو اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے لگ گئے چنانچہ مجھے ایک بار پھر اس کی پیٹ بدلنا پڑی، میں اسے خون آلود لباس میں تو اسکول نہیں لے جا سکتی تھی۔

مجھے لیزا کو لے کر 9 بجے اسکول پہنچنا تھا لیکن ان جگہوں میں پانچ منٹ تاخیر سے پہنچی۔ اسکول کی ہیڈ ٹیچر نے مجھے ناگواری سے دیکھا۔ ان کے یہاں دیر سے آنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس طرح وہ اپنا پروگرام وقت پر شروع نہیں کر سکتے تھے۔ واپس آنے کے بعد میں نے ہاتھ روم صاف کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت تک کتے کے منہ

مجبوری

ایک مہینے نے عید الفصحی کے 16 ماہ بعد خواب میں دیکھا کہ جنت میں سب بکرے کھیل رہے ہیں مگر اس کا بکرا بیٹھا ہوا ہے، مہینے نے اپنے بکرے سے پوچھا۔ ”اے تو کیوں نہیں اٹھ کے کھیل رہا؟“

بکرے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”حاجی صاحب میرا ایک پایا آپ کے فریزر میں ہے میں 3 ٹانگوں سے نہیں کھیل سکتا۔“

لوڈ شیڈنگ کے اثرات

ایک پاکستانی فوجی دوسرے سے۔ ”یار جہول صاحب کہتا ہے کہ اس بار جنگ کمپیوٹر سے لڑی جائے گی؟“

دوسرا فوجی۔ ”ہاں میزائل کمپیوٹر سے کنٹرول ہوتے ہیں ناں اس لیے۔“

پہلا فوجی۔ ”پھر تو ہم جنگ بار جائیں گے۔“

دوسرا فوجی۔ ”وہ کیسے؟“

پہلا فوجی۔ ”اگر میزائل چھوڑنے سے پہلے بجلی چلی گئی تو؟“

سیر کو سوا سیر

شوہر۔ ”میری امی آرہی ہیں کچھ بتالو۔“ بیوی نے منہ بنالیا۔

اگلی بار بیوی۔ ”میری امی آئی ہیں پلیز آپ باہر سے کچھ لے آئیں۔“ شوہر رکشالے آیا۔

سلیقہ پسند

پاکستانی بیویاں سلیقہ والی ہوتی ہیں وہ سب کے سامنے اپنے شوہر کو ”اے گدھے“ یا ”اے گدھے“ نہیں کہتیں، اس لیے وہ مختصر کر کے کہتی ہیں۔ A.G/O.G

مرسلہ۔ رضوان خونی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

سے خون بہتا ہوا چکا تھا۔ ورنہ اسے بھی جانوروں کے اسپتال لے جانا پڑتا۔ پھر میں نے ناشتے کے برتن دھوئے، کچن صاف کیا اور بستر کی چادریں بدلنے لگی۔

تم سوچ رہی ہوگی کہ میں نے اپنے ناشتے کا ذکر نہیں کیا۔ میں اسی بھاگ دوڑ کے دوران تھوڑی بہت کافی یا چائے لے لیتی ہوں اور سینڈویچ بناتے وقت ایک آدھ کھڑا منہ میں رکھ لیتی ہوں۔ یہی میرا ناشتا ہے مجھے اپنے وزن کو بھی کنٹرول کرنا ہے کیونکہ میرے پاس کھیلنے یا ورزش کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔

بستر کی چادریں بدلنے کے بعد میں نے ساس کے لیے نہانے کا پانی گرم کیا۔ مجھے اس کی تھوڑی بہت مدد کرنا پڑتی ہے۔ وہ ستر سال کی ہو گئی ہے اور کبھی کبھی اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں دقت ہوتی ہے۔ اس لیے اسے سہارا دیے رہتی ہوں۔ اگر وہ گر پڑی اور اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تو میں کس طرح سنبھال پاؤں گی۔ اکثر ویسٹروہ اپنا لباس خود ہی تبدیل کر لیتی ہے لیکن اس جمعرات کو اسے بزرگ شہریوں کی میٹنگ میں جانا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سا لباس پہن کر جائے۔ اگر میں اسے کوئی مشورہ دیتی تو اس کی سمجھ میں نہ آتا کیونکہ اس کا ذوق مجھ سے بہت مختلف تھا۔ مجھے بھی کسی کام سے باہر جانا تھا لہذا میں نے جلدی جلدی شاو لیا اور لباس تبدیل کر کے جانے کے لیے تیار ہو گئی ورنہ مجھے دیر ہو جاتی۔

عین اسی وقت میری ساس کو خیال آیا کہ اس موسم میں نیلا سوئٹر پہننا مناسب نہ ہوگا اور نیلی سوئٹر اس اسکرٹ سے مچھ نہیں کر رہا تھا جو میں نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ لوٹک روم میں کھڑی شکوہ کر رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے پھر میں نے الماری سے ایک گہرے نیلے رنگ کا اسکرٹ نکالا جس پر معمولی سی شکلیں پڑی ہوئی تھیں لیکن وہ اسے اس حالت میں پہننے کے لیے تیار نہ تھی۔ مجبوراً مجھے اس پر استری کرنا پڑی لیکن اس دوران میں وہ براؤن اسکرٹ اور نیلی سوئٹر پہن چکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ موسم سرد ہو گیا ہے اور اگر وہ نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنتی ہے تو اس کے پاس اس کی مناسبت سے کوئی کوٹ نہیں ہے۔ میرے پاس اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا چنانچہ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ہم اس پر بعد میں بات کریں گے۔ ویسے بھی میرے پاس سچ سے پہلے بالکل وقت نہیں تھا۔ مجھے ایک بیچ لیز اور میکس کو ان کے اسکول سے لیتا تھا اور اگر میں ان کے لیے صرف سوپ یا

ٹوڈلز بھی بناتی تو یہ مشکل تمام ہی یہ کام ہو سکتے تھے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے ملازمت کے سلسلے میں لیبر ڈیپارٹمنٹ بھی جانا ہے۔ اس کا پیکر شروع ہو جاتا، وہ مجھے کفایت شعاری کی تلقین کرتی اور پوچھتی کہ میں ان سوپرو کا کیا کرتی ہوں جو وہ ہر ماہ مجھے کھانے کی مدد میں دیتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی رقم تھی جسے میں بے دردی سے خرچ کر دیتی تھی۔ میں خاموشی سے باہر آئی اور اپنی بائیک پر سوار ہو کر منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ مجھے ہوا کی مخالف سمت سفر کرنا تھا۔ اس لیے بائیک چلانے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں دس بج کر پانچ منٹ پر اس دفتر میں پہنچی۔ وہاں کاؤنٹر پر موجود ایک عورت نے مجھے بی بی ڈی پر پروگرام کے بارے میں بتایا یعنی بیک ٹو ورک، یہ ان لوگوں کے لیے تھا جو ایک وقفہ کے بعد کام پر واپس آنا چاہتے ہوں۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں جانے کے لیے کہا جہاں اس شخص سے میری ملاقات ہوگی، میں اسے پہلے سے نہیں جانتی تھی۔ اس لیے مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ میں اس وقت تھوڑی سی تلخ ضرور ہوئی جب اس نے بتایا کہ میں اس پروگرام میں شامل نہیں ہو سکتی۔

انہیں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو تیز رفتاری سے عمدہ ٹائپ کر سکتا ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بھی ایک کمنے میں دس سے پندرہ صفحات ٹائپ کر سکتی ہوں جبکہ وہ بچوں کے ہوتے ہوئے یہ خاصا مشکل کام ہے۔ شاید مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اس سے وہ یہ سمجھا کہ میں گھر پر ٹائپ کرتی ہوں اور اس طرح ٹیکس چوری کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ خود بھی یہ کام نہیں کرنا چاہتی کیونکہ یہ کوئی لگی بندھی آمدنی نہیں ہے اور اسی لیے ملازمت تلاش کر رہی ہوں لیکن وہ میری باتوں سے قائل نہیں ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے ایسی عورتوں کا حق نہیں مارنا چاہیے جو ملازمت کر کے اپنا گزارہ کرتی ہیں بلکہ اس پر خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ مجھے شوہر کی سپورٹ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ اعتراض بھی تھا کہ دو بچوں کے ہوتے ہیں کس طرح ملازمت کی ذمہ داریاں نبھاسکوں گی۔

اس کا اعتراض بجا لیکن لیزا جس پری اسکول میں جاتی تھی وہاں ایک بہت اچھا ڈسے کیئر سینٹر بھی تھا اور وہ پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ اگر مجھے ملازمت مل گئی تو وہ لیزا کو ڈسے کیئر سینٹر میں داخل کر لیں گے۔ اس کی باتیں سننے کے بعد بھی میں خاموش تھی لیکن جب اس نے کہا کہ مجھے ایک کورس کرنا چاہیے اس کے بعد وہ میری ملازمت کے بارے

میں سوچ سکتا ہے۔ یہ کورس ان لوگوں کے لیے تھا جو طویل عرصہ سے ملازمت نہیں کر رہے تھے۔ اس کورس میں بتایا جاتا تھا کہ کس طرح انہیں مچ اٹھنا ہوگا اور دوبارہ کام پر جانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔ اس دوران وہ پورے وقت مجھے گھورتا رہا۔ اس کی نظریں میرے جسم کو جھڑپ رہی تھیں مانا کہ دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود خاصی پرکشش تھی اور جب تک لوگوں کو نہ بتاؤں کہ شادی شدہ ہوں، انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا لیکن خوب صورت اور پرکشش ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر کوئی ہمیں چلتا پھرتا اشتہار سمجھ کر اپنی نظریں گاڑ دے۔ وہ جس بے باکی سے میرے جسم کا جائزہ لے رہا تھا، اس سے مجھے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ شاید وہ مجھے ٹائپ کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ٹائپ رائٹر کی جانب بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی کھڑا ہو گیا اور نہ جانے اسے کیا سوچیں کہ وہ چلانے لگا۔ شاید وہ مجھے ٹائپ کرنے سے روکنا چاہ رہا تھا۔ اس کی چیخ و پکار سے میں خوفزدہ ہو گئی۔ اگر اسے نہ روکی تو شور سن کر دفتر کے دوسرے لوگ بھی وہاں آ جاتے اور میرا تماشباں بن جاتے۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن اس پر تو جیسے دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے ایسا کیا کر دیا۔ اگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں ٹائپنگ کروں تو آرام سے بھی منع کر سکتا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھی تاکہ اسے شور مچانے سے روک سکوں۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا اور اپنی میز سے جا کھرا یا۔ اس کا ہاتھ لگنے سے میز پر رکھا ہوا پانی کا جگ زمین پر گر پڑا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ نیچے جھک کر کالج کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔

میری نظروں کے سامنے صبح کا منظر گھوم گیا جب لیزا نے شہد کی بوتل زمین پر گرانی تھی اور اس کے ٹکڑے چھتے ہوئے میری انگلی کٹ گئی تھی۔ اس کوشش میں وہ بھی زخمی ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے اسے کالر سے پکڑا اور اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ میری توقع سے زیادہ بھاری ثابت ہوا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ شاید اتنی آسانی سے اسے نہ اٹھا سکوں گی۔ اس نے غموم کر مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر مجھے ناگواری کے آثار نظر آئے جیسے اسے میری یہ حرکت اچھی نہ لگی ہو جبکہ میں اس کی بہتری کے لیے ایسا کر رہی تھی۔ وہ تھوڑا سا خوفزدہ بھی تھا۔ اس کا چہرہ ٹھٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور اس کے ماتھے سے پینا بہہ رہا تھا۔ ایسی حالت

میری ساس کی بھی ہو جاتی تھی جب وہ سختی کہ لے بولڈ میرے ساتھ چھٹیاں منانے کہیں باہر جانا چاہتا ہے تو اسے بے ہوشی کے دورے پڑنا شروع ہو جاتے۔

میں نے کمرے کی کھڑکی پوری کھول دی تاکہ اسے تازہ ہوا مل سکے اور اسے کرسی پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ کرسی کے گرد گھومتا رہا۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ مجھ سے خوف زدہ ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی میں اس کے پاس اپنی غرض سے آئی تھی۔ خوف زدہ مجھے ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں نے اس کے انکار پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں تو صرف اتنا چاہتی تھی کہ وہ میری ٹائپنگ دیکھ لے تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ میں اس کی مرضی اور معیار کے مطابق ٹائپ کر سکتی ہوں۔ شاید یہی بات اسے ناگوار گزری تھی، وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی گلی ہوئی بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔

اس کی نظر فرش پر گئی۔ وہاں دو پینسلیں پڑی تھیں جو غالباً پانی کے جگ کے ساتھ ہی میز سے گر گئی تھیں اس کا پاؤں ایک پینسل پر پڑا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتی وہ کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر جا چکا تھا۔ میں نے دہشت کے عالم میں اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ پانچویں منزل سے گرنے کے بعد اس کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کاش وہ احتیاط سے کام لیتا۔

مجھے اس جیل میں رہتے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ پولیس کو شبہ ہے کہ شاید میں نے اسے دھکا دیا تھا۔ جبکہ میں نے سمجھیں تمام واقعات بلا کم و کاست بتا دیے ہیں۔ تمہارے خیال میں یہ حادثہ بے پروائی کے سبب پیش آیا اور تم اسے ثابت بھی کر سکتی ہو۔ جانتی ہوں تم بڑی پائے کی وکیل ہو اور تم نے قتل کے مجرموں کو بھی سزا سے بچایا ہے، مجھے تمہارے الفاظ پر یقین ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ساری زندگی اس جیل میں نہیں گزار سکتی۔ ہاں۔ دو تین سال کی بات اور ہے۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ میری نے دفتر سے طویل چھٹی لے لی ہے اور میری ساس کو لے بولڈ کے لیے کھانا بنانا پڑ رہا ہے۔ اب ان دونوں کو میری قدر معلوم ہو رہی ہوگی۔ اچھا ہے کچھ عرصہ گھر سے دور رہوں تاکہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ لیکن اس کے لیے مجھے یہ اعتراف بھی کرنا ہوگا کہ میں نے جان بوجھ کر اسے دھکا دیا۔ میرے خیال میں پورے دن کی مشقت کے عوض یہ سودا بہت کم نہیں۔ تم کیا کہتی ہو؟



محی الدین نواب

چھٹی قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرائی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پرے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بتایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بے پایاں اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحریر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی چلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کی روپ، کئی چہروں کی روپ، محبت کی مٹاتوں، رقابتوں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ



گیا۔ اس نے جھک کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ”یہ محبت کیا ہوتی ہے؟ جب بولنے کے لیے کوئی نہ ہو تو آدمی کتے سے اور کتا آدمی سے بولنے لگتا ہے۔ سنا ہے مجھوں بھی اسی طرح لیلیٰ کے کتے سے بولتا رہتا تھا۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اچانک ہی خاموش فضاؤں میں بیٹھے سر بولنے لگے۔ دور کہیں سے بانسری کی تان ابھری تھی جیسے رات کی اندھیر نگری سے ماروی نے نکارا ہو۔ بڑی درد بھری آواز تھی سیدھی مراد کے کلیجے میں گھس رہی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات جانے والی تھی۔ ایسے وقت نہ جانے کون دل جلا راگ سے آگ لگا رہا تھا۔ وہ بھی جیسے جدائی کا مارا ہوگا۔ درد مشترک ہو تو اپنی طرف منہ نہ کرے۔ وہ تخت سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ بیگ کو اٹھا کر شانے سے لٹکا کر آواز کی سمت جانے لگا۔ پھر چار قدم چل کر رک گیا۔ وہ سریلی تان کھلی فضا میں گونج رہی تھی۔ چاروں طرف سے سنا کی دے رہی تھی۔ وہ کدھر جائے؟ وہ سوچ سوچ کر چاروں طرف گھوم گھوم کر کسی ایک سمت کا تعین کرنا چاہتا تھا لیکن پیار کے گنبد سے گونجنے والی بانسری ہر صوفیانہ اثر ہی تھی۔ وہ دیوانہ وار گھوم گھوم کر زور سے بولنے لگا۔

”ہے ماروی!

ہو ہو ماروی!

بانسریا تیرے شہر میں بول رہی ہے

دیوانے دل کی دنیا ڈول رہی ہے۔“

اس کی آواز سنائے کا سینہ چیرتی ہوئی دور تک پھیل رہی تھی۔ نیند کی نگری میں فریادیں کر گونج رہی تھی۔

پھر ذرا سی دیر میں اس ہونک کے پاس عورتوں اور مردوں کی بھیڑ لگ گئی۔ محبت فریادیں گئی تھی۔ ابھی شہر سو رہا تھا۔ ابھی ماروی کے پیار نے جگا دیا۔

ایک بزرگ نے پوچھا۔ ”کون ہوتا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔ اپنی ماروی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔“

ایک جوان نے کہا۔ ”یہ بھی موہن لال کی طرح کسی موہنی کا دیوانہ لگتا ہے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی بانسری کی تان بالکل قریب سے سنائی دی۔ عورتوں اور مردوں کی بھیڑ دھوڑوں میں جھٹکنے لگی۔ وہ دکھائی دینے لگا۔ کرتہ اور دھوٹی پہنے ہوئے تھا۔ جگوان کرشن مراری کی طرح بانسری کو ہونٹوں سے

لگائے سر پھونک رہا تھا۔ ایک عورت نے کہا۔ ”یہ موہنی کا دیوانہ ہے۔ جس دن مال بیچنے شہر جاتا ہے اس دن صبح بولنے سے پہلے اٹھ بیٹھتا ہے۔ بانسری بجا کر اسے یاد کرتا ہے۔“

موہن نے بانسری کو ہونٹوں سے ہٹا کر کہا۔ ”میں اسے یاد کرتا ہوں، میری بانسری موہنی کو خبر پہنچاتی ہے کہ میں مال لے کر شہر جا رہا ہوں اور اس کی بستی سے گزرے والا ہوں۔“

مراد نے پوچھا۔ ”کیا تم کسی شہر کی طرف جا رہے ہو؟“

”ہاں۔ میں مرغیاں اور مویشی بیچنے قلات جاتا ہوں۔“

”وہاں سے ڈیرا بگٹی کتنی دور ہے۔“

”قلات کے بعد بھی ہے۔ بھی کے بعد ڈیرا بگٹی بہت دور ہے۔ کیا تم ادھر جاؤ گے؟“

وہ خلا میں تکتے ہوئے ماروی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔ وہ مجھے وہیں ملے گی۔“

ایک نے پوچھا۔ ”تم کون ہو اور کہاں سے آ رہے ہو؟“

”میں آپ ہی لوگوں کی طرح محبت کرنے والا انسان ہوں۔ کراچی سے آ رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے۔ اپنے بارے میں زیادہ نہیں بتا سکوں گا۔“

”کچھ تو بتانا ہوگا۔ بڑے شہروں میں بڑی بڑی واردات کرنے والے گرفتاری سے بچنے کے لیے ادھر چھپے آتے ہیں۔“

”میں نے کوئی واردات نہیں کی ہے۔“

”پھر کراچی سے پیدل کیسے آئے ہو۔ ادھر ریل گاڑی نہیں چلتی ہے۔ پکی سڑک نہیں ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”تم خضدار کی پکی سڑک سے اتر کر تین کلومیٹر چل کر یہاں آئے ہو۔ معلوم ہوتا ہے جہاں جانا ہے وہاں کار راستہ نہیں جانتے۔“

مراد نے کچھ سوچا پھر کہا۔ ”سچ یہ ہے کہ ایک عورت تین بد معاشوں کے ساتھ میرا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ مجھے گناہ گار بنانا چاہتی ہے۔ لیکن میں صرف اپنی ماروی سے شادی کروں گا۔ لیکن وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ ابھی وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔ ادھر ضرور آئے گی۔“

وہ موہن کو دیکھ کر بولا۔ ”میری مدد کرو۔ مجھے یہاں سے دور اپنی گاڑی میں لے چلو۔“

”میں اونٹ گاڑی میں مال لے جاتا ہوں۔ وہ بہت آہستہ چلتی ہے اور کوئی عورت موٹر گاڑی میں آئے گی تو تم اس سے بچ کر کہاں جا سکو گے؟“

اس نے پوچھا۔ ”کیا یہاں کسی کے پاس چارہ ہے؟“

ماروی

یاد دہتیوں والی گاڑی ہے؟ میں اس کی منہ مانگی قیمت دوں گا۔“

معلوم ہوا وہاں تیز رفتار گاڑیاں کسی کے پاس نہیں ہیں۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا یہاں گھوڑا مل سکتا ہے؟“

ایک نے کہا۔ ”کل رات دو آدمی گھوڑوں پر آئے تھے۔ وہ تھکے ہوئے تھے یہاں ایک مکان میں سو رہے ہیں۔“

دو گھڑ سواروں کی بات پر مراد کا ماتھا ٹھنکا۔ پچھلی رات دو ڈاکو اس سے مقابلے کے دوران میں جان بچانے کے لیے دو گھوڑوں پر فرار ہوئے تھے۔ وہ یہاں پہنچے ہوئے تھے اور یقیناً پچھلی رات کی طرح صلح ہوں گے۔

اس نے پوچھا۔ ”ان کے پاس تین گھوڑے ہوں گے اور بندو قیں ہوں گی۔“

”گھوڑے دو ہیں اور بندو قیں بھی ہیں۔ یہاں سے اکثر ڈاکو اور اسمگلر گزرتے رہتے ہیں لیکن ہم کسی کاراستہ نہیں روکتے اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیتے ہیں۔“

مراد ظالموں کے آگے ہاتھ نہیں جوڑ سکتا تھا۔ پھر وہ اسے پہچانتے ہی گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہاں سے فوراً بھاگ جانا ہی دانشمندی ہوتی۔

لیکن پھر وہی مسئلہ درپیش تھا۔ وہ فرار ہوتے وقت پیدل ہوتا اور ڈاکو اس پر گھوڑے دوڑاتے گزر جاتے وہاں کسی کے پاس کوئی تیز رفتار گاڑی نہیں تھی۔

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے بستی والوں کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا تم سب ان بددوق والوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو؟ میرا ساتھ دو۔ میں انہیں یہاں سے بھاگا دوں گا یا مار ڈالوں گا۔“

کتنے ہی سراکار میں ملے لگے۔ وہ کہنے لگے کہ وہاں گولیاں چلنے نہیں دیں گے۔ عورتیں اور بچے سہم گئے تھے۔ کچھ لوگ اس سے کہہ رہے تھے۔ ”تم جاؤ۔ تمہیں خدا کا واسطہ دیتے ہیں۔ یہاں سے جاؤ۔ ہماری عورتوں اور بچوں پر رحم کرو۔“

وہ پریشان ہو گیا کہ پیدل کہاں جائے اور کتنی دور تک جائے؟ اس کے پیچھے ڈاکو آئیں گے۔ مرینہ بھی آئے گی۔ وہ پیدل جس راستے پر جائے گا، مارا جائے گا۔

اس کے آگے ایک ہی راستہ تھا کہ تیز رفتار سواری مل جائے اور اس وقت وہاں دو گھوڑے تھے۔ ان میں سے ایک اس کی ضرورت پوری کر سکتا تھا۔

اس نے مجبور ہو کر اپنے لباس میں ہاتھ ڈالا پھر آہستگی سے ریوالت نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھتے ہی وہ سب سہم کر پیچھے ہٹنے لگے اس نے کہا۔ ”ڈرو نہیں۔ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تمہاری سلامتی چاہوں گا۔ میرا صرف ایک کام کرو۔ مجھے اس مکان تک پہنچا دو جہاں وہ دونوں سو رہے ہیں۔ اس کے بعد تم اپنے گھروں میں جا کر دروازے اور کھڑکیاں بند کر لو۔ اگر گولیاں چلیں گی تو تم سب محفوظ رہو گے۔“

اسی طرح انہیں سلامتی مل سکتی تھی۔ وہ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف تیزی سے جانے لگے۔ وہ دو جوانوں کے ساتھ چلتا ہوا ایک اسکول کے پاس آیا۔ وہاں ایک کھونٹے سے دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک جوان نے کچھ قاصلے پر ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ جس کا دروازہ سبز رنگ کا ہے۔ اس مکان میں وہ دونوں ہیں۔“

اس نے مکان کی طرف دیکھا پھر ہاتھ کے اشارے سے انہیں جانے کو کہا۔ وہ چلے گئے۔ ابھی رات باقی تھی۔ دور افق سے پچھلے پیر کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ چاند کی سرخی نے دور تک سرخ روشنی پھیلا دی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس مکان کی ایک کھڑکی کے پاس آیا۔ پھر کان لگا کر سننے لگا۔

کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ کسی سامان کو ادھر سے ادھر سرکانے کی آواز تھی۔ پھر کوئی منہ میں پانی لے کر کھلی کر رہا تھا۔ اور کوئی کہہ رہا تھا۔ ”ہمیں اس طرح بے خبر ہو کر نہیں سونا چاہیے تھا۔ بستی والے تھانے میں مخبری کر سکتے ہیں۔ ہمیں گرفتار کر سکتے ہیں۔“

دوسرے کی آواز سنائی دی۔ ”میں یہاں سے ایک بار گزر چکا ہوں۔ یہ لوگ بزدل ہیں۔ ہم جیسوں کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ ڈرو پوک ہیں اس لیے ہم سے دشمنی نہیں کریں گے۔“

”صبح ہونے سے پہلے نکل چلو۔ مجھے وہ لاکھوں روپے اور سونے کے زیورات دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار بہت بڑا نقصان اٹھایا ہے۔“

”اسے بھول جاؤ۔ یاد کرنے سے غصہ آتا ہے۔ پتا نہیں وہ دشمن کون تھا۔ تمہیں نہیں آتا کہ اکیلا تھا اور ہمارے ساتھیوں کی موت بن گیا تھا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اب ہمیں نظر آئے گا تو اسے گولیوں سے چھلکی کر کے رکھ دیں گے۔“

مراد کان لگائے سن رہا تھا۔ اسے صرف ایک

سے ریوالت نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھتے ہی وہ سب سہم کر پیچھے ہٹنے لگے اس نے کہا۔ ”ڈرو نہیں۔ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تمہاری سلامتی چاہوں گا۔ میرا صرف ایک کام کرو۔ مجھے اس مکان تک پہنچا دو جہاں وہ دونوں سو رہے ہیں۔ اس کے بعد تم اپنے گھروں میں جا کر دروازے اور کھڑکیاں بند کر لو۔ اگر گولیاں چلیں گی تو تم سب محفوظ رہو گے۔“

اسی طرح انہیں سلامتی مل سکتی تھی۔ وہ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف تیزی سے جانے لگے۔ وہ دو جوانوں کے ساتھ چلتا ہوا ایک اسکول کے پاس آیا۔ وہاں ایک کھونٹے سے دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک جوان نے کچھ قاصلے پر ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ جس کا دروازہ سبز رنگ کا ہے۔ اس مکان میں وہ دونوں ہیں۔“

اس نے مکان کی طرف دیکھا پھر ہاتھ کے اشارے سے انہیں جانے کو کہا۔ وہ چلے گئے۔ ابھی رات باقی تھی۔ دور افق سے پچھلے پیر کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ چاند کی سرخی نے دور تک سرخ روشنی پھیلا دی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس مکان کی ایک کھڑکی کے پاس آیا۔ پھر کان لگا کر سننے لگا۔

کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ کسی سامان کو ادھر سے ادھر سرکانے کی آواز تھی۔ پھر کوئی منہ میں پانی لے کر کھلی کر رہا تھا۔ اور کوئی کہہ رہا تھا۔ ”ہمیں اس طرح بے خبر ہو کر نہیں سونا چاہیے تھا۔ بستی والے تھانے میں مخبری کر سکتے ہیں۔ ہمیں گرفتار کر سکتے ہیں۔“

دوسرے کی آواز سنائی دی۔ ”میں یہاں سے ایک بار گزر چکا ہوں۔ یہ لوگ بزدل ہیں۔ ہم جیسوں کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ ڈرو پوک ہیں اس لیے ہم سے دشمنی نہیں کریں گے۔“

”صبح ہونے سے پہلے نکل چلو۔ مجھے وہ لاکھوں روپے اور سونے کے زیورات دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار بہت بڑا نقصان اٹھایا ہے۔“

”اسے بھول جاؤ۔ یاد کرنے سے غصہ آتا ہے۔ پتا نہیں وہ دشمن کون تھا۔ تمہیں نہیں آتا کہ اکیلا تھا اور ہمارے ساتھیوں کی موت بن گیا تھا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اب ہمیں نظر آئے گا تو اسے گولیوں سے چھلکی کر کے رکھ دیں گے۔“

مراد کان لگائے سن رہا تھا۔ اسے صرف ایک

فرز انگی کی طرف، ہوش و حواس کی کاروباری دنیا میں واپس آجائے گا۔

لیکن یہ معاملہ اور الجھ گیا تھا۔ محبوب نے جیل کی چار دیواری میں مراد کی جگہ آکر ساری تدبیروں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔

ماروی اپنے محسن کی بہتری کے لیے اس کی نظروں میں مرحومہ بن رہی تھی۔ ان کے کٹھنڈ کوٹھی کا عیش و آرام چھوڑ کر کہیں دور ایک ویرانے میں جھپٹے اور رہنے جا رہی تھی۔

عارضی طور پر مرحومہ بننے کے سلسلے میں سمیرا اور معروف چلی نے اسے سہولتیں فراہم کی تھیں۔ وہ ایک انٹر کٹھنڈ کوچ میں چاچا اور چاچی کے ساتھ کراچی کے سپر ہائی وے سے روانہ ہوئی تھی۔ قاصدے کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ خیال تھا کہ آدھی رات سے پہلے سنی سے سوکو میٹر آگے ایک گاؤں ریتی تک پہنچ جائے گی لیکن منزل تک پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی۔

سفر کے دوران چاچا جھمرو بہت بیمار ہو گیا تھا۔ پچھلے کئی مہینوں سے گردے کی تکلیف تھی پھر بخار نے آدبو چاچا کی بڑے اسپتال میں اچھے ڈاکٹر سے علاج کرانا ضروری ہو گیا تھا۔ انہوں نے جیکب آباد پہنچ کر سفر ملتوی کر دیا۔

ایک بڑے ٹاؤن میں پہنچے ہی ماروی نے عبا بہن لی۔ نقاب میں چھپ گئی سمیرا نے کہا تھا۔ ”محبوب صاحب تمہیں تلاش کرنے کے لیے اخبارات میں تمہاری تصویریں شائع کرائیں گے۔ چینلز کے ذریعہ بھی تمہیں پیش کرتے رہیں گے لہذا تمہیں نقاب میں رہنا چاہیے۔“

اور یہی ہوا تھا۔ انہوں نے چاچا کے علاج کے لیے جیکب آباد کے ایک ہوٹل میں عارضی رہائش اختیار کی تھی۔ وہاں اس نے دوسری رات ٹی وی چینلز میں اپنی تصویر دیکھی تھی۔ اس کا دیوانہ محبوب اسے ڈھونڈ لگانے کے لیے لاکھوں روپے انعام کے طور پر دینے کا اعلان کر رہا تھا۔

ہوٹل میں اخبارات بھی آتے ہیں۔ چاچی مٹی نے اخبار کے ایک صفحہ پر اس کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھ۔ اخبار میں بھی تیری تصویر چھپوا دی ہے۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”تو نقاب میں مردوں سے جھپٹے گی لیکن عورتوں سے تو پردہ نہیں کرے گی۔ جو تجھے دیکھے گی وہ لاکھوں روپے حاصل کرنے کے لیے محبوب کو یہاں لے آئے گی۔ اخبار میں ان کا فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”ہم کیا کریں چاچی! ہم نے انہوں نے کاڈرانا کیا ہے۔ بیچاری سمیرا کو سچ سچ بیوہ بن گیا

جو زمین پر بڑا تکلیف سے کرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے من نکل کر دور چلی گئی تھی۔ مراد نے قریب آکر اس کے جسم میں دو گولیاں اتار دیں۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا نہیں ہوا۔ وہ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

رحمی بھاگ رہا تھا۔ گولی بازو میں گھس گئی تھی۔ انگارے کی طرح دھک رہی تھی۔ وہ جلن کی شدت کے باعث لڑکھڑا کر گر پڑا۔ مراد اس کے سر پر پھینچ گیا۔ اس کے زخمی بازو کو ٹھوکر ماری تو وہ حلق پھاڑ کر چیخنے لگا۔ اس کی گن بھی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

اس نے جھک کر اس کی کینچی سے ریوالتور لگا کر کہا۔ ”میں اتاڑی ہوں تو کیا ہوا؟ کیا اتنے قریب سے بھی نہیں مرے گا؟“

وہ اسے گولی مار کر اٹھ گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا اپنے بیگ کے پاس آ گیا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں ٹھونٹے ہوئے ادھنی آواز میں بولا۔ ”باہر آ جاؤ۔ وہ دونوں جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔“

وہ شانے سے بیگ نکال کر گھوڑوں کے پاس آیا پھر ایک کی گردن کو چھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں حاصل کرنے کے لیے یہ خون خرابا ہوا ہے۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔“

وہ ایک گھوڑے کی لگام تھام کر اس پر سوار ہو گیا۔ بستی والے اس کے پاس آ رہے تھے۔ کچھ لوگ مکان کے پیچھے جا کر ان کی لاشیں دیکھ کر آئے تھے۔ مراد نے کہا۔ ”ان لاشوں کو دفن کر کے تھانے پولیس اور کچھری کے چکروں سے بچ سکتے ہو۔ جو بہتر سمجھو وہ کرو۔ جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔“

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی وہ آگے بڑھا پھر سر پٹ دوڑتا ہوا اسے بستی والوں سے دور لے گیا۔ وہ اتاڑی جیکبو دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

ایک مثلث زاویے تین۔ ایک محبت دیوانے تین تین رنگاڑا کام بگاڑا۔

محبت میں دو ہوں تو داستان عشق روائی انداز میں اختتام کو پہنچتی ہے۔ تین ہوں تو ختم ہونے کو نہیں آتی۔ کبھی ہائیتی کا نپتی کبھی انجمنی تھی تماشے دکھائی چلی جاتی ہے۔

یہ تماشا سب کے سامنے ہی تھا کہ ماروی کو انہوں نے کیا کیا تھا اور کیا بھی کیا تھا۔ کمال یہ بھی تھا کہ اسے دو دیوانوں کی دنیا سے ناپود کیا گیا تھا اور وہ موجود بھی تھی۔

خیال تھا کہ ماروی ناپود ہوگی تو محبوب دیوانگی سے

میرے بیگ میں نہیں تھیں۔ کوئی انہیں یہاں لایا ہے۔“ دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ وہ بلیکٹ چپ ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ خطرے کا احساس ہوا۔ ایک نے کہا۔ ”یہ بیگ یہ روپے انہیں کوئی یہاں لایا ہے۔“

”ہاں ہمیں کھڑکی سے دکھا رہا ہے اور اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا ہے۔“ وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے اپنی بندو قوں کے پاس آئے۔ انہیں اٹھا کر کارتوس کی چٹی شانوں سے لٹکا کر اسی تیزی سے دوڑتے ہوئے پچھلے دروازے پر آگئے۔ پھر اسے کھولنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اسے بھی باہر سے بند کر دیا گیا ہے۔

اب ان پر خوف طاری ہوا۔ رحمی نے کہا۔ ”ہم گھر گئے ہیں۔ یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔“

وہ مکان کے پچھلے محسن میں تھے۔ ادھر کی دیواریں دس فٹ اونچی تھیں وہ آسانی سے انہیں پھلانگ کر فرار ہو سکتے تھے۔ لیکن باہر تو دشمن تاک میں ہوں گے۔

اور پتا نہیں وہ کتنے ہوں گے؟ وہ کل رات والا دشمن تھا ہے یا ابھی پولیس والوں نے انہیں گھیر لیا ہے؟

انہیں طرح طرح کے اندیشے باہر جانے سے روک رہے تھے۔ رحمی نے کہا۔ ”پولیس والے ہوتے تو ہمیں لٹکارتے۔ ہتھیار باہر پھینک کر آنے کو کہتے۔“

”ہاں وہ اکیلا ہے۔ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔“ وہ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی دیوار سے لگا کر اس پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ چاند کی روشنی میں دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر وہ اپنی گن سنبھال کر دیوار پر چڑھ کر بولا۔ ”وہ ادھر نہیں ہے۔ سامنے لاکھوں روپے پڑے ہیں وہاں ہوگا۔ میں باہر جا کر دروازہ کھولوں ہوں۔ پھر ہم اس سے نمٹ لیں گے۔“

وہ دیوار سے باہر کود کر دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ وہاں مکانات ایک دوسرے کے قریب تھے۔ مراد ایک مکان کی دیوار کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ وہ پچھلا دروازہ کھلتے ہی رحمی بھی باہر آیا۔ اسی وقت مراد نے فائرنگ شروع کر دی۔

وہ ایک دوسرے سے دور نہیں تھے۔ دو چار گز کے قاصدے پر تھے۔ اس کے باوجود وہ اتاڑی صحیح نشانہ نہ لے سکا۔ وہ بچ گئے لیکن زخمی ہو کر گر پڑے ایک پری طرح زخمی ہوا تھا۔ دوسرے کے بازو میں گولی لگی تھی۔ وہ جھالی فائرنگ کرتے ہوئے بھاگنے لگا۔

گھوڑے کی ضرورت تھی۔ وہ مکان کے دروازے کو باہر سے بند کر دیتا تو وہ دونوں اس کا راستہ روکنے کے لیے باہر نہیں آسکتے تھے۔ وہ آسانی سے ایک گھوڑے پر بیٹھ کر وہاں سے جاسکتا تھا۔

لیکن اس کے جانے کے بعد پچارے بستی والوں کی شامت آجاتی۔ وہ ڈاکو انہیں نقصان پہنچا کر گیا ہے۔

اس کا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا کہ وہ عورتوں اور بچوں کو ان عاملوں کے حوالے کر کے چلا جائے۔ اس نے دبے قدموں آگے بڑھ کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ پھر اس نے مکان کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا، پیچھے بھی ایک دروازہ تھا۔ اس نے اسے بھی باہر سے بند کر دیا۔ اب وہ دونوں وہاں قیدی بن گئے تھے۔

اس نے جہیز کر لیا کہ انہیں ٹھکانے لگا کر بستی والوں کو ان سے نجات دلا کر جائے گا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ پھر چپ ہو گئے۔ کھڑکی پر دیکھ سناکی دی۔ ایک نے کہا۔ ”پتا نہیں کون ہے اسے دروازے پر آنا چاہیے۔ وہ کھڑکی بجھا رہا ہے۔“

اس نے دروازے کے پاس آکر اس کی چٹنی کرائی پھر اس کے دونوں پٹ کھولنے چاہے تو وہ نہیں کھلا۔ اس نے زور سے دھکا دیا پھر کہا۔ ”یہ باہر سے بند ہے۔“

دوسرا بڑبڑاتے ہوئے کھڑکی کے پاس جاتے ہوئے بولا۔ ”وہ باہر سے کیسے بند ہو گیا؟ شاید کسی بچے نے شرارت کی ہے۔“

اس نے کھڑکی کے پاس آکر اس کے دونوں پٹ کھول دیے۔ پھر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

کوئی نہیں تھا لیکن وہ سامنے ایک بڑے سے پتھری طرف دیکھ کر چونک گیا۔ اس پتھر کے اوپر اس کا بیگ کھلا ہوا لٹا رکھا تھا اور ان میں سے بڑے نوٹوں کی گڈیاں باہر نکل کر بکھری ہوئی تھیں۔

وہ شدید حیرانی سے چیخ پڑا۔ ”رحمی! ہمارے لاکھوں روپے... ادھر آ...“

رحمی دوڑتا ہوا آیا۔ پھر دونوں ہی اپنی لٹی ہوئی دولت کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر تڑپ گئے۔ رحمی نے کہا۔ ”یہ میرا بیگ ہے۔ یہ گاڑی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ یہاں کیسے آیا؟“

وہ دروازے کے پاس آکر اسے دھکا دے کر کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”نوٹوں کی گڈیاں

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے ویسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کستوری عنبر زعفران سے ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لحاظ کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگوا لیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(ویسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

ماروی

چاچا نے سرگھما کر پیچھے ماروی اور چاچی کو دیکھا۔ وہ تینوں پریشان ہو گئے تھے۔ چلے گئے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں روپے پیسے کا لاپٹی نہیں ہوں۔ ماں قسم دس لاکھ روپے کے لیے کسی کو فون نہیں کروں گا۔ ان تینوں کو ذرا اطمینان ہوا۔ وہ بولا۔ ”آپ اتنی دور نہ جائیں۔ میرے گھر میں چھپ کر رہیں۔“

”آئیں...؟“ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ چاچی نے انکار میں سر ہلایا۔ چاچا نے کہا۔ ”تم بہت اچھے ہو۔ مگر ہم تم پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ وہاں ہم اپنے بھائی کے گھر جا رہے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”وہاں پہنچنے تک راستے میں نہ جانے کتنے لوگ ماروی کو دیکھ کر پیچھے پڑ جائیں گے۔“

”ہم راستے میں کہیں نہیں رکھیں گے۔“

”رکنا تو پڑے گا۔ راستے میں بیٹروں بھرا ہوگا۔ کسی دھابے کے سامنے رک کر کچھ کھانا پینا ہوگا اور اگر کہیں نہ بھی رُکے تو پولیس والے روکیں گے۔ وہ تو ماروی کو کھن کے بال کی طرح چنگی میں لے جائیں گے اور تم سب دیکھتے رہ جاؤ گے۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ آگے پولیس چوکیاں تھیں۔ انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ان سے بچ کر آگے نہیں جا سکیں گے۔ چاچی نے مجبور ہو کر پوچھا۔ ”تمہارے گھر میں اور کون ہے؟ ہم وہاں بیٹھ کر سوچیں گے۔“

”میرے بوڑھے ماں باپ ہیں۔ باپ بیمار رہتا ہے۔ ماں بیچاری گھر کے کام سے لگی رہتی ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”تمہارے گھر میں محلے بڑوس کی عورتیں آئیں گی تو میں ان سے پردہ نہیں کر سکوں گی۔ بھید کھل جائے گا کہ تمہارے گھر میں چھپی ہوئی ہوں۔“

”میں کسی کو گھر میں کھنے نہیں دوں گا۔ دکھ معصیت میں کوئی جھانکنے نہیں آتا۔ اب کوئی آئے گا تو دھکاردوں گا۔“

اس نے ایک دروازے کے سامنے گاڑی روک کر کہا۔ ”یہ میرا مکان ہے۔ آؤ۔ یہاں آرام سے رہو۔“

چاچی نے کہا۔ ”اے بیٹے اتم نے تو ہمیں سوچتے ہی نہیں دیا اور یہاں لے آئے۔“

”میں سوچتے کو منع نہیں کرتا۔ گھر میں آرام سے بیٹھ کر سوچیں۔ پھر تم جو ہوگی وہ کروں گا۔“

بے شک انہیں اطمینان اور سہولت سے بیٹھ کر سوچنا سمجھتا تھا۔ منہ چھپانے کے تمام راستے کمزور تھے۔ ابھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ دنیا والوں سے چھپ کر رہنے کے لیے کیا

وہاں سے سنی اور رتی جانے کے لیے بس سردی تھی لیکن آٹھ یا دس گھنٹوں کا سفر تھا۔ ماروی اتنی دیر تک مسافروں کے درمیان منہ چھپا کر نہیں رہ سکتی تھی۔ مجبوری تھی آگے بھی لوگوں سے چھپ کر سفر کرنا تھا۔ اسپتال کے باہر ٹیکسی اور آنر سٹے کھڑے تھے۔ چاچا نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ”میں بیمار ہوں۔ بس میں سفر نہیں کر سکوں گا۔ ہمیں رتی سے سوکو میٹر آگے جانا ہے۔“

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ ”اس ویرانے میں کون جاتا ہے۔ سنی سے آگے ایک بھی بیٹروں پس نہیں ہے۔ ایک بڑے کین میں بیٹروں لے جانا ہوگا۔ ٹیکسی بھی فل کرائی ہوگی۔“

چاچا چاچی راضی ہو گئے۔ ڈرائیور ان کا سامان اٹھانے اسپتال کے کمرے میں آیا۔ ماروی عمارت میں لیکن کمرے میں نقاب الٹ کر گئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی شگ کیا۔

نقاب نہ بھی اٹھتی چہرہ چھپا رہتا۔ تب بھی دیکھنے کے لیے آنکھیں تو بے پردہ رہتی ہیں۔ اور وہ آنکھیں ایسی تھیں کہ پہلی نظر میں سمجھ لیتی تھیں۔ کوئی عاشق مزاج ہو یا نہ ہو۔ ایک بار دیکھنے کے بعد یاد رہ جاتی تھیں۔

ڈرائیور نے اخبار کے صفحہ پر اور ٹی وی اسکرین پر چاند سا چہرہ تو دیکھا ہی تھا۔ وہ دس لاکھ روپے دینے والی آنکھیں بھی دیکھی تھیں۔ وہ بھلایا دیکھے نہ رہیں۔

وہ سامان اٹھا کر سوچتا ہوا۔ ٹیکسی کے پاس آیا۔ اسے ڈکی میں رکھنے لگا۔ یہ تو اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ نصیب کی لائری کھلے گی اور وہ کہیں ملے گی تو اسے فوراً چادر میں چھپالے گا۔ اس پر کسی کی نظر نہیں پڑنے دے گا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ وہ پہلے ہی نقاب میں چھپی ہوئی تھی۔

ماروی چاچی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چاچا آگلی سیٹ پر آگیا۔ ڈرائیور نے کار اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام جلال احمد ہے۔ مگر سب میرے کو جلا کہتے ہیں۔ سچ کہتا ہوں کسی سے جلتا نہیں ہوں۔ مگر یہ نام پڑ گیا ہے۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

چاچا نے کہا۔ ”میرا نام بھی بہت اچھا تھا۔ مگر کچھ ہوا گیا۔ سب مجھے جھمرو چاچا کہتے ہیں۔“

چلے گئے۔ چاچا نے سوال کیا۔ ”آپ لوگ چھپنے کے لیے اتنی دور کیوں جا رہے ہیں؟“

”کیا...؟“ وہ تینوں چونک گئے۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے ماروی کو پہچان لیا ہے۔ ٹی وی اور اخبار میں یہی نام لکھا ہوا ہے۔“

تھا۔ میں محبوب صاحب سے دور رہنے کے لیے مراد سے دور ہو گئی۔ پھر بھی بات نہیں بن رہی ہے اور بگڑتی جا رہی ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”یہاں لوگ میری صورت دیکھتے ہی لاکھوں روپے کے لیے مجھ پر جھپٹ پڑیں گے۔“

”تیرا چاچا اسپتال میں پڑا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے چھوڑ کر مجھے کہاں چھپانے لے جاؤں؟“

”میں جہاں چھپنے جاؤں گی وہاں میری تصویر مجھ سے پہلے پہنچی ہوگی۔ محبوب صاحب اپنی دولت سے کھیلنا خوب جانتے ہیں۔ لیکن میری محبت میں جب بھی اچھا کرتے ہیں تو برائی ہوتی ہے۔ ان کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی؟ یہ نہیں سوچا کہ انعام حاصل کرنے والے مجھے تماشا بنا دیں گے۔“

چاچی نے اخبار کو پھینکتے ہوئے کہا۔ ”چوبے میں جائیں انعام پانے والے۔ تم اپنی بات کرو۔ جلدی فیصلہ کرو۔ ہمیں یہاں سے بھی بھاگنا ہوگا۔“

وہ دونوں سوچنے لگیں۔ ماروی نے کہا۔ ”ہمیں ایسی جگہ جانا ہوگا جہاں نہ ٹی وی ہو نہ کوئی اخبار پڑھتا ہو۔“

”گاؤں دیہات والے ان پڑھ ہوتے ہیں۔ اخبار نہیں پڑھتے مگر ٹی وی تو ہر جگہ پہنچ گیا ہے۔“

”نہیں چاچی...! اب بھی ایسے گاؤں دیہات ہیں جہاں بجلی کی روشنی نہیں ہے۔“

ہم سنی اور رتی سے آگے جائیں گے۔ وہاں بجلی کی روشنی نہیں ہے اور نہ کوئی اخبار ادھر آتا ہے۔“

ماروی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چاچا کی طبیعت ذرا سنبھل گئی ہے۔ ہم ڈاکٹر سے دوائیں لے کر انہیں ابھی اسپتال سے لے جائیں گے۔ چلو۔ یہاں سے نکلو۔“

اس نے عمارت پر چڑھ کر نقاب میں چھپا لیا۔ پھر وہ دونوں اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر ہوٹل کا بل ادا کر کے اسپتال پہنچ گئیں۔ اس نے جاچا سے پوچھا۔ ”اب کیسی طبیعت ہے؟“

اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”بس ٹھیک ہے۔ بڑھاپے میں بیماریوں کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔“

نتی نے پوچھا۔ ”ہمیں یہاں سے بھاگنا ہوگا۔ کیا ٹرین یا ٹیکسی میں سفر کر سکو گے؟“

اس نے پوچھا۔ ”کیا محبوب صاحب ادھر آ رہے ہیں؟“

”سمجھو آ رہے ہیں۔ تم اپنی بات کرو؟“

”طبیعت کبھی بگڑتی ہے کبھی سنبھلتی ہے۔ ہمیں ماروی کو چھپا کر رکھنا ہے۔ یہاں سے بھاگنا ہی ہے تو ٹرین اور ٹیکسی کیا میں پیدل بھی دوڑتا جاؤں گا۔“

دو ٹلی کیفیات سے گزرنے لگی ہوں۔ محبوب نے مجھے جیت لیا ہے۔ وہ بھی اہم ہو گیا ہے۔ میرے دل کے ترازو میں دونوں عاشقوں کا پلڑا برابر ہو رہا ہے۔“

جلال نے کہا۔ ”پھر تو میں کہتا ہوں۔ وہ دولت لٹانے والا گولی کھانے والا تمہاری خاطر موت سے لڑنے والا سچا عاشق ہے۔ مراد تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس نے تمہارے لیے نہ کچھ کیا ہے نہ کرے گا۔ جیل میں پڑا ہے۔ یا تو اسے پھانسی ہوگی یا عمر قید ہوگی وہ بھی باہر نہیں آسکے گا۔“

وہ تڑپ کر بولی۔ ”میرے مراد کے بارے میں ایسا نہ کہو۔ وہ میری خاطر زلیخا کو نہ ٹھکراتا تو آج جیل میں نہ ہوتا۔ ابھی وہ ایک بے بس قیدی ہے۔ اگر آزاد ہوتا میری عزت کا محافظ بن کر ساتھ رہتا۔ پھر محبوب کی طرح وہ بھی میرے لیے گولیاں کھاتا اور جان کی بازیاں لگا دیتا۔“

مراد کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اسے ایک بار جیل کی سلاخوں سے باہر نکلنے کا موقع مل جائے تو وہ آگ اور بارود سے کھیلنا ہوا مجھ تک پہنچے گا۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”تم اُسے بھی چاہتی ہو۔ اسے بھی چاہتی ہو۔ محبوب تمہیں چاہتا ہے اور مراد کو رقیب نہیں سمجھتا اور مراد بھی محبوب پر اعتماد کرتا ہے۔ وہ جیل میں رہ کر دیکھ رہا ہے کہ تم محبوب کے رحم و کرم پر ہو۔ تم تینوں کس طرح کا عشق کر رہے ہو۔ یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔“

”تم دس لاکھ کے لالچ سے باز آ جاؤ۔ مجھے بہن کہا ہے تو بہن کے کام آؤ۔ پھر معلوم ہوگا کہ بے لوث محبت کیسے کی جاتی ہے اور ہم تینوں کس طرح کی غرض اور لالچ کے بغیر ایک دوسرے پر اعتماد کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے پیار کر رہے ہیں۔“

ماں کی قسم کھانے والے بھائی...! عشق سمجھایا نہیں جاتا۔ اپنے بہترین اعمال سے سمجھایا جاتا ہے۔“

”تم بہت اچھی ہو۔ اچھی باتیں کر رہی ہو اور وہ تم سے محبت کرنے والے دونوں عاشق بھی خوب ہیں۔ لیکن میں بہت غریب ہوں کمزور ہوں۔ یہاں بیٹھے بٹھائے آسانی سے دس لاکھ مل رہے ہیں۔ میں انہیں ٹھکرانے کا حوصلہ نہیں کروں گا۔ فی الحال تمہارا فون میرے پاس رہے گا۔ تم انعام دینے والوں سے بات نہیں کرو گی۔ میں اپنے فون سے بات کروں گا۔“

”میرا فون واپس کرو۔ میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔“

”پہلے بات کر لوں۔ انعام کی رقم مجھے مل جائے پھر اسے واپس کر دوں گا۔ تم میری شرافت کو مجھو میں نے تمہیں

مجھے ہر طرح کا عیش و آرام پہنچاتا رہا تھا۔“

وہ بولا۔ ”اس پر خدا کی رحمت ہو۔“

”وہ بھی میرا عاشق ہے۔ مراد کا رقیب ہے۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”اس پر خدا کی مار ہو۔ وہ جنہیں حاصل کرنے کے لیے دولت لٹا رہا ہے۔“

”کیا کیا جائے۔ انسان اپنی ضرورت سے بھی مجبور ہوتا ہے۔ کچھ لینے کے لیے ہی کچھ دیتا رہتا ہے۔“

”سب ہی خود غرض نہیں ہوتے۔“

”ہوتے ہیں۔ تم خود کو دیکھو۔ بھائی بننے کا اور میری مصیبتوں میں کام آنے کا دعویٰ کر رہے ہو لیکن اس کے عوض دس لاکھ روپے حاصل کرنا چاہتے ہو۔“

وہ جھینپ گیا۔ پھر بولا۔ ”میں اس کی طرح دو تہند نہیں ہوں۔ غریب نیکی ڈرا تیر ہوں۔ کیا تم نہیں چاہو گی کہ ایک غریب بھائی کا ایک مکان ہو جائے اس کے پاس ایک اور نیکی ہو جائے۔“

”پھر تو اس دو تہند کو بھی یہ چاہنا چاہیے کہ اس کے لاکھوں روپے کے احسانات کے عوض میں مراد کی محبت اسے دوں۔ مراد کو چھوڑ کر اس کی ہوجاؤں۔ جبکہ وہ فرشتہ ہے۔ ایسا نہیں چاہتا۔“

وہ خیالوں میں محبوب کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ مراد کو رقیب نہیں سمجھتا ہے۔ اگر سمجھتا تو اس کا مقدمہ نہ لیتا۔ مراد جیل کی چار دیواری میں ہے۔ یہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس غریب کو میری نظروں میں کتر بنا کر مجھے حاصل کر لیتا۔ میں اس کے احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہوں۔ راضی نہ ہونے کے باوجود مجھے اس کی مشکوہ بننا پڑتا۔“

جلال نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ کون ہے؟ جو تمہارا عاشق بھی ہے اور مراد کا رقیب بھی نہیں ہے۔“

”وہ ایک بہت بڑا بزنس میں محبوب علی چانڈیو ہے۔ اس نے مجھے اغوا سے اور ہلاکت سے بچانے کے لیے دشمنوں سے مقابلہ کیا ہے۔ میری خاطر گولی کھائی ہے۔ میں نے اس کو لائے کو صرف میری خاطر موت سے لڑتے دیکھا ہے۔“

وہ اس کے بہترین اعمال سے متاثر ہو کر کہہ رہی تھی۔ ”اس کے احسانات اس کی قربانیاں جب بھی یاد آتی ہیں۔ میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ میں سحر زدہ سی ہو جاتی ہوں۔ اس محبت کرنے والے فرشتے کی منگی میں آ جاتی ہوں۔“

پھر وہ دل ہی دل میں بولی۔ ”ہائے میں کیا کروں اب

چاہا جانے کہا۔“ ابھی تم نے کہا تھا روپے بیسے کے لالچ نہیں ہو۔ دس لاکھ روپے کے لیے کسی کو فون نہیں گرو گے۔“

”ایسا نہ کہتا تو تم لوگ میرے گھر نہ آتے۔“

وہ تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے گئے۔ ماروی نے کہا۔ ”تم بہن بھی کہہ رہے ہو اور دھوکا بھی دے رہے ہو۔“

”اگر بھائی مان لو تو یہ دھوکا نہیں ہوگا۔ ایک۔ لیکن اسے بھائی کی غرضی دور کرے گی۔“

”اور تم بھائی بن کر دس لاکھ لے کر بہن کو ان مصیبتوں میں پہنچاؤ گے، جہاں سے یہ بھاگ کر آئی ہے۔“

اس نے ماروی کو سنجیدگی سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”تم کیسی مصیبتوں سے بھاگ کر آئی ہو؟ تم کون ہو؟ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ مجھے اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ۔ جب میں نے کہہ دیا ہے کہ بھائی ہوں تو پھر یہ بھائی تمہاری مصیبتیں ضرور دور کرے گا۔“

اس کی باتوں سے سنجیدگی اور سچائی جھلک رہی تھی۔ ماروی تھوڑی دیر تک چپ رہی پھر بولی۔ ”میری مصیبت یہ ہے کہ مجھ سے جو بھی محبت کرتا ہے وہ مجھے مصیبت میں ڈالتا ہے اور خود بھی مصیبتیں جھیلنا رہتا ہے۔“

مراد میرے بچپن کی محبت ہے۔ ہم جوان ہوئے تو اس کی زندگی میں ایک حویلی کی شہزادی آئی۔ مراد کو اس کی قربت بھی ملتی اور لاکھوں روپے بھی ملتے۔ لیکن اس نے میری خاطر اسے ٹھکرادیا۔“

جلال احمہ نے کہا۔ ”داشا باں! تمہارا مراد چا عاشق ہے۔“

وہ بولی۔ ”اگر وہ اسے نہ ٹھکراتا تو اس کے ساتھ فرار ہو کر عیش و عشرت کی زندگی گزارتا۔ یا کم از کم کہیں آزادی سے گھر بنا پھرنا رہا۔ لیکن میری محبت بہت تھمی پڑ رہی ہے۔ اسے گلے سے جموئے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ خدا ہی بچائے والا ہے۔ دشمن اسے پھاسی پر چڑھانے والے ہیں۔“

جلال نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”یا خدا...! یہ تو ایسی مصیبت ہے کہ قانونی محکموں سے اور دولت سے بھی دور ہو سکتی ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”ایک دو تہند اسے دور کرنے کی پوری کوششیں کر رہا ہے۔ مقدمہ کے سلسلے میں لاکھوں روپے خرچ کر رہا ہے اور لاکھوں خرچ کرنے والا ہے۔“

وہ بولا۔ ”ہماری دنیا میں ایسے سچی داستان بہت کم ہیں۔“

”ایک وڈیرا میری عزت کا دشمن ہے۔ وہ دو تہند مجھے اس عالم کے خلاف تحفظ دیتا آ رہا ہے۔ اس نے مجھے عزت آبرو سے رہنے کے لیے ایک کوئی دی تھی۔ وہ فرشتہ

کرتا ہے؟

انہوں نے گھر میں آکر چلنے کے ماں باپ سے ملاقات کی۔ پھر چاچی نے ایک الگ کمرے میں آکر وہاں آرام سے بیٹھ کر ماروی سے کہا۔ ”معروف صاحب نے ایک طرف تو ہمیں یہاں تک دوڑایا ہے۔ دوسری طرف تمہارا اشتہار لگا کر ہمارے لیے مصیبت کر دی ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”سمیرا نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے جانے کے بعد محبوب صاحب کی تسلی کے لیے مجھے ڈھونڈا جائے گا۔ اگر میں اخبار اور ٹی وی میں اپنی کوئی خبر پڑھوں اور تصویریں دیکھوں تو ہرگز واپس نہ آؤں۔“

”وہ لوگ بڑھے کسے عقل والے ہیں۔ کیا اتنی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ دس لاکھ کا انعام رکھا جائے گا تو ساری دنیا ہمارے پیچھے پڑ جائے گی؟“

”چاچی اہم نے انہیں نہیں دلایا تھا کہ جس دیرانے میں رہنے جا رہے ہیں۔ ادھر کوئی ہمیں ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔“

چاچا نے کہا۔ ”ہم نے جیسا کہا۔ ویسا ہی انہوں نے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ان کی بات چھوڑو، اپنی سوچو، ہمیں کیا کرتا ہے؟“

ماروی نے اپنے فون کا سوچ آف رکھا تھا۔ اسے آن کرتے ہوئے بولی۔ ”میں سمیرا سے بات کرتی ہوں۔ وہ دوسرا اشتہار لگا نہیں گے کہ ماروی کو تلاش نہ کیا جائے۔ دس لاکھ روپے کا انعام ختم کر دیا گیا ہے۔“

جلال احمد عرف جلا وہاں بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ماروی سے کہا۔ ”بہن! ایسا ظلم نہ کرو۔ غریب کا فائدہ ہونے دو۔ تم واپس جانا نہیں چاہتیں نہ جاؤ۔ یہاں ساری زندگی اپنے بھائی کے ساتھ رہو۔“

وہ ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا تم وہاں سے یہاں چھپنے کیوں آئی ہو؟ تمہاری جو بھی پریشانی ہے۔ ماں قسم اسے یہ بھائی دور کرے گا۔“

”کوئی میری پریشانیاں دور نہیں کر سکے گا۔ جنہوں نے دس لاکھ کا انعام رکھا ہے۔ وہ بھی پریشان ہیں۔“

اس نے نمبر سچ کر کے فون کو کان سے لگایا۔ چلے نے ایک دم سے آگے بڑھ کر فون کو اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اسے بند کر دیا۔ چاچی نے غصہ سے کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں بیٹا اور بھائی بن کر بول رہا ہوں تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟ اب بھی کہتا ہوں۔ مجھے اپنا بتانا لو اور دس لاکھ روپے حاصل کرنے دو۔ عقل کی بات سمجھاتا ہوں۔ کسی کو خبر نہ ہو اور یہ کام چپ چاپ ہو جانے دو تو اچھا ہے۔“

یہاں لاکر چوروں، بد معاشوں اور لالچی انسانوں سے تحفظ دیا ہے۔ باہر کسی نے نہیں دیکھ لیا تو ایک نہیں ہزاروں تم پر جھپٹ پڑیں گے۔ تم کس کس سے جان چھڑاؤ گی۔ عزت آبرو سے بھی جاؤ گی۔“

وہ اپنے طور پر درست کہہ رہا تھا۔ ماروی نے سوچا۔ اسے سمیرا اور معروف سے باتیں کرنے دے۔ پھر سمیرا خود ہی جلال عرف جلتے سے کہے گی کہ ماروی سے باتیں کرنے کے بعد اسے رقم دی جائے گی۔ تب ہی وہ مجبور ہو کر ان سے بات کرانے کے لیے فون واپس کر دے گا۔

وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ تم ان سے باتیں کرو۔“ اس نے ماروی کا فون اپنی جیب میں رکھا پھر اپنا فون نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اخبار میں ان لوگوں کا نمبر پڑھتے ہی اپنے فون میں لکھ لیا تھا۔ یہ۔ یہاں ہے۔“ اس نے مبن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف ریکارڈنگ کی آواز نے اسے مایوس کیا۔ ماروی نے کہا۔ ”میرا فون مجھے دو۔ ابھی بات ہو جائے گی۔“ وہ مجبور ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ مگر پہلے میں بات کروں گا۔“

”منطور ہے۔ تم ہی پہلے بات کرو گے۔“ اس نے جیب سے فون نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو۔ کوئی چالاکی نہ دکھانا۔ میں بھائی بن کر تمہیں سلامتی دے رہا ہوں۔ مجھے بھائی ہی بن کر رہنے دو۔“ وہ فون لے کر نمبر شیخ کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے سامنے ہی بول رہی ہوں۔ سنتے رہو۔“

رابطہ ہوتے ہی سمیرا کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو ماروی! تم نے اپنا فون کیوں بند رکھا تھا۔ میں کئی بار کال کر چکی ہوں۔“

وہ بولی۔ ”میں نے سوچا تھا۔ کوئی خاص ضرورت ہوگی تو فون کھولوں گی ورنہ اسے چھپا کر رکھوں گی۔ راستے میں کہیں کالنگ ٹون بجتے لگے تو فون چھیننے والے آجاتے ہیں۔“

جلال عرف جلا فون سے کان لگا کر سن رہا تھا۔ سمیرا کہہ رہی تھی۔ ”تم نے سنا ہوگا اور پڑھا ہوگا اور تم جانتی ہو کہ ہم سچ سچ تمہیں تلاش نہیں کر رہے ہیں۔ محبوب صاحب کو یقین دلا رہے ہیں کہ تم اغوا کی گئی ہو۔ کہیں تم ہو گئی ہو یا تمہیں ہلاک کر دیا گیا ہے۔ ہم نے ان کی تسلی کے لیے دس لاکھ روپے کا انعام رکھا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ ہم تمہاری واپسی چاہتے ہیں نہ کسی کو دس لاکھ دیں گے۔“ جلتے کا منہ حیرت اور مایوسی سے کھل گیا۔ ماروی نے

کہا۔ ”لیکن آپ لوگوں نے جس طرح انعام کا لالچ دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مجھ پر ممکنہ آ رہی ہیں۔ انعام کے لالچ میں لوگ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں اور میں عبا اور غائب میں چھپی رہتی ہوں۔ اس کے باوجود جلال احمد نامی ایک ٹیکسی ڈرائیور کی گرفت میں آ گئی ہوں۔ یہ میرے ذریعہ دس لاکھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو پہلے اس سے بات کرو۔“

ماروی نے فون جلتے کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولا۔ ”بی بی جی! یہ کیا ناک ہے؟ انعام دینے کے لیے جو فون نمبر بتایا گیا ہے۔ وہ تو بند رہتا ہے۔ وہاں سے کوئی بول نہیں ہے اور تم بول رہی ہو کہ سچ سچ دس لاکھ نہیں دیئے جائیں گے۔ یہ ناک صرف محبوب کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے کیا جا رہا ہے۔“

سمیرا نے کہا۔ ”تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ ماروی کو پریشان نہ کرو۔ اسے واپس یہاں لاؤ گے تو تمہیں کوئی رقم نہیں ملے گی۔“

وہ بولا۔ ”میں نے محبوب کی کہانی سنی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے جب انہیں معلوم ہوگا کہ ماروی کو نہ اغوا کیا گیا ہے نہ ہلاک کیا گیا ہے۔ یہ میرے پاس زندہ سلامت ہے۔ تب وہ دو تیند عاشق صاحب مجھے دس لاکھ ضرور دیں گے۔“

یہ ایسی بات تھی کہ ادھر سمیرا کو ادھر ماروی کو چپ لگ گئی۔ وہ بول رہا تھا۔ ”سنو۔ اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے میں کیا کروں گا؟ خطرہ مول لے کر ماروی کو کراچی لانا چاہوں گا تو اسے ڈھونڈنے والے راستے میں پہچان لیں گے اور پولیس والے بھی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جائیں گے۔“ ادھر ماروی ادھر سمیرا اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ جلتے کچھ بول نہیں پا رہی تھیں۔ وہ سمیرا سے کہہ رہا تھا۔ ”میدم...! انعام حاصل کرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچے گی۔ ان میں دس لاکھ روپے تقسیم کیے جائیں گے تو ہر ایک کو شاید ایک ایک پیسہ ملے گا۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ کچھ تو میرے پاس بھی عقل ہے۔ میں یہ کروں گا کہ تمہارا ناک محبوب کو معلوم ہو جائے گا۔ میں بتاؤں گا کہ جس ماروی کو چھپایا جا رہا ہے۔ وہ میرے پاس ہے۔“

وہ دونوں پریشان ہو گئیں۔ فون پر ٹھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر سمیرا نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ”جلال احمد! تم نہیں جانتے ماروی بہت مظلوم ہے۔ اس کے دونوں عاشق بھی انجانے میں اس پر ظلم کر رہے ہیں۔ وہ اپنے پیار کی سچائی سے اس کے لیے مسائل پیدا کر رہے

ہیں۔ کیا ایسے وقت ہم اور تم اس غریب لڑکی کے ساتھ ٹکی نہیں کر سکتے؟“

وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ فون پر بول رہی تھی۔ ”ہم چاہتے ہیں ماروی بچپن سے مراد کی ہے مراد کی ہی رہے۔ محبوب صاحب سے اتنی دور ہو جائے کہ انہیں اس کی موت کا یقین ہو جائے۔ تب انہیں رفتہ رفتہ صبر آ جائے گا۔ یہ اپنی کاروباری دنیا میں واپس آ جائیں گے اور آج نہیں تو کل ماروی کو ایک دن اس کا مراد مل جائے گا۔“

جلال احمد! تم غریب ٹیکسی ڈرائیور ہو۔ ہم تمہیں خالی ہاتھ نہیں رہنے دیں گے۔ کچھ نہ کچھ انعام ضرور دیں گے۔ تم خدا کے واسطے ماروی سے ٹکی کرو۔“

اس نے پوچھا۔ ”مجھے کیا ملے گا؟ میں غریب آدمی ہوں۔ نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے کچھ تو ملنا چاہیے۔“ ”اگر تم ماروی کو اس کی منزل تک پہنچا دو گے تو ہم تمہیں ایک لاکھ روپے دیں گے۔“

اس کے چہرے سے ایک ذرا اطمینان ظاہر ہوا۔ وہ بولا۔ ”میں پولیس اور لالچی لوگوں کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کسی جھیلے کے بغیر ایک لاکھ مل جائیں تو خدا کا شکر ادا کروں گا۔“

”تو پھر ماروی جہاں چاہتی ہے وہاں اسے پہنچا دو۔“ ”جس دن یہاں مجھے ایک لاکھ ملیں گے۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس کے گھر کے دروازے تک اسے پہنچا دوں گا۔“

ماروی بھی فون سے کان لگا کر باتیں سن رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ”وہاں سے ایک لاکھ یہاں کون پہنچائے گا؟ کیا بینک یا ڈاک خانے کے ذریعہ رقم آئے گی؟ میں نہیں چاہتا کہ بینک والوں کو یا ڈاک خانے والوں کو معلوم ہو کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اتنی بڑی رقم مل رہی ہے۔ پھر آپ بتائیں یہ رقم مجھے کب اور کیسے ملے گی؟“

ماروی نے کہا۔ ”سمیرا...! یہ رقم میں ابھی یہاں ادا کروں گی۔ تم دوسرا مسئلہ حل کرو۔“ ”وہ دوسرا مسئلہ کیا ہے؟“

”سفر کے دوران پولیس چوکیاں آئیں گی۔ وہ تلاشیں لیتے ہیں۔ مجھے بھی بے غائب دیکھنا چاہیں گے۔ پھر مجھے دیکھ کر دس لاکھ حاصل کرنا چاہیں گے۔ ان سے کیسے نمٹا جائے گا؟“

سمیرا نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ تم وہاں سے چلو۔ جب بھی کسی پولیس چوکی میں روکا جائے گا۔ وہ پولیس والے اشتہار

میں دیئے ہوئے نمبر پر ہم سے رابطہ کریں گے۔ ہم انہیں جواب دیں گے کہ اب تم کشیدہ نہیں ہو۔ ہماری مرضی کے مطابق اپنے گھر جا رہی ہو۔ جس کسی نے ماروی کو تلاش کر کے ہمارے پاس پہنچایا تھا۔ ہم اسے انعام دے چکے ہیں۔“

ماروی نے کہا۔ ”ہاں اب میں کسی رکاوٹ کے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جاؤں گی۔ سمیرا...! تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔“

سمیرا سے رابطہ ختم ہو گیا۔ جلال عرف جلا ماروی کو بے چینی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ ابھی تم نے یہاں ایک لاکھ دینے کی بات کی ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہاں کی ہے۔ تو پھر...؟“ ”یہ۔ اتنی بڑی رقم۔ یہاں... تمہارے پاس ہے؟“ چاچی نے کہا۔ ”ہمارا سامان گاڑی میں رکھو۔ کمرے سے باہر جاؤ۔ واپس آؤ گے تو رقم مل جائے گی۔“

”میں تم لوگوں کو کھلائے پلائے بغیر یہاں سے نہیں لے جاؤں گا۔ راستے میں کھانے پینے کا اور ضرورت کا جو سامان ہے۔ ابھی یہاں سے خرید لیں گے۔ چاچا جھرو میرے ساتھ بازار چلو۔“

وہ چاچا کے ساتھ چلا گیا۔ ماروی اپنی اپنی کھولتے ہوئے بولی۔ ”میں ان میں سے ایک لاکھ جلال کو دیدوں گی۔ تم نے باقی بڑی تدبیر سے اپنے پاس محفوظ رکھے ہیں انہیں وہیں رہنے دو۔“

انہوں نے یہی کیا۔ وہ چاچا کے ساتھ ضروری سامان سفر لے کر آیا تو اسے ایک لاکھ دیدے۔ اس نے خوش ہو کر دعا مانگی دیں۔ اپنے ماں باپ کو وہ رقم دے کر اسے چھپا کر رکھنے کی تاکید کی۔ پھر وہ سب مطمئن ہو کر آرام سے بیٹھ کر روٹیاں کھانے لگے۔

لیکن ان کے نصیب میں اطمینان نہیں تھا۔ کھانے کے دوران میں باہر والے دروازے پر دستک سنائی دی۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے پوچھا۔ ”کون آیا ہوگا؟“

جلتے نے کہا۔ ”گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں نے اتان سے کہہ دیا ہے۔ وہ کسی کو اندر نہیں آنے دیں گی۔ کوئی لاث صاحب بھی ہوگا تو اسے باہر ہی سے ٹال دیں گی۔“

وہ سر جھکا کر کھانے لگے۔ ٹھوڑی دیر بعد اس کی ماں نے آکر کہا۔ ”پڑوین آئی تھی۔ اس کے پیچھے دو آدمی کھڑے تھے۔ پوچھ رہی تھی ہمارے گھر میں کہاں سے مہمان آئے ہیں؟ میں نے کہا۔ سکھر سے آئے ہیں۔ وہ اندر آنا چاہتی

تھی۔ میں نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا کہ مہمان ابھی روٹی کھا رہے ہیں۔“

پھر وہ چلے سے بولی۔ ”بیٹے! ابھی تو میں نے ٹال دیا ہے۔ لیکن وہ پھر آئے گی۔ اس کے ساتھ ابھی دو بندے تھے۔ ان کی تعداد بڑھ سکتی ہے۔“

چلے نے سر ہلا کر کہا۔ ”بات پھیل رہی ہوگی۔ ابھی دو آئے تھے۔ بعد میں دوسو بھی چلے آئیں گے۔“

ان کا کھانا حرام ہو گیا۔ وہ کھانے سے اٹھ گئے۔ پانی کا گھونٹ بھی حلق سے اتارنا نہیں جا رہا تھا۔ ایسی پریشانی کے وقت کوئی تدبیر ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ چلے نے ماں سے کہا۔ ”پھر جا کر دیکھو۔ وہ باہر ہیں یا چپکے ہیں؟“

وہ بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ اس نے کھڑکی کے پردے کو زوراً ہٹا کر دیکھا۔ پردوں میں نہیں تھی۔ لیکن اب وہاں تین افراد نظر آ رہے تھے۔

ماں نے واپس آ کر کہا۔ ”ایک آدمی اور بڑھ گیا ہے۔ اب تو چلے کی عورتیں بھی بھیڑ لگا گئیں گی۔“

لاٹھوں روپے حاصل کرنے والوں کی تعداد بڑھتی رہنے والی تھی۔ ماروی عبا اپنے کھڑکی چلے نے کہا۔ ”اناں! میں چاچی اور چاچا کے ساتھ سامان لے کر سامنے کے دروازے سے نکلوں گا۔ تم ایسے وقت ماروی کو بچھلے دروازے سے لے جاؤ۔“

ماں نے کہا۔ ”میں پیچھے جا کر دیکھ لوں۔ کوئی نہیں ہوگا تو ابھی اسے یہاں سے لے جاؤں گی۔“

وہ وہاں سے گئی پھر ایک منٹ میں آ کر بولی۔ ”کوئی نہیں ہے بھیڑ سامنے لگ رہی ہے۔ ماروی! فوراً میرے ساتھ آؤ۔“

بیٹے نے کہا۔ ”اناں! اہم مسجد دیار حبیب کے سامنے انتظار کریں گے۔ تم سے پہلے وہاں پہنچیں گے۔“

چلے سامان اٹھا کر چاچا چاچی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس وقت تک چلے کی کئی عورتیں اور مرد وہاں آ گئے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاچی اور چاچا کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں عبا میں چھپنے والی اور اخباروں میں چھپنے والی نظر نہیں آ رہی تھی۔

چلے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے جا رہا تھا۔ ایک عورت نے پوچھا۔ ”ایک اور نقاب میں تھی۔ وہ کہاں ہے؟“

”وہ بیمار ہو گئی ہے۔ کچھ روز ہمارے گھر میں رہے گی۔ میں ان بزرگوں کو ٹیکشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔“

واپسی میں ڈاکٹر کو لے کر آؤں گا۔ خدا کے لیے اس بیمار کو پریشان نہ کرنا۔ جب ڈاکٹر اجازت دے۔ تب اسے ہی بھر کے دیکھ لیتا۔“

یہ کہہ کر وہ ٹیکسی آگے بڑھا کر تیز رفتاری سے دور لپٹا چلا گیا۔ چلے کی ذہانت نے بڑا کام دکھایا۔ پیچھا کرنے والوں سے آخر پیچھا چھوٹ ہی گیا۔

اس نے مسجد دیار حبیب کے سامنے ڈرائیو کر انتظار کیا۔ ماروی چلے کی ماں کے ساتھ خیریت سے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے اس کی ماں کا شکریہ ادا کیا پھر وہاں سے آگے چل پڑے۔ انسان پریشانیوں کے دہانے میں نہ آئے۔ حوصلے اور ذہانت سے کام لے تو بڑی بڑی مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔

بہر حال بڑی الجھنوں کے بعد معاملہ سلجھ گیا تھا۔ آگے کوئی رکاوٹ پیش آتی تو اس سے بھی منہ کی تدبیر سوچ لی گئی تھی۔

ماروی آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچ رہی تھی۔ خیالوں میں محبوب تھا۔ اس نے نیکی اور شرافت سے پیار کی انتہا کر دی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ اس پر دولت لٹا رہا تھا اور وہ اس سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اس کی طلب میں خون بھی بہا رہا تھا۔ موت سے لڑ رہا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں اربوں روپے کے بزنس کو بھی خاک میں ملا رہا تھا۔

اور عشق کیسے کیا جاتا ہے؟

اور کتنے احسانات رہ گئے ہیں کرنے کے لیے؟

اور کتنی قربانیاں رہ گئی ہیں دینے کے لیے؟

وہ دیوانہ بانی جان لیوا آزمائشوں سے بھی گزرنے والا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی جو اس کی لاعلمی میں وہ دیوانہ کر رہا تھا۔ اس کی تلاش میں وہ اپنی کوششیں جا بجا داور سمندر پار تک پھیلا ہوا کاروبار چھوڑ کر کم ہو گیا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ سمیرا معروف تجلی جیسے ڈھونڈ کر ہلکان ہو رہے ہیں وہ ایسی جگہ ہے جہاں دنیا کا کوئی خزانہ جاسوس بھی پہنچ نہیں پائے گا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ محبوب نے اسے تلاش کرنے کے لیے مراد کو جیل سے باہر کر دیا ہے اور سزائے موت تک پہنچنے کے لیے خود اس کی جگہ قیدی بن گیا ہے۔

یہ تو عشق اور قربانیوں کی انتہا تھی۔ ماروی کو اتنی بڑی قربانی کا علم ہوتا تو وہ تڑپ کر رہ جاتی۔

وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ محبوب نے قیدی بننے کے

لیے مراد کو بے خبر رکھا ہے۔ وہ بے چارہ بھی نہیں جانتا ہے کہ دم بدم احسانات کرنے والا سامیں اس کی جگہ کبھی کیا ہے۔

اور مراد کیا تھا؟

وہ بھی عشق کے امتحان میں محبوب سے پیچھے نہیں تھا۔ اسے پہلے سے بتایا جاتا کہ محبوب اس کی جگہ سزا کاٹنے جیل میں آئے گا تو وہ ہرگز ایسا نہ ہونے دیتا۔ وہ تو اپنی ماروی کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے مرینہ کی باتوں میں آ کر جیل سے نکل آیا تھا۔

یہ ماروی کی بد نصیبی تھی کہ وہ مراد کے حالات سے بے خبر تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے پیار میں اس کی تلاش میں ایک گدھا گاڑی والا منہ زور گھڑسوار اور دو دھاری تلواریں ہو گیا ہے۔ بارود سے کھیلنے والا بدوق بردار بن گیا ہے۔ اور گولیاں برساتا ہوا لاشیں گراتا ہوا اس کی طرف چلا آ رہا ہے۔

اری ماروی! تو کچھ نہیں جانتی! ایک تیری خاطر مرنے کے لیے اندر گیا ہے۔ دوسرا مرنے مارنے کی خاطر باہر آ گیا ہے اور باہر آ کر شہ زور دینا جا رہا ہے۔

ٹیکسی کی رفتار سست ہونے لگی۔ پولیس چوکی کا سپاہی ہاتھ اٹھا کر رکتے کا اشارہ کر رہا تھا۔ جلال گاڑی کو روک کر باہر آیا۔ وہاں تین سپاہی تھے۔ ان کا افسر لکڑی کے کین کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ میز پر دہلی شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

اس نے بوتل کو منہ سے لگا کر دو گھونٹ پینے کے بعد سپاہی سے کہا۔ ”جا کے دیکھ۔ کوئی دینے دلانے والی سواری ہے کہ نہیں؟“

ایک سپاہی نے ٹیکسی کے پاس سے چچ کر کہا۔ ”سر! ایک آدمی اور دو عورتیں ہیں۔ ان کے پاس کھانے پینے اڑھنے کا سامان ہے اور کچھ نہیں ہے۔“

وہ کرسی سے اٹھ کر مستی میں ذرا تن کر زریں لب بڑ بڑایا۔ ”سالا بولتا ہے۔ عورتیں ہیں۔ یہ نہیں بولتا کہ بوڑھی ہیں یا جوان؟“

وہ بوتل ہاتھ میں پکڑے لڑکھڑاتا ہوا پچھلی سیٹ کے پاس آیا۔ پھر جھک کر کھڑکی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ایک پردے میں ہے۔ ایک پردے سے باہر۔“

پھر وہ ایک سپاہی کی طرف ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”اسے سیدو...! وہ پردے والا گانا کیا ہے؟“

سپاہی نے کہا۔ ”پردے میں رہنے دو۔ پردہ نہ اٹھاؤ، پردہ جواٹھ گیا تو بھید کھیل جائے گا۔“

افسر نے ڈانٹ کر کہا۔ ”اے اگلو کار کی اولاد! سز

جلال نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا۔ ”حضور! ہم جائیں؟“
وہ کھانستے کھانستے ڈنگاتے ہوئے اسے دھکا دے
کر بولا۔ ”یہ تو وہ ہے۔۔۔۔۔“

وہ ہاتھ تپا کر بولا۔ ”ارے وہ ہے یہ تو۔۔۔۔۔“
صبح یہاں سے ایک گاڑی والا گزرا تھا۔ اس کے
پاس اخبار تھا اور اخبار میں اس کی تصویر تھی۔ ارے۔۔۔ اس
کے پیچھے تو دس لاکھ روپے کا انعام ہے۔“
جلال نے کہا۔ ”جی ہاں۔ انعام حاصل کرنے کے
لیے فون نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔“

”ہاں میرے پاس کاغذ نہیں تھا۔ میں نے بوتل کے
لیبل پر وہ نمبر لکھا تھا۔“

پھر اس نے چونک کر نیچے قدموں کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔ ”یہ۔ یہ بوتل تو ٹوٹ گئی۔۔۔۔۔“

وہ جلدی سے جھک کر بوتل کے ٹکڑے اٹھا کر جوڑنے
لگا۔ جلال نے کہا۔ ”وہ نمبر میرے پاس ہیں لیکن اب بیکار
ہو گئے ہیں۔ یہ اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گئی ہے۔ انعام
دینے والے ماں باپ اس کے ساتھ بیٹھے ہیں۔“

وہ کھڑکی سے جھانک کر چاچا اور چاچی کو آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”یہ تو غریب غریب سے لگتے
ہیں۔ کیا یہ کسی کو دس لاکھ روپے انعام دے سکتے ہیں؟“

چاچی نے کہا۔ ”دینے کی ضرورت ہی نہیں
پڑی۔ بیٹی خود ہی ہمارے پاس آگئی ہے۔“

”میں کیسے یقین کروں؟“

جلال نے کہا۔ ”میرے پاس انعام دینے والوں کا
نمبر ہے۔ ان سے بات کر کے پوچھ لو۔“

وہ اپنا فون نکال کر بولا۔ ”نمبر بتاؤ۔“

جلال نے ماروی کے نمبر نوٹ کرائے۔ ادھر ماروی
نے چپ چاپ اپنا فون چاچی کی طرف بڑھا دیا۔ اس

شرابی نے ٹیکسی سے ذرا دور جا کر نمبر سچ کیے۔ رابطہ ہونے پر
چاچی نے ذرا رعب دار آواز میں کہا۔ ”ہیلو کون ہے؟“

وہ بولا۔ ”میں دیران چوکی کا پولیس افسر آپ کو خوش
خبری سنارہا ہوں۔ وہ جو آپ کی دس لاکھ روپے والی لڑکی
ہے اسے ابھی ابھی اپنی چوکی میں پکڑا ہے۔ اسے جانے
نہیں دوں گا۔ آپ پولیس دس لاکھ ادھر لے کے
آئیں گے۔ یا میں لڑکی کو ادھر لے کے آؤں؟“

چاچی نے کہا۔ ”افسر صاحب! جس لڑکی کو آپ نے
پکڑا ہے وہ میرے پاس ہے اور میں اس کے ساتھ آپ کی
چوکی میں ٹیکسی کے اندر بیٹھی ہوں۔“

چوکی میں ٹیکسی کے اندر بیٹھی ہوں۔“

چوکی میں ٹیکسی کے اندر بیٹھی ہوں۔“

اس نے اچھل کر پلٹ کر دیکھا۔ پھر دوڑتا ہوا کسی
کے پاس آیا۔ چاچی نے کہا۔ ”آپ کو یقین نہیں آئے گا تو
ہمارے ساتھ بڑے افسروں کے سامنے چل کر ماننا پڑے
گا کہ آپ خواجواہ ہمیں پریشان کرتے رہے ہیں۔“

”نہیں۔ میں پریشان تو نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو
چیک کر رہا ہوں۔ میں۔ میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔“

اس نے حسرت سے ماروی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ
کیا ہوا۔۔۔؟ تم خود ہی ادھر پہنچ گئیں۔ میری بوتل ٹوٹ گئی
ہے۔ میں نے ٹھوڑی سی پی ٹی تھی۔ میرے نقصان کا کچھ خیال
کر دو۔ دس لاکھ نہ سہی۔ دس بوتلیں تو مل جائیں پھر میں نہیں
روکوں گا۔ قسم سے کہتا ہوں پھر نہیں روکوں گا۔“

جلال نے چاچا سے کہا۔ ”انہیں پانچ سو دے دیں۔“

افسر نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا۔ ”پانچ سو سے کیا ہوگا۔ یہ میرے تین تین بچے بھی ہیں۔“

چاچا نے جیب سے ایک ہزار روپے نکال کر دیے۔
وہ خوش ہو کر بولا۔ ”شکریہ۔ اے ڈرائیور! انہیں آرام سے
لے جاؤ۔“

جلال نے فوراً ہی سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی پھر
اسے تیز رفتاری سے بڑھاتا ہوا وہاں سے دور ہوتا چلا
گیا۔ افسر ہزار کے نوٹ کو اور جانے والی گاڑی کو دیکھ کر سوچ
رہا تھا۔ ”الدار اسامی ہے۔ بیٹی خود ان کے پاس آگئی۔ کسی
کو انعام نہیں دیتا پڑا۔ ان کے دس لاکھ روپے پہنچ گئے۔“

کیوں پہنچ گئے؟

مال تجوری میں محفوظ ہے۔

کیوں محفوظ ہے؟

تجوری اس کے پاس ہے۔ مال ہمارے پاس ہونا چاہیے۔

ایک سپاہی نے کہا۔ ”سراوہ تو جا چکے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟“

وہ بولا۔ ”جانے کے بعد ہی تو ہوگا۔ مال ہمارے
نصیب میں ہے۔ ہمارے پاس ہی آئے گا۔“

اس نے فون پر نمبر سچ کیے۔ رابطہ ہونے پر ایک
بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ ”سلام صاحب! حکم کریں۔“

وہ بولا۔ ”سر باز! ایک گٹری اسامی ہے۔ ایک کھتے
کے اندر تمہارے علاقے سے گزرنے والی ہے۔“

”کیا ان کے پاس نقد رقم یا سونا چاندی ہے؟“

”نہیں۔ وہ نادان نہیں ہیں۔ اس ویران علاقے میں
سفر کر رہے ہیں۔ نہ نقد رقم رکھیں گے نہ سونا چاندی لے جائیں
گے لیکن ہم ان سے لاکھوں روپے وصول کر سکیں گے۔“

”کیسے کریں گے؟“

”کیسے کریں گے؟“

”ٹیکسی میں بوڑھے ماں باپ ہیں اور ان کی جوان بیٹی ہے۔ بیٹی کو پکڑ کر چھپا دو۔ ان کے ماں باپ کو جانے دو۔ ان سے بولو چپ چاپ دس لاکھ لاکھ روپے کے تو بیٹی ملے گی۔ اگر چالاکی دکھائیں گے۔ اگر پولیس کی یا دوسرے بد معاشوں کی مدد سے حملہ کریں گے تو بیٹی زندہ نہیں ملے گی۔“

سر باز اس علاقہ کا ایک خطرناک ڈاکو تھا۔ اس کے ساتھی جدید اسلحہ سے لیس رہتے تھے۔ اس علاقے میں پولیس برائے نام تھی۔ سپاہیوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ وہ نہ تو ان سے لڑتے تھے نہ بھی واردات سے انہیں روکتے تھے۔ اپنے کان پکڑتے تھے اور ان ڈاکوؤں سے سمجھوتا کر کے اپنی بیوی بچوں کے لیے زندہ رہتے تھے۔ سپاہی کبھی بے چارے نہیں ہوتے مگر ہو گئے تھے۔ اب وہ چور سپاہی دس لاکھ روپے انعام کے ذریعہ نہیں اغوا برائے تاوان کے ذریعہ حاصل کرنے والے تھے۔

☆☆☆

انہوں نے ایک بڑا سا گڑھا کھود کر دونوں کی لاشیں اس میں پھینک دی تھیں پھر اس گڑھے کو بند کر دیا تھا۔ جہاں جہاں لہو کے دھبے تھے انہیں دھو ڈالا تھا۔ مراد ایک گھوڑا لے گیا تھا۔ دوسرا کھونٹے سے بندھا ہوا تھا۔ اس گھوڑے کو آزاد کر کے اسے ہانک دیا تھا۔ وہ آزاد ہوتے ہی ہنہاتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

اب وہاں آنے والوں کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ تین اجنبی ادھر آئے تھے۔ ان کے درمیان گولیاں چلی تھیں۔ دو مارے گئے تھے اور ایک زندہ واپس چلا گیا تھا۔

وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ وہ امن و امان سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے مسئلہ نہیں بنتے تھے۔ اس راستے سے گزرنے والے ڈاکو اور اسمگلر ان کا سکون برباد کرتے رہتے تھے۔ پولیس والے کبھی کبھی آتے تھے لیکن انہوں نے کبھی کسی کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ وہ بے چارے نہیں جانتے تھے کہ ابھی ان پر ایک اور آفت آنے والی تھی اور اس آفت کا نام مرینہ تھا۔

خفہ دار سینٹرل جیل کے جیلر نے اپنے دو سپاہیوں کے ذریعہ پیٹروں کے دو بڑے کین بھیج دیے تھے۔ اس کی گاڑی کی منگی فل ہو گئی تھی اور ایک فاضل کین بعد میں کام آ سکتا تھا۔

گاڑی میں جان پڑتے ہی وہ اس سمت چل پڑی جدھر مراد ڈاکوؤں کی گاڑی میں گیا تھا۔ وہ تقریباً دو گھنٹے بعد اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ یار دلدار

دشمن جاں کتنی دور نکل گیا ہوگا۔ لیکن اس پولیس والی کی تربیت کا تقاضا تھا کہ دنیا کے آخری سرے تک اپنے شکار کا پیچھا کرتے رہو۔ ہاتھ سے نکلنے والے کین نہ کہیں ہاتھ آتی جاتے ہیں۔

وہ اپنی تربیت اور تجربات کے مطابق درست تھی۔ آگے جا کر بیچ سڑک پر وہ گاڑی دکھائی دی۔ اس نے قریب آ کر دیکھا تو اگلی سیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اسے ڈرائیو کرنے والا سیٹ پر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پولی کی طرف سے لہو میں بھیجا ہوا تھا۔

مرینہ کے ایک تابعدار نے کہا۔ ”ہم تاریکی میں دیکھ نہیں پائے تھے۔ مراد شاید اسی گاڑی میں فرار ہوا تھا۔“ وہ بولی۔ ”یہی میں سوچ رہی ہوں۔ وہ گاڑی چلانا نہیں جانتا ہے۔ اس نے وہاں چار ڈاکوؤں کو ہلاک کیا۔ پھر ایک کو زخمی کر کے اس سے گاڑی ڈرائیو کراتا ہوا یہاں تک آیا۔ زخمی یہاں پہنچے پہنچے مر گیا۔ وہ مجبور ہو کر پھر پیدل بھاگ رہا ہے۔“

دوسرے تابعدار نے کہا۔ ”وہ پھر پیدل ہو گیا ہے تو ہم آگے جا کر اسے پکڑ لیں گے۔“

وہ تینوں مرینہ کے ساتھ تیزی سے آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اسے ڈرائیو کرتے ہوئے آگے جانے لگے۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ”مائی گاڈ! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بیچارہ سا اور بیوقوف سا نظر آنے والا ایسا تیز طرار چنگیز بن جائے گا۔“

ایک تابعدار نے کہا۔ ”اس نے کل رات بندوق پکڑی۔ آدھے گھنٹے تک گولیاں چلانا سیکھیں اور اتنا زبردست شوٹر بن گیا ہے کہ پانچ ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔“

دوسرے تابعدار نے کہا۔ ”بندہ بہت خطرناک اور ضدی ہے۔ کل شام سے ہمیں دوڑا رہا ہے۔ جھٹکا نہیں جانتا۔ ماروی کے پیچھے بھاگتا جا رہا ہے۔“

تیسرے تابعدار نے کہا۔ ”یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم سے سامنا ہو گا تو وہ ہتھیار نہیں پھینکے گا۔ جم کے مقابلہ کرے گا۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ اسے ہلاک نہ کرنا۔ صرف زخمی کرنا۔ میں اسے اپناج بنا کر اپنے قدموں میں رکھوں گی۔ اب وہ میرے کھوے چائا کرے گا۔“

تیسرے تابعدار نے کہا۔ ”وہ ہمیں گولی مارے گا تو کیا ہم اس پر گولی نہ چلائیں۔“

”گولی ضرور چلاؤ۔ مگر اسے زندہ رہنا چاہیے۔ اگر تم

ماروی

میں سے کسی نے اسے ہلاک کیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی اور کوئی مجھے دھوکا دے کر واپس جانا چاہے گا تو میرے پاپا اسے کتے کی موت ماریں گے۔“

وہ تینوں چپ رہے۔ دلاور جان جیسے جلا دھڑلے کی بیٹی سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیو کر رہا تھا۔ دو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تینوں نے عقب نما آئینے میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ دل میں کہا۔ ”ہماری جان کیا مفت کی ہے؟ کوئی ہمیں مار ڈالے اور ہم اسے نہ ماریں۔“ ایک نے دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ”مراد نشانے پر آئے گا تو بچ کر نہیں جائے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اور یہ لندن زاوی ہمیں ہلاک کرنا چاہے گی تو کیا ہم اسے چھوڑ دیں گے؟“

گاڑی اس بستی میں آ کر رک گئی جہاں سے مراد گزر کر گیا تھا۔ سڑک کے کنارے والا ہوٹل کھل گیا تھا۔ سونے والے بیدار ہو گئے تھے۔ سب اپنے اپنے کام سے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ مرینہ نے ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔ ”یہاں پچھلی رات ایک ہٹا کتا جواں آیا تھا وہ کہاں ہے؟“

دھابے کے مالک نے کہا۔ ”میں تو اپنے گھر جا کر سو جاتا ہوں۔ ادھر کوئی آیا ہو گا تو میں نے نہیں دیکھا۔“

وہ تینوں تابعدار بھی وہاں کے محلوں اور گلیوں میں پوچھتے پھر رہے تھے۔ سب انکار کر رہے تھے۔ اگر کوئی آیا ہو گا تو رات کی تاریکی میں چپ چاپ ادھر سے گزر گیا ہوگا۔

مرینہ سمجھ رہی تھی کہ مراد کبھی ایک جگہ نہیں ٹھہرے گا۔ ماروی کی تلاش میں بھاگتا بھٹکتا رہے گا۔ وہ چاروں اسے ڈھونڈتے ہوئے ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ وہ اچانک ایک مکان کے سامنے رک گئے۔

مرینہ کی جاسوس نظروں نے اس مکان کے پچھلے دروازے اور دیواروں پر پلٹس کے نشانات دیکھے۔ ایک اناڑی شوٹر سے جتنے نشانات خطا ہوئے تھے وہ سب وہاں نشان چھوڑ گئے تھے۔ پھر وہاں ضائع ہونے والے پلٹس بھی پائے گئے۔

ان چاروں نے دو چار ہوائی فائر کیے تو بستی والے ہم گئے۔ مرینہ کے حکم سے تابعداروں نے ان سب کو نشانے پر رکھا پھر وہ بولی۔ ”وہ یہاں ہے۔ فوراً بتاؤ اسے کہاں چھپا ہوا ہے؟“

وہ قسمیں کھانے لگے کہ اسے نہ چھپایا گیا ہے نہ وہ چھپ کر رہنے والا تھا۔ وہ بہت ہی خطرناک بندہ تھا۔ دو

ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کے ایک گھوڑے پر اس طرف گیا ہے۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر بتایا کہ کس سمت گیا ہے۔ مرینہ نے پوچھا۔ ”کتنی دیر ہوئی ہے؟“

”کوئی ایک گھنٹا ہو رہا ہے۔“

وہ چاروں فوراً ہی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اسی سمت چل پڑے۔ راستے میں مرینہ بڑبڑا رہی تھی۔ ”یہ وہ سیدھا سادا گدھے گاڑی والا نہیں ہے جسے میں جیل سے نکال کر لائی ہوں۔ میں شاید دھوکا کھا گئی ہوں۔ کسی بہت ہی ماہر اور شاطر چھپے ہوئے فائر کو لے آئی ہوں۔“

وہ دور کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ غضب کا شوٹر ہے۔ اس نے بستی میں بھی دو ڈاکوؤں کو مار ڈالا۔ ایک رات میں سات مرڈار کیے ہیں وہ بھی جہاں لڑتے ہوئے... اد گاڈ...! آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں ہو رہا ہے۔“

وہ بڑی حیرت سے بڑے جذبے سے سوچ رہی تھی۔ اتنی متاثر ہو رہی تھی کہ اس کی طرف کھینچی جا رہی تھی۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے ایسے ہی غضب ناک لائف پارٹر کی ضرورت تھی۔ وہ اس کے حواس پر حاوی ہو گیا تھا۔

اس نے ڈرائیو کرنے والے کو اور پیچھے بیٹھے والے تابعداروں کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”اس سے سامنا ہو تو گولی نہ چلانا۔“

ان تینوں نے پھر عقب نما آئینے میں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھا۔ وہ حکم دے کر چپ ہو گئی تھی۔ ایک نے پوچھا۔ ”اگر اس نے گولیاں چلائیں تو؟“

”میں چلانے نہیں دوں گی۔ اس کے سامنے آ جاؤں گی۔ اس کے سامنے ہتھیار پھینک دوں گی۔ تب وہ نہیں لڑے گا اور مجھ سے دور نہیں بھاگے گا۔“

ایک نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ ”اس سے اچھی بات کیا ہوگی؟ آپ نے بڑی دانشمندی سے یہ فیصلہ کیا ہے۔“

وہ اپنے دل میں بولی۔ ”کیا کروں؟ میں ہتھیار ڈالنے والی عورت نہیں ہوں۔ لیکن وہ اسی طرح قابو میں آئے گا۔“

گاڑی کی محدود فضا میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار ایسی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ابھی اس کے پاس پہنچنے ہی والی ہو۔

پھر وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”کتنی دیر ہو گئی ہے۔ کوئی انسانی آبادی، کوئی کچا پکا مکان دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“

ایک نے کہا۔ ”یہ بلوچستان کا بہت ہی ویران پہاڑی علاقہ ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”وہ پچھلی رات سے بھاگ رہا ہے۔ آخر انسان ہے۔ بھوکا ہوگا۔ سونا چاہتا ہوگا۔ آگے کسی انسانی آبادی میں پہنچا ہوگا۔ تم رفتار اور بڑھاؤ۔“

رفتار اور بڑھ گئی۔ لیکن آگے جا کر سست پڑ گئی۔ آگے راستہ دوستوں میں جا رہا تھا۔ ڈرائیو کرنے والے نے پوچھا۔ ”میڈم...! اب کدھر چلیں؟“

وہ الجھ گئی۔ بڑبڑانے لگی۔ ”وہ کدھر گیا ہوگا؟“

وہ گاڑی سے اتر کر بولی۔ ”باہر آؤ۔ گھوڑا اپنے پیروں کے نشانات چھوڑتا گیا ہوگا۔ ہم اسی سمت جائیں گے۔“

وہ گاڑی سے اتر کر دونوں راستوں پر دوڑ تک جا کر نشانات تلاش کرنے لگے اور مایوس ہونے لگے۔ حیرانی کی بات تھی کہ وہ گھوڑے پر وہاں سے نہیں گزرا تھا۔

وہ دوڑ تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ یہاں تک آنے سے پہلے ہی سڑک چھوڑ کر ادھر میدانی پہاڑی ناہوار راستوں سے گیا ہوگا۔ گھوڑا اسے ہر طرح کے شیب و فراز سے لے جا رہا ہوگا۔“

وہ پریشان ہو کر دوڑ تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں کہاں جا رہا ہوگا۔ ہمیں کس سمت جانا چاہیے۔“

وہ سب بڑی طرح الجھ گئے تھے۔ دو طرفہ راستوں کو دیکھ رہے تھے کہ کس سمت جائیں؟

الجھتے رہنے میں وقت ضائع ہو رہا تھا۔ آخر وہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ کہیں تو جانا تھا۔ وہ ایک راستے پر چل پڑے۔

پچھلی سیٹوں پر دونوں تابعدار سو گئے۔ وہ پچھلے میں گھنٹوں سے جاگ رہے تھے۔ کہیں کھانے پینے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ جس بستی سے مراد گھوڑا لے کر گیا تھا۔ وہاں پیٹ بھرا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ مراد کے پیچھے پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے بھی کچھ کھایا تھا نہ تابعداروں کو کھانے دیا تھا۔ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

سورج سر پر آ گیا تھا۔ انہوں نے ایک بستی میں پہنچ کر اچھی طرح کھایا پیا۔ دھابے کے مالک سے پوچھا۔ ”کیا ادھر سے کوئی گھوڑا گزرا ہے؟“

دھابے کے مالک نے کہا۔ ”ہاں۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ایک گھڑا جوان آیا تھا۔ اس نے ایک گلاس پانی پیا پھر سکی جانے کا راستہ پوچھا اور چلا گیا۔“

مرینہ نے پوچھا۔ ”سکی کس طرف ہے؟“

اس نے کہا۔ ”یہاں سے شمال کی طرف ہے۔ یہ

سڑک یہاں سے رحمت پور جاتی ہے۔ وہاں سے ریل گاڑی گزرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک پکی سڑک بھی سکی کی طرف دیتی ہے۔“

ڈرائیو کرنے والے نے کہا۔ ”میڈم! ہمیں کم از کم دو گھنٹے کی نیند لینے دیں۔“

وہ بولی۔ ”ہم اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ وہ ماروی کی تلاش میں اسی طرف جائے گا۔ مجھے تو نیند نہیں آئے گی۔ میں گاڑی چلاؤں گی تم تینوں سوتے ہوئے چلو۔“

وہ پھر گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں سے آگے جانے لگے۔ مراد اس کے دماغ میں سلگ رہا تھا۔ وہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ سو نہیں سکتی تھی۔ جب تک وہ نہ ملتا اس کی آنکھیں بھی ربتیں۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی چار دیواری نظر آئی۔ اس کے چاروں طرف کپڑے کی رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ دو اونچے لال پیلے جھنڈے بھی لہرا رہے تھے۔ وہ کسی بزرگ کا حصار تھا۔ ایک بوڑھا ہاتھ میں جھنڈی لے کر بیچ سڑک پر کھڑا ہو گیا تھا اور گاڑی کو روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

مرینہ نے گاڑی کو روک کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

وہ بوڑھا کسی پیر و مرشد کا نام بتا کر کہنے لگا۔ ”سیا مہی بزرگ دین کا حصار ہے۔ یہاں نذرانہ دو۔ دعا لیں ماکھو کو من کی مراد پوری ہوتی ہے۔ بھئی! تیری مراد بھی پوری ہوگی۔“

مرینہ کو دینی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ وہ دعا اور نذرانوں کو بھلا کیا مانتی۔ لیکن اس بوڑھے نے مراد کا نام لیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ من کی مراد پوری ہوگی۔ وہ اسے ضرور ملے گا۔

اس نے فوراً ہی بیگ میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پیر کے پاس جانے کا نام نہیں ہے۔ ان سے کہنا مراد کو میرے پاس پہنچا دیں۔ وہ مجھے ملے گا تو یہاں آؤں گی اور ہزاروں روپے دوں گی۔“

وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس بوڑھے کی باتوں نے اس کے اندر جوش اور جذبے کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آگے جا کر مراد کو پا لے گی۔

کوئی دل میں گھس جائے تو اسی طرح پاگل کر دیتا ہے۔ وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتی ہوئی رحمت پور پہنچ گئی۔ وہ تینوں سو رہے تھے۔ انہیں جگا کر کہا۔ ”مراد یہاں

ہوگا۔ ہمیں تیس گھنٹوں سے دوڑا رہا ہے۔ یہاں کسی ہوٹل میں نیند پوری کر رہا ہوگا۔ چلو ہر چھوٹے بڑے ہوٹل میں گھس کر دیکھو۔“

انہوں نے ایک بازار میں گاڑی کو پارک کیا پھر دروازے کھول کر باہر آ گئے۔ وہاں دوڑ تک کئی ہوٹل تھے۔ وہاں جا کر اسے تلاش کرنے لگے۔ مراد کا حلیہ بتا کر کہنے لگے کہ جو اسے ابھی ہمارے سامنے لائے گا۔ اسے دس ہزار روپے انعام دیں گے۔

انعام کے لالچ میں کئی لوگ مراد کا حلیہ ذہن میں رکھ کر اسے ڈھونڈنے لگے۔ تھانیدار کو معلوم ہوا تو اس نے ایک کھناراجیپ میں آ کر مرینہ کو دیکھا پھر بڑے رعب اور دبدبے سے پوچھا۔ ”کون ہو تم...؟ کسے تلاش کرتی پھر رہی ہو؟ یہ مراد کون ہے؟“

وہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”اسے کیوں ڈھونڈ رہی ہو؟ جانتی ہو میں یہاں کا تھانے دار ہوں۔ تمہیں پہلے میرے پاس آنا چاہیے تھا۔“

مرینہ نے اسے حقارت سے دیکھا۔ ایک طرف تھوکا۔ پھر اپنا آئی ڈی کارڈ دکھایا تو اس نے فوراً الارٹ ہو کر سیلیوٹ کیا۔ وہ بولی۔ ”ڈھول کے پول ہو۔ صرف اوپر سے بچتے رہتے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”سوری میڈم...! آپ حکم کریں۔“

اس نے پوچھا۔ ”تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے۔ جس نے گرے کھر کی شلوار زیب تن کی ہے۔ اس کا قد چھوٹ سے ایک آدھ انچ زیادہ ہوگا۔ بہت صحت مند ہے۔ باڈی بلڈر دکھائی دیتا ہے۔“

تھانیدار نے کہا۔ ”شاید وہ ادھر آیا تھا لیکن ہماری نظروں میں نہیں آیا۔ ہمارے دو سپاہی ریلوے اسٹیشن کے پیچھے سے ایک گھوڑے کی لگام پکڑ کر لائے تھے کہہ رہے تھے۔ اس گھوڑے کا کوئی مالک نہیں ہے۔“

مرینہ نے پورے یقین سے کہا۔ ”وہی ہوگا۔ اس نے گھوڑے کو یہاں چھوڑ دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے اسے کوئی دوسری تیز رفتار گاڑی مل گئی ہے۔“

تھانیدار نے کہا۔ ”ایک ٹرین دس بجے ادھر سے سنی اور خوش کی طرف جاتی ہے۔“

وہ اچھل پڑی۔ اسے آگے اور کچھ نہیں سننا تھا۔ اپنی گاڑی کی طرف دوڑتے ہوئے تابعداروں سے بولی۔ ”وہ ٹرین میں سنی کی طرف گیا ہے۔ بس مل گیا سمجھو۔“

وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ اس قدر جوش میں تھی کہ تابعداروں کے جاگنے کے باوجود خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ آندھی طوفان کی رفتار سے آڑی جا رہی تھی۔ وہ تینوں پریشان تھے۔ نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ بیزار ہو رہے تھے۔

ایک نے کہا۔ ”میڈم! پلیز اسپید کم کریں۔“

اس نے جھڑک دیا۔ ”میوٹ اپ۔ میں اتنا ڈی نہیں ہوں۔ وہ دس بجے کی ٹرین سے گیا ہے۔ ابھی دو بج رہے ہیں۔ وہ ہم سے چار گھنٹے آگے ہے۔ وہ سنی پہنچ کر ضرور کچھ کھانے پینے اور سونے کے لیے بڑھے گا۔“

وہ سڑک بھی ریلوے لائن کے ساتھ چلتی تھی۔ کبھی دور ہو جاتی تھی۔ پھر کئی کلومیٹر کے بعد ریل کی پٹریوں کی طرف چلی آتی تھی۔ ایک بار ان کی گاڑی پٹریوں سے بہت دور آ گئی۔ مرینہ نے کہا۔ ”وہ ریل لائن نظر نہیں آرہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ سڑک دوسری طرف جا رہی ہو؟“

ایک تابعدار نے کہا۔ ”نو میڈم...! تھانیدار نے کہا تھا۔ یہ سڑک بھی سنی کی طرف جاتی ہے۔“

آگے وہی ویران پہاڑی علاقہ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد انہوں نے دیکھا۔ آگے سڑک پر ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ چار گھڑ سوار اس ٹیکسی کے چاروں طرف بندوبست تانے ہوئے تھے۔

مرینہ نے گاڑی روک دی۔ وہ ان سے دور سڑک کے موڑ پر چھوٹے ٹیلے کے پیچھے تھی۔ لینڈ کروزر ان گھڑ سواروں کی نظروں میں نہیں آئی تھی۔

بندوبست کی زد میں آنے والے ٹیکسی کے دروازے کھول کر باہر آ رہے تھے۔ ایک دروازے سے جو باہر نکلا وہ عبا پہننے ہوئے تھی اور نقاب میں چھپی ہوئی تھی۔

مرینہ نے تابعداروں سے کہا۔ ”وہ ڈاکو ہیں۔ انہیں لوٹنے کے بعد ادھر سے گزریں گے اور ہمیں اسی راستے پر آگے جانا ہے۔ ان سے کراؤ لازمی ہوگا۔“

ایک نے کہا۔ ”ہاں۔ اور تو کوئی صورت نہیں ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہمیں آگے جا کر ریلوے ٹریک کے ساتھ سنی پہنچنا ہے۔ مورچے بناؤ۔“

انہوں نے لائٹ ریج کی رائفلیں سیٹوں کے نیچے سے نکال لیں۔ کارتوس کے تیلے اٹھا لیے پھر گاڑی سے نکل کر جھکتے ہوئے، چھپتے ہوئے ان سے قریب تر ہونے لگے۔ مرینہ ایک ٹیلے کے پیچھے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر پہنچ گئی۔ وہاں سے ان کی باتیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

تین ڈاکو گھوڑوں سے اتر گئے تھے۔ ان کا سردار گھوڑے پر بیٹھا کہہ رہا تھا۔ ”ہم اس لڑکی کو لے جا رہے

ہیں۔ اسے زندہ سلامت واپس چاہتے ہو تو دس لاکھ روپے لے آؤ۔ ہمیں بتاؤ۔ کتنی دیر میں رقم لاؤ گے۔ ہم اسی وقت لڑکی کو یہاں لے آئیں گے۔ پولیس کو یا اپنے بد معاشوں کو حملہ کرنے کے لیے لاؤ گے تو یہ تمہیں زندہ نہیں ملے گی۔“

مرینہ چاچی اور چاچا کو نہیں جانتی تھی۔ جسے پہچانتی تھی وہ خراب میں تھی۔ چاچی ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی۔ ”مجھے پکڑ کر رکھو۔ میری بیٹی یہاں سے جا کر دس لاکھ کا انتظام کر کے اس ڈرائیور کے ذریعہ ہم یہاں پہنچا دے گی۔“

سردار نے جتنے ہوئے کہا۔ ”ہم تیرے جیسی بڑھیا کو اپنے پاس رکھ کر کیا کریں گے؟ ہمیں رقم نہیں ملے گی تو جوان لڑکی کو بازار میں بیچ دیں گے۔ کچھ تو رقم مل جائے گی۔“

مرینہ کو ان کے معاملات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ آمدنی طوفان کی رفتار سے آئی تھی۔ آگے بھی اسی رفتار سے مراد تک پہنچنے کے لیے بے چین تھی اور وہ ڈاکو یار بن گئے تھے۔

اس نے رائفل سے سردار کا نشانہ لیا۔ وہ تو اسکاٹ لینڈ یارڈ کی تربیت یافتہ تھی۔ ٹریگر کے دباتے ہی گولی سیدھی سردار کی پیشانی پر لگی۔ فائرنگ کی گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ سردار گھوڑے کی پیٹھ سے الٹ گیا۔ پیچھے گر نہ سکا۔ اس کے پاؤں رکاب میں پھنسے ہوئے تھے۔ گھوڑا بدک کر اس کی لٹکتی ہوئی لاش کو لے کر بھاگنے لگا۔

تینوں ڈاکو اچانک حملے سے بوکھلا گئے۔ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگنے لگے۔ جوابی فائرنگ کرنے کے لیے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ گولی نے کہاں سے آ کر سردار کو شہید کیا ہے۔

ایسے وقت تابعداروں نے بھی فائرنگ کی۔ وہ بھاگنے والے بھی گولیاں کھا کر گرے اور گھوڑے ان کے بغیر بھاگتے چلے گئے۔ ان میں سے ایک ٹیکسی کے پیچھے ہی گرا تھا۔ بری طرح زخمی ہوا تھا۔ لیکن زندہ تھا۔

ایک ڈاکو کے بھاگتے وقت اس کا گھوڑا ماروی کے اتنے قریب سے گزرا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی تھی۔

مرینہ اور تابعدار اپنی لینڈ کروزر میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ اشارت ہو کر تیزی سے آگے بڑھی۔ لیکن ٹیکسی کے پاس سے گزرنے کے لیے رفتار ذراست کرنی پڑی وہاں چاچی اور چاچا زمین پر بیٹھے ہوئے ماروی کو سنبھال رہے تھے۔ اچھی طرح سانس لینے کے لیے اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب شاسائی ہوئی۔ مرینہ نے ادھر سے گزرتے ہوئے ایک نظر عبادی پر ڈالی تو ذہن کو جھٹکا سا

لگا۔ سو کن دکھائی دی تھی۔ وہ چیخ کر بولی۔ ”گاڑی روکو۔“ اس کے رکتے ہی وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر دوڑتی ہوئی آئی پھر ماروی کے پاس آ کر رک گئی۔ وہ زمین پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے قریب سے دیکھ کر یقین ہوا کہ ماروی ہی ہے تو وہ خوشی کے مارے قہقہے لگانے لگی۔

اس نے ایک ہی بار اسے جیل میں دیکھا تھا۔ جب وہ مراد سے ملاقات کرنے آئی تھی اور اسے دیکھ کر بڑی سنگدلی سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مراد سے اس کی وہ آخری ملاقات ہوگی۔ پھر بھی وہ اپنے عاشق سے ملنے نہیں پائے گی۔ اس فیصلے پر عمل کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ ابھی اسے گولی مار کر ایک بہت بڑی دیوار گرا سکتی تھی۔

ہاں کون اسے روک سکتا تھا؟

یہ وہی بد نصیب سو کن تھی۔ جس کی خاطر وہ کچھ رات اسے دھوکا دے کر فرار ہوا تھا۔

اور جس کی خاطر ٹھکرا کر گیا تھا وہ اس کے پیشے پر مبنی تھی۔

وہ مارے خوشی کے قہقہے لگا رہی تھی۔ قہقہوں کے دوران مست ہو کر ادھر سے ادھر ڈنگا رہی تھی۔ وہاں سب کے سب اسے حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بات پر پانچوں کی طرح ہنس رہی ہے۔

اس کے تابعداروں نے پہلے بھی ماروی کو نہیں دیکھا تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی ہے۔ جس کے خاطر مراد ان کی میڈم کو ٹھکرا کر گیا ہے تو وہ اس کی خوشیوں کو سمجھ لیتے کہ سو کن اس کے ہاتھوں مرنے آگئی ہے۔

ماروی حیران تھی۔ پریشان ہو کر سوچ رہی تھی کہ وہ کون ہے اور اسے دیکھ کر کیوں اس طرح ہنس رہی ہے؟

چاچی نے پوچھا۔ ”اے بیٹی! تم کون ہو؟ تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تم نے ڈاکوؤں سے ہمیں بچایا ہے۔“

ہمیں جانتی ہو؟ اس طرح کیوں ہنس رہی ہو؟“

وہ جتنے جتنے یکتخت چب ہو گئی۔ کوئی بات اچانک ہی ذہن میں آئی تھی۔ وہ ماروی کو سمجھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر اس کی نگاہوں سے سنجیدگی جھلکنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان سے دور جا کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ سر جھکا کر سوچنے لگی۔

چاچا نے ان تابعداروں سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے۔ ہماری بیٹی کو دیکھ کر کیوں ہنس رہی تھی۔ اب انکا نام سے چپ ہو گئی ہے۔ دور جا کر بیٹھ گئی ہے؟“

ایک تابعدار نے کہا۔ ”ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میڈم کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ لندن سے آئی ہیں۔ وہاں کی ایک بہت بڑی پولیس افسر ہیں اور یہاں کراچی کی جیل میں جو بڑے جیلر صاحب ہیں ان کی بیٹی ہیں۔“

کراچی جیل کی بات پر ماروی نے چونک کر اس تابعدار کو دیکھا۔ دل نے دھڑک دھڑک کر کہا۔ ”وہاں میرا مراد ہے۔“

چاچی نے ان سے کہا۔ ”ہمارا ہونے والا داماد وہاں جیل میں ہے۔ پچھارے پرل کا جھوٹا الزام ہے۔“

ان تابعداروں کو معلوم تھا کہ مراد پرل کا جھوٹا الزام ہے اور مرینہ اس پر عاشق ہو کر اسے جیل سے نکال لائی ہے۔ ایک تابعدار نے پوچھا۔ ”تمہارے داماد کا نام کیا ہے؟“

چاچا نے کہا۔ ”مراد۔۔۔“

ان تینوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے ماروی کو دیکھا سو چاچا پھر اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”کیا اس کا نام ماروی ہے؟“

چاچی نے کہا۔ ”ہاں۔ تم اس کا نام کیسے جانتے ہو؟“

وہ تینوں جواب میں بہت کچھ بول سکتے تھے۔ لیکن میڈم کا موڈ اور مزاج سمجھے بغیر کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ اس وقت اس کا موڈ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ پہلے تو خوش ہو رہی تھی۔ پھر سنجیدہ ہو کر دور جا کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ جو آمدنی طوفان کی رفتار سے مراد کو پکڑنے جا رہی تھی۔ وہ اچانک تھم گئی تھی۔ اب جلدی نہیں تھی۔ دماغ میں یہ بات آئی تھی کہ ماروی اس کی منشی میں رہے گی تو مراد خود ہی گنہگار آئے گا۔

وہ ان سب سے دور جا کر اس بات پر غور کر رہی تھی کہ ماروی کو مارو یا جائے یا زندہ رکھا جائے؟

وہ کئی پہلوؤں سے سوچ رہی تھی۔ ایک پہلو یہ تھا کہ اس کے زندہ رہنے سے مراد اسی کے پیچھے بھاگتا رہے گا۔ مجھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔

اگر مر جائے گی تو مراد کچھ دنوں کے بعد اسے بھول کر میری طرف مائل ہو جائے گا اور اگر اسے بھول نہیں پائے گا اور اگر اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں نے ماروی کو مار ڈالا ہے تو پھر بھی میرا یا نہیں بنے گا۔ میری جان کا دشمن بن جائے گا۔

اور اگر میں اسے زندہ رہنے دوں۔ اسے کہیں چھپا کر قیدی بنا کر صرف اس کی آواز مراد کو سنائی رہوں تو وہ ماروی کی سلامتی کے لیے ہمیشہ میرا غلام بنا رہے گا۔

اور میں یہی چاہتی ہوں کہ ایسا غضب ناک شہر ہو۔

مرد میرا غلام بن کر رہے۔

اور یہی مناسب ہے وہ اپنی معشوقہ کی سلامتی کی خاطر مجھ سے دور نہیں بھاگے گا۔ میں جو کہتی رہوں گی وہ کرتا رہے گا۔

اس نے سر اٹھا کر دور چاچی کے پاس کھڑی ہوئی ماروی کو دیکھا۔ پھر بڑی ناگواری سے کہا۔ ”بچ گئی۔ اسے زندہ رکھنا ہی ہوگا۔“

اس نے فون نکال کر جیلر باپ سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”ہیلو مائی ڈیر سوئیٹ پاپا!“

وہ بولا۔ ”بیٹی! کہاں ہو؟ کیا مراد کو پکڑ لیا ہے۔“

”سمجھیں کہ پکڑ لیا ہے۔ ماروی میرے ہاتھ آ گئی ہے۔ آئندہ یہ میرے کنبے میں رہے گی تو سمجھ لیں کہ وہ میرے قدموں میں لوٹا رہے گا۔“

”ہوں۔ پھر تو تم اس کے پیچھے نہیں بھاگو گی وہ تمہارے پیچھے ہاتھ باندھے آتا رہے گا۔“

”پاپا! آپ نے کہا تھا کہ کوئی وڈیرا آپ کا دوست ہے۔ ادھر کسی علاقے میں اس کی جیل ہے۔ وہاں درجنوں عورتیں اور مرد قید باشندے جھیلے رہتے ہیں۔“

”اچھا تو تم چاہتی ہو ماروی کو وہاں قیدی بنا کر رکھا جائے۔“

”ہیں پاپا۔۔۔!“

”نو پرائیم۔ میں وڈیرے سے بات کرتا ہوں۔ انتظار کرو۔ ابھی تمہیں کال کروں گا۔“

وہ فون بند کر کے انتظار کرنے لگی۔ ایک تابعدار نے آ کر کہا۔ ”میڈم۔۔۔! آپ جلد سے جلد مراد تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ کیا ہم چل رہے ہیں؟“

”نہیں۔ اب جلدی نہیں ہے۔ تم تینوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ماروی تک پہنچ گئی ہوں۔ وہ جو لڑکی وہاں عبا پہنے ہوئے ہے وہی وہی ماروی ہے۔“

”جی ہاں۔ ہم نے باتوں ہی باتوں میں معلوم کیا ہے۔“

اس نے چونک کر اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اسے مراد کے بارے میں بتایا ہے؟“

”نو میڈم۔ ہم انجان بن گئے ہیں۔“

”شاباش۔ جاؤ۔ میں ابھی ایک ضروری کال اینڈ کر کے آؤں گی۔ انہیں باتوں میں الجھائے رکھو۔“

وہ ماروی اور چاچی کی طرف چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد باپ نے فون پر کہا۔ ”وڈیرے سے بات ہو گئی ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ تم کیا چاہتی ہو۔ وہاں تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ وہ میرے بہترین دوستوں میں سے ہے۔“

”اس کا نام بتائیں؟“

”اس کا نام شاہ میاں ولی ہے۔ اپنے علاقہ کا بادشاہ ہے۔ سرکاری پولیس اس کی نمک خوار ہے۔ آج تک کسی بھی حکمران کے دور میں اس کی جیل میں چھاپا نہیں پڑا۔ وہاں ماروی تک مراد اور محبوب تو کیا قانون کے محافظ بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔“

”آپ اس کا پتا اور فون نمبر بتائیں۔ میں ابھی اس وڈیرے سے بات کروں گی۔“

باپ نے پتا اور فون نمبر بتایا۔ اس نے وڈیرہ شاہ میاں ولی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”اٹکل! میں دلاور جان کی بیٹی مرینہ بول رہی ہوں۔ ابھی پاپا نے آپ سے بات کی ہے۔“

”ہاں بیٹی! ابھی تمہارے باپ نے بتایا ہے۔ تم کوئی شکار پھانس کر لا رہی ہو اور وہ ایک بہت ہی خوبصورت جوان لڑکی ہے۔ میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ کب آرہی ہو؟“

”اس وقت میں سنی کے قریب ہوں۔ آپ بتائیں ابھی شام کے پانچ بجے ہیں۔ یہاں سے چلوں گی تو وہاں تک کتنے گھنٹوں میں پہنچ جاؤں گی۔ میرے پاس لینڈ کروزر ہے۔“

وہ بولا۔ ”اندازاً اُس گھنٹے کے اندر پہنچ جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آرہی ہوں۔“

اس نے رابطہ ختم کر کے دور ماروی کی طرف دیکھا پھر پتھر سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے سامنے آگئی۔ ماروی نے تینوں تابعداروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ان سے معلوم ہوا ہے کہ تم جیلر صاحب کی بیٹی ہو۔ اسی جیل میں میرا مراد سزا پارہا ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں۔ لیکن تم نہیں جانتیں کہ وہ جیل سے فرار ہو گیا تھا۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”نہیں۔ وہ جیل سے کیسے بھاگ سکے گا۔ وہ تو بہت ہی سیدھا سادا سا ایک غریب اور کمزور آدمی ہے۔“

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”ہاں وہ کتنا سیدھا اور کمزور ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ جیل میں چند بد معاش قیدی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔“

”یہ ہو سکتا ہے وہاں خطرناک مجرم ہوتے ہیں۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”وہ جیل سے بھاگنے کے بعد پولیس سے تو بچ گیا لیکن ایک وڈیرے کے ہتھے میں آ گیا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ آسمان سے گرا کجور میں اٹکا تو وہ اس وقت اس وڈیرے کی ایک جیل میں آرام فرما رہا ہے۔“

”وہ جیل کہاں ہے؟“

”یہاں سے پتا نہیں کتنی دور ہے۔ اس جگہ کا نام جام تھا رو ہے۔ میں مراد کو ڈھونڈنے یہاں تک آئی تھی۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ وہ جام تھا رو میں پکڑا گیا ہے۔ وہاں کے وڈیرے نے اسے اپنی جیل میں ڈال دیا ہے۔ میں وہاں جا رہی ہوں۔ اس سے ملنے کی کوشش کروں گی۔“

ماروی نے تڑپ کر کہا۔ ”میں بھی جاؤں گی۔ اللہ...! یہ میرے مراد کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ پہلے اسے جھوٹے الزام میں جیل بھیجا گیا۔ اب اسے زبردستی جیل سے بھاگ کر کسی وڈیرے کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔“

چاچی نے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ کیا مراد سے فون پر بات ہو سکتی ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”پہلے وڈیرے سے جا کر ملوں گی۔ وہ اپنے فون کے ذریعہ اس سے بات کرانے پر رضی ہوگا تو تم چاچی سنی اس سے باتیں کر سکو گی۔“

ماروی نے کہا۔ ”چاچی! ہمیں جانا ہوگا۔ نہیں تو میں اس کے لیے سوچ سوچ کے مرنی رہوں گی۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میری گاڑی میں بیٹھو اور چلو۔ ورنہ کروڑوں وہ چاچی کے ساتھ لینڈ کروزر میں آکر بیٹھ گئی۔ مرینہ نے تابعداروں سے کہا۔ ”تم میں سے ایک گاڑی ڈرائیو کرے گا۔ باقی ماروی کے چاچا کو لے کر اس جگہ میں ساتھ ساتھ چلو۔“

پھر اس نے جلال احمد سے کہا۔ ”ہمیں جہاں تک لے جاسکتے ہو۔ لے چلو۔ جو بھی معقول معاوضہ ہوگا۔ ہمیں ملے گا۔“

وہ قائلہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مرینہ ڈرائیو کرنے والے تابعدار کے ساتھ اگلی سیٹ پر تھی۔ پچھلی سیٹ پر ماروی اور چاچی تھیں۔ باقی افراد پیچھے کی سیٹ پر آ رہے تھے۔

☆☆☆

ابھی وہ سب گردش میں تھے۔ مراد بھی گردش سفر میں تھا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ سے اتر کر ٹرین میں سوار ہوا تھا اور سنی تک گیا تھا۔ وہاں سے بس یا رکشا جیسی میں ریتی کی طرف جانا تھا۔

اس نے سنی کے ایک ہوٹل میں پہنچ کر غسل کیا۔ پھر روٹی کھانے کے دوران ہوٹل کی کھڑکی سے باہر بازار کی رونق دیکھنے لگا۔ قریب ہی ایک آٹو پارٹس کی دکان میں مارو کی ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ ایک موٹر سائیکل پندرہ ہزار میں فروخت کی جا رہی تھی۔

ماروی

وہ لقمہ چباتے ہوئے سوچنے لگا۔ مجھے گاڑی کی سخت ضرورت ہے۔ اگرچہ میں چلا نہیں سکتا۔ لیکن موٹر سائیکل چلانا تو بہت آسان ہے۔ ایک دن میں سیکھ جاؤں گا۔

وہ فارسیل کی تختی کو دیکھ کر اپنے آپ سے بولا۔ ”اسے خرید لینا چاہیے؟ کوشش کروں گا تو سیکھ لوں گا۔ جب بدوقت چلانا سیکھ گیا ہوں تو اسے بھی چلانا آجائے گا۔“

وہ کھانے کے بعد آٹو پارٹس کی دکان میں آیا۔ وہاں ایک موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر بولا۔ ”اگر اس میں کوئی خرابی نہیں ہے تو ابھی خرید لوں گا۔“

دکاندار نے کہا۔ ”اے دن گاڑی ہے۔ صرف چھ مہینے چلائی ہے۔ بیسوں کی بہت ضرورت ہے اس لیے بیچ رہا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”خرید تو لوں گا۔ لیکن مجھے چلانا نہیں آتا ہے۔ کیا تمہارا کوئی آدمی مجھے چلانا سکھا سکتا ہے؟“

”میرا سالا ابھی سکھا دے گا۔ اس کے ساتھ بازار کا ایک راؤنڈ مارو گے تو چلانا آجائے گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ”اگر تمہارا سالا مجھے سکھاتا ہو اور جی تک جائے گا تو میں پانچ ہزار زیادہ دوں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ضرور جائے گا۔ اس کے ساتھ ریتی تک چلائے جاؤ گے تو ایکسپرت ہو جاؤ گے۔“

اس نے آواز دے کر سالے کو بلایا۔ مراد نے انہیں بیس ہزار دیے۔ وہ بولا۔ ”گاڑی تمہارے نام کرنے کے کاغذات آج نہیں کل تک ملیں گے۔“

”مجھے کاغذات کی جلدی نہیں ہے۔ اپنے پاس رکھو گے۔ کسی دن آکر لے لوں گا۔“

اس کے سالے کا نام رمضان تھا۔ رمضان اس کے پاس آکر گاڑی کو سڑک پر لا کر بتانے لگا کہ اسے کس طرح اسٹارٹ کرتے ہیں اور چلاتے ہیں۔ کس طرح گیزر بدلتے ہیں اور ضرورت کے مطابق رفتار بڑھاتے گھٹاتے ہیں۔

وہ اس کی ہدایات کے مطابق چلانے لگا۔ رمضان گاڑی کے ساتھ ساتھ چلا ہوا گاڑی کرنے لگا۔ پھر اس کے پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ وہ ریتی کی طرف جانے لگے۔

وہ کبھی بھی غلطیاں کرنے کے باوجود بڑے اعتماد سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ریتی پہنچے تک اسے راہنمائی کی ضرورت نہیں رہی۔ وہاں اس نے مٹی چاچی کی بہن اور بہنوئی کے نام لیے تو اس چھوٹی سی بستی میں اسے مطلوبہ دروازے تک پہنچا دیا گیا۔

ماروی نے کہا تھا کہ وہ چاچی اور چاچا کے ساتھ اسی

گھر میں رہنے آئے گی۔ لیکن وہاں نہیں تھی۔ چاچی کی بہن نے کہا۔ ”یہاں رہو۔ ہو سکتا ہے مٹی آج کل میں آجائے۔“

ماروی ان کے ساتھ کئی دن پہلے نکل گئی۔ اسے وہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ پھر کیوں نہیں پہنچی...؟

کیا کہیں رک گئی ہے یا بد نصیبی نے پھر اس کے آگے رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں؟

مستحسین تو پوچھے بغیر آتی جا رہی تھیں۔ اس نے میزبان خاتون سے کہا۔ ”میں دوسرے راستوں سے بھٹکتا آ رہا ہوں۔ چاچی دوسرے راستے سے آ رہی ہوگی۔ اب اس دوسرے راستے سے میں دور تک جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ وہ تینوں کہاں رہ گئے ہیں۔“

پھر اس نے سوچ کر کہا۔ ”اگر وہ میرے جانے کے بعد آئیں گے تو آپ مجھے فون پر اطلاع دے سکیں گی۔“

”ہم غریب ہیں۔ یہاں بستی میں صرف ایک اسکول ماسٹر کے پاس فون ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”میرے پاس بھی نہیں ہے۔ اور یہ بہت ضروری ہے۔ آج ہی خریدوں گا۔“

اس نے اسکول ماسٹر سے ملاقات کی۔ وہ بولا۔ ”میرا بیٹا دعویٰ میں ہے۔ اس نے یہ فون دیا ہے۔ ہم بھی سنی اس پر باتیں کرتے ہیں۔ یہاں بجلی نہیں ہے۔ بیٹری ری چارج کرانے اور بیٹریس ڈالنے کے لیے سنی جاتا ہوں۔“

مراد نے اس کا فون نمبر لکھ کر کہا۔ ”میں اپنا فون خرید کر آپ سے بات کروں گا۔ آپ ایک مہربانی کریں یہاں جب بھی میرے رشتے دار آئیں گے تو آپ فوراً مجھے فون پر اطلاع دیں گے۔ میں آج ہی آپ کے نمبر پر اپنا فون نمبر بھیجوں گا۔“

اسکول ماسٹر نے اور چاچی کی بہن نے یقین دلایا کہ اسے فوراً ہی اطلاع دی جائے گی۔

اسے کچھ دیر وہاں آرام کرنا چاہیے تھا۔ لیکن آرام حرام ہو گیا تھا۔ اسے دیکھے بغیر اسے پائے بغیر نہ نیند آ سکتی تھی۔ نہ بھوک لگ رہی تھی۔ کیا معشوق تھی، دوڑائے جا رہی تھی۔

اس نے سنی والہیں آکر ایک فون خریدا پھر اسکول ماسٹر کو اپنا نمبر Send کر دیا۔ یہ وہی گدھا گاڑی والا تھا جو تین وقت کھاتا تھا۔ دو جوڑے لباس میں خوش رہتا تھا اور ماروی کی محبت اسے سرشار رکھتی تھی۔

آج اسی ماروی کی محبت میں اس نے موبائل فون خریدا جو پہلے غیر ضروری تھا۔ موٹر سائیکل چلانا سیکھ گیا اور تو

کنزینیں

ایک فلاسفر نے کیا خوب کہا ہے، انسان کی پہچان اس کی خوب صورتی، لباس، خاندان، تعلیم اور دولت سے نہیں ہوتی، اگر انسان کسی چیز سے پہچانا جاتا ہے تو وہ صرف اس کا اپنا "شناختی کارڈ" اس لیے ہمیشہ اپنا شناختی کارڈ اپنے پاس رکھے۔

اثر انگیز

ایک بزرگ آدمی کی آنکھوں کا آپریشن ہوا، ڈاکٹر نے سجدہ کرنے سے روکا اور 14 دن تک اشارے سے نماز پڑھنے کو کہا۔ بزرگ نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ایک دو دن تو گھر والوں نے سمجھا شاید روٹی چباتے ہوئے آنکھوں کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے پوچھ ہی لیا کہ ڈاکٹر نے تو سجدہ کرنے سے منع کیا ہے تاکہ کھانا کھانے سے۔

بزرگ نے بہت ہی خوب صورت جواب دیا کہ جس کو سجدہ نہ کر سکوں اس کا رزق کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

مرسلہ۔ رضوان خولی کریدوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

باتیں کرے گی تمہیں مراد سمجھے گی۔

"میں تو یہاں مراد ہی ہوں۔ اسے بھی یہی کہوں گا۔"

"نہیں۔ تم محبوب ہو۔ اسے سچ بتاؤ گے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

"کیوں مناسب نہیں ہوگا۔ اسے سچ معلوم ہونا چاہیے۔"

"اسے یہ معلوم ہوگا کہ مراد مجھے سزائے موت پانے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ گیا ہے تو وہ ماروی کی نظروں سے گر جائے گا۔"

"یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ وہ کتر ہو جائے گا۔ تم برتر ہو جاؤ گے۔ وہ تمہاری ہو جائے گی۔"

"سچ یہ ہے کہ مراد نے مجھے یہاں نہیں پہنچایا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ میں اس کی جگہ سزا پا رہا ہوں۔ وہ انجان ہے محصوم ہے۔ میں جھوٹ بول کر ماروی کا دل نہیں جیتوں گا۔"

وہ گھور کر بولا۔ "تم کیا ہو محبوب؟ اس کے لیے دولت لٹا رہے ہو۔ اونچی سوسائٹی میں جو عزت اور شہرت ہے۔ اسے خاک میں ملا رہے ہو۔ تم نے اس کے لیے لبوہا یا ہے۔ مرتے مرتے بچے ہو۔ اب مرنے کے لیے یہاں

مراد جیل میں نہیں ہے۔ جب میری یہ بات سچ ہوگی کہ مراد جیل سے نکل کر وڈیرے کے چنگل میں آ گیا ہے۔"

"ہاں اس طرح ماروی کو یقین ہو جائے گا کہ اس کے دونوں عاشق کن حالات سے گزر رہے ہیں۔"

"یہ مجھ پر شبہ نہیں کرے گی۔ مطمئن ہو کر میرے ساتھ مراد سے ملنے جائے گی۔"

وہ بولا۔ "میں ابھی محبوب کے سیل میں ملنے جا رہا ہوں۔ انتظار کرو۔ ماروی سے اس کی بات کراؤں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ مرینہ نے پچھلی سیٹ کی طرف گھوم کر کہا۔ "تم ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ میرے پایا کو شش کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں تم مراد سے باتیں کر سکو گی۔"

ماروی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خدا کا شکر ہے۔"

☆☆☆

وہ سب ہی ایک دوسرے کے ساتھ خوب تماشا کر رہے تھے۔ سمیرا اور معروف جلی نے محبوب اور مراد کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا تھا کہ انہوں نے ماروی کو ان سے دور کیا ہے۔

محبوب نے سمیرا اور معروف سے یہ چھپایا تھا کہ وہ مراد کی جگہ جیل میں بھیج گیا ہے اور مراد سے یہ حقیقت چھپائی تھی کہ وہ اس کی جگہ قیدی بن گیا ہے۔

مرینہ نے بھی مراد کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کتنی آسانی سے اسے محبوب بنا کر سیاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جیل سے باہر لے آئی تھی۔

اب مرینہ ماروی کو یہ نہیں بتا رہی تھی کہ مراد اسے تلاش کرنے کے لیے اسی علاقہ میں کہیں آیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماروی تک پہنچے وہ اسے دھوکا دے کر ایک وڈیرے کی جیل میں لے جا رہی تھی۔

جیلر نے سیل میں آ کر محبوب سے کہا۔ "بہت بڑی خوش خبری سنا رہا ہوں۔ ماروی زندہ ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔ جب یہاں سے نکل کر باہر جاؤ گے تو پورے ایک لاکھ روپے لوں گا اور ابھی فون پر اس سے باتیں کراؤں گا۔"

وہ خوشی سے اچھل پڑا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ تیزی سے چلتا ہوا قریب آ کر آہنی سلاخوں کو تھام کر بولا۔ "میں ایک لاکھ سے زیادہ دوں گا۔ کیا واقعی وہ زندہ ہے۔ میں اس سے باتیں کروں گا۔ یا خدا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟"

"پہلے یہ سوچ لو اور سمجھ لو تمہیں کیا کہنا ہے؟ وہ تم سے

اتارا۔ مراد نے پوچھا۔ "کیا یہی راستہ جام تھا رو گیا ہے؟" وہ دوسرا گھونٹ نہ لی سکا۔ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ کسی وقت بھی ڈھلکا دیتی ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے اندر اندیشے اور بے چینی بھر گئی تھی۔ ایک دشمن عورت ماروی کو لے گئی تھی۔ ایک موٹی عقل سے بھی یہ بات سمجھی جاسکتی تھی کہ نیک ارادے سے نہیں لے گئی ہے۔

ماروی کا سراغ بھی ملا تو یوں ملا کہ گلاب کانتوں کے ساتھ ملا۔ کیا نصیب تھے کہ دوڑائے چلے جا رہے تھے۔

اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ٹیک ماری۔ اسے اسٹارٹ کیا پھر آگے چل پڑا۔ راستے میں کسی سے معلوم ہو جاتا کہ جام تھا رو کہاں ہے؟

☆☆☆

وہ پچھلی شام سے مراد کے پیچھے دوڑ لگا رہی تھی۔ اب وہ دونوں جام تھا رو جاتے وقت ایک ہی راستے پر تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اب وہ اس کے پیچھے آ رہا ہے۔

وہ مرینہ سے تقریباً پچاس کلومیٹر پیچھے تھا پھر یہ کہ ایک سیکنڈ ونڈ موٹر سائیکل پر دوڑ رہا تھا۔ پھر وہی طوفانی رفتار کو نہیں بکڑ سکتا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ آگے جا کر گاڑی بدلنا ہوگی۔

آگے جا کر کیا ہونے والا ہے یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ مرینہ فی الحال مطمئن تھی۔ ماروی اس کے ہاتھ آگئی تھی۔ یقین تھا کہ مراد اس کی خاطر کھٹے ٹیکنے ضرور آئے گا۔

وہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ماروی کو دیکھا۔ پھر فون پر باپ سے کہا۔ "ماروی میرے ساتھ گاڑی میں ہے اور میری باتیں سن رہی ہے۔ ہم مراد سے ملنے جام تھا رو جا رہے ہیں۔ اسے اب بھی پوری طرح یقین نہیں ہے کہ مراد ایک جیل سے فرار ہو کر دوسری جیل میں پہنچ گیا ہے۔ ہم اسے ابھی یقین دلا سکتے ہیں۔"

"کیسے یقین دلا نا چاہتی ہو؟"

ماروی اور چاہتی یہ باتیں سن رہی تھیں لیکن پچھلی سیٹ سے جیلر باپ کی باتیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ مرینہ نے کہا۔ "پاپا! یہ فون پر مراد سے باتیں کرے گی تو اسے یقین آ جائے گا۔"

باپ نے پوچھا۔ "مراد کہاں ہے؟ یہاں تو محبوب ہے۔"

"میں چاہتی ہوں۔ ماروی کو معلوم ہو جائے کہ کون کہاں ہے؟ وہ فون پر بولے گا۔ اسے یقین دلانے گا کہ

اور بارود اور لہو سے کھیلنا بھی آ گیا تھا۔

اس کا دل کہتا تھا کہ ماروی چاہتی کے ساتھ ادھر ضرور آئے گی۔ راستے میں ہوگی یا کسی شہر یا قصبے میں ضرور ٹاؤک مٹی ہوگی۔ وہ اس راستے پر داپس جانے لگا جو ریلوے لائن کے ساتھ بھی قریب ہو کر جاتا تھا۔ بھی بہت دور ہو جاتا تھا۔

اس نے بہت دور آنے کے بعد موٹر سائیکل کی رفتار دبی کر دی۔ آگے سڑک کے اس پاس تین لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں مرینہ اپنے تابعداروں کے ساتھ آئی تھی۔ انہوں نے چار گھڑ سوار ڈاکوؤں کو ہلاک کیا تھا پھر ماروی چاہتی اور چاہا کو وہاں سے لے گئے تھے۔

اس نے گاڑی روک دی۔ دو لاشیں سڑک سے دور تھیں۔ تیسرا سڑک کے کنارے پڑا تھا۔ ابھی لاش میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ بری طرح زخمی تھا۔ مراد کو دیکھتے ہی تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "پانی...!"

اس نے موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہو تم لوگ؟ یہاں کس نے گولیاں چلائی ہیں؟"

وہ گہری گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ایک عورت تین مردوں کے ساتھ لینڈ کروزر میں آئی تھی۔ وہ فوراً ہی اس کے اور قریب آ کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر بولا۔ "وہ عورت کدھر گئی ہے؟ کیا وہ تم لوگوں سے کسی ایسے شخص کا پتا چھ رہی تھی جو میرے پیسا ہو؟"

"وہ ایک قیدی کی بات کر رہی تھی جو کراچی جیل سے فرار ہو کر جام تھا رو میں پکڑا گیا ہے۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر ہانپتے ہوئے بول رہا تھا۔ "یہاں ایک بوڑھا ایک بوڑھی ایک جوان لڑکی کے ساتھ ٹیکسی میں تھے۔ اس بوڑھی نے کہا۔ کراچی جیل میں اس کا ہونے والا داماد ہے۔ اس نے اس کا نام مراد بتایا تھا۔"

ایک دم سے مراد کے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ ہائے...! جان حیات ماروی دکھائی دے رہی تھی۔ چاہتی تھی نے اسے ہونے والا داماد کہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "وہ لڑکی اپنے بزرگوں کے ساتھ کدھر گئی ہے؟"

"وہ عورت انہیں جام تھا رو لے گئی ہے۔"

"جام تھا رو کدھر ہے۔ جلدی بولو۔"

وہ انگ انگ کر سانس لیتے ہوئے بولا۔ "پانی...!"

اس نے فوراً ہی بیگ میں سے پانی کی بوتل نکالی۔ اس کا جسم ہولے ہولے جھٹکے کھارہا تھا۔ اس کا منہ ذرا سا کھل گیا تھا۔ مراد نے بوتل کھول کر اس کے منہ میں تھوڑا سا پانی ڈالا اس نے ایک جھٹکا کھا کر پانی کو حلق سے

سپینس ڈائجسٹ 188 مئی 2014ء

آئے ہو۔ یہ سب اس کی طلب میں کر رہے ہو۔ اور اب جھوٹ بول کر وہ آسانی سے مل رہی ہے تو اسے حاصل کرنے سے کتر رہے ہو۔

”میں اسے سچے ایمان سے اور پیار کی نچاکی سے حاصل کروں گا ورنہ نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔ مگر اسے یہ ضرور بتاؤ کہ وہ جیل سے باہر اسے تلاش کرنے گیا تھا لیکن دشمنوں نے اسے پکڑ کر جام تھارو کے ایک نئی جیل میں پہنچا دیا ہے۔“

محبوب نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا واقعی؟ کیا مراد کسی نئی مصیبت میں پھنس گیا ہے؟“

”ہاں۔ تم جانتے ہو مرینہ اسے کس مقصد کے لیے لے گئی تھی۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور وہ اسے دھوکا دے رہا ہے۔ میری بیٹی بھی باگل ہو گئی ہے۔ اسے پانے کے لیے چوبیس گھنٹوں سے بھاگتی پھرتی رہی ہے۔“

”وہ مراد کو کسی وڈیرے کی جیل سے کیسے چھڑا کر لائے گی؟“

”تم ابھی فون پر ماروی سے بولو کہ مرینہ سے تعاون کرے۔ اس کے ساتھ جام تھارو جائے۔ وہاں وڈیرے سے سمجھوتا کیا جائے گا۔ اسے منہ مانگی رقم دی جائے گی۔“

”آپ فون پر بات کر ائیں۔ پچارہ مراد کسی نہ کسی مصیبت میں پھنستا ہی رہتا ہے۔“

جیلر دلاور جان نے فون پر بیٹی سے کہا۔ ”ماروی کو فون دو۔ اس سے بولو مراد سے باتیں کرے۔“

محبوب نے کہا۔ ”آپ پھر مجھے مراد کہہ رہے ہیں۔“

”میں تو کہوں گا۔ تم قیدی نمبر سات سو سات ہو۔ اسے حقیقت تم بتاؤ۔“

اس نے فون محبوب کو دیا۔ اسے کان سے لگاتے ہی ماروی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو مراد...!“

کئی دنوں کے بعد گمشدہ آواز سنائی دی تو وہ سیدھی دل میں جا کر دھڑکنے لگی۔ وہ محبت سے سرشار ہو کر خوشی سے مست ہو کر بولا۔ ”اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ماروی! تم زندہ ہو۔ سلامت ہو۔ میں خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ مجھے نئی زندگی مل رہی ہے۔ تم کہاں کم ہو گئی تھیں؟“

”میں کیا بتاؤں؟ بولنے کے لیے بہت کچھ ہے۔“

مرینہ کہتی ہے کہ میں صرف ضروری باتیں کروں۔ میں تمہارے پاس آ رہی ہوں۔ تم کسی وڈیرے کی جیل میں بند ہو گئے ہونگے؟“

محبوب نے کہا۔ ”میں نہیں مراد وہاں قیدی بن گیا ہے۔“

ماروی نے چونک کر فون کو دیکھا پھر کہا۔ ”ہاں مجھے کچھ ایسا لگا تھا کہ میں مراد سے نہیں آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔ آپ کے لیے دولت کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ پر خدا کی رحمت ہو۔ آپ مراد کو وہاں سے چھڑا کے لے آئیں۔“

”انشا اللہ اسے وہاں سے رہائی ملے گی۔ لیکن ابھی میں اپنا ایک پیسا بھی کام میں نہیں لاسکتا۔ ایک چیک بھی نہیں لکھ سکتا کیونکہ مراد کی جگہ جیل میں سزا کاٹ رہا ہوں۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”یہ یقین کرنے والی بات نہیں ہے۔ مگر تم یقین کرو ماروی...! میں نے بھی تم سے جھوٹ بات نہیں کی۔ اس وقت بھی تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔“

”کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مراد آپ کو سزا دے سکتے ہیں؟“

”نہیں ماروی! مراد خود غرض اور مطلب پرست نہیں ہے۔ وہ جان دیدے گا لیکن کبھی مجھے کسی مصیبت میں نہیں ڈالے گا۔ میں نے ایسی چال چلی ہے کہ جیلر سے اور مرینہ سے معاملات طے کر کے اس کی جگہ آ گیا ہوں۔“

وہ میرے اس طریقہ کار سے بے خبر ہے۔ تمہاری تلاش میں باہر چلا گیا ہے۔ میں ایک ایک بات سچ کہہ رہا ہوں۔ مراد میری اس چال سے بے خبر ہے۔ وہ پچارہ سمجھ رہا ہے کہ تمہیں تلاش کرنے کے لیے جیل سے فرار ہوا ہے۔“

وہ ایسی باتیں ایسے حقائق سن کر الجھ رہی تھی۔ پریشان ہو کر بولی۔ ”آپ لوگ کیا چکر چلا رہے ہیں۔ کیسی چالیں چل رہے ہیں۔ میں الجھ رہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

آپ مراد کی جگہ آ گئے۔ مراد دوسری جیل میں بند ہو گیا ہے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟“

”تمہاری خاطر کیا ہے۔ تمہارے انخواہ ہونے کے بعد سب ہی کو یقین ہو رہا تھا کہ تمہیں ہلاک کر دیا گیا ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ تمہارے پاس دوسری دنیا میں جانا چاہتا تھا۔“

اس کا ایک ہی راستہ تھا کہ تمہارے لیے جان دینا ہے تو ہم قتل ہونے کا فائدہ اٹھاؤں۔ مراد کو مکمل سزائے موت سے بچا کر اس کی جگہ لے کر تمہارے پاس آ جاؤں۔“

ماروی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ عشق میں ایسی دیوانگی اس نے سنی تھی۔ دیکھی نہیں تھی۔ وہ بے اختیار بولی۔ ”ایسا پاگل تو دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔“

وہ یکبارگی روتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے جنون نے آپ کی دیوانگی نے تو مجھے جکڑ لیا ہے۔ محبت کے ایسے قہقہے میں گھس لیا ہے کہ اب کبھی نکل نہیں پاؤں گی بلکہ نکلنا ہی نہیں چاہوں گی۔“

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رو رہی تھی۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ محبوب نے کہا۔ ”چپ ہو جاؤ۔ آنسو پونچھ لو۔ تم زندہ سلامت ہو۔ اب میں زندگی کی طرف لوٹ آنے کے لیے مقدمہ جیتنے کے لیے دن رات ایک کروں گا۔“

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”میرے محبوب...! میں پہلی بار آپ کو میرے محبوب کہہ رہی ہوں۔ وعدہ کریں۔ آپ اپنی ماروی کی خاطر جیت کر باہر آئیں گے۔“

وہ مسرتوں سے بھر گیا تھا۔ ماروی نے کتنی قربانیوں کے بعد اسے بڑے پیار سے بڑے جذبے سے میرے محبوب کہا تھا۔ وہ خوشی سے کانپتے ہوئے بولا۔ ”انشا اللہ آؤں گا۔ اب تو میں تمام دولت اور جائیداد کو داؤ پر لگا کر۔ یہ مقدمہ جیت کر جلد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔“

”وعدہ کریں میرے مراد کو کبھی جیل سے نکال لائیں گے۔“

”وعدہ کرتا ہوں۔ جب مقدمہ جیت لوں گا تو ہم دونوں ہی تمام شکنجوں سے نکل آئیں گے۔“

پھر اس نے کہا۔ ”ماروی! یہ جیلر صاحب مجھ سے فون لے رہے ہیں۔ میری ایک بات مانو جام تھارو میں مراد سے مل کر کراچی آ جاؤ۔ میری سیکورٹی میں رہو۔“

”اب میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔ مراد سے جا کر ملوں گی۔ پھر اس کے ساتھ کراچی آؤں گی۔“

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ بولی۔ ”ہیلو...؟“

جیلر کی آواز سنائی دی۔ ”فون مرینہ کو دو۔ میری بیٹی کے ساتھ جام تھارو جاؤ۔ وہاں اپنے مراد سے مل سکو گی۔“

اس نے فون مرینہ کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولی۔ ”تھینک یو پاپا! میں ماروی کی باتیں سن رہی تھی اور ادھر کے جوابات سمجھ رہی تھی۔“

وہ کن آنکھوں سے ماروی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ ماروی کو ہم پر اعتماد ہو گیا ہے۔“

اس نے فون بند کیا۔ ماروی نے کہا۔ ”آپ بہت اچھی ہیں۔ میں آپ پر اعتماد کر رہی ہوں۔“

مرینہ قاتحانہ انداز میں مسکراتی لگی۔ ادھر محبوب نے جیلر سے کہا۔ ”ماروی نے زندہ ہو کر مجھے دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان بنا دیا ہے۔ میں خوب خوشیاں منانا جشن منانا چاہتا ہوں۔ پلیز آپ ابھی معروف صاحب سے میری بات کر ائیں۔ اب انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں یہاں

ہوں۔ وہ دنیا کے بڑے بڑے وکیلوں کی خدمات حاصل کر کے مجھے یہاں سے نکال لے جائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”بے شک یہی ہوگا۔ مسٹر معروف کو بھی سب کچھ معلوم ہونا چاہیے اور آپ مجھے بھی بہت کچھ دیں گے۔ لیکن ذرا صبر کریں۔ بارہ گھنٹے بعد آپ جو چاہیں گے وہ ہوگا۔“

”بارہ گھنٹے بعد کیوں؟“

”ہماری کچھ مجبوریاں ہیں۔ ماروی دس بارہ گھنٹوں میں جام تھارو پہنچے گی۔ اس کے بعد ہی اصل صورت حال سامنے آئے گی۔ پھر ہم بھی سوچیں گے آپ بھی سوچیں گے کہ ہم نے کیا کیا ہے اور اب آپ کو کیا کرنا چاہیے؟“

اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ محبوب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بڑی مکاری سے مسکراتا ہوا وہاں سے چلتا ہوا جیل کے دوسرے حصے میں آیا۔ پھر اس نے فون پر وڈیرا شاہ ولی سے کہا۔ ”سامیں! میری بیٹی آ رہی ہے۔ ماروی کو ساتھ لارہی ہے۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ وہ لڑکی ایک ارب پتی بزنس مین کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔“

وڈیرے نے کہا۔ ”یہ آنکھوں کا نور دل کا سرور تو شاید بیٹی کے لیے کہا جاتا ہے۔“

با اصول

ایک ادبی رسالے کا اصول تھا کہ اس میں جس قلم کار کے افسانے شائع ہوتے تھے انہیں باقاعدہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ایک قلم کار نے اس رسالے کو اپنے بہت سے افسانے بھیجے۔ مگر اس کی کوئی بھی کہانی رسالے کی زینت نہ بن سکی۔ اس صورت حال سے ادیب بہت افسردہ ہوا اور تنگ، ایک دن رسالے کے دفتر جا پہنچا۔ رسالے کے ایڈیٹر نے اسے ایک افسانے کے مساوی معاوضہ پیش کر دیا۔

ادیب بہت خوش ہوا۔ اس نے ایڈیٹر سے پوچھا کیا میرا کوئی افسانہ شائع ہونے کے لیے منتخب ہو گیا۔ ایڈیٹر نے جواب دیا۔ ”نہیں! آپ کا کوئی بھی افسانہ قابل اشاعت نہیں ہے۔ یہ رقم تو وہ ہے جو ریڈی میں آپ کے افسانے فروخت کر کے حاصل ہوئی ہے۔“

مرسلہ: حسنین عباس، مکمل عباس، بگیا نہ روڈ کھاریاں

191

”اگر بیٹی کے لیے کہا جاتا ہے تو آپ سے گزارش ہے کہ اسے بیٹی بنا کر دی آئی پی ٹریسٹ دیں۔ اس کے دونوں عاشق سر پھرے ہیں۔ ایک اپنی دولت سے مارتا ہے۔ دوسرا بارود سے کھیلنے والا خطرناک کھلاڑی بن گیا ہے۔“

”اگر وہ ایسے خطرناک ہیں تو آپ کیوں نہیں ڈرتے؟“

”میں اور میری بیٹی قانون کی چھتر چھایہ میں رہتے ہیں اور صرف قانون سے ہی نہیں مجرموں سے بھی کھیلنا جانتے ہیں۔ آپ ایک محدود علاقے میں پولیس والوں کو خرید کر حکمرانی کرتے ہیں۔ وہ دونوں پاگل ایسے سر پھرے ہیں کہ آپ کو اس علاقہ سے اٹھا کر باہر لے جائیں گے۔“

”وہ ایسے خطرناک ہیں توڑکی کو میرے پاس نہ لاؤ۔“

وہ جیتے ہوئے بولا۔ ”ڈر گئے؟ آپ تو دعویٰ کرتے تھے کہ آپ کی اجازت کے بغیر کوئی آپ کی زمین پر قدم نہیں رکھ سکتا ہے۔ پھر وہ دونوں ادھر کیسے آئیں گے؟“

ادھر سے وہ قہقہہ لگانے لگا۔ جیلر نے پوچھا۔ ”آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟“

وہ جیتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے ڈرانے پر ہنسی آرہی ہے۔ ابھی یہ لکھ لیں۔ آپ کو جلد ہی معلوم ہوگا کہ میں ایک ارب پتی سے اور ایک بارود کے کھلاڑی سے کیسے کھیلوں گا اور ان دونوں سے کس طرح فائدہ اٹھاؤں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں دیکھوں گا۔ فی الحال ہم یہی چاہیں کہ ماروی تمہاری جیل میں رہے اور ان دونوں کے ہاتھ نہ لگے۔“

”جو میرے ہاتھ آجاتی ہے وہ پھر کسی کے ہاتھوں میں نہیں جاتی۔ فی الحال خدا حافظ۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ جیلر دلاور جان فون بند کر کے آفس کی طرف جاتے ہوئے موجودہ حالات کے ہر پہلو پر غور کرنے لگا۔ وہ باپ بیٹی بڑی حکمت عملی سے بڑی ہنرمندی سے ان تین عاشقوں کو گھیر رہے تھے۔ مرینہ اپنی سوکن کو ایک وڈیرے کے جیل میں پہنچا رہی تھی۔ محبوب اس کی سلامتی کے لیے جیل سے باہر نہیں آسکتا تھا۔ بس ایک مراد کی طرف سے اندیشہ تھا۔ وہ زنجیریں توڑنے کے بعد ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

ویسے مرینہ نے ایسی چال چلی تھی کہ اب مراد کے بھی کس بل ڈھیلے ہونے والے تھے۔ وہ بھی ماروی کی سلامتی کے لیے اس لندن والی کے آگے گھٹنے ٹیکنے والا تھا۔

☆☆☆

میر اور معروف تھکی محبوب کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے پانی کی طرح پیے بہا رہے تھے۔ یہ خدشہ تھا کہ محبوب کو

ماروی کی موت کی غلط اطلاع ملے گی تو وہ دیوانہ خودکشی کر لے گا۔ اسے ایسے اقدام سے روکنے کے لیے انہوں نے اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعہ اعلان کرایا کہ ماروی زندہ ہے۔ پھر انہوں نے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ چھپوائے۔ پمفلٹ میں یہ لکھوایا۔ ”میرے محبوب! تمہاری ماروی زندہ ہے۔ واپس آ جاؤ۔“

انہوں نے ان پمفلٹس کو ملک کے ہر صوبے ہر شہر اور گاؤں دیہاتوں میں پھیلا دیا۔ یہ امید تھی کہ محبوب جہاں بھی ہوگا۔ اسے پڑھ کر واپس آ جائے گا۔

وہ کاغذی تحریر دنیا کے ہر حصے میں پہنچ سکتی تھی۔ صرف پڑھنے والے کے پاس جیل کے اندر نہیں آ سکتی تھی۔ وہ جو اتنی محنت کر رہے تھے اور رقم ضائع کر رہے تھے اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر حالات ایک نئے موڑ پر آ گئے تھے۔ محبوب کو جیل کی چار دیواری کے اندر ہی ماروی کی خیریت معلوم ہو گئی۔ اس سے فون پر باتیں بھی ہو گئیں۔ اب وہ جیل سے باہر نکلنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ ماروی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کراچی واپس آ کر پھر اس کی پناہ میں رہے گی اور وہ اسے نئے سرے سے پناہ دینے کے لیے فی الحال میر اور معروف جلی سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

اس کے چاہنے سے کیا ہوتا؟ وہ جیل میں جیلر کا محتاج تھا اور جیلر نے اسے بارہ گھنٹے کے لیے نال دیا تھا۔ ایک قیدی کی مجبوری تھی وہ دل پر ہنسر رکھ کر بارہ گھنٹے گزار رہا تھا۔

ویسے حالات بدل رہے تھے۔ قتل کا مقدمہ کھول دینے والا تھا۔ حشمت جلالی نے عدالت میں جب سے قتل کی آواز فون پر سنی تھی۔ تب سے پریشان تھا، گھبراہٹا ہوا تھا۔ کبھی یقین ہو رہا تھا کہ زلیخا زندہ ہے اور اسی نے فون پر بات کی ہے۔ کبھی بڑی چٹکی سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ یہ فریاد ہو سکتا ہے۔ دشمنوں کی چال ہو سکتی ہے کسی عورت نے زلیخا بن کر اسے خوف اور اندیشوں میں مبتلا کیا ہے۔

اس نے اپنے وکیل سے بات کی۔ اسے زلیخا کے فون کے متعلق بتایا۔ وہ بھی سن کر الجھ گیا۔ اس نے کہا۔ ”اس فون کال سے دو ہی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ فریاد ہے۔ دوسرا یہ کہ فریاد نہ ہوا اور وہ دوسری پیشی کے دوران جج عدالت میں حاضر ہوگی تو یہ مقدمہ آپ کے خلاف ہو جائے گا۔“

وہ حاضر ہو کر بیان دے گی کہ مراد نے نہ اس کے زیورات چرائے ہیں نہ اس سے زیادتی کی ہے۔ یوں مراد کے

مرے قتل اور چوری کا الزام مل جائے گا۔ اسے الزامات سے بری کر کے عزت کے ساتھ رہا کر دیا جائے گا۔

پھر آپ پر الزام آئے گا کہ کھیتوں میں پائی جانے والی لاش کو آپ نے بیٹی کیوں کہا؟ کیوں تیزاب سے اس کا چہرہ بگاڑا گیا۔ آپ نے نہیں بگاڑا تو کس نے بگاڑا؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکے گا کہ کسی بے قصور متول کو زلیخا ثابت کرنے کے لیے ہی اس پر تیزاب پھینکا گیا تھا۔“

حشمت جلالی کو پسینا آنے لگا۔ وکیل نے کہا۔ ”اگر بیٹی واقعی زندہ ہے تو وہ عدالت میں آ کر آپ پر کارروکاری کا الزام لگائے گی۔ یہ بیان دے گی کہ باپ اور بھائی کے خوف سے وہ فرار ہو گئی تھی۔“

رابعہ وکیل کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے حشمت سے کہا۔ ”میں نے جب سے سنا ہے کہ اس نے آپ کو فون کیا ہے اور وہ زندہ ہے۔ تب سے خداوند کریم کا شکر ادا کر رہی ہوں۔ اس کی زندگی کی اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔“

حشمت نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے۔ میری تباہی اور موت کی دعائیں مانگ رہی ہو۔“

”آپ کے خلاف دعائیں نہ مانگوں تب بھی بیٹی کی واپسی آپ کو جیل کی چار دیواری میں پہنچا دے گی۔“

اس ایک فون کال نے باپ کو اور دونوں بیٹوں کو دھلا کر رکھ دیا تھا۔ گیسوں کے ساتھ گھنٹیں پس جاتا ہے۔ وہ بھی باپ کے ساتھ پس جانے والے تھے۔

فی الحال دوسری پیشی تک سوچتے سمجھتے کا بہت وقت تھا۔ انہیں کسی ایک بات کو ماننا تھا کہ زلیخا زندہ ہے یا نہیں ہے؟ اگر زندہ ہے تو کیا اس مقدمہ سے بھاگتا ہوگا؟

ابھی کسی نتیجہ پر پہنچنے کا وقت تھا۔ رابعہ کی یہ تدبیر کامیاب رہی تھی۔ وہ تینوں باپ بیٹے اس کی واپسی پر بھی چین کر رہے تھے کبھی انکار کر رہے تھے۔ اور انکار کرنے کے باوجود بے اختیار اسے تصور میں دیکھنے لگتے تھے۔

ایک رات تو حشمت جلالی نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ پہلی بار بیٹی اسے خواب میں دکھائی دی تھی۔ وہ کمرے کی نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑے ایک سمت تک رہا تھا۔ اسے اپنوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس نے بھی پیدا کرنے والے ماں باپ کو خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ البتہ بچا کر نے والیوں کو دیکھا تھا۔ اس رات پہلی بار بیٹی نے اسے بڑبڑا دیا تھا۔

وہ خواب اس کے ذہن کو چھوڑ کر کبہ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ تب ہی خواب میں آئی ہے۔ ورنہ آج سے پہلے کیوں نہیں آئی تھی؟ وہ خواب نہیں تھا۔ ایک وارنگ تھی۔

رابعہ تو اپنے اس مجازی خدا سے بری طرح تپ مگنی تھی۔ پتا نہیں کیوں ایسے شوہر اپنے نام کے ساتھ خدا کا نام لے آتے ہیں۔ خدا نہیں بن پاتے تو مجازی خدا کہلا کر خوش ہوتے ہیں اور سینے پر مونگ دلتے رہتے ہیں۔

جب سے اس نے کھانے میں زہر ملائے دیکھا تھا۔ تب سے سوچ رہی تھی۔ وہ کبخت وڈیرا مر رہی جائے تو اچھا ہے۔

اس کے سوچتے سے وہ مرنے نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ سچ سچ اسے مار رہی تھی۔ وہ دونوں بڑی رازداری سے ایک چھت کے نیچے زہر ملا کھیل کھیل رہے تھے۔ حشمت رابعہ کی نظریں بچا کر اس کے کھانے میں زہر کا ایک قطرہ ٹپکاتا تھا۔ وہ بھی اس کی لالچی میں اس کے کھانے کو زہر ملا کرنے لگی تھی۔

رشتے زہر بن جائیں تو اسی طرح آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ کبھی زبان کے زہر سے اور کبھی سچ سچ عداوت کے زہر سے۔ حشمت جلالی نے رابعہ کو سلو پوائزن دینے کی پہل کی تھی۔ رابعہ سچ گئی تھی۔ اب بھی چال اس پر اتار رہی تھی۔

وہ پچھلے پندرہ دنوں سے زہر ملا کھانا کھا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ آگے چل کر اور زیادہ کمزور ہونے والا تھا۔

جو گڑھا اس نے رابعہ کے لیے کھودا تھا۔ اس میں گر چکا تھا۔ ایک دن اس پر مٹی ڈالی جانے والی تھی۔

ڈاکٹر نے اس کی لیبارٹری رپورٹ پڑھی تھی اور کہا تھا خون میں کمی ہو رہی ہے۔ اس نے کمی پوری کرنے کی دوا کم دی تھی۔ اسے خون بڑھانے والی غذا کم اور پھل کھانے کو کہا تھا اور وہ لالچی میں اپنی کرنی کا پھل کھا رہا تھا۔

رابعہ اس کا پچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ جب تک وہ جی رہا تھا۔ تب تک اس کی ہر سانس کو یو جھل کر دینا چاہتی تھی۔ اپنا کیچا ٹھنڈا کرنے کے لیے مزید تدابیر سوچتی رہتی تھی۔

پھر ایک تدبیر سوچی۔ اس نے اپنے داماد سے فون پر کہا۔ ”پتا نہیں تم سعودی عرب سے کب آؤ گے۔ فی الحال ایک سی ڈی میں میری مرحوم بیٹی کی چلتی پھرتی تصویریں بھیجو اور زلیخا کی طرف سے ایک خط لکھو کہ وہ بیمار ہے۔ طبیعت سنبھل جائے گی اور جمال کو چھٹی ملے گی تو وہ پاکستان آ کر

اپنے عالم باپ اور بھائیوں سے منٹ لے گی۔“
اس کے داماد جمال نے یہی کیا۔ اس کے پاس مرحوم
بیوی کی کئی ویڈیو فلمیں تھیں۔ اس نے ان ویڈیوز میں سے
خاص خاص سین ایک سی ڈی میں ٹرانسفر کرائے۔ ایک الگ
ویڈیو فلم تیار کی پھر رابعہ کے نام ایک خط لکھا۔

”میری پیاری امی...!

ہم عورتیں کیا ہیں...؟

باپ بھائی اور شوہروں کے لیے محض کھلونا ہیں۔ یہ
اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہمیں بیاہ کر لاتے ہیں
پھر ہماری جوانی نچوڑ لینے کے بعد غیر ضروری سامان کی طرح
بے رخصی کے اسٹور روم میں ڈال کر بھول جاتے ہیں۔

ہم ڈیڑھوں کے خاندان میں پیدا ہو کر کاروباری
کے الزام میں مار ڈالی جاتی ہیں۔ میرے ظالم باپ اور بے
غیرت بھائیوں نے مجھے بھی مار ڈالنے کی کوششیں کی
تھیں۔ خدا کا شکر ہے آپ کی دعاؤں نے مجھے بچالیا۔

میں جمال کے ساتھ ایک خوش نصیب سہاگن بن کر
مسرتوں سے بھرپور زندگی گزار رہی ہوں۔ آپ میری ویڈیو
فلم میں میری ہنسی کھیلتی زندگی کی جھلکیاں دیکھیں۔ مارنے
والوں سے اوپر وہ بچانے والا قوی ہے نہرمان ہے۔

ابھی آپ دیکھ رہی ہیں تو میری گود میں آپ کا نواسہ
نظر آئے گا۔ دیکھیں کتنا خوبصورت اور چمکیلا ہے۔ بالکل
مراد لگ رہا ہے۔ اپنے باپ پر گیا ہے۔

میرے مجازی خدا جمال کہتے ہیں کہ یہ مراد کی امانت
ہے۔ اگر وہ اجازت دے گا تو ہم اسے کیلچے سے لگا کر رکھیں
گے۔ ورنہ اس کی امانت اسے سونپ دیں گے۔

میں جلد ہی جمال کے بچے کی ماں بننے والی
ہوں۔ زندگی سے فارغ ہوتے ہی پاکستان آؤں گی۔ اپنے
بچے کے باپ کو جھوٹے مقدمے میں سزائے موت پانے
نہیں دوں گی۔ بھری عدالت میں باپ اور بھائی کہلانے
والے دشمنوں کا پول کھول دوں گی۔

پچھلے ڈھائی برسوں سے خاموش رہی۔ سوچا تھا ان
دشمنوں کو معاف کر دوں گی آخر باپ اور بھائی ہیں۔ لیکن
انہوں نے مراد کو میرے بچے کے باپ کو مقدمہ میں پھنسا
کر یہ سمجھا دیا ہے کہ وہ آئندہ میرے تمام بچوں سے بھی
دشمنی کرتے رہیں گے۔

فقط آپ کی بیٹی... زلیخا۔“

حشمت جلالی ایک دن کے لیے شہر سے گھر میں آیا
ہوا تھا۔ اسی دن کو رنیر سردس سے ایک پکٹ حویلی کے پتے

پر آیا۔ اس نے اسے کھول کر ایک سی ڈی اور لفافے کو دیکھا
پھر لفافے سے خط نکال کر پڑھا تو بیٹھے بیٹھے لرز گیا۔
اس نے فوراً ہی کمپیوٹر کو آن کیا۔ پھر اسے آپریشن کی
توسی ڈی کے ذریعہ اسکرین پر زلیخا چلتی پھرتی دکھائی
دی۔ جسے خواب میں جلتے پھرتے دیکھا تھا وہ سچ
آنکھوں کے سامنے متحرک تھی۔

اس کا سر گھومنے لگا۔ ثبوت آنکھوں کے سامنے تھا کہ
بیٹی زندہ ہے۔ اسی نے خط لکھا ہے اور اسی نے چاروں بچے
فون کیا تھا۔

اس ڈیڑھ کی حالت قابل دید تھی۔ بیٹی اس کے
اندر گھس کر کیلچے کوچ رہی تھی۔ وہ کسمسا رہا تھا۔ بار بار ہاتھ
بدل رہا تھا۔

وہ اسی وقت گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی طرف بھاگا۔ اس نے
فون پر رابعہ کو اور دونوں بیٹوں کو بتایا کہ زلیخا کی شک وشبہ کے
زندہ ہے۔ وہ ثبوت لے کر آ رہا ہے۔ بڑے بیٹے برکت نے
پوچھا۔ ”ایسا کیا ثبوت مل گیا ہے کہ آپ ڈر گئے ہیں۔ بھاگے
آ رہے ہیں۔ خود کو سنبھالیں۔ آرام سے آئیں۔“

اس نے کہا۔ ”ثبوت دیکھو گے تو بولنا بھول جاؤ گے۔
وکیل نعیم درانی سے بولو آج رات آٹھ بجے ہماری کونٹی میں
آئیں۔ باہم ان کے آفس میں جائیں گے۔ میں شام تک
کراچی پہنچ رہا ہوں۔“

ادھر دونوں بیٹوں کے دماغوں میں ہلچل مچ گئی
تھی۔ رابعہ اندر سے خوش تھی اوپر سے پریشانی بھی ظاہر کر
رہی تھی اور بیٹی کی زندگی کا ثبوت ملنے پر خوشی کا بھی اظہار کر
رہی تھی اور یہ تو جانتی ہی تھی کہ جو خط آیا ہے اس میں کیا لکھا
ہے اور اس نے کس طرح ایک مجرم باپ کو بدلہ دیا ہے۔

پچھلے چھ دنوں سے ایک وقت کے کھانے میں ڈھیر کا
ایک قطرہ اس کے اعصاب کو کمزور بناتا جا رہا تھا۔ وہ
جسمانی طور سے کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اب دماغ پر ہتھوڑے
پڑ رہے تھے۔

وکیل نعیم درانی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ زلیخا کی
واپس نہ آئے، جو کمیتوں میں ماری گئی ہے وہی زلیخا ثابت
ہوتی رہے۔ ورنہ اس کا بگاڑا ہوا چہرہ ثابت کرے گا کہ
اسے زلیخا بنانے کے لیے اس پر تیزاب پھینکا گیا تھا۔ اور
اب وہ سب جیتی جاگتی زلیخا کا وجود آنکھوں کے سامنے
اسکرین پر دیکھنے والے تھے۔ وہ اگلی بیٹی میں اسکرین سے
نکل کر عدالت میں آنے والی تھی۔

اس نے کراچی پہنچ کر رابعہ کو بیٹوں کو اور وکیل درانی

کو اس کی متحرک تصویریں دکھائیں۔ اس کا خط پڑھ لیا۔
وکیل نے اسے پڑھ کر اور اسکرین پر زلیخا کو دیکھ کر
کہا۔ ”اب کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔ یہ مقدمہ آپ ہار
چکے ہیں۔“

وکیل نے جیسے عدالتی فیصلہ سنا دیا۔ اس نے
کہا۔ ”اب ہلاک ہونے والی فرضی زلیخا کا مقدمہ آپ کے
محلے پڑے گا۔ ادھر مراد جیل سے باہر آئے گا۔ ادھر آپ
اندراجائیں گے چونکہ مرڈر کیس ہے اس لیے میں آپ کو
منانت پر رہائش کرا سکوں گا۔“

حشمت نے دونوں بیٹوں کو دیکھا پھر بڑے اعتماد
سے کہا۔ ”یہ میرے دو مضبوط بازو ہیں۔ مجھے ہتھکڑیاں لگنے
نہیں دیں گے۔ ان میں سے کوئی میری جگہ جیل جائے گا۔“
وہ دونوں اچھل پڑے۔ ”ہم کیوں سزا پانے جائیں
گے؟ ہم نے کیا کیا ہے کہ سزا پائیں گے؟“

حشمت نے کہا۔ ”شرم کرو۔ باپ کے کام آنے سے
پہلے بھاگنے کی باتیں کر رہے ہو۔“

رحمت نے کہا۔ ”کام آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ
ہم پھانسی چڑھنے کے لیے جیل چلے جائیں۔“

باپ نے کہا۔ ”کیا تم لوگوں نے پھانسی چڑھنے کا
کام نہیں کیا ہے؟ کمیتوں میں سب سے پہلے تم دونوں نے
ہی وہ لاش دیکھی تھی بلکہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہمارے
حواریوں نے رانی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس وقت تو
میں حویلی میں تھا۔“

برکت نے کہا۔ ”حویلی میں آپ نے اس سے منہ کالا کیا
تھا۔ ہم نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ موج سستی آپ نے
کی اور جیل میں ہم جا میں گے؟ وہاں باجانی شاہ...!“

رحمت نے کہا۔ ”ہم کیا انوکھے پٹھے ہیں؟ آپ کو
پاگل دکھائی دے رہے ہیں؟“

حشمت نے کہا۔ ”جیل میں جانے کا مطلب یہ نہیں
ہے کہ پھانسی پر چڑھ جاؤ گے۔ میں باہر رہ کر تمہارا مقدمہ
لڑتا رہوں گا۔“

برکت نے کہا۔ ”اسی طرح آپ اندر جائیں گے تو
ہم آپ کا مقدمہ لڑتے رہیں گے۔“

ان باپ بیٹوں کے درمیان نفرت اور عداوت پیدا
کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ رابعہ نے بیٹوں کی حمایت کر کے
چنگاری بھڑکائی۔ ”میرے بیٹے درست کہہ رہے ہیں۔ آپ
نے میری بیٹی پر یہ الزام لگانا چاہا کہ وہ کسی یار کے ساتھ فرار
ہو رہی تھی۔ اس کے یار نے چہرہ بگاڑ کر اسے مار ڈالا

ہے۔ یہ سارے منصوبے آپ نے بنائے تھے۔ آپ نے
ملازمہ درانی کو براہ دیکھا تھا۔“
وہ ناگواری سے بولی۔ ”شرم کریں۔ جس کی آبرو
لوٹی اسی کو بیٹی بنا کر کمیتوں میں ہلاک کر دیا۔ سارا کیا دھرا
آپ کا ہے پھر میرا کوئی بیٹا جیل میں کیوں جائے گا؟“

رابعہ ایک بڑے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں کی
حمایت حاصل ہوتے ہی وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس
کے دائیں بائیں آکر بیٹھ گئے۔

حشمت حیرانی سے منہ کھولے انہیں دیکھ رہا تھا۔ سمجھ
گیا کہ اس کے دو بازو دو اہم سپاہی اس کے محاذ سے اکھڑ کر
نئے محاذ پر ماں کی گود میں پہنچ گئے ہیں۔

اس کا سر جھکانے لگا۔ سلو پوٹرن ایسے ہی وقت اپنا
اثر دکھاتا تھا۔ اس نے صوفے کی پشت سے ٹپک لگا کر
آنکھیں بند کر لیں۔ اب ایک ہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ
اس مقدمے سے جان چھڑائے۔ بیٹے ساتھ نہیں دیں گے
تو وہ عدالتی جنگ جاری نہیں رکھ سکے گا۔

اس نے پوچھا۔ ”دڑانی صاحب! کیا ہم زلیخا کے
آنے سے پہلے مقدمہ لڑنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ کسی بھی
طرح اس مقدمے کو ختم کر سکتے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”اس کے لیے محبوب علی چانڈیو کے دست
راست معروف چٹلی سے بات کرنی ہوگی۔ وہ سمجھوتا کرنے
پر آمادہ ہوگا تو معمولی سی قانونی کارروائی کے بعد یہ مقدمہ ختم
ہو جائے گا۔“

رابعہ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے چانڈیو اور معروف چٹلی
راضی نہیں ہوں گے۔“

وکیل نے کہا۔ ”راضی ہو جائیں گے۔ وہ معروف
کاروباری لوگ ہیں۔ اس مقدمہ سے فوراً جان چھڑائیں
گے۔ ان کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ وہ مقدمہ کے اخراجات
سے بچیں گے اور اہم بات یہ کہ مراد کو رہائی مل جائے گی۔“

حشمت جلالی نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر
کہا۔ ”پتا نہیں! کیسی کمزوری ہے۔ دل گھبرا رہا ہے۔ درانی
صاحب! آپ محبوب علی چانڈیو سے صلح معافی کی بات کریں۔“
درانی نے کہا۔ ”چانڈیو لاپتا ہے۔ اس کے اپنے
لوگ اخبارات اور ٹی وی کے ذریعہ اسے تلاش کر رہے
ہیں۔ میں معروف چٹلی سے بات کروں گا۔“

حشمت جلالی صوفہ کی پشت سے ٹپک لگائے آنکھیں
بند کیے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سے اپنا سر سہلا رہا تھا۔ رابعہ نے
اس کی کھوپڑی گھما دی تھی۔ وہ دو بیٹوں کے درمیان بیٹھی

☆☆☆

شاہ ولی میاں کی زمین اتنی کلو میٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے باپ دادا نے جام تھارو کے نام سے ایک چھوٹا سا شہر آباد کیا تھا۔ باقی زمینوں پر دور تک آم کے باغات تھے۔ آموں کی کوالٹی اتنی عمدہ تھی کہ وہ بیرونی ممالک بھیجے جاتے تھے۔ اچھی خاصی آمدنی تھی۔ وہ خوب کمار ہا تھا۔

وہ مست ہو کر کہتا تھا۔ ”دولت کس لیے کمائی جاتی ہے؟“ پھر خود ہی جواب دیتا تھا۔ ”شراب میں بہنے کے لیے اور شباب میں ڈوبنے کے لیے۔“

ایک بیوی تھی شہزادی ثریا جو بہت ہی خوبصورت اور صحت مند تھی۔ لیکن شراب کا مزہ گھروالی کے ساتھ نہیں باہر والی کے ساتھ آتا ہے۔ اس لیے اس کے فارم ہاؤس میں دستور عیاشی کے مطابق باہر والیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔

شہزادی ثریا نے سات برسوں میں تین بیٹے پیدا کیے تھے۔ ایک کا نام شاہ داد میاں دوسرے کا نام شاہ زاد میاں اور تیسرے کا شاہ ارباز میاں تھا۔ دو بیٹے اپنے باپ کی زمین اور آم کے باغات سنبھالتے تھے۔ تیسرا بیٹا شاہ ارباز لندن میں رہتا تھا۔ وہاں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

وہ تین بیٹے پیدا کرنے کے دوران مرجھاتی رہی تھی۔ تیسرے بیٹے کے بعد اس کے بدن میں ہڈیاں زیادہ اور گوشت کم رہ گیا تھا۔ عورت ہو یا قربانی کا جانور، مرد گوشت ٹوٹتا ہے۔ گوشت چباتا ہے اور ہڈیاں پھینک دیتا ہے۔

شاہ ولی میاں اپنے وعدہ کے خلاف اس پر سوکن لے آیا۔ دوسری بیوی بانو عقیلہ کھلتا ہوا تازہ گلاب بھی۔ بچے والی ہونے کے بعد اس پر بھی زوال آنے والا تھا۔ ابھی تو حویلی میں اسی کا مان مرتبہ بڑھا ہوا تھا۔

شہزادی ثریا نے اعتراض کیا کہ سوکن کے ساتھ نہیں رہے گی۔ اس بات پر جھگڑے ہونے لگے۔ شاہ ولی میاں نے ایک روز اس کی پٹائی کی تو بڑے بیٹے شاہ داد میاں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ”یہ میری ماں ہے۔ اس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ میں نے جس ہاتھ سے تیرا ہاتھ پکڑا ہے۔ اس میں صرف تیرا ہونہیں ماں کا دودھ بھی شامل ہے۔“

وہ باپ کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”آئندہ اتنی پر نہ ہاتھ اٹھانا نہ گالی دینا۔ جوان بیٹا برداشت نہیں کرے گا۔“

وہ گہری سنجیدگی سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آج تک کسی نے میرا ہاتھ پکڑنے کی جرأت نہیں کی۔ کیا تمہیں میری طاقت کا اندازہ ہے۔ ابھی ایک ملازم کو اشارہ کروں گا

شاہ داد میاں نے باپ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کہا۔ ”آپ جانتے ہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ لیکن جس طرح ماں کا احترام کرتا ہوں۔ اسی طرح آپ کے آگے جھکتا ہوں۔ میں آپ کا فرمانبردار ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔“

اس نے متاثر ہو کر بیٹے کو دیکھا۔ اس کی ماں پر ایک نظر ڈالی پھر وہاں سے پلٹ کر چلا گیا۔ ماں نے آگے بڑھ کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ کر دمھی آواز میں بولا۔ ”میں اس کے سامنے مصلحاً جھک گیا تھا۔“

ماں نے حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”یہ یہاں کا حکمران ہے۔ لیکن یہ بوڑھا ہونا ہے۔ حکمران مجھے ہونا چاہیے۔ اپنی زمینیں نہ سبکی آم کے باغات تو میرے نام ہونے چاہئیں۔ لیکن یہ تمام زمینوں پر اور آمدنی کے ذرائع پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے۔“

شہزادی ثریا بیٹے کے باغیانہ خیالات سن کر خوش ہو رہی تھی۔ وہ بھی سرگوشی میں بولی۔ ”تدبیر کرتے رہو گے تو نقد یرغبتی رہے گی۔ بڑی رازداری سے اپنے وقاداروں اور جاں نثاروں کی تعداد بڑھاتے رہو۔“

وہ ماں کا ہاتھ اپنے سر پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی دعاؤں سے یہی کر رہا ہوں۔“

وہ اس کی پیشانی کو چوم کر بولی۔ ”میرا بیٹا بہت کچھ دار ہے۔ بیٹے! ایک کام کرو۔ یہ میری سوکن کا کٹا دور کر دو۔“

”رہنے دیں اتنی! جب ابا آپ کو نہیں پوچھتا ہے۔ آپ کی طرف نہیں آتا ہے تو اسے جانے دیں جہاں بھی جاتا ہے۔“

پھر وہ ماں کے کان میں بولا۔ ”میں آپ کی سوکن سے بھی فائدہ اٹھانے والا ہوں۔“

ماں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر دروازے کے پاس آیا۔ اسے اندر سے بند کیا پھر ماں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ بالکل قریب ہو کر سرگوشی میں بولا۔ ”آپ کی سوکن کی بہن نبیلہ یہاں آتی جاتی رہتی ہے۔ وہ مجھے پھانس رہی ہے۔“

ماں نے غصہ سے کہا۔ ”بڑی بہن تمہارے باپ کو پھانس کر حویلی والی بن گئی۔ چھوٹی تم پر ڈورے ڈال رہی ہے۔“

وہ بولا۔ ”آپ میری پوری بات سنیں۔ میں جان بوجھ کر پھنس رہا ہوں۔“

”کیا...؟“ ماں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔
 وہ بولا۔ ”عقیلہ بڑی چالبار ہے۔ وہ ایک طرف مجھ کو
 اور دوسری طرف ابا کو بھانس رہی ہے۔“
 ”یا اللہ! اور تم دیکھ بھجھ کر بھی اس کے جال میں پھنس
 رہے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“
 وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”آپ شیں تو سہی۔ آپ کی
 سوکن عقیلہ چاہتی ہے کہ میں اس کی بہن کا دیوانہ بن کر
 رہوں گا تو دونوں بہنیں ہم باپ بیٹے کے سروں پر ناجاتی
 رہیں گی۔“
 وہ ماں کو بازوؤں میں لے کر بولا۔ ”اور میں ناچتے
 دول گا۔ جانتی ہیں کیوں؟“
 وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ”وہ دونوں بہنیں اتنی
 سر چڑھ گئی ہیں کہ ابا کے تجوری والے کمرے میں جاتی
 ہیں۔ اس تجوری میں زمینوں کی اور کاروبار کی اہم
 دستاویزات ہیں۔ کچھ ایسی دستاویزات ہیں جن سے ابا
 محروم ہوگا تو مشکل میں پڑ جائے گا۔ قانون کی نگار اس کے
 سر پر لگتی رہے گی۔“
 وہ بیٹے کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بول رہا
 تھا۔ ”وہاں کچھ ایسے کاغذات ہیں جو اسے کئی عورتوں اور
 مردوں کا قاتل ثابت کرتے ہیں۔“
 ”یعنی اس نے خود ہی اپنے بڑے اعمال کا ذخیرہ اس
 تجوری میں سنبھال کر رکھا ہے؟“
 ”جی ہاں۔ ایسے کاغذات بھی ہیں جو اس کی نجی جیل
 کے بارے میں بہت سے راز فاش کرتے ہیں۔ میں یہ تمام
 دستاویزی ثبوت حاصل کروں گا۔“
 ماں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیسے حاصل کرو گے؟“
 ”میں نے آپ کی سوکن سے کہا ہے کہ اس کی بہن
 نبیلہ سے شادی کروں گا لیکن اس وقت جب وہ تجوری سے
 میری مطلوبہ دستاویزات چرا کر لائیں گی۔ اور دونوں بہنوں
 نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد ہی ہاتھ کی صفائی دکھائیں گی۔“
 اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا وہ اتنی اہم چیزیں
 وہاں سے چرا کر لے آئیں گی۔“
 ”وہ بہت شاطر ہے۔ ابا کے ساتھ تجوری والے
 کمرے میں راتیں گزارتی ہے۔ وہ پینے کا عادی ہے اسے
 زیادہ پلاتی ہے اور اس کی مدد ہوگی سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ وہ
 ایک رات تجوری سے ایک دستاویز نکال کر میرے پاس
 لائی تھی۔ وہ میرے کام کی نہیں تھی۔ واپس لے گئی۔ وہ
 پڑھی لکھی نہیں ہے۔ اس لیے دیر ہو رہی ہے۔ اب تک ایک

ہی کام کی دستاویز ہاتھ لگی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ رفتہ رفتہ
 میرے کام کے کاغذات مجھے ملتے رہیں گے۔“
 ”میں تمہاری کامیابی کی دعائیں مانگوں گی۔“
 دوسرا بیٹا شاہ زاد بھی ماں کو بہت چاہتا تھا۔ باپ کا
 بھی فرمانبردار تھا۔ ثریا اور شاہ داد نے فی الحال اسے اس
 سنگین معاملے میں اپنا راز دار نہیں بنایا۔ تیسرا بیٹا ان سب
 معاملات سے دور لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔
 ایک ماہ کے اندر ہی اس کی سوتیلی ماں عقیلہ نے اس
 کے تمام مطلوبہ اہم کاغذات اسے لا کر دیے اور کہا۔ ”آپ
 وعدے کے مطابق میری بہن سے شادی کرو۔“
 اس نے کہا۔ ”ابا اپنی سالی سے میری شادی نہیں
 ہونے دے گا۔ پہلے میں نبیلہ سے چھپ کر نکاح پڑھاؤں گا
 پھر کچھ روز گزارنے کے بعد اس رشتے کا اعلان کروں گا۔“
 ”نکاح کب پڑھاؤ گے۔ کہاں پڑھاؤ گے؟“
 ”کل ابالا ڈکانہ چارہا ہے۔ تم نبیلہ کے ساتھ چھوٹی
 حویلی میں آ جاؤ۔ میں قاضی صاحب اور چند دوستوں کے
 ساتھ وہاں انتظار کروں گا۔“
 ”ایسا نہ ہو کہ تمہارا باپ اچانک واپس آ جائے؟“
 ”نہیں آئے گا۔ اس سے نہ ڈرو۔ خوش ہو جاؤ۔ آج
 تمہارا سوتیلہ بیٹا ہوں کل تمہارا بہنوئی بن جاؤں گا۔“
 وہ بولی۔ ”قاضی صاحب کو یہ رشتہ نہ بتانا۔ ہو سکتا ہے
 کہ یہ قابل اعتراض ہو۔ وہ نکاح نہیں پڑھا سکیں گے۔“
 ”فکر نہ کرو۔ کل ہماری نئی رشتے داری ہر حال میں
 ہوگی۔“
 وہ چھوٹی حویلی ان کی زمینوں کے ایک دور افتادہ حصے
 میں تھی۔ شاہ داد کا ایک ڈرائیور ان دو بہنوں کو بڑی راز داری
 سے وہاں لے آیا۔ حویلی کے اندر شاہ داد کے چار گن مین
 تھے۔ عقیلہ نے پوچھا۔ ”قاضی صاحب نہیں آئے؟“
 شاہ داد نے کہا۔ ”آجائیں گے۔ بیٹھو اور یہ بتاؤ کہ
 آج نہیں تو کل ابا کو چوری کا پتا چلے گا تو اسے کس پر شبہ
 ہوگا؟“
 عقیلہ نے کہا۔ ”سب سے پہلے تم پر شبہ ہوگا۔ وہ نشی
 حالت میں مجھ سے کہتا رہتا ہے کہ اسے تم پر بھروسہ نہیں
 ہے۔ تم اپنی اصلیت کو اندر چھپا کر رکھتے ہو اور اوپر سے
 فرمانبراد بن کر رہتے ہو۔ وہ صرف اپنے دو بیٹوں پر بھروسہ
 کرتا ہے۔“
 وہ بولا۔ ”تم درست کہہ رہی ہو۔ ابا مجھ پر شبہ کرتا
 ہے لیکن وہ کبھی سمجھ نہیں پائے گا کہ میں اس کی تجوری تک

کیسے پہنچا جبکہ ہم تین بیٹے کبھی اس کمرے میں نہیں جاتے
 اور جب وہ کہیں جاتا ہے تو اپنے کمرے کو مقفل رکھتا
 ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حویلی کے ملازم اس کے تابعدار
 ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں ہم تالا توڑنا چاہیں گے تو اسے
 خبر ہو جائے گی۔“
 عقیلہ نے پریشان ہو کر سوچا پھر کہا۔ ”وہ دو بیٹوں پر
 شبہ نہیں کرے گا۔ یہ سمجھے گا کہ تم نے کسی کے ذریعہ چوری
 کرائی ہے۔“
 وہ بولا۔ ”ذریعہ تو صرف تمہیں ہی بتاؤں گا کیونکہ
 ایک تم ہی ہو جو اس کی شراب نوشی اور مدد ہوشی کے دوران
 اس کمرے میں راتیں گزارتی رہی ہو۔“
 ”ہاں۔ وہ مجھ پر بھی شبہ کرے گا۔“
 ”تم پر بھی نہیں۔ صرف تم پر ہی شبہ کرے گا۔
 تمہارے سوا کوئی وہاں قدم نہیں رکھتا ہے۔ وہ پورے یقین
 کے ساتھ تمہاری گروں دیوے گا۔“
 نبیلہ نے سہم کر کہا۔ ”ہاجی کو نہ ڈراؤ۔ تم ہمارے
 ساتھ ہو۔ میں اس گھر کی بیوی بن جاؤں گی تو ہمارا پڑا بھاری
 ہوگا۔ ہم ہاجی پر الزام نہیں آنے دیں گے۔“
 شاہ داد نے کہا۔ ”الزام تو تم پر بھی آئے گا کیونکہ تم
 بھی دوبارہ اسی کمرے میں راتیں گزار چکی ہو۔“
 نبیلہ چونک گئی پھر غصہ دکھاتے ہوئے بولی۔ ”ابھی
 مجھ سے شادی کر رہے ہو اور الزام دے رہے ہو کہ میں نے
 تمہارے باپ کے کمرے میں راتیں گزار دی ہیں۔“
 وہ بولا۔ ”حویلی میں میرے بھی خبڑ ہیں۔ تم دونوں بہنیں جو
 بازاری مکمل مکمل رہی ہو وہ سب میرے علم میں ہے۔“
 ان کا بھید مکمل کیا تھا۔ انہوں نے پریشان ہو کر ایک
 دوسرے کو دیکھا پھر عقیلہ نے کہا۔ ”تم میری بہن پر جھوٹا
 الزام لگا رہے ہو۔ یہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔ اتنا
 شرمناک الزام لگاتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔“
 شاہ داد نے آگے بڑھ کر ایک زور کا طمانچا رسید
 کیا۔ پھر کہا۔ ”میں ایک ہی بات جانتا ہوں۔ چوری کا پتا
 چلتے ہی ابا تم دونوں پر تشدد کی انتہا کرتا رہے گا۔ پھر
 کیا ہوگا؟“
 اس نے کمرے سے جاتے ہوئے کہا۔ ”پھر تم دونوں
 نیم مردہ ہو کر میرا نام اگل دو گی۔ بہتر ہے کہ یہیں مردہ
 ہو جاؤ۔“
 وہ بولا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ وہاں صرف گن
 مین رہ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ہی دو گولیاں چلنے کی آواز

سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔
 دوسرے دن شاہ ولی میاں لاڈکانہ سے واپس آیا تو
 عقیلہ کو نہ پا کر ثریا سے پوچھا۔ ”تمہاری سوکن کہاں گئی ہے؟“
 اس نے کہا۔ ”وہ میری پابند نہیں ہے۔ مجھ سے پوچھ
 کر نہیں جاتی۔ میں کیا جانوں کہاں گئی ہے۔“
 اس نے عقیلہ کے میکے میں فون کیا۔ وہاں سے کہا
 گیا۔ ”کل صبح دس بجے ایک پرانی سی کار آئی تھی۔ دونوں بہنیں
 یہ کہہ کر گئی تھیں کہ حویلی میں جا رہی ہیں۔ کیا وہاں نہیں ہیں؟“
 وہ جھجھلا کر بولا۔ ”کیا یہاں ہوتیں تو میں تم سے
 پوچھتا۔ آخر وہ کل سے کہاں گئی ہے؟“
 اس نے اپنے تمام کارندوں کو فون پر حکم دیا کہ دونوں
 بہنوں کو تلاش کیا جائے۔ تھانے میں کم شدگی کی رپورٹ
 درج کرائی۔ پولیس بھی انہیں تلاش کرنے لگی۔ لیکن کسی کو
 ان کا نام و نشان تک نہیں مل رہا تھا۔
 یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون انہیں ایک پرانی کار میں لینے
 آیا تھا اور انہیں کہاں لے گیا تھا۔ وہ کار بھی کسی کو کہیں نظر
 نہیں آئی۔ کسی بڑے شہر کی ٹریفک میں جا کر ناقابل شناخت
 ہو گئی تھی۔
 شاہ ولی میاں ایک دن وہ تجوری کھول کر ایک
 ضروری کاغذ تلاش کر رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہاں
 اس کی بہت سی اہم دستاویزات نہیں ہیں۔ اس نے پریشان
 ہو کر ایک ایک دستاویز پر نظر ڈالی تو انکشاف ہوا کہ اس کے
 خلاف ایسے ایسے ٹھوس ثبوت تجوری کے باہر چلے گئے ہیں جو
 اسے قانون کی گرفت میں لا کر بھائی کے پھندے تک پہنچا
 سکتے ہیں۔ اس کی نجی جیل سے تعلق رکھنے والے کاغذات بھی
 غائب تھے۔ وہ خوف سے تھرا کر رہ گیا۔ وہ اس جیل کے
 پس پردہ کیا دھندا کرتا ہے یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس
 کا بہت ہی اہم راز طشت از بام ہونے والا تھا۔ وہ صدمہ
 سے زمین پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی ان دونوں بہنوں کی طرف
 دھیان گیا۔ ان کے سوا کوئی چرہ ہی نہیں سکتا تھا۔
 اس نے اپنے متعلق سوچا۔ ”کبھی کبھی میں اتنی پی لیتا
 تھا کہ مدد ہوش ہو جاتا تھا ایسے وقت عقیلہ اور نبیلہ میرے بیگ
 سے چابیاں نکال کر تجوری کھول لیتی ہوں گی۔
 میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ انہیں تجوری میں
 رکھے ہوئے کاغذات سے دلچسپی ہوگی۔ وہ پڑھنا لکھنا نہیں
 جانتی تھیں نہ کوئی کاغذ پڑھ سکتی تھیں۔ نہ ان کی اہمیت انہیں
 معلوم ہو سکتی تھی۔
 اور وہ ان پڑھ جاہل عورتیں ایسے ہی کاغذات لے گئی

ہیں جن کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ان کاغذات سے میرے دشمن ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیا وہ دونوں میرے کسی دشمن کا کام کرنے کے لیے بیوی اور سالی بن کر آئی ہیں؟“

وہ غصہ اور صدمے سے چیخ پڑا۔ دونوں بیٹوں کو بلا کر کہنے لگا۔ ”میرے اہم کاغذات چرائے گئے ہیں۔ مجھے ان غائب ہونے والی عورتوں پر شبہ ہے۔ میں انہیں کہاں جا کر پکڑوں؟“

وہ دو انگلیاں دکھاتے ہوئے بولا۔ ”پچھلے دو ہفتوں سے ہم انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ پولیس بھی تھک ہار کر بیٹھ گئی ہے۔ میں کیا کروں؟ ان حرام زادوں کو کہاں جا کے پکڑوں؟“

جس مجرم کو پکڑنا چاہیے تھا۔ اسی بیٹے کا بازو تھام کر بولا۔ ”بیٹے! کچھ کرو۔ کم از کم یہ تو معلوم کرو کہ وہ ہمارے کس دشمن کے لیے کام کر رہی ہیں اور کہاں جا کے سرگئی ہیں۔ ان کا نام و نشان بھی نہیں مل رہا ہے۔“

دوسرے بیٹے شاہ زاد نے کہا۔ ”ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ جن کے لیے کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے ہی ان دونوں کو مار ڈالا ہے تاکہ وہ بھی پکڑی جائیں تو ان کی نشاندہی کرنے کے لیے زندہ نہ رہیں۔“

شاہ ولی میاں نے کہا۔ ”میری اہم کمزوریاں دشمن کے ہاتھوں میں پھنسی گئی ہیں۔ اسے تو ڈنگے کی چوٹ پر لٹکا کر چاہیے تھا۔ وہ خاموش کیوں ہے؟ کیوں اب تک چھپا ہوا ہے؟“

شاہ داد نے کہا۔ ”ابھی اس کی کوئی مجبوری ہوگی یا کوئی حکمت عملی ہوگی۔ وہ آپ کو چیلنج کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہا ہوگا۔“

اور واقعی شاہ داد کو جلدی نہیں تھی۔ وہ خوب سوچ سمجھ کر باپ کی کمزوریوں سے کھینچنے والا تھا۔

شاہ ولی میاں اسی گلو میٹر تک پھیلی ہوئی زمینوں کا تنہا مالک تھا۔ وہاں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کے سر کارندوں کی ایک فوج تھی۔ دشمنوں سے یا اپنی زمین پر رہنے والے باغیوں سے نمٹنے کے لیے وہ فوج گھوڑوں پر اور جیب کاروں پر دندناتی پھرتی تھی۔

وہاں تھا نہ تھا اور سرکار سے تنخواہ پانے والی پولیس شاہ والے میاں سے بھی ہر ماہ فاضل تنخواہ لے کر اس کے تمام جرائم کی پردہ پوشی کیا کرتی تھی۔

ڈاکو ہوں قاتل ہوں یا سیاسی مجرم ہوں وہاں کسی خوف اور اندیشے کے بغیر آرام اور اطمینان سے رہتے تھے۔

جو غریب مفروضہ مجرم ہوتے تھے وہ شاہ ولی میاں کی ضرورت کے وقت کام آنے والے فوجی بن جاتے تھے۔ اس کے لیے واردائیں کرتے تھے پھر اسی جیل میں

آکر چھپ جاتے تھے۔

شاہ داد میاں وہاں کی جیل سے زمینوں سے اور آم کے باغات سے ہونے والی آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ باپ اپنی زندگی میں دیئے والے انہیں تھا۔ اس کی صحت بتا رہی تھی کہ جلدی مرنے والا بھی نہیں ہے۔

اب یہ موقع ملا تھا وہ باپ کی کمزوریوں سے کھیل کر اس سے منہ مانی رہیں وصول کرتا رہتا۔ وہ باقاعدہ پلاننگ کے مطابق کام کرنے لگا۔ اس نے ایک ایسے ایسے کے فنکار کو اچھی خاصی رقم دے کر اپنا راز دار بنایا جو کسی کی بھی آواز کی اور لہجے کی نقالی بڑی مہارت ہے کرتا تھا۔

اس کا نام کچھ اور ہوگا۔ اس کے اور اپنے فن کے حوالے سے متوالا کہلاتا تھا۔ شاہ داد میاں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ شاہ ولی میاں کو کب فون پر مخاطب کرے گا اور اس سے کیا بولے گا۔

اس نے ایک کاغذ پر اسکرپٹ کی طرح تمام اہم باتیں لکھ کر متوالا کو دی تھیں۔ تاکہ اسے ہر بات یاد رہے اور وہ فون پر بے جھجک بول سکے۔

شاہ ولی میاں ایک روز اپنے بیٹوں کے ساتھ آم کے ایک باغ میں آیا۔ وہاں متوالا کے فون نے اسے متوجہ کیا۔ شاہ ولی نے فون دیا کہ اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو کون ہے؟“

دوسری طرف سے بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔

”بعض اوقات فولادی تجوریاں موم ہو جاتی ہیں۔ تازک عورتیں انہیں کھول کر اپنا کام دکھا جاتی ہیں۔“

یہ سنتے ہی وہ بیٹوں سے بولا۔ ”وہ بول رہا ہے۔“

شاہ داد نے انجان بن کر پوچھا۔ ”کون؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اچھا تو بیٹا بھی تمہارے ساتھ ہے۔ چلو اسے بھی معلوم ہو جائے گا کہ تجوری کے کاغذات کیا گل کھلانے والے ہیں۔ زمینوں سے ہونے والی آمدنی کے علاوہ نجی جیل سے ہونے والی حرام کی کمائی میں بیٹے بھی باپ کے ساتھ ہیں۔ باپ پھنسے گا تو بیٹے بھی پھنسیں گے۔“

شاہ ولی نے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”یہ بتانا تو فون نہ کرتا۔ ابھی تمہارے سامنے ہوتا۔“

”ان تمام دستاویزات کی کیا قیمت لو گے؟“

”تمام کاغذات میرے ہی پاس رہیں گے۔ انہیں حفاظت سے رکھنے کا معاوضہ ایک لاکھ روپے ماہانہ لوں گا۔“

”ہر ماہ ایک لاکھ روپے کی ادائیگی مذاق نہیں

ہے۔ اوقات میں رہ کر بولو۔“

”میری اوقات یہ ہے کہ میں آرمی والوں کے بہت قریب ہوں۔ میں پولیس اور انجینئرس والوں کو گنتی میں نہیں لاتا۔ جب چاہوں گا آرمی کے جوان اس عجرمانہ جیل میں پہنچ جائیں گے۔ انہیں رشوت سے خرید نہیں سکو گے۔“

وہ تینوں اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے اس جیل کے نہ خانے کا بھی علم ہے جہاں جا کر اصل مفروضہ مجرم چھپ جایا کرتے ہیں۔

عجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے اکثر سیاستدان اقتدار کی کرسی سے گرتے ہی ملک سے فرار ہو جاتے ہیں۔ دو برس پہلے ایک سیاستدان گرفتاری سے بچنے کے لیے کس طرح فرار ہوا تھا یہ کوئی نہ جان سکا۔ وہ نہ تو ہوائی جہاز سے گیا تھا نہ بحری راستے تھے۔ خشکی کے راستے سے بھی اس نے سرحد پار نہیں کی تھی۔ پولیس انجینئرس اور آرمی والے اسے ڈھونڈتے ہی رہ گئے تھے اور وہ شاہ ولی کی جیل میں پہنچ کر عیش و آرام سے تھا۔ آئندہ انکیشن میں اس کی پارٹی جیتے گی تو وہ پھر منظر عام پر سیاست کے میدان میں آئے گا۔

متوالا فون پر بول رہا تھا۔ ”قومی دولت لوٹنے والا ایک اعلیٰ عہدیدار بھی وہاں چھپا ہے۔ لاکھوں روپے کمانے والا ایک جعلی کمپنی کا مالک بھی وہاں آرام سے ہے۔“

شاہ ولی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”چپ ہو جاؤ۔ ماہانہ پچاس ہزار روپے خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ۔“

”ایک لاکھ سے کم نہیں لوں گا۔ جو کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہے۔“

اس کے علاوہ وہاں میرا ایک نمائندہ دن رات رہے گا۔ یوں سمجھو وہیں زندگی گزارے گا۔ نجی جیل کے پاس جو تین کمروں والا مکان ہے جہاں تمہارے سرکارندے رہتے ہیں اسے خالی کراؤ۔ میرا وہ نمائندہ وہیں رہا کرے گا۔ اس نمائندے پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کرو گے۔ اسے نجی جیل کے گراؤنڈ فلور سے نہ خانے تک جاتے آتے رہنے کی آزادی دو گے۔ اسے ذرا بھی نقصان پہنچایا جائے گا تو اس سے زیادہ نقصان تم اٹھاؤ گے۔“

”یہ مناسب نہیں ہے۔ وہ نمائندہ یہاں کی تمام ضروریات کا بھیدی بن کر رہے گا۔“

”یہی تو میرا کھیل ہے۔ اس بھیدی سے تمہارے تمام بھید مجھے معلوم ہوتے رہیں گے۔“

شاہ ولی نے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ تم کب تک چھپے رہو گے؟ ماہانہ رقم کیسے وصول کرو گے؟ کوئی تو اتنی بڑی رقم لینے

آئے گا۔ یا ہمیں وہاں پہنچانا ہوگا۔“

”رقم پہنچانے کے لیے کہیں دور نہیں جاؤ گے میرے نمائندے کو دیدیا کرو گے پھر اس ٹوہ میں نہیں رہو گے کہ وہ رقم کس طرح کہاں پہنچاتا ہے؟“

شاہ داد کے لیے رقم حاصل کرنا آسان تھا۔ پلاننگ کے مطابق وہ نمائندہ ماہانہ رقم اپنے پاس رکھتا۔ شاہ داد وہاں آتا جاتا رہتا پھر موقع پا کر اس سے رقم لے جاتا۔

شاہ ولی یہ دیکھتا کہ نمائندہ وہاں رہ کر کیا کر رہا ہے؟ لیکن یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ فون کے ذریعہ کہاں خبریں پہنچا رہا ہے اور اسے کہیں خبریں پہنچانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جیسا کہ شاہ داد باپ کے ساتھ تمام دھندے میں ملوث رہتا تھا۔ وہ اندر کی ایک ایک بات جانتا تھا۔ اس نے یوں ہی باپ کو آتو بتانے کے لیے اس نمائندے کو خبر بھی بنا دیا تھا۔

ایسی ٹھوس اور جامع پلاننگ کے بعد وہ پچھلے ایک برس سے ماہانہ ایک لاکھ روپے کما رہا تھا۔ باپ کی کوئی اور کمزوری پکڑ کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت معلوم ہوا کہ وہاں کسی ماروی نام کی لڑکی کو لایا جا رہا ہے۔

جب اس کا باپ فون پر جیلر لا اور جان سے ماروی کے متعلق باتیں کر رہا تھا تو شاہ داد وہاں بیٹھا سن رہا تھا۔ ان کی گفتگو ختم ہونے کے بعد اس نے کہا۔ ”پہلی بار کسی لڑکی کو اس جیل میں لایا جا رہا ہے۔ کیا وہ کسی معاملے میں بہت اہم ہے؟“

وہ بولا۔ ”جیلر میرا دوست ہے۔ پرانی شناسائی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا جلد ہی اس لڑکی سے مالی فائدہ پہنچے گا۔ وہ ایک قاتل کی اور ایک ارب پتی کی معشوقہ ہے۔ ارب پتی اس کی حفاظت اور سلامتی کے لیے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرتا رہے گا۔ اس کے برعکس وہ قاتل اپنی ماروی کی خاطر ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گا۔“

شاہ داد یہ سن کر بے چین ہو گیا کہ ماروی کے ذریعہ کروڑوں روپے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس نے باپ سے کہا۔ ”وہ لڑکی بہت قیمتی ہے۔ اسے جیل میں نہ رکھا جائے ہم اسے حفاظت سے نہیں رکھیں گے۔ اسے برباد کر دیں گے تو وہ ارب پتی اس کے عوض ایک پیسا بھی نہیں دے گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”مرید لندن کی ایک بہت بڑی پولیس افسر ہے۔ وہ باپ بیٹی ہماری اس جیل کے بارے میں جانتے ہیں۔ لیکن وہاں نہ خانہ ہے یہ نہیں جانتے۔ وہ ہمارے خفیہ معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرے گی۔ اس چالباز عورت سے ہوشیار رہنا ہوگا۔“

شاہ داد کروڑوں روپے دینے والے عاشق کے معاملے میں ہوشیاری دکھانے کی سوچ رہا تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ ماروی کو چھپا کر رکھنے کا معاوضہ باپ کی جیب میں نہ جائے۔ پورا کا پورا اس کے ہاتھ لگتا رہے۔ اس نے پوچھا۔ ”اس ارب پتی کا نام کیا ہے؟“

”محبوب علی چانڈیو... فیشن انڈسٹریز کا مالک ہے۔“

شاہ داد باپ کے پاس سے اٹھ کر حویلی کے باہر آ گیا۔ اس نے فون نکال کر نمبر شیخ کیے۔ پھر اسے کان سے لگا یا۔ دوسری طرف کال بیل سنائی دے رہی تھی۔ پھر ایک شناسا آواز سنائی دی۔ ”ہیلو شاہ داد! کیسے ہو؟“

”بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہارا بونٹیک کیسا چل رہا ہے؟“

وہ بولا۔ ”طارق روڈ پر بیٹھا ہوں یہاں فیشن سے تعلق رکھنے والے کاروبار خوب چلتے ہیں۔“

”کیا وہاں کسی فیشن انڈسٹریز کے مالک محبوب علی چانڈیو کو تم جانتے ہو؟“

”کیسے نہیں جانوں گا۔ ان کا ہی مال فروخت کرتا ہوں۔“

”تمہارا ان سے فون پر رابطہ رہتا ہوگا۔“

”بالکل رہتا ہے۔ باپ دادا سے یہ اچانک تمہیں ان سے کیوں دلچسپی ہو گئی ہے؟“

اس نے دلچسپی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس سے پوچھا۔ ”کیا محبوب علی چانڈیو کا فون نمبر دے سکتے ہو؟“

”بھئی وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔ ہم جیسے دکانداروں سے بات نہیں کرتا ہے۔ ہمارا رابطہ اور لین دین اس کے مارکیٹنگ منیجر سے رہتا ہے۔“

”کیا اس منیجر سے اس کا نمبر معلوم کر سکتے ہو؟“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”یار! بات کیا ہے؟ کیا اس ارب پتی کی پھڑی ہوئی محبوبہ کو اس کے پاس پہنچاؤ گے؟“

”اچھا تو تم اس کے عشق کی داستان جانتے ہو؟“

”یہاں کون نہیں جانتا؟ پورے کاروباری حلقے میں ماروی اور محبوب کا نام گونج رہا ہے۔ سنا ہے چانڈیو اس کے عشق میں رانچا کی طرح جوگی بن گیا ہے۔ دنیا داری چھوڑ کر اس کی تلاش میں کہیں گم ہو گیا ہے۔“

شاہ داد نے کہا۔ ”میں نے بھی سنا ہے اسے ڈھونڈ کر لانے والے کے لیے لاکھوں روپے کا انعام رکھا گیا ہے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اچھا تو اسے ڈھونڈنے کے لیے اس کا فون نمبر چاہتے ہو۔“

شاہ داد بھی ہنستے ہوئے بولا۔ ”بھی سمجھ لو۔ سخی کی کمائی میں سب کا حصہ تمہارا بھی۔ اگر میں نے ڈھونڈ لیا اور

لاکھوں روپے مل گئے تو تمہیں بھی کچھ دے ہی دوں گا۔“

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ پھر دکاندار دوست نے کہا۔ ”کوئی جوگی اپنے پاس فون نہیں رکھتا۔ میں چانڈیو کے ایک بزرگ اور نگران اعلیٰ معروف نجی کا فون نمبر بتا رہا ہوں۔ کیا ان سے بات کرو گے؟“

”ہاں۔ نمبر بتاؤ۔“

اس نے نمبر بتائے شاہ داد نے اسے فون میں لگا لیا۔ رابطہ ختم کر کے سوچتے لگا۔ ایک ارب پتی نے اس کے عشق میں جوگ لیا ہے۔ تعجب ہے۔ وہ لڑکی کتنی حسین و جمیل ہوگی۔ اس نے تو جنس اور بے چینی پیدا کر دی ہے۔ میں دیکھوں گا کہ کیسی ہے چند گھنٹوں میں یہاں آنے والی ہے۔

☆☆☆

سمیرا اور معروف نجی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وڈیرا حشمت جلالی مقدمہ بازی سے باز آنا چاہے گا اور ان سے بھجوتا کرنا چاہے گا۔

معروف آفس میں محبوب کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وکیل نعیم وڑائی اس سے ملنے آیا اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تعجب ہے۔ دریا الٹا بہہ رہا ہے۔ آپ کہیں بھول سے تو نہیں آگئے...؟ آئیں۔ تشریف رکھیں۔“

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں بھول چوک سے بچنے کی کوششیں کرتا ہوں۔ البتہ وڈیرا حشمت جلالی سچ کا بھولا ہے شام کو گھر آنا چاہتا ہے۔“

”آپ اس بات کی وضاحت کریں۔“

”حشمت جلالی بھجوتا کرنا چاہتا ہے۔ مراد کے معاملے کو عدالت کے باہر ختم کر دینا چاہتا ہے۔“

”وہ اچانک کافر سے مسلمان کیوں ہو رہا ہے؟“

وکیل نے کہا۔ ”یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ حضرات نیکی کریں اسے مسلمان ہونے دیں۔“

”بے شک مقدمہ بازی ختم ہوگی تو ہم بھی فضول بھاگ دوڑ سے بچیں گے۔ اپنے کاروبار پر پوری توجہ دیں گے لیکن معلوم تو ہو کہ اچانک صبح کیوں کی جارہی ہے؟ ہم شہر کر سکتے ہیں کٹ مٹائی کے پیچھے بھی دشمن کی کوئی چال ہوگی۔“

”آپ ہر طرح سے اطمینان کر لیں۔ حشمت جلالی سے یا تو ملاقات کریں یا ابھی فون پر بات کریں۔ پھر آپ مطمئن ہوں گے۔ راضی ہو جائیں گے تو صلح ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے آپ اس سے بات کر لیں۔“

سمیرا ایک قائل لے کر کمرے میں آئی۔ معروف نے کہا۔ ”یہاں بیٹھو اور ایک چوٹکا دینے والی خبر سنو۔ حشمت

جلالی مقدمہ ختم کرنا چاہتا ہے۔“

سمیرا نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے نعیم وڑائی کو دیکھا۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”جلالی صاحب میں درانی بول رہا ہوں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا تھا“ محبوب علی چانڈیو کہیں گئے ہیں۔ معروف نجی صاحب ان کے قائم مقام ہیں۔ مقدمہ کے سلسلے میں ان سے ہی معاملات طے ہو سکتے ہیں۔“

اس نے تھوڑی دیر تک دوسری طرف کی باتیں سنتے رہنے کے بعد کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں معروف صاحب کو فون دے رہا ہوں۔ ان سے بات کریں۔“

اس نے فون معروف کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے لے کر کان سے لگا کر بولا۔ ”جی حشمت جلالی صاحب! فرمائیں۔“

حشمت نے کہا۔ ”مراد کا جو مقدمہ لڑا جا رہا ہے۔ اس کے گمراہ آپ ہی ہیں؟“

”جی ہاں۔ میں محبوب کے بڑنس سے لے کر گھر تک کے تمام معاملات کی گمراہی کرتا ہوں۔“

”میں نے مراد پر خواہ مخواہ مقدمہ دائر کیا ہے۔ ہم ایک پیشی بھی بھگت چکے ہیں۔ آگے میں نہیں چاہتا۔ میں تھک گیا ہوں۔ یہ مقدمہ ختم ہو جائے تو ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔“

”آپ نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا ہے؟“

”میں بہت بیمار رہنے لگا ہوں۔ میری بیماری ڈاکٹر کی بھی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ مشکل کہتی ہے ایسی حالت میں عدالت کے چکر نہ لگاؤں۔ رقم ضائع نہ کروں۔ مجھے جیسے بیمار کو آرام اور سکون سے رہنا چاہیے۔“

”میں بحث نہیں کروں گا صلح اس شرط پر ہوگی کہ آپ کی کوئی شرط نہیں مانی جائے گی۔“

”میری طرف سے لین دین کی کوئی شرط نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے پھر میں وڑائی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اس مقدمہ کو کس طرح قانونی طور پر ختم کیا جائے گا؟“

فون کار رابطہ ختم ہو گیا۔ وکیل درانی نے کہا۔ ”اسے ختم کرنے میں کوئی درد دوسری نہیں ہوگی۔ ہمارے اور آپ کی طرف سے صلح مٹائی کی درخواست پیش کی جائے گی۔ پھر ایک ہی پیشی میں یہ کیس ختم ہو جائے گا۔“

سمیرا نے کہا۔ ”یہ ثابت نہیں ہوا ہے کہ مراد نے دلچا کو واقعی قتل کیا تھا یا نہیں؟ وہ قتل ہر حال میں جرم ہے۔ اسے قانون کیسے معاف کرے گا؟“

درانی نے کہا۔ ”اگر عدالت کی طرف سے ایسا

اعتراض اٹھایا جائے گا تو ہم تحریری بیان دیں گے کہ مراد کی طرف سے خون بہا کی ادائیگی ہو چکی ہے۔ جب کسی اعتراض کے بغیر مقدمہ عدالت سے خارج کر دیا جائے گا۔ مراد کو رہائی مل جائے گی۔“

معروف نے کہا۔ ”ہمیں منظور ہے۔ ہمارا وکیل آج ہی آپ سے ملے گا۔ آپ دونوں کو شش کریں کہ یہ کیس جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ بے چارے مراد کو رہائی مل جائے۔“

”جج صاحبان ایسے صلح مٹائی کے معاملات عدالت سے باہر اپنے جیمبر میں نٹاتے ہیں۔ اس کے لیے خصوصی وقت دیتے ہیں۔ ایک یا دو ہفتے میں یہ معاملہ نٹ جائے گا۔“

وکیل نعیم وڑائی مصافحہ کر کے چلا گیا۔ سمیرا نے خوش ہو کر کہا۔ ”یہ تو کمال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصی مدد مل رہی ہے۔ مراد کو رہائی ملے گی تو آپ فوراً ہی ماروی سے اس کا نکاح پڑھا دیں۔ وہ اس کی شریک حیات بن جائے گی پھر محبوب صاحب اخلاقا اس کی طلب سے باز آ جائیں گے۔“

معروف نے کہا۔ ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اس کا عشق ختم ہو یا نہ ہو۔ کم از کم جنون ہی ختم ہو جائے اور وہ پہلے کی طرح بڑنس کی طرف دھیان دینے لگے۔“

”پتا نہیں وہ کہاں ہوں گے؟ انہیں کس طرح معلوم ہوگا کہ مراد کو رہائی ملنے والی ہے؟ جیسے ہی انہیں معلوم ہوگا وہ ہم سے ضرور رابطہ کریں گے۔“

”ہم تو کئی ذرائع سے اسے بتاتے آرہے ہیں کہ ماروی زندہ ہے وہ واپس آ جائے۔“

وہ کرسی پر پھلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”تعجب ہے وہ جہاں بھی ہے وہاں کیا فی وی نہیں دیکھتا ہوگا؟ اخبار نہیں پڑھتا ہوگا؟ ہمارا ایک بھی پمفلٹ اس کی نظروں سے نہیں گزرا ہوگا؟“

وہ بولی۔ ”اگر ہمارا ایک بھی اشتہار ان کے سامنے آئے گا تو وہ فوراً ہم سے رابطہ کریں گے آخر وہ کہاں ہیں کہ ہماری آواز ان تک نہیں پہنچ رہی ہے؟“

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے تھا۔ اسے چاہنے والے اسے واپس بلانے والے کسی یہ ناممکن سی بات سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ وہ مراد کی جگہ بیٹھا ہوا ہے۔ جب صلح مٹائی کے نتیجے میں رہائی ملے گی تو حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ جیل سے باہر مراد نہیں محبوب علی چانڈیو چلا آ رہا ہے۔

واقعی وہ دن انتہائی حیرتوں کا اور مشرکوں کا ہوگا جب وہ جیل سے باہر آئے گا۔ اس روز سمیرا اور معروف پر حیرتوں

کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ ان کے سامنے جیسے جادو سے گمشدہ محبوب آجائے گا۔

میرا نے کہا۔ ”بیچارہ مراد بے قصور جیل میں پڑا ہوا ہے۔ کیا اسے خوش خبری سنائی جائے۔ وہ غریب ایسا قیدی ہے کہ اس سے ملنے والی ماروی بھی دور چلی گئی ہے۔ اسے معلوم ہوگا کہ رہائی ملنے والی ہے تو وہاں اس قیدی کی زندگی کچھ روز کے لیے آسان ہو جائے گی۔“

معروف نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”اس غریب سے زندگی کی سرستیں چھین لی گئی ہیں۔ ہم اسے خوش خبری سنا کر تھوڑی سی خوشیاں دے سکتے ہیں۔“

اس نے میز پر سے فون اٹھا کر جیلر دلاور جان کے نمبر پر دیا۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”میں معروف چلی بول رہا ہوں۔“

”جی معروف صاحب! فرمائیں کیسے یاد کیا؟“

”میں مراد سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں پھڑوں کو ملانے کا نیک کام کرتا ہی رہتا ہوں۔ آپ اجازت نامہ لے آئیں۔“

”قانون عدالت اور اجازت نامہ تو آپ ہیں۔ محبوب سے جو لین دین تھا مجھ سے بھی ہو سکتا ہے۔“

”سوری۔ یہ فی الحال نہیں ہو سکے گا۔ یہاں کے موجودہ حالات مجھے اجازت نہیں دیں گے۔“

”آپ ہمارا پیغام دینا چاہیں گے؟“

”ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ فرمائیں پیغام کیا ہے؟“

”مدعی شہادت جلالی مقدمہ کو ختم کر رہا ہے۔ ہمارے درمیان سمجھوتا ہو گیا ہے۔ مراد کو جلد ہی رہائی مل جائے گی۔“

جیلر فون کو کان سے لگائے خلا میں تک رہا تھا۔ تصور میں محبوب کو رہائی پاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ معروف نے پوچھا۔ ”آپ چپ کیوں ہیں؟“

وہ خیالات سے چونک کر بولا۔ ”میں حیران ہوں کہ اچانک مراد کی قسمت چمک رہی ہے۔ میں ابھی یہ خوش خبری سناؤں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے بیٹی کی ضد مان کر انتہائی احقانہ اور بھرماتہ غلطی کی تھی۔ قیدیوں کو تبدیل کیا تھا۔ جب سے اندر ہی اندر رہا تھا کہ اتنے بڑے جرم کا بھی انکشاف ہوگا تو اس کی نوکری بھی جائے گی اور جیل کی کوئی کوشش اس کے مقدمہ میں لکھ دی جائے گی۔

مرینہ نے باپ سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ وہ مراد کو دونوں میں واپس لے آئے گی۔ پھر اسے باہر لے جانے کے بعد یہ جھوٹ بولے گی کہ مراد اس سے رسیاں تزا کر بھاگ

کیا ہے اور وہ سچ سچ فرار ہو گیا تھا۔

اس کے بعد جیلر کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ وہ مجبور ہو گیا تھا۔ اب اسے ہر حال میں محبوب کو مراد بنا کر رکھنا تھا۔ ورنہ کسی وقت بھی اس کی شہادت آسکتی تھی۔

ابھی معروف چلی نے مراد کے لیے جو خوش خبری سنائی۔ وہ دراصل جیلر کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ اگر مقدمہ ختم ہو جاتا۔ محبوب جلد ہی رہائی پا کر جیل سے چلا جاتا تو جیلر کو تمام اندیشوں سے نجات مل جاتی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا جیل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا قیدی نمبر سات سوسات کے سیل میں آیا۔ وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جیلر کو دیکھ کر فوراً ہی سلاخوں کے پاس آکر بولا۔ ”کیا ماروی جام تھارو پہنچ گئی ہے؟“

”نہیں۔ رات تو یادیں بچے تک پہنچ گئی۔ اس کی فکر نہ کرو۔ وہ میری بیٹی کے ساتھ ہے۔ ایک زبردست خوش خبری سنو۔ ڈیرا جلالی تمہارے مقدمہ سے ہاتھ اٹھا رہا ہے۔ سمجھوتا کر رہا ہے۔ جلد ہی تمہیں یہاں سے رہائی مل جائے گی۔“

محبوب نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”شیطان کبھی فرشتہ بن ہی نہیں سکتا۔ وہ دشمن ماروی کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ سمجھوتا کبھی نہیں کرے گا۔“

”تم یقین کرو یا نہ کرو۔ ابھی تمہارے معروف چلی نے کہا ہے کہ میں یہ خوش خبری بیچارے مراد تک پہنچا دوں اور مراد تو سلاخوں کے پیچھے تم ہی ہو۔ جو معروف صاحب تمہارا پورا کاروبار سنبھال رہے ہیں اور تمہارے ذہنی معاملات سے نمٹتے رہتے ہیں کیا وہ جھوٹ بولیں گے؟“

وہ خوشی سے کھل گیا۔ ”اگر معروف صاحب نے یہ کہا ہے تو پھر مجھے یقین کرنا چاہیے۔“

دشمن کا سمجھوتا کرنا مقدمے کا ختم ہونا اور جھوٹے الزام سے بری ہونا بہت بڑی بات تھی۔ محبوب نے سیل میں ایک طرف جا کر قلم رو ہو کر سجدہ کیا۔ وہ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ ادھر ماروی مل گئی تھی۔ ادھر رہائی ملنے والی تھی۔ وہ سجدہ کرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا تھا۔ ایسے وقت دل میں بات آئی کہ مراد اگر کسی ڈیڑھ سے کی جیل میں ہے اور مرینہ ماروی کو اس سے ملانے لے جا رہی ہے تو اس سے پہلے فون کے ذریعہ مراد سے بات ہو سکتی ہیں۔

اس نے سلاخوں کے پاس آکر جیلر سے پوچھا۔ ”مراد جام تھارو کی ایک جیل میں ہے؟“

”ہاں۔ میری بیٹی ماروی کو اسی کے پاس لے جا رہی ہے۔“

”بیٹی کو فون کریں جہاں ہے وہاں رک جائے۔ ابھی جام تھارو نہ جائے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ کیوں نہ جائے؟“

”پہلے فون پر مراد سے ماروی کی بات کرائی جائے۔“

”وہ ڈیرا سر پھرا ہے۔ فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں دے رہا ہے۔“

”جو فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں دے رہا ہے وہ ملاقات کی اجازت کیوں دے رہا ہے؟ کیا اس لیے کہ ماروی وہاں آئے اور اسے بھی اپنی جیل میں ڈال دے؟“

”وہ ایسا نہیں کرے گا۔ میرا دوست ہے۔ ماروی اور مرینہ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

”مجھے مرینہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ابھی فون کرو اور مرینہ سے پوچھو جب ماروی فون پر مراد کی آواز سن لے تب اسے وہاں لے جائے۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”کیا تم مجھے حکم دے رہے ہو؟“

”میں التجا کر رہا ہوں۔ پلیز ابھی فون کرو۔ میری ماروی کو ادھر جانے سے روک دو۔ مجھے یقین کرنے دو کہ جہاں وہ جا رہی ہے وہاں مراد ہے اور وہ اپنے مراد سے مل پائے گی۔“

”یہ تمہیں چند گھنٹوں کے بعد معلوم ہو جائے گا۔“

”جب ابھی معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ فون پر مراد کی آواز سن سکتی ہے تو پھر چند گھنٹوں کے بعد کیوں؟“

”میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ میری بیٹی جو بہتر سمجھ رہی ہے وہ کر رہی ہے۔“

وہ غصہ سے بولا۔ ”تم دونوں باپ بیٹی فراڈ ہو۔ پتا نہیں میری ماروی کے ساتھ کیا کرنے والے ہو۔ میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ فون کرو اور اسے جام تھارو جانے سے روکو۔ ورنہ میری دشمنی پہنچی پڑے گی۔“

جیلر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر کہا۔ ”دشمنی اور توکرے؟ پتھرے میں رہ کر چیخے گا چلائے گا اور زیادہ سے زیادہ گالیاں دے گا اور کیا کرے گا؟“

پھر حقارت سے بولا۔ ”قسمت تجھ پر مہربان ہے۔ تجھے جلد ہی رہائی ملنے والی ہے۔ جا اور ایک بار سجدہ کر رہائی ملے تک اللہ اللہ کرتا رہ۔ اپنی اوقات میں رہے گا تو

عزت سے باہر جائے گا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ کر جانے لگا۔ محبوب نے یکبارگی کھینچ کر کہا۔ ”میں محبوب علی چانڈیو ہوں۔ قیدی نمبر سات سوسات مراد علی سنگی نہیں ہوں۔“

جیلر کے اندر جیسے دھماکا ہوا۔ وہ ایکدم سے اچھل کر پلٹ کر دوڑتا ہوا آیا۔ ”ارے یہ کیا بول رہا ہے۔ چپ ہو جا۔۔۔“

وہ سلاخوں کے درمیان دونوں ہاتھ لے جا کر اس کا منہ بند کرنا چاہتا تھا۔ محبوب نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ ”میں اپنی اوقات بتا رہا ہوں۔ اب تو دیکھو گے کہ میں کیسی دشمنی کروں گا۔“

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”فار گاڈ سیک آہستہ بول۔ میں بھول گیا تھا کہ تو کیسی دشمنی کر سکتا ہے۔ ذرا عقل سے کام لے۔ یہاں اپنی اصلیت ظاہر کرے گا تو جو رہائی ملنے والی ہے وہ نہیں ملے گی۔ تجھے پھر اس جرم میں حید سزا ملے گی کہ تو نے اصل قیدی کو فرار کرانے کے لیے قانون کے محافظوں کو دھوکا دیا ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”اور اس دھوکے بازی میں جیلر دلاور جان نے اپنی بیٹی کی خاطر جی جان سے ساتھ دیا ہے۔ پھر حیرا کیا بنے گا؟ تو بھی اسی سیل میں رہنے آئے گا۔ ہم دونوں یہاں مل کر بھائی کی طرح رہیں گے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”محبوب صاحب! آپ بہت ذہین ہیں۔ اپنی ذہانت سے سوچیں سمجھیں آپ کو اسی طرح رازداری سے رہ کر رہائی پا کر باہر جانا چاہیے۔“

”میں ماروی کے لیے یہاں آیا ہوں۔ وہ زندہ نہ ہوتی تو مزائے موت پا کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ خدا کا شکر ہے وہ زندہ سلامت ہے۔ اگر وہ جام تھارو جائے گی اس کی سلامتی پر اس کی عزت پر ذرا بھی آج آئے گی اور وہ کل صبح تک کراچی نہیں آئے گی تو میں اس کے بغیر یہاں سے باہر نہیں جاؤں گا۔“

”وہ سلامتی سے رہے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”یہ وعدہ کرو کہ کل صبح تک میرے بزرگ معروف چلی کے پاس پہنچ جائے گی ورنہ کل کے بعد میں تمہاری وردی اتروادوں گا۔“

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ ”وہ کراچی نہیں آسکے گی۔ مرینہ مراد کو پھانسنے کے لیے اسے چارہ بتا رہی ہے اور اسے جی جیل میں چھپا کر رکھنے والی ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”سوچنے میں وقت ضائع نہ

ستم ظریف

امجد نس

غیروں پر غیروں کا ستم تو روایتی انداز میں زندگی کا حصہ ہے مگر... اپنوں پر اپنوں کا ظلم... خواہ کتنا ہی روایتی اور پرانا قصہ ہو لیکن جب جب ہوا دلوں پر ایک الگ ہی نقش چھوڑ گیا۔ دولت کی ہوس شاید اپنے پرانے کی تمیز بھی کھو دیتی ہے۔ یہی حال ان خون کے رشتوں کا بھی تھا جو گھر کے بھیدی لنگا ڈھار رہے تھے۔

انوار رائے تادان کی ایک چونکا دینے والی روداد

26 مئی

مسٹر ہنٹر! "خالص مال" کو ابھی حالت میں رکھیے۔ ہدایت کے مطابق میں نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ نہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔ یکم اور میں دیا اندازی کے ساتھ سودا خانا میں گئے۔ تاہم آپ کے معلومات کے ذرائع میں غامی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیونکر اور کب تک کر سکوں گا۔ تاہم سودے کے معاملے میں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ اور آپ سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "خالص مال" کو نقصان پہنچنے کی صورت میں یہ تعاون فوراً ختم ہو جائے گا۔

بے چین و منتظر..... کلارک فورٹھ کیو

☆☆☆

ڈیڑ مسٹر فورٹھ کیو! معصوم نہ بنیں، نہ ہمارے ذرائع کو چیلنج کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ حذر کر رہے ہیں۔ ہمارے دست کر سکتے ہیں۔ تاہم آپ نے تعاون کے حوالے سے جو باتیں کی ہیں تو ہم آپ کو 25% رعایت دے رہے ہیں۔ آپ 750,000 ڈالرز تیار رکھیں تاکہ ہم "خالص مال" کی ڈیوری کا بندوبست کریں۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ آپ کا مطلوبہ آئٹم ہمارے ہاتھ سے جلد ترسیل ہو جائے۔

پُر یقین..... اے، ہنٹر

☆☆☆

ڈیڑ مسٹر ہنٹر!

یہ خط میں لان میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں اور برسوں میں پہلی بار سکون اور اطمینان محسوس کر رہا ہوں۔ صاف سوچ کے ساتھ پراحت ہوں کہ میں سودے کو بھرپور انداز میں پیش کر رہا ہوں۔ آپ نے 25% رعایت دے کر اپنی مقبولیت پسندی کا ثبوت دیا ہے..... ایسے لوگوں سے کوئی بھی دوسرا مقول شخص احقاد اور

سٹائیس مئی، صبح سات بجے۔ ٹیلی فون کال، مسٹر کلارک "فورٹھ کیو" کے لیے۔ فورٹھ کیو مینشن، لانگ آئی لینڈ۔ "مسٹر فورٹھ کیو، بولنا مت..... صرف سنتے جاؤ، فون کالز آسانی سے کھول لی جاتی ہیں، لیکن خطوط نہیں..... یہ کال پہلی اور آخری ہے، نیز بہت مختصر ہے۔ تمہاری 10 سالہ سوتیلی بیٹی اموجن ہمارے پاس ہے۔ آئندہ ٹائپ شدہ خطوط میں اسے "خالص مال" لکھا جائے گا۔ مزید معلومات کے لیے خطوط کا تبادلہ ویران "گارور فارم" کے سامنے والے رنگ آلود میل باکس کے ذریعہ ہوگا۔ یہ تمہاری پراپرٹی کے نزدیک دوڑوڑ کے کونے پر ہے۔ ہر شب اسے چیک کرتے رہو۔ بیوی کے علاوہ کسی کو بتایا تو جی کو ختم سمجھو۔"

کلک، ٹوں..... س..... س.....

منجانب۔ ہنٹر اینڈ کو،

☆☆☆

25 مئی

ڈیڑ مسٹر فورٹھ کیو۔ بحوالہ "خالص مال" بذریعہ خطوط اب تک جو تبادلہ خیال ہوا ہے، اس کے بعد ہماری جانب سے طے ہوا ہے کہ "خالص مال" کی صاف تقرری ترسیل آپ کو دس لاکھ ڈالر کی ادائیگی پر ہو جائے گی۔ ہماری معلومات کے ذرائع مستند ہیں..... ہم جانتے ہیں کہ یہ رقم آپ کے لیے زیادہ نہیں ہے۔ آپ اور آپ کی بیگم جس اذیت سے گزر رہے ہیں، اسے ختم کیجیے۔ ٹائپ شدہ جواب طے کردہ میل باکس میں کل دس بجے کے بعد ڈال دیجیے۔ ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ باقی آپ پر منحصر ہے کہ آپ رازداری کا خیال رکھیں۔ "خالص مال" محفوظ حالت میں ہے۔

تخلص۔ اے۔ ہنٹر

☆☆☆

"پھر اسے سمجھائیں کہ گڑبڑ نہ کرے۔ عقل سے کام لے۔ رہائی پانے تک زبان بند رکھے۔"

"وہ ایک ہی بات کہتا ہے۔ ماروی یہاں صبح تک نہ آئی تو اس کے بغیر یہاں سے رہائی نہیں پائے گا۔ کل یہاں ہنگامے کرے گا۔ خود کو محبوب کی حیثیت سے ظاہر کرے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "کچھ کریں پاپا...!"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہاں اس کا منہ بند کرنے کے لیے اس پر تار چڑھ کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کے چہنچے چلانے سے جیل کے دوسرے عہدیداروں کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ کئی عہدیداروں سے میری بھتی نہیں ہے۔ انہیں دھمکی کرنے کا بھرپور موقع ملے گا۔ پھر سمجھو کہ میرا کیا ہوگا؟"

"پاپا! کل شام سے مراد کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔ اب ماروی ہاتھ آئی ہے۔ اب میں باری ہوئی بازی جیتنے والی ہوں۔ مراد اسے حاصل کرنے کے لیے میرا تابعدار بن جائے گا۔ کچھ کریں پاپا...!"

"مرینہ اس پر مٹی ڈالو۔ ایسے بہت سے گہرو جوان تمہاری زندگی میں آئیں گے تم ماروی کو لے کر یہاں آ جاؤ۔"

"تو پاپا...! مراد تو میری ضد بن گیا ہے۔ میں باری ہوئی بازی جیتنا جانتی ہوں۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کریں۔ میں ابھی کال بیک کروں گی۔"

دلاور جان نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ابھی تھوڑی دیر میں کال کرے گی۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"میں ساری رات انتظار کروں گا۔ لیکن صبح ماروی کا منہ دیکھنا چاہوں گا۔"

اس نے محبوب کو بے بسی سے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ادھر مرینہ لینڈ کروزر سے دور کھڑی تیزی سے سوچ رہی تھی کہ کیا کرے؟

باپ کو قانونی گرفت سے بچانا تھا اور مراد کو تو آخری ساتوں تک نہیں چھوڑنا تھا۔

اور محبوب وہاں ماروی کو طلب کر رہا تھا۔ اس نے جیل باپ کو خوف اور اندیشوں کی سولی پر لٹکا دیا تھا۔

وہ چاروں طرف گھوم کر رات کی تاریکی کو دیکھنے لگی۔ سوچتے لگی۔ اسے کچھ کرنا پڑتا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز کرداریں ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

کر۔ فوراً مرینہ سے بولو کہ ماروی کو یہاں لے آئے۔"

اس نے مجبور ہو کر بے دلی سے فون پر بیٹی کے نمبر شیج کیے۔ اسے کان سے لگا یا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی بولا۔ "تم کہاں ہو؟ جام تھارو سے کتنی دور ہو؟"

"میں نہیں جانتی۔ ہمارے ساتھ ایک عیسی ڈرائیور ہے۔ ابھی اس نے کہا ہے کہ ہم تین گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"مرینہ! میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ ابھی ادھر نہ جاؤ۔ رک جاؤ۔ پہلے میری بات سن لو۔"

"بات کیا ہے یوکیس؟ میں آگے بڑھتے ہوئے بھی آپ کی باتیں سن سکتی ہوں۔"

"نہیں جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

اس نے ڈرائیو کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ ساتھ آنے والی عیسی بھی رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے پاپا؟ آپ پریشان ہیں؟"

"یہ محبوب کہہ رہا ہے کہ ماروی کو جام تھارو نہ لے جاؤ۔ کل صبح تک کراچی لے آؤ۔"

"اسے بھونکنے دیں۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔"

"یہ میری کمزوریوں سے کھیل رہا ہے۔ کہتا ہے ماروی صبح تک یہاں نہ آئی تو چیخ چیخ کر اعلان کرے گا کہ یہ محبوب ہے قیدی مراد نہیں ہے۔"

مرینہ نے پیچھے بیٹھی ہوئی ماروی کو کون انکھوں سے دیکھا پھر دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آ گئی۔ وہاں سے ڈرا دور ہو کر حصہ سے بولی۔ "اس کتے کی کھوپڑی اچانک کیوں گھوم گئی ہے؟"

"پتا نہیں اس کے دماغ میں یہ بات کیسے ساگنی ہے کہ جام تھارو کی جیل میں مراد نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو پہلے فون پر ماروی کو اس کی آواز سنائی جاتی۔ اور وہ یہی کہہ رہا ہے کہ پہلے ماروی اور مراد کو فون پر ملایا جائے۔ جب وہ بات کرے گی۔ مطمئن ہوگی۔ تب اس سے ملنے جام تھارو جائے گی۔"

"ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ وہاں مراد ہے۔ نہ ہم محبوب کا مطالبہ پورا کر سکیں گے۔"

"ایک نئی بات یہ ہے مرینہ...! کہ شہمت جلالی مقدمہ بازی سے باز آ گیا ہے۔ ایک آدھ ہفتے میں مراد کو یعنی کہ محبوب کو یہاں سے رہائی مل جائے گی۔"

غلوں کے ساتھ سووے بازی کر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ آپ کے تعاون کے باوجود 750000 ڈالر ایک بڑی رقم ہے اور میں اپنی موجودہ حیثیت کے باوجود شارٹ نوٹس پر اگر رقم کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہوں تو رازداری کو نقصان پہنچنے کے روشن امکانات ہیں۔ کیا آپ مزید رقم کے ساتھ ”خالص مال“ کی ترسیل میں آرام محسوس نہیں کریں گے؟

مستقلیت پسند..... کلارک فورٹھ کیو
☆☆☆

ڈیر مسٹر فورٹھ کیو!

”خالص مال“ ایک بیش قیمت بلکہ انمول آئٹم ہے، جس کی اسٹوریج ایک مشکل امر ہے اور اس قسم کے آئٹم کی اسٹوریج اور ترسیل کمپنی کے لیے ایک نازک اور مشکل تر کام ہے۔ تمام تر حقائق اور دشواریوں کی روشنی میں ہم اس شرط پر قیمت نصف کرنے کے لیے تیار ہیں کہ رقم فوری طور پر ادا کی جائے گی۔ یہ ہماری فائل پیشکش ہے۔

ہمیشہ کے مانند، پُر یقین..... اے۔ ہنٹر
☆☆☆

ڈیر مسٹر ہنٹر،

آپ کی تازہ پیشکش اور تعاون کے بعد مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میرا خیال درست تھا کہ میں سمجھدار اور حقیقت پسند افراد سے معاملہ کر رہا ہوں۔ بے شک بیگم ”خالص مال“ سے متعلق صدمہ کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ میں نے ان کا غم بانٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کسی عورت سے شادی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کمپنی کو خریدنا، تو پھر ہمیں اتناؤں کے ساتھ قرضہ جات اور ڈتے داریوں کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ تاہم بیگم اور میں 500000 ڈالر کے لیے قدرے مشکوک ہیں۔ امید ہے کہ آپ 10000 کے لگ بھگ سوچیں گے۔

بعد احترام..... کلارک فورٹھ کیو
☆☆☆

فورٹھ کیو!

کل درمیانی شب میل باکس میں 90000 ڈالر رکھ دو۔ اسے طلسمی سمجھو یا پھر ”خالص مال“ سے ہاتھ دھونے کے لیے تیار ہو، تم ہمیں غیر آرام دہ حالت میں رکھنے کی کوشش کر رہے ہو اور یہ ہمیں پسند نہیں۔ ہم قائل نہیں ہیں لیکن بننے میں دیر بھی نہیں لگے گی۔

اے۔ ہنٹر

☆☆☆

ڈیر مسٹر ہنٹر،

اسر کی تکلیف دہ حالت سے برسوں بعد آرام ملا ہے

اور میں سووے کے معاملے میں بہتر انداز میں سوچنے کے قائل ہوں۔ اگرچہ بیگم کا تقاضا ہے کہ میں کچھ نہ کچھ کروں۔ لیکن 90000..... ڈالر میری استطاعت سے باہر ہیں۔ میرے اگلے خط کے ساتھ 20000..... ڈالر موجود ہوں گے۔ اسٹم کی ترسیل کے لیے تیار رہو۔ میں شروع سے ایمانداری کے ساتھ معاملہ کر رہا ہوں..... حتیٰ کہ میری تازہ پیشکش کا بیگم کو بھی علم نہیں ہے۔

مخلص بہ قلب..... کلارک فورٹھ کیو
☆☆☆

فورٹھ کیو!

پاگل ہو گئے ہو؟ ”خالص مال“ انمول ہے۔ ہم پھر دہراتے ہیں کہ ہم قائل نہیں ہیں۔ تم ایک نکتہ پر غافل ہو کہ زندگی اور صحت کے مقابلہ میں رقم کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم ”خالص مال“ کل روانہ کر دیں گے اگر تم ہماری پریشانی اور خاموشی کے بیش نظر 5000 ڈالر بڑھادو؟ جلدی کرو۔

اے۔ ہنٹر

☆☆☆

برائے ہنٹر اینڈ کو

31 مئی

ڈیر مسٹر ہنٹر، کافی غور و خوض کے بعد میں تمہاری آخری تجویز کو مسترد کرتا ہوں اور اپنی سابقہ پیشکش کا اعادہ کرتا ہوں۔ مزید یہ کہ اس معاملے میں کسی اور بات چیت کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ لہذا اپنی کوردانہ کرو یا سودا ختم سمجھو۔

فورٹھ کیو

☆☆☆

کیم جون

کلارک فورٹھ کیو، مجھ سمیت ہنٹر اینڈ کو کا پور ڈیویڈن ہو گیا ہے۔ نیا دانس پر بیڈنٹ نئے خیالات و نظریات کا مالک ہے۔ ہم جو خطوط روانہ کر چکے ہیں، ان سب کی کاربن کاپی محفوظ ہے۔ تمہارے ٹائپ کردہ خطوط بھی محفوظ ہیں۔

یقیناً، انوکھ گانگ کے لیے یہاں کا قانون نہایت سخت ہے، تاہم یہ قانون بچوں کے لیے اتنا شدید نہیں ہے۔ پہلے جرم پر بچوں کو عموماً معاف کر دیا جاتا ہے یا علامتی سزا دی جاتی ہے..... اگر تم چاہتے ہو کہ یہ تمام خطوط پولیس کے حوالے نہ کیے جائیں تو 500000 ڈالر کل رات، چھوٹے نوٹوں کی شکل میں میل باکس میں رکھ دو..... مجھے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

تمہارے..... ”خالص مال“

تین سال کے بچے، عبداللہ کے بیٹے پہل نے اپنے ماموں محمد بن ہارون کو نماز تہجد پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کے پیچھے خود بھی کھڑے ہو گئے۔ ماموں کا بہت زیادہ وقت عبادت و ریاضت ہی میں گزرتا تھا اور پہل نے اپنے ماموں کی ریاضت پر توجہ دیے ہوئے تھے۔ صبح فجر کی اذان سے ذرا پہلے ماموں نے سوچا کہ ذرا سی دیر کے لیے اگر کرکالی جائے تو مناسب ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ مڑے اور اپنے پیچھے اپنے تین سال کے بھانجے کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے، پوچھا۔ ”بیٹے پہل! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ پہل نے مصحوبیت سے جواب دیا۔ ”ماموں! میں آپ کے ساتھ عبادت کر رہا تھا۔“

ماموں نے دریافت کیا۔ ”کب سے؟“

جواب ملا۔ ”جب سے آپ خود مصروف عبادت ہیں۔“

ماموں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تمہارے

بروں میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

منتکلم صوفی

ضیائیں بلگرامی

قدرت یوں تو روز ازل سے ہی انسان کے چونکنے اور سوچنے کے لیے بہت سے دروا کرتی آئی ہے لیکن انسان کی عقل کے پردے ان معاملات کی جانب متوجہ ہونے ہی نہیں دیتے۔ اس کے باوجود جہالت کی دبیز چادر کو ہٹانے کے لیے کچھ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی چاہت اور اطاعت میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ گمراہی بہت پیچھے رہ جاتی ہے... آپ کو بھی اللہ نے یہ اعجاز دیا کہ بچہ جب بولنے اور سمجھنے کی سکت نہیں رکھتا آپ لوگوں کو نصیحت و وعظ فرماتے تھے... کچھ خبر نہیں خدا کی قدرت کب اور کس پر مہربان ہو جائے۔

اپنی کرامات و عبادات سے مخلوق کو فیض یاب

کرنے والے ولی کی روداد



بھانجے نے جواب دیا۔ ”میروں کو تکلیف تو نہیں ہوئی، ہاں دل کو لذت ضرور ملی۔“
نٹھے سے بچے کے عار قانہ جواب نے محمد بن سائر کو اور زیادہ حیران کر دیا۔ ابھی یہ حیرت دور نہ ہوئی تھی کہ بہل نے ایک اور عجیب و غریب بات کہہ دی، بولے۔ ”ماموں! میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں؟“
ماموں نے جواب دیا۔ ”ضرور بتاؤ۔“

بھانجے نے کہا۔ ”میں ازل سے آج تک عرش کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ کیا آپ میری بات سمجھ گئے؟“
ماموں کے دل کی جو حالت ہوئی، اسے وہ بیان نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے بھانجے کو تنبیہ کی۔ ”بھانجے! اپنے نٹھے سے منہ سے اتنی بڑی بات تم کیوں کہہ رہے ہو؟ تم ابھی دنیا سے واقف نہیں ہو۔ اگر تمہاری یہ بات دوسرے لوگ سن لیں گے تو تمہیں دار پر چڑھا دیں گے۔ آئندہ یہ بات کسی اور کے سامنے نہ کہنا۔“
بھانجے پر شاید اس بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا، مزید عرض کیا۔ ”اور ماموں! آپ حیرت کریں گے کہ جب خدا نے مجھ سے کہا تھا است برکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) تو مجھے اپنا جواب ملی (بے شک) آج تک یاد ہے۔“
ماموں نے اپنا سر پیٹ لیا، بولے۔ ”بہل! خدا کے لیے تو اپنی زبان بند کر تو ابھی بچہ ہے لیکن میں اس عمر میں ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔“ بھانجے نے خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

بہل نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ ان کے افطار میں طرح طرح کی چیزیں سامنے رکھ دی جاتیں لیکن یہ ہمیشہ چوکی روٹی سے افطار کرتے۔ گھر والے بہل کی عادات پر حیران رہتے اور عالم یہ تھا کہ ابھی کسی ایک عادت نے انہیں حیرت میں ڈالا ہی تھا اور یہ ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ کسی نئے واقعے، کسی نئی بات نے مزید حیرت میں ڈال دیا۔
بہل کو غور و فکر کی بڑی عادت تھی۔ بارہ سال کی عمر میں کسی مسئلے نے انہیں الجھا دیا۔ یہ اپنی سمجھ کے مطابق اس پر غور و فکر کرتے رہے لیکن جب مسئلہ سمجھ میں نہ آیا تو آپ نے اپنے عہد کے بڑے بڑے عابد و زاہد اور لائق لوگوں کی ذہن میں ایک فہرست تیار کی کہ اس معاملے میں کس سے مدد لی جاسکتی ہے۔ آخر پھر بڑے عہد کے حبیب حمزہ کی طرف دل مائل ہو گیا اور بارہ سال لڑکے نے پھر سے سفر اختیار کیا۔ حبیب حمزہ نے اس ہونہار نو عمر مہمان کی پیشانی میں چند ایسی علامتیں دیکھیں جو غیر معمولی تھیں۔ انہوں نے بہل کا پر جوش استقبال کیا، پوچھا۔ ”بیٹے! تمہارا نام؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”بہل بن عبد اللہ!“
حبیب حمزہ نے پوچھا۔ ”کہاں سے آئے ہو؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”حسرت سے۔“
حبیب حمزہ نے شفقت سے اپنے پاس بٹھالیا، بولے۔ ”بیٹے! جب تک جی چاہے میرے پاس رہو اور جو کچھ جاننا یا پوچھنا چاہتے ہو، اس کے لیے میں حاضر ہوں۔“

کئی دن بعد بہل نے حبیب حمزہ سے اپنے دل کے ترددات دور کیے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے۔ آخر مطمئن ہو کر حسرت واپس چلے گئے۔ حبیب حمزہ کی صحبت نے ان میں یہ تبدیلی پیدا کر دی تھی کہ پہلے وہ افطار کے بعد کچھ کھانی لیتے تھے لیکن اب اس میں بھی کمی پیدا ہو گئی کہ رات کو بس ایک چمٹا تک کی دو ٹکیاں کھا کر عبادت میں مشغول ہو جاتے اور یہ ٹکیاں بھی جو کی ہوئیں۔ کچھ عرصے بعد اس میں بھی ترمیم کر دی۔ پہلے ہر روز افطار کر لیا کرتے تھے لیکن اب تین تین دن بعد افطار کرنے لگے پھر اس میں اور اضافہ کر دیا اور کئی دن اور کئی رات متواتر روزے رکھ کر صرف ایک بادام پر گزار کرنے لگے۔ جو لوگ آپ کے ذکر و عقل سے واقف تھے انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ آخر شب و روز کا، ہفتوں روزہ رکھ کر ان کا ایک بادام کھا لیتا، ان میں تو ان کی کس طرح قائم رکھتا ہے۔ ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے پوچھ بھی لیا۔

”حضرت! ذرا ایک بات تو بتائیے۔ آخر یہ ایک بادام، جو آپ شب و روز کے کئی ہفتوں کے ایک روزے کے بعد کھاتے ہیں، آپ کے جسم میں کس طرح توانائی قائم رکھتا ہے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”حیرت انگیز سوال مناسب اور معقول ہے لیکن میں جن تجربات کے بعد یہاں تک پہنچا ہوں وہ کچھ عجیب اور عقل سے باور ہیں۔ میں نے فائدہ کشی اور کھانے کا الگ الگ تجربہ کیا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ حال تھا کہ بھوک سے قہا ہت غلبہ پالیا کرتی تھی اور جب کھا لیتا تو توانائی بحال ہو جاتی تھی لیکن میں نے یہ تجربہ مسلسل جاری رکھا تو ایک عجیب و غریب نتیجہ برآمد ہوا۔“

مشکل صوفی

اب عالم یہ ہے کہ اگر میں کھا لیتا ہوں تو روح میں قہا ہت آ جاتی ہے اور فائدہ کشی کرتا ہوں تو اسے توانائی حاصل ہو جاتی ہے۔“
جب سے آپ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ شعبان کے روزوں کی فضیلت زیادہ ہے۔ آپ شعبان کے روزے بالکل نہیں چھوڑتے تھے۔ آپ کی گفتگو میں علم کلام کی جھلک بہت زیادہ پائی جاتی تھی۔ آپ اہل تسر کے حال پر افسوس کرتے تھے، فرماتے تھے۔ ”افسوس کہ لوگ پڑے سوتے ہیں اور جب یہ مرجائیں گے تو بیدار ہوں گے اور جب بیدار ہوں گے تو بچھتا میں گے اور جب بچھتا میں گے تو ان کا بچھتنا نا بے کار ہوگا اور انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔“ اس کے بعد فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ کورات اور دن کی گھڑیوں میں دلوں کی اطلاع ہوتی رہتی ہے اور جب وہ کسی کے دل میں اپنے سوا کسی اور کی احتیاج دیکھتا ہے تو اس پر اٹھیں کو مسلط کر دیتا ہے۔“
کسی نے سوال کیا۔ ”حضرت! ایک صوفی کو کن باتوں کی پابندی کرنی چاہیے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تین چیزوں کی۔ اول اپنے راز کی نگہداشت، دوم اپنے فقر کی حفاظت اور سوم اپنے فرائض کی ادائیگی۔ لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ نیت کا قیلم ہے اور نیت، قلب کا قیلم ہے۔ قلب بدن کا قیلم ہے، بدن اعضا کا قیلم ہے اور اعضا دنیا کے قیلم ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو کہ جو گمان سے بچاؤ جس سے بچا۔ جو جس سے بچاؤ جسیت سے بچا، جو جہیت سے بچاؤ زور (جھوٹ، غریب، بکر) سے بچا، جو زور سے بچاؤ بہتان سے بچا۔“
جب آپ ایک عرصے تک ایسی باتیں کرتے رہے تو تسر کے با اثر حضرات ان سے عاجز آنے لگے۔ آپ ان سے ذرا بھی نہ ڈرتے تھے جو کہنا ہوتا تھا بر ملا کہہ دیتے تھے۔

ابن منصور طحاوی کو آپ کی صاف گوئی اتنی پسند آئی کہ آپ کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ ابن منصور کی صاف گوئی تو بعد میں اتنی مشہور ہوئی کہ ”انالحن“ کے شور نے انہیں دار پر چڑھا دیا۔ تسر کے عوام، خواص اور عرفاء، بہل بن عبد اللہ کی مخالفت میں متحد اور یک زبان ہو گئے۔ ان تینوں کا ایک نمائندہ وفد کی شکل میں آپ کی خدمت میں پہنچا اور تند و تیز لہجے میں آپ کو منع کیا کہ ان کے خلاف زبان نہ کھولی جائے۔

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے جبکہ دنیا کے سارے فتنے تم تینوں کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔“
ان میں عارف نے آپ کی بات کو بہت شدت سے محسوس کیا، پوچھا۔ ”عوام اور خواص کے فتنوں کی تو میں بات اس لیے نہیں کروں گا کہ اپنی اپنی حالت سے یہ دونوں خود ہی واقف ہوں گے اور خود ہی جواب دے لیں گے لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عارفوں کی طرف سے اہل دنیا میں کون سے فتنے نازل ہوتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کہوں گا، اگر تم عارف ہو تو اس سے ضرور اتفاق کرو گے۔ عارف اسی کو کہتے ہیں ناں جو سب کچھ جانتا ہے یعنی وہ حق اور ناحق سے خوب اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے۔ اس واقعیت کے بعد جب وہ حق کے وجوب میں تاخیر سے کام لیتا ہے تو ہمیں سے فتنوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔“

عامی نے سوال کیا۔ ”اور حضرت! ہماری وجہ سے کون سے اور کس طرح فتنوں کا نزول ہوتا ہے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”تم پہلے عامی کی تعریف کو کچھ لو اس کے بعد میں جواب دوں گا۔“

عامی نے کہا۔ ”اس کی آپ ہی تعریف فرمادیں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”عامی وہ شخص یا لوگ کہلا میں گے جو علوم عقلی و نقلی اور باطنی سے واقف نہیں ہوتے، اگر یہ ان علوم کو حاصل کر لیں گے مگر انہیں سمجھنے کی استطاعت اور لیاقت نہ رکھتے ہوں تو اس سے جو فتنے پیدا ہوں گے وہ عوامی فتنے کہلا میں گے۔“
خواصی نمائندہ کیوں چپ رہتا، فوراً بولا۔ ”اور حضرت! اب اس فتنے کی وضاحت بھی فرمادیں جسے آپ خواص کا فتنہ فرما رہے ہیں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”خواص وہ ہیں جو جانتے تو سب کچھ ہیں مگر ان کی عقل اور حیلہ جو دانش انہیں رخصت اور تاویل میں الجھا دیتی ہے یعنی جسے اختیار کرنا چاہیے اس سے نظریں جماتے ہیں اور تاویل میں ایک دوسرا عمل اختیار کر کے خود کو زبردستی حق بجانب قرار دیتے ہیں۔“

تینوں آدمی لا جواب ہو کر چلے گئے لیکن ان کے دلوں میں آپ کے خلاف کینہ بیٹھ گیا۔ ان لوگوں نے مل جل کر آپ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ انہوں نے علمائے عصر کو بھی آپ کے خلاف کر دیا اور کہا کہ عبد اللہ کا بیٹا، عالموں جیسی باتیں کرتا ہے حالانکہ وہ محض صوفی ہے۔ وہ علما کو برا بھلا کہتا ہے۔

چند عالم آپ کی خدمت میں پہنچے اور دریافت کیا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ آپ ہمیں برا بھلا کہتے ہیں؟“
آپ نے کہا۔ ”یہ کس نے کہا، میں تو علما کو برا بھلا نہیں کہتا۔“

عالموں نے کہا۔ "مستمر کے خواص میں سے ایک شخص نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ نے کہا ہے کہ ہم لوگ جیلہ جوہنہ میں اور رخصت اور تاویلات میں الجھے رہتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "رخصت اور تاویلات میں تو یہاں کے خواص الجھے رہتے ہیں اور یہ بھی ان کی تاویل ہی ہے کہ انہوں نے اس میں علما کو بھی شامل کر لیا۔"

عالموں میں سے کسی نے پوچھا۔ "ویسے عالموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہمارے ہم عصر علما تین باتوں سے مایوس ہو چکے ہیں یا یوں کہو کہ ان میں ناکام رہے ہیں۔"

عالموں نے بیک زبان دریافت کیا۔ "کون سی تین باتوں میں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "توبہ کی مستقل پابندی سے سنت کی پیروی سے اور ترکِ مردمِ آزادی سے۔"

علما آپ کے پاس سے کدورتیں لے کر اٹھے اور لوگوں میں آپ کے خلاف اشتعال پھیلاتے رہے۔

آپ کے خلاف تتر میں اس قدر واویلا مچا اور لوگوں نے تل جمل کرنا شروع کر دیا کہ آپ کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ ابنِ منصور طلاج نے معلوم نہیں کیا سوچا کہ کچھ کہے سے بغیر آپ سے علیحدگی اختیار کر لی اور ایک دوسرے صوفی عمرو بن عثمان کی کے پاس چلے گئے۔ آپ کو ابنِ منصور کے اس رویے نے اذیت پہنچائی۔ آپ نے اپنا کل اثاثہ خدا کی راہ میں دے دیا اور کہہ مقرر روانہ ہو گئے۔ آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ کسی سے کچھ بھی نہ مانگیں گے۔

دورانِ سفر آپ کو اکثر فاقہ کشی کرنا پڑی۔ آپ کا نفس آپ کو بہت مجبور کر رہا تھا۔ آپ نے خود کو مخاطب کیا۔ "اے میرے نفس! میں محسوس کر رہا ہوں کہ تیری مسلسل فاقہ کشی سے بہت بری حالت ہو رہی ہے لیکن میں بھی کیا کروں، مجبور ہوں اس لیے صبر کر۔"

نفس نے اندر سے خوشامدی کی۔ "اے کھل! میں مچھلی اور روٹی کھانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ میری یہ خواہش پوری کر دیں تو میں آپ کو مکہ معظمہ تک نہیں ستاؤں گا اور خاموش رہوں گا۔"

آپ نے کہا۔ "لیکن میں کیا کروں؟ میں نے تو یہ عہد کر رکھا ہے کہ کسی سے کچھ مانگوں گا نہیں اور میرے پاس رقم نہیں ہے کہ اس سے مچھلی اور روٹی خرید کر تیری خواہش پوری کروں۔"

نفس نے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ آپ میری خواہش کس طرح پوری کریں گے لیکن میں روٹی اور مچھلی ضرور کھانا ضرور چاہتا ہوں۔"

آپ ذرا پریشان سے ہو گئے، بولے۔ "نمبر جا، دیکھ تو میں تجھے کسی سزا دیتا ہوں۔"

آپ نے ادھر ادھر محوم پھر کر جائزہ لیا کہ یہاں کس قسم کی مشقت کر کے کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ ایک اونٹ چکی سے بندھا ہوا مشقت کر رہا ہے۔ آپ چکی والے کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے پوچھا۔ "بھائی! کیا یہ اونٹ اسی طرح دن بھر چکی میں لگا رہتا ہے؟"

چکی والے نے جواب دیا۔ "ہاں، کیوں؟ تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

آپ نے پوچھا۔ "یہ اونٹ کس کا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں نے اسے کرایے پر لے رکھا ہے۔"

آپ اس جواب سے بہت خوش ہوئے، پوچھا۔ "اونٹ والے کو اونٹ کی دن بھر کی مشقت کا کیا معاوضہ دیتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "دو دینار۔"

آپ نے کہا۔ "چکی والے مجھ پر ایک مہربانی کر دو۔ تم اس اونٹ کو کھول دو اور مجھے اس کی جگہ باغداد، دو، شام کو مجھے دو دینار کے بجائے ایک دینار دے دینا۔"

چکی والے نے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور تعجب سے پوچھا۔ "اس اونٹ کی جگہ تم جو گے؟"

"ہاں، کیونکہ اس وقت میرا نفس روٹی اور مچھلی کے لیے بہت تنگ کر رہا ہے۔"

چکی والے کو تامل ہوا لیکن آپ نے اصرار کیا۔ "اے شخص! تو فکر نہ کر، اس طرح میں اپنے نفس کو سزا دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ آئندہ مجھے تنگ نہ کرے۔"

چکی والے نے اونٹ کھول دیا اور اونٹ کی جگہ آپ کو باغداد دیا۔ آپ دن بھر چکی میں جتنی مشقت کرتے رہے۔ شام کو اس محنت کے عوض آپ کو ایک دینار مل گیا۔ آپ نے اس دینار سے روٹی اور مچھلی خریدی اور اپنے نفس کی خواہش پوری کر دی۔ آپ تنگ کر چکا چور ہو چکے تھے۔ دن بھر کی مشقت نے برا حال کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے نفس سے کہا۔ "دیکھ آئندہ جب بھی تو ایسی ویسی

متکلمہ صوفی

خواہش کرے گا تو میں تجھے اسی طرح محنت و مشقت میں لگا دوں گا۔"

مکہ معظمہ میں آپ کی ملاقات ذوالنون مصری سے ہوئی۔ آپ ان سے بیعت ہو گئے۔

☆☆☆

تستر واپس آ کر آپ نے نہایت خاموشی سے اپنا کام جاری رکھا۔ آپ لوگوں کو تعلیم و تلقین کر کے صدق و صفا کی راہ دکھاتے۔ آپ کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ اسی دورانِ عمر ولیف نامی حاکم سخت بیمار پڑ گیا۔ اطباء نے جی جان سے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ عمر ولیف نے بیماری سے تنگ آ کر اطباء کو ڈانٹ دیا۔

"تم نے حکمت پڑھی ہے یا گھاس کاٹی ہے۔ میں مہینوں سے بستر مرگ پر پڑا ہوں یاں رگڑ رہا ہوں اور تم مجھے سخت مشق بنائے ہوئے ہو، آخر بات کیا ہے؟"

طبیعیوں نے بے بسی سے جواب دیا۔ "حضور والا! ہم سب نے اپنے علم سے مقدور بھر کوشش کر ڈالی لیکن ناکام رہے۔ مشیت ایزدی کیا ہے ہمیں نہیں معلوم مگر یہ ضرور جانتے ہیں کہ اب معاملہ دوا کا نہیں دعا کا ہے۔ اب کسی خدا رسیدہ سے التجا کیجیے کہ وہ آپ کے حق میں دعا کرے۔"

عمر ولیف نے مایوسی سے دریافت کیا۔ "لیکن وہ خدا رسیدہ ملے گا کہاں؟"

ایک طبیب نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ کھل بن عبد اللہ مستجاب الدعوات ہیں، خدا ان کی ضرورت سنے گا۔"

عمر ولیف نے انھوں سے کہا۔ "لیکن شاید وہ میرے حق میں کوئی دعا نہ کریں۔"

طیب نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

عمر ولیف نے جواب دیا۔ "وہ اس دور کے عوام، خواص، عرفاء اور علما سبھی سے نفور اور تالاں ہیں۔ ظاہر ہے وہ مجھے اس لائق کیوں سمجھیں گے کہ دعا کریں۔"

طیب نے کہا۔ "آپ کا خیال درست نہیں ہے۔ کھل دیکھی انسانوں کی خدمت پر ہر وقت کمر بستہ رہتے ہیں۔ آپ ان سے رجوع کریں گے تو میری ناقص رائے میں وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔"

عمر ولیف نے کہا۔ "لیکن ان سے رجوع کس طرح کیا جائے؟"

طیب نے جواب دیا۔ "آپ اپنا ایک آدمی اس درخواست کے ساتھ ان کی خدمت میں روانہ کر دیں کہ بندہ لب گور آپ کی عنایات کا طالب بیضا زندگی کی سانس پوری کر رہا ہے۔ اگر یہاں تک آنے کی زحمت نہیں گوارا کر سکتے تو اس عاجز کے حق میں موت ہی کی بددعا فرما دیجیے۔"

عمر ولیف نے طیب کے مشورے پر عمل کیا۔ آپ فوراً عمر ولیف کے پاس پہنچ گئے فرمایا۔ "تو نے بددعا کی خواہش کی ہے، یہ میں کس طرح کر سکتا ہوں۔"

عمر ولیف نے رقت سے عرض کیا۔ "میں آپ سے دعا کی درخواست کس منہ سے کروں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں، تو دعا کی خواہش بھی کر سکتا ہے لیکن یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لے کہ دعا ہی کے حق میں اثر انداز ہوتی ہے جو تائب ہو چکا ہو۔ اس لیے پہلے تو تم توبہ کرو، اس کے بعد میں دعا کروں گا۔"

عمر ولیف کی توجہ ان پر پڑی تو فوراً توبہ استغفار کرنے لگا۔

آپ نے کہا۔ "اوں ہوں، یوں نہیں، توبہ استغفار کے ساتھ ساتھ تم ان قیدیوں کو بھی رہا کر دو جو قید خانے میں یونہی بند کر دیے گئے ہیں۔" عمر ولیف نے اس حکم کی بھی تعمیل کر دی۔

آپ نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔ گریہ و زاری کرتے ہوئے فرمایا۔ "اے اللہ! جس طرح تو نے اپنی نافرمانی کی زلت سے عمر ولیف کو دو چار کر دیا ہے اسی طرح میری عبادت کی عظمت بھی عمر ولیف کو دکھا دے۔"

دعا بھی ختم ہی ہوئی تھی کہ عمر ولیف کو اپنے مرض میں افاقہ محسوس ہونے لگا۔ اسی وقت آپ کا ایک ارادت مند تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ آپ کو واپس لے جانا چاہتا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ "ذرا دیر ٹھہر جا، عمر ولیف کو اچھا ہو جانے دے پھر میں تیرے ساتھ چلوں گا۔"

وہ ٹھہر گیا اور عمر ولیف کی حالت یہاں تک سدھ گئی کہ وہ بیمار لگتا ہی نہ تھا۔

آپ نے کہا۔ "عمر ولیف اب تم بالکل اچھے ہو چکے ہو اس لیے مجھے اجازت دو۔"

عمر ولیف نے عاجزی سے کہا۔ ”حضرت! ایک ذرا توقف فرمائیں۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

آپؐ رک گئے، عمر ولیف اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد جب واپس آیا تو اشرافیوں کی مجلس اس کے ہاتھ میں مٹی، نہایت ادب سے عرض کیا۔

”حضرت! یہ حقیر سا نذرانہ میری جانب سے قبول فرمائیں۔“

آپؐ نے غصے سے جواب دیا۔ ”کیا تم یہ اشرافیاں میری دعا کی قیمت میں دے رہے ہو؟“

عمر ولیف نے کانپ کر عرض کیا۔ ”حضرت! یہ میری مجال کہ میں اس قسم کا خیال تک لاؤں، استغفر اللہ!“

آپؐ نے حقارت سے کہا۔ ”پھر انہیں وہیں لے جا کر رکھ دو جہاں سے نکال کر لائے ہو۔“

عمر ولیف نے مجبوراً مجلس نذر کرنے کے خیال سے توبہ کر لی۔

آپؐ کا مرید اس گفتگو کو نہایت افسوس سے سن رہا تھا وہی میں ایک جگہ عرض کیا۔ ”حضرت! نذرانہ قبول نہ کر کے آپؐ نے اچھا نہیں کیا۔“

آپؐ نے پوچھا۔ ”کیوں؟ اگر قبول کر لیتا تو کیا ہوتا؟“

مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپؐ سے کیا چھپاؤں دراصل میں بے حد مقروض ہوں، اگر آپؐ نذرانہ قبول کر لیتے تو میں اپنے قرض سے سبکدوشی حاصل کر لیتا۔“

آپؐ نے فرمایا۔ ”تو ذرا چاہتا ہے؟ کتنا زور چاہتا ہے؟ اپنے سامنے دیکھ۔“

مرید نے سامنے جو دیکھا تو دور تک سونا ہی سونا دکھائی دیا۔ مرید کے منہ میں پانی بھر آیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ ”خدا نے جس کو یہ مرتبہ عطا کیا ہوا اس کو دولت کی تمنا کس طرح ہو سکتی ہے۔“

☆☆☆

جسے کا دن تھا، ایک بزرگ آپؐ کی ملاقات کو حاضر ہوئے۔ آپؐ کے نزدیک ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ ان بزرگ کو سانپ کے خوف نے قریب نہیں جانے دیا۔ وہ دور کھڑے آپؐ کی اجازت کے منتظر رہے۔ آپؐ نے کہا۔ ”وہاں دور کھڑے کیا کر رہے ہو، میرے قریب آ جاؤ۔“

ان بزرگ نے جواب دیا۔ ”حضرت! اس سانپ کو تو دور کیجیے۔“

آپؐ نے کہا۔ ”ڈرو مت، اس کی پروا کیے بغیر آ جاؤ یہ نہیں ستائے گا۔“

وہ بزرگ ذرا جھنجھکتے ہوئے آپؐ کے قریب پہنچے، سانپ ایک طرف ہٹ گیا۔

آپؐ نے ان بزرگ سے کہا۔ ”جو آسمان کی حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے وہی زمین کی چیزوں سے خوف کھاتا ہے۔“

بزرگ کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔

آپؐ نے دریافت کیا۔ ”کیا نماز جوہ کا بھی خیال ہے؟“

بزرگ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں لیکن جامع مسجد تو یہاں سے اڑتا لیس گھنٹوں کے فاصلے پر ہے۔ ہم یہ فاصلہ آخر طے کسی طرح کریں گے؟“

آپؐ نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ ”اس کی فکر تم کیوں کرتے ہو۔ لو میرا ہاتھ پکڑ لو ہم ابھی وہاں پہنچ جائیں گے۔“

ان بزرگ نے آپؐ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پلک جھپکتے میں جو ان بزرگ کو ہوش آیا تو خود کو مسجد کے دروازے پر کھڑا دیکھا۔ دونوں مسجد کے اندر داخل ہو گئے اور نمازیوں کے صف میں کھڑے ہو کر نماز جمعہ ادا کی۔ اس کے بعد آپؐ نے ان بزرگ سے فرمایا۔

”حضرت! قلم صاحب ایمان تو بہت قلیل ہیں، البتہ کلمہ کو بہت زیادہ ہیں۔“

بزرگ تو خاموش ہو گئے لیکن شاید یہ بات اللہ کو اچھی نہیں لگی۔ دوسرے جسے کو آپؐ وضو کر کے جامع مسجد تشریف لے گئے۔

مسجد بھری ہوئی تھی۔ امام خطبے کے لیے منبر پر چڑھ چکا تھا۔ کھل بن عبد اللہ لوگوں کے اوپر سے گزرتے ہوئے مجلس صف میں داخل ہو گئے۔ مسجد کچھ کچھ بھری ہوئی تھی۔ آپؐ کے سیدھے ہاتھ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ آپؐ نے اسے سرسری نظر سے دیکھا تو اس کی خوب صورتی نے آپؐ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کے پاس سے خوشبو کے پھلے پھوٹ رہے تھے۔ اس نے ایک اونٹنی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے بھی آپؐ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”سہل! تیرا کیا حال ہے؟ ٹھیک تو ہے؟“

آپؐ نے قدرے مرموب ہو کر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہوں اے اللہ کے صالح بندے۔“

آپؐ پریشان تھے کہ اس نوجوان نے تو آپؐ کو پہچان لیا ہے لیکن آپؐ اسے پہچاننے سے قاصر رہے تھے۔ اسی وقت آپؐ کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ آپؐ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آدمیوں کا زبردست جھوم دیکھ کر مت پست ہو گئی۔ اتنی بہت ساری مجلس

متکلمہ صوفی

کو بھلا تک کر پیشاب کے لیے جانا بڑا مشکل کام تھا۔ دوسری طرف پیشاب کی شدت کا یہ حال تھا کہ انتہائی صبر و برداشت کے باوجود رک نہیں رہا تھا اور یہ بھی اندیشہ تھا کہ واپس آتے آتے کہیں جماعت سے محروم نہ ہو جائیں۔ آپؐ اسی الجھن میں مبتلا تھے کہ اس اجنبی نوجوان نے آپؐ سے مسکرا کر دریافت کیا۔ ”اے سہل! کیا تمہیں پیشاب کی تکلیف ہو رہی ہے؟“

آپؐ نے حیرت سے جواب دیا۔ ”ہاں مگر تمہیں اس کا کیوں علم ہوا؟“

نوجوان نے اپنی چادر اتار کر آپؐ کو اوڑھادی اور کہا۔ ”سہل! ان فضول سوال و جواب میں اپنا وقت ضائع نہ کرو، فوراً جا کر قضاء حاجت کر کے واپس آؤ اور نماز میں شامل ہو جاؤ۔“

آپؐ کی آنکھیں بند ہو گئیں کیونکہ نوجوان نے چادر کچھ اس طرح اڑھائی تھی کہ اس میں آپؐ کا چہرہ بند ہو گیا تھا۔ آپؐ نے گھبرا کر اپنے چہرے پر سے چادر ہٹائی تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سامنے ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ نہ مسجد کی نمازیوں کی صفیں تھیں اور نہ مسجد کے آس پاس کا ماحول۔ سامنے ایک بڑا سا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے پر ایک شخص کھڑا ہوا تھا، اس نے آپؐ سے کہا۔ ”سہل! اندر جاؤ اور قضاء حاجت سے فارغ ہو کر واپس آ جاؤ۔“

آپؐ اس محل میں داخل ہو گئے، یہ نہایت عالی شان تھا۔ اندر داہنی طرف ایک گھٹا درخت کھڑا تھا۔ اس کی جڑ میں ایک لوٹا رکھا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ درخت سے ذرا آگے بیت الخلا تھا۔ آپؐ بیت الخلا سے فارغ ہو کر باہر جو نکلے تو درخت کی ایک شاخ سے ایک رومال لٹکا ہوا دیکھا۔ اس رومال میں ایک مسواک بندھی تھی، پیچھے سے آواز آئی۔ ”سہل! تم غسل کر سکتے ہو اس کے بعد وضو کر لینا۔“

آپؐ نے غسل کیا اور وضو کر کے کپڑے پہنے اور چادر اوڑھنے لگے۔ آپؐ نے ابھی چادر اپنے سر پر ڈالی ہی تھی کہ آپؐ نے آواز سنی۔ ”سہل! اگر تو اپنے کاموں سے فارغ ہو چکا ہے تو ہمیں مطلع کر تا کہ ہم تیری واپسی کا انتظام کریں۔“

آپؐ نے جواب دیا۔ ”میں اپنے ہر کام سے فارغ ہو چکا ہوں۔“

اس نے آپؐ کے اوپر سے چادر تنگ لی۔ آپؐ نے گھبرا کر اس پاس دیکھا تو وہیں امام کے سامنے مجلس صف میں، اس اجنبی نوجوان کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے پریشان ہو کر اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیا اس نوجوان کے علاوہ کوئی اور شخص بھی اس واقعے سے واقف ہے۔ پتا چلا سبھی لاعلم ہیں۔ آپؐ اس سوچ میں پڑ گئے کہ یہ جو کچھ ہو چکا ہے کہیں کوئی خواب تو نہیں تھا۔ بھی آپؐ اس پر یقین لاتے اور بھی تکذیب کرنے لگتے۔ اسی اور جڑ میں جماعت کھڑی ہو گئی۔ آپؐ نے نماز ادا کی لیکن نماز کے دوران بھی یہی واقعہ آپؐ کو پریشان کرتا رہا اور اس فکر نے آپؐ کو اور زیادہ تنگ کر دیا تھا کہ آخر یہ نوجوان ہے کون؟

نمازیں پڑھ پڑھ کر نمازی مسجد سے نکلے گئے۔ آپؐ نے اس نوجوان کا پیچھا کیا اور مسجد سے باہر نکل کر اس کا خاموشی سے تعاقب کرنے لگے۔ کافی دیر چلتے رہنے کے بعد وہ نوجوان ایک بڑے سے بھاٹک میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ہی آپؐ بھی داخل ہو گئے۔ وہ نوجوان ایک دم پیچھے مڑا اور آپؐ سے کہنے لگا۔ ”اے سہل! تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟ کیا تم اس پر یقین نہیں کر رہے جو آج تمہارے ساتھ پیش آ چکا ہے؟“

آپؐ نے جواب دیا۔ ”اپنے شک و شبہ کو دور کرنے کے لیے ہی تو میں نے تمہارا پیچھا کیا ہے۔ میری حیرت کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہی ہے کہ آخر یہ اسرار کیا ہیں؟“

نوجوان نے کہا۔ ”اچھا پھر میرے پیچھے چلے آؤ۔“

آپؐ اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ اندر داہنی طرف وہی گھٹا درخت کھڑا تھا۔ اس کی جڑ میں پانی سے لبریز لوٹا رکھا ہوا تھا۔ درخت سے ذرا آگے بیت الخلا تھا اور درخت کی ایک شاخ سے مسواک سمیت ایک رومال لٹکا رہا تھا۔

نوجوان نے آپؐ سے کہا۔ ”مزید یقین کے لیے رومال کو چھو کر بھی دیکھ لو کہ یہ کیلا ہے یا نہیں؟“

آپؐ نے رومال چھوا تو وہ واقعی گیلا تھا۔ آپؐ نے شدت جذبات میں کہا۔ ”میں اس واقعے کی صداقت پر اسی طرح یقین لا رہا ہوں جس طرح خدا پر رکھتا ہوں۔“

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ”سہل! یاد رکھو جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے اس کی ہر شے اطاعت کرتی ہے، اسے ڈھونڈو گے تو ضرور پالو گے۔“ پھر مسکرا کر کہا۔ ”اور سہل! تمہیں اپنا وہ فقرہ یاد ہے کہ قلم صاحب ایمان تو بہت قلیل ہیں اور کلمہ کو بہت زیادہ ہیں۔“

آپؐ کے دل پر ایک چوٹ لگی، آنکھیں بھرا آئیں۔ نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ آپؐ کی آنکھوں پر رکھ دیے اور آنسو پونچھنے لگا۔ اس نے آنسو پونچھ کر جیسے ہی دونوں ہاتھ آپؐ کے چہرے سے ہٹائے تو دیکھا، سامنے نہ تو وہ نوجوان تھا، نہ وہ محل اور نہ کوئی دوسری ایسی چیز جس کا کل کے متعلقات میں شمار ہوتا تھا۔ آپؐ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ آپؐ فوراً ہی اندر داخل ہو گئے

اور گریہ و زاری کرتے ہوئے سجدے میں گر گئے۔

☆☆☆

ایک عرصے بعد دوران سفر آپ کو ایک جنگل میں یوں محسوس ہوا گویا عبادت اور یاد الہی کی یہ لذت انہیں پہلے کبھی نہیں حاصل ہوئی تھی۔ اس دوران نماز کا وقت آگیا۔ آپ نے سوچا کہ اس لذت میں مزید اضافے کے لیے وضو بہت ضروری ہے لیکن اس دوران جنگل میں پانی حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ آپ غم و رنج سے اداس ہو گئے اور پانی کی عدم یافت سے پوری روح بے چین اور مضطرب ہی ہو گئی۔ اچانک کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ آپ نے آہٹ کی سمت دیکھا، درختوں کی آڑ سے کوئی کالی شے حرکت کرتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ آپ حیرت سے اس سمت غور سے دیکھنے لگے۔ کوئی کالا کھٹا شخص دو پیروں پر آپ کی طرف چلا آ رہا تھا۔ جب وہ درختوں کے درمیان سے نکل کر باہر سامنے آگیا تو آپ پریشان ہوئے اور حیرت زدہ ہو گئے۔ یہ ایک رچھ تھا جس نے اپنے سر پر ایک گھڑا اٹھا رکھا تھا اور اس گھڑے کو اس نے اپنے اگلے دونوں پاؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بالکل آپ کے قریب آگیا۔ آپ کے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ اس نے اپنے سر سے گھڑا آپ کے سامنے اتار کر رکھ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔

آپ نے زیر لب سوال کیا۔ ”خدا یا تیری شان ہے کہ یہ گھڑا اس طرح میرے پاس آگیا۔“

وہ رچھ آپ کے سامنے مودب کھڑا رہا۔ آپ کے دل میں ایک علمی شبہ پیدا ہوا اور آہستہ سے رچھ کو یوں مخاطب کیا، گویا اس سے جواب لینا مقصود نہیں ہے بلکہ محض اپنے علمی اعتراض کو زبان سے ادا کر کے دل کا بوجھ اتارنا ہے۔

”واللہ میں حیران ہوں کہ یہ پانی کا گھڑا جس طرح میرے پاس آیا ہے اس سے میں کیا سمجھوں؟“

انہیں ایسا محسوس ہوا گویا رچھ جواب دے رہا ہے۔ ”اے ہل! ہم وحوش لوگ آج آپس میں ان لوگوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جو اللہ کی محبت اور توکل میں دنیا سے تعلقات چھوڑے ہوئے ہیں کہ اچانک یہ آواز آئی ہل! بن عبد اللہ وضو کے لیے پانی تلاش کرتے پھر رہے ہیں چنانچہ میں نے یہ گھڑا لیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔“

ہل! پر حشی طاری ہو گئی، جب ذرا ہوش آیا تو آپ نے دیکھا، پانی کا گھڑا سامنے رکھا ہوا ہلچل رہا تھا۔ آپ نے اس پانی سے وضو کیا۔ کچھ پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ آپ نے پانی پینا چاہا تو آواز سنائی دی۔ ”اے ہل! انہیں یہ پانی پینے کے لیے نہیں وضو کے لیے بھیجا گیا ہے اس لیے پینے سے پرہیز کرو۔“

گھڑا آہستہ آہستہ مل رہا تھا۔ آپ نے اس سمت غور سے دیکھا۔ جدھر سے آواز آئی تھی لیکن ادھر کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے بعد گھڑے کی طرف دیکھا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔

آپ کو اپنے مرشد ذوالنون مصری کی یاد بہت ستاتی رہتی تھی۔ آپ دیوار سے ٹک لگا کر نہیں بیٹھتے تھے اور نہ ہی کبھی پھیلا تے تھے۔ لوگ آپ سے مختلف سوالات کر کے تقریر کرنے پر مجبور کرتے تھے لیکن جب سے آپ مکہ معظمہ سے واپس آئے تھے اس قسم کے جوابات اور تقریروں سے ہمیشہ گریز کیا کرتے تھے۔ ایک دن لوگوں نے دیکھا آپ اپنے بھتیجی کی انگلیاں بائیں رہے ہیں۔ کسی نے دریافت کیا۔ ”حضرت! ان انگلیوں میں کیا ہو گیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ان میں سخت درد اٹھ کھڑا ہوا ہے۔“

پوچھا گیا۔ ”کیا کہیں چوٹ لگ گئی ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اس کی وجہ کچھ عرصہ بعد بتاؤں گا۔“

آپ چار ماہ تک انگلیوں کو باندھ رہے۔ لوگوں نے اس سلسلے میں بارہا سوالات کیے لیکن آپ نے جواب نہیں دیا۔ آپ کے مریدوں میں سے ایک شخص مصر گیا۔ وہاں آپ کے مرشد ذوالنون مصری سے ملاقات کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کے بھتیجی کی انگلیاں بھی بندھی ہوئی ہیں۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”حضرت! میں تسر سے آیا ہوں، وہاں میں نے اپنے مرشد ہل! بن عبد اللہ کے بھتیجی کی انگلیاں بھی اسی طرح بندھی دیکھی ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں ان سے بار بار پوچھا بھی لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، کیا آپ بتا سکتے ہیں کیا ایسا کیوں ہے؟“

ذوالنون مصری نے جواب دیا۔ ”اے شخص! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہل! کے علاوہ آج ایسا دوسرا کوئی بھی نہیں جو میرے دربار سے باخبر ہو کہ اس طرح میری بیرونی کرے۔“ مزید فرمایا۔ ”میں تقریباً چار ماہ سے انگلیوں کے درد میں مبتلا ہوں۔“ وہ شخص جب تسر واپس پہنچا تو دیکھا ہل! نے انگلیاں کھول دی ہیں۔ وہ چونکا اس راز سے واقف ہو چکا تھا اس لیے وہ ادب

جذبات سے مغلوب ہو کر آپ کے قدموں میں گر گیا اور کہنے لگا۔ ”حضرت! اپنے پیر و مرشد کی مریدی کا جو حق آپ نے ادا فرمایا ہے میں یا کوئی اور اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔“

ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ آپ خلاف معمول دیوار سے پشت لگائے بیٹھے ہیں، لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی پھر آپ نے پیر بھی پھیلا دیے اور فرمایا۔ ”لوگو! انہیں جو کچھ پوچھتا ہے مجھ سے پوچھ لو۔ آج میں تمہاری باتوں کے جواب دوں گا۔“

کسی نے پوچھا۔ ”حضرت! یہ کیا ماجرا ہے کہ پہلے آپ نہ تو اس طرح دیوار سے پشت لگاتے تھے اور نہ اس طرح پھیلا کر بیٹھتے تھے اور ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ جب آپ سے سوالات کیے جاتے تھے تو ان کے جوابات بھی نہیں دیتے تھے پھر آج یہ حیرت انگیز تبدیلی کس طرح آگئی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تھوڑی دیر پہلے تک میرے مرشد حضرت ذوالنون مصری بقید حیات تھے اور میں ان کے احترام میں یہ احتیاط رو رکھتا تھا لیکن اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس لیے میں اب خود کو آزاد اور ہلکا سا محسوس کر رہا ہوں۔“

آپ نے حج کا دوبارہ قصد فرمایا اور بے سرو سامانی سے روانہ ہو گئے۔ کسی بیابان سے گزرتے ہوئے آپ کو ایک نہایت بد حال بڑھیا ملی۔ اس کی غربت اور افلاس کا یہ حال تھا کہ پورا جسم چھتروں سے ڈھکا تھا اور شاید بھوک سے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ آپ نے ازراہ رحم اسے اپنے پاس سے کچھ دینا چاہا تو اس نے آپ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ہل! ترز گئے، بولی۔ ”ہل! کیا تو اللہ سے زیادہ رحم و کریم ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہرگز نہیں۔“

بڑھیا نے کہا۔ ”پھر تو نے میرے حال پر رحم کی جرأت کس طرح کی؟ اللہ جو سب سے زیادہ رحم و کریم ہے اور میرے چچے ہوئے حالات سے باخبر ہے، کیا وہ میری مدد نہیں کر سکتا؟“

آپ نے ڈر کر جواب دیا۔ ”کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی مرزد ہو گئی؟“

بڑھیا نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی غلطی بند کر لی اور ذرا دیر بعد آپ کے سامنے کھول دی۔ آپ نے دیکھا اس کی ہتھیلی پر سونے کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ اس نے آپ کو حقارت سے مخاطب کیا۔ ”ہل! تم کسی کو دینے کے لیے اپنی جیب سے نکالتے ہو لیکن مجھے غیب سے ملتا ہے۔“

اس فقرے نے آپ کی جو حالت کر دی بس آپ ہی جان سکتے تھے۔ آپ نے ذرا دیر کے لیے اس کے پاس قیام کیا اور بارگاہ ایزدی میں پیشانی رکھ دی، گڑ گڑاتے ہوئے بولے۔ ”اے اللہ! تیرا بندہ ہل! تو تیرے بندوں کو پچھاننے سے قاصر رہ جاتا ہے پھر تجھے کس طرح پچھانے جانے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔“

جب آپ نے سجدے سے سر اٹھایا تو وہ بڑھیا پھر غائب ہو چکی تھی۔

آپ نے بیت اللہ پہنچ کر اس کا طواف شروع کر دیا۔ طواف سے فراغت پا کر آپ ایک طرف بیٹھ گئے تو اچانک وہ بڑھیا نظر آگئی اور یہ دیکھ کر تو ان کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے کہ بڑھیا بیت اللہ کا طواف نہیں کر رہی تھی بلکہ بیت اللہ بڑھیا کا طواف کر رہا تھا۔ جب یہ طواف کر چکا تو آپ نے اس بڑھیا سے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ ”کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ بیت اللہ نے تیرا کیوں طواف کیا؟“

بڑھیا ہنسنے لگی، بولی۔ ”ہل! کیا تو یہ ذرا سی بات بھی نہیں جانتا کہ جو لوگ اختیاری طور پر یہاں پہنچتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بیت اللہ کا طواف کریں لیکن جو یہاں اضطراری عالم میں آتے ہیں، کعبہ ان کا خود طواف کرتا ہے۔“ آپ پر ایک بار پھر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔

☆☆☆

آپ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے اور بہت بڑا پرندہ میدان حشر میں جمع لوگوں کے سروں پر منڈلا رہا ہے اور پھر وہ ایک شخص کے کاندھے پر بیٹھ گیا اور اس شخص کو دھکیلتا ہوا ایک طرف غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد یہ پرندہ پھر نمودار ہوا، اس شخص کا کوئی پتا نہ تھا۔ یہ پرندہ ایک اور شخص کے کاندھے پر بیٹھ گیا اور پھر اسے بھی دھکیلتا ہوا ایک طرف لے گیا، یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تیسری بار پھر تھا نمودار ہوا۔

آپ نے عاجزی سے سوال کیا۔ ”اے اللہ! تیرے بھید تیرے سوا کون جان سکتا ہے، کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہ پرندہ کیا کر رہا ہے اور یہ ہے کون؟“

آپ کو جواب دیا گیا۔ ”اے ہل! یہ پرندہ میرے بندوں کا تقویٰ ہے اور یہ صاحب تقویٰ کو پکڑ پکڑ کر جنت میں داخل کر رہا ہے۔“

سے پروردہ آپ کو بھی جنت میں لے گیا۔ وہاں آپ کی تین ایسے شاہساز بزرگوں سے ملاقات ہوئی جو رحلت فرما چکے تھے اور آپ ان کی بزرگی اور عظمت سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپ نے ان کے بعد دیگرے ان تینوں سے ایک ہی سوال کیا، پوچھا۔ ”میں یہ چاہتا ہوں کہ دنیا میں آپ کو سب سے زیادہ ڈراؤنی شے کون سی پیش آتی؟“ انہوں نے جواب دیا۔ ”خاتمے کا ڈر۔“ ان تینوں کا ایک ہی جواب تھا۔ اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل گئی اور محسوس کیا کہ انہیں بھی سب سے زیادہ خاتمے کا ہی ڈر ہے۔

کچھ عرصہ بعد آپ نے پھر ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ آپ نے دیکھا ابلیس آپ کے سامنے موجود ہے۔ آپ نے اس سے سوال کیا۔ ”ابلیس! میں تجھ سے ایک سوال کروں؟“ اس نے جواب دیا۔ ”کیجیے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تو جھوٹ تو نہیں بولے گا؟“ ابلیس نے جواب دیا۔ ”ہل! میں تم سے مایوس ہو چکا ہوں اس لیے جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ آپ نے سوال کیا۔ ”کیا تو یہ بتائے گا کہ تیرے نزدیک سب سے زیادہ پریشان کن کیا بات ہوتی ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”بندے کا خدا کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول رہنا۔“ آپ نے کہا۔ ”تو معلم السکوت رہ چکا ہے، خدا کی وحدانیت کا علم تجھ سے زیادہ کسے حاصل ہوگا، آج میں تیری زبان سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔“

ابلیس نے اللہ کی وحدانیت پر یوں شروع کر دیا، وہ دیر تک بولتا رہا اور وہ رموز و اسرار بیان کیے کہ اس دنیا کا بڑے سے بڑا عارف بھی اتنی تشریح کے ساتھ معارف وحدانیت نہیں بیان کر سکتا۔

☆☆☆

آپ کے پڑوس میں دو بھائی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک حج پر گیا۔ اس نے عرفات میں بہل بن عبد اللہ کو دیکھا۔ وہ آپ سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن موقع نہیں مل سکا۔ وہ جب گھر واپس آیا تو اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ ”بھائی! افسوس کہ بہل بن عبد اللہ کے قریب ہونے کے باوجود جب میدان عرفات میں آپ کو دیکھا تو کوشش کے باوجود میں آپ کے پاس نہ پہنچ سکا اور وہاں ملاقات کی سعادت سے محروم رہ گیا۔“

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! آپ ہوش میں تو ہیں، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آٹھویں ذی الحجہ کو آپ کے پاس بیٹھا آپ کی باتیں سن رہا تھا پھر میں کس طرح یقین کر لوں کہ آپ نے حضرت کو میدان عرفات میں دیکھا؟“ بڑے بھائی کو فضا آگیا۔ ”تم مجھے جھٹلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے انہیں عرفات کے میدان میں دیکھا تھا۔“

چھوٹے بھائی نے پوچھا۔ ”کس کی قسم؟“ بڑے بھائی نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں آپ کے پاس چلتے ہیں، اگر آپ یہ کہہ دیں کہ ہاں میں انہیں عرفات میں دیکھ چکا ہوں تب کی بات ہے۔ آپ مجھے دیکھ کر مسکرائے بھی تھے۔ اگر میری بات غلط ثابت ہوئی تو مجھ پر میری بیوی حرام ہے۔“

دونوں بھائی آپ کے پاس پہنچے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔ چھوٹے بھائی نے آپ سے کہا۔ ”کیا میں آٹھویں ذی الحجہ کو آپ کے پاس موجود نہیں تھا؟“ بڑے بھائی نے جوش سے کہا۔ ”اور حضرت! آپ حج فرمائیے کہ کیا میں آپ سے میدان عرفات میں نہیں ملا تھا؟ آپ تو مجھے دیکھ کر مسکرائے بھی تھے اور میں کوشش کے باوجود آپ کے پاس پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔“

آپ نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ ”تو اپنے بڑے بھائی سے ناحق الجھ رہا ہے، جا خدا کی عبادت میں مشغول ہو جا۔“ اور بڑے بھائی کو حکم دیا۔ ”کون ہے جو تجھے جھٹلا دے، تو اپنی بیوی کو مت چھوڑ۔“ بڑے بھائی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ آٹھویں ذی الحجہ کو یہاں موجود تھے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو نے میدان عرفات میں جو کچھ دیکھا تھا، اب اسے کسی اور سے ہرگز بیان نہ کرنا۔“ دونوں بھائی ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ ایک شخص آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا اور آپ سے پوچھا۔ ”حضرت! یہ بتائیے نجات کس بات میں ہے؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”تین باتوں میں۔ خاموشی، تنہائی اور کم کھانے میں۔“

وہ شخص بہت خوش ہوا، بولا۔ ”حضرت! میں آپ کی صحبت میں زندگی گزار دینا چاہتا ہوں۔“ آپ نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے تو رہ میری صحبت میں لیکن یہ تو بتا کہ میرے بعد تو کس کی صحبت اختیار کرے گا؟“ اس نے کہا۔ ”پھر خدا کی صحبت اختیار کروں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”پھر ابھی سے خدا کی صحبت کیوں نہیں اختیار کرتا کیونکہ اس کی صحبت سے کبھی تجھے مایوس نہیں ہونا پڑے گا۔“ آخری عمر میں آپ کے پاس درندے بے تکلف آنے جانے لگے۔ آپ نے ان کے لیے ایک کوٹھری وقف کر دی تھی اور اس کوٹھری کا نام بیت السباع (درندوں کا گھر) رکھ دیا تھا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ درندے دم ہلاتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور انہیں ان کی کوٹھری میں پہنچا دیتے۔ وہاں ان درندوں کی گوشت سے تواضع کی جاتی۔

ایک دوسرے بزرگ شیخ ابو الغیث یحییٰ کے سامنے جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو بعض آدمیوں نے اعتراض کیا۔ ”بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ بہل بن عبد اللہ تیری کے پاس جنگلی درندے یا تو جانوروں کی طرح آتے جاتے رہیں اور کسی کو کوئی گزند نہ پہنچائیں؟“ شیخ ابو الغیث یحییٰ نے غصے سے جواب دیا۔ ”تم لوگ بہل بن عبد اللہ کے مرتبے سے واقف نہیں ہو سکتے اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔“

کسی معترض نے کہا۔ ”حضرت! آپ بھی تو صاحب کشف ہیں آخر آپ کی طرف سے کوئی ایسی کرامت کیوں نہیں ظاہر ہوتی؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”تو ذرا میرے ساتھ جنگل تک چل، وہاں مجھے ایک کام ہے اور وہاں تیرے اعتراض کا جواب بھی مل جائے گا۔“

شیخ ابو الغیث یحییٰ اس معترض کو لے کر جنگل میں چلے گئے۔ یہ دونوں صاحبان اپنے اپنے گدھوں پر سوار تھے۔ جنگل میں شیخ ابو الغیث یحییٰ تو گدھے کو چھوڑ کر لکڑیاں کاٹنے لگے اور معترض ادھر ادھر ہوا خوری کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک طرف سے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ معترض ڈر کر بھاگنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا۔ شیر نے شیخ یحییٰ کے گدھے کو پھاڑ ڈالا تھا اور اسے غرا کر چٹ کر رہا تھا۔

معترض خوف کے ساتھ ساتھ دل میں اس بات پر فحش رہا تھا کہ آج شیخ یحییٰ کو وہ لا جواب کر کے رہے گا اور ان سے پوچھے گا کہ ”حضرت! آپ کی کرامت کہاں چلی گئی کہ شیر آپ کی موجودگی میں آپ کے گدھے کو چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ آپ نے اسے روک نہیں لیا۔“ آپ لکڑیوں کا گٹھا لیے ہوئے جنگل سے نمودار ہوئے اور ادھر ادھر اپنے گدھے کو تلاش کرنے لگے۔ شیر آپ کے گدھے کو ایک درخت کی آڑ میں کھانے میں مشغول تھا۔

شیخ یحییٰ نے اپنے گدھے کو آواز دی تو معترض نے طنز کیا۔ ”حضرت! آپ کا گدھا تو شیر کے پیٹ میں پہنچ چکا، اب آپ قیامت تک اسے پکارتے رہیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”وہ شیر کہاں ہے؟“ معترض نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس درخت کے پیچھے۔“ آپ نے پوچھا۔ ”اور تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ کیا تجھے شیر سے ڈر نہیں لگ رہا؟“

معترض نے جواب دیا۔ ”چونکہ شیر کی یہ عادت ہے کہ اگر اس کا پیٹ بھر چکا ہو تو وہ بلاوجہ چیر پھاڑ نہیں کرتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر شیر میری طرف رجوع ہوا تو میں اپنے گدھے کو اس کے حوالے کر کے کسی درخت پر چڑھ جاؤں گا۔“

شیخ یحییٰ نے کہا۔ ”افسوس کہ اب میں ان لکڑیوں کا گٹھا گھر تک کس طرح لے جاؤں گا؟“ معترض نے طنز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کام کے لیے میں اپنا گدھا تو پیش کرنے سے رہا۔ شیر کو حکم دیں کہ وہ آپ کا گدھا گل دے۔“

شیخ یحییٰ شیر والے درخت کی طرف بڑھے، بولے۔ ”کوئی ترکیب تو کرنا ہی پڑے گی۔“ معترض کی جان نکل گئی، خوشامد کرتے ہوئے بولا۔ ”حضرت! وہاں آجائے، میرا گدھا حاضر ہے۔ یہاں سے نکلنے کی فکر کیجیے۔“ لیکن شیخ یحییٰ رکے نہیں۔ درخت کے پیچھے شیر اس وقت بھی موجود تھا۔

آپ نے شیر کو ڈانٹا۔ ”کم بخت! یہ تو نے کیا کیا کہ میرا گدھا چٹ کر گیا۔ اب میں اپنی لکڑیاں کس پر لاؤں گا؟“ شیر نے کتے کی طرح دم ہلانا شروع کر دی۔ آپ نے اس کا کان پکڑ لیا، بولے۔ ”آج تو میں تجھے چھوڑنے سے رہا۔ اگر گدھا نہیں ہے تو کیا ہوا تو موجود ہے۔ چل میری لکڑیوں کا گٹھا اپنی پشت پر لاؤ میرے گھر تک پہنچا۔“

معترض نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا تو اس کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے۔ آپ نے اس سے کہا۔ ”تو کیوں گھبراتا ہے، میں بات انصاف کی کر رہا ہوں۔ جب اس نے میرا گدھا کھایا ہے تو لا محالہ لکڑیاں بھی اس کی پشت پر لا دی جائیں گی۔“

آپ نے لکڑیوں کا گٹھائیر کی پشت پر رکھ دیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ خوف زدہ معترض آپ کے پیچھے چلے رہا تھا۔ آپ نے اپنے دروازے پر پہنچ کر لکڑیوں کا گٹھائیر کی پشت سے اتار لیا اور شیر کو حکم دیا۔ ”اب تو جنگل واپس جا۔“

شیر اس طرح دم دبا کر فرار ہوا جس طرح بکری بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

آپ نے خوف زدہ معترض سے پوچھا۔ ”بھل بن عبد اللہ کے اس واقعے کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جس میں لوگ یہ جانتے ہیں کہ انہوں نے درعدوں کے لیے بیت السباع قائم کر رکھا ہے؟“

اس نے سہم کر جواب دیا۔ ”اب آپ جو کچھ فرمائیں گے میں یقین کر لوں گا۔“

☆☆☆

وقات کے قریب آپ کے سر یدوں نے پوچھا۔ ”حضرت! آپ کے بعد آپ کا خلیفہ کون ہوگا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”شاد لکیر آتش پرست۔“

لوگوں نے پوچھا۔ ”برسر منبر وعظ کون کہے گا؟“

آپ نے اپنا پہلا جواب دہرایا۔ ”شاد لکیر آتش پرست۔“ لوگ حیرت کی وجہ سے زبان سے تو کچھ بھی نہ کہہ سکے لیکن ان کی صورتیں کہہ رہی تھیں کہ ایک آتش پرست آخر کس طرح ان کا خلیفہ بنے گا اور اسے برسر منبر مسلمان کس طرح جانے دیں گے۔

آپ نے شاد لکیر آتش پرست کو بلوایا اور اسے صیحت کی۔ ”شاد لکیر! میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ میرے انتقال کے تیسرے دن یہاں آجانا اور عصر کی نماز کے وقت سے وعظ کہنا شروع کر دینا۔“

آپ کے انتقال فرمانے کے تین دن بعد شاد لکیر آپ کی خانقاہ میں داخل ہوا اس وقت وہ پٹا بڑا ہی لاس پہنے ہوئے تھا۔ وہ اسی لباس میں منبر پر چڑھ گیا اور حاضرین کو مخاطب کیا۔ ”لوگو! تمہارے سردار نے مجھے راہ نمائیا ہے جس میں اس میں کوئی اعتراض تو نہیں؟“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

مجھے میں سے کسی نے سرگوشی کے انداز میں اعتراض کیا۔ ”لیکن جناب! یہ بات ہے کتنی عجیب کہ ایک آتش پرست، خدائے واحد کے منبر سے ہماری راہ نمائی کرے۔“

شاد لکیر آتش پرست نے فس کر جواب دیا۔ ”تیرا شبہ درست ہے لیکن اس ہدایت میں جو بھل بن عبد اللہ نے میرے حق میں فرمائی تھی، یہاں اشارہ بھی مضمر ہے کہ میں آتش پرستی کو ترک کر دوں۔“

اتنا کہہ کر اس نے اپنا آتش پرستی کا لبادہ اتار دیا۔ اس کے اندر اسلامی لبادہ موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ”اب میں مسلمان ہوا ہوں۔“ شاد لکیر کمر پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

اس کے بعد اس نے پہلا وعظ جو کیا، اس کے مشہور الفاظ یہ تھے۔ ”لوگو! میں نے تو ظاہری لبادہ اتار کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا ہے لیکن تم لوگ مسلمان ہو اور اگر تم روز محشر بھل بن عبد اللہ سے ملنا اور ان کے قریب رہنا چاہتے ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے دلوں پر سے غیر اللہ کے لبادے اتار دیکھو۔“

ان جملوں نے لوگوں کے دلوں کی حالت بدل دی اور وہ سب ذرا وقار رونے لگے۔

آپ کے جنازے میں ایک آتش پرست بھی موجود تھا۔ اس نے غلامی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اوپر سے فرشتوں کا نزول دیکھ رہا ہوں۔ اسے کاش تم بھی دیکھ سکتے۔“ اس کے بعد وہ آتش پرست بھی مسلمان ہو گیا۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ زندگی چار قسم کی ہوتی ہے۔ فرشتوں کی زندگی، جو ہمیشہ اطاعت میں گزرتی ہے۔ نبیوں کی زندگی، جو علم اور وحی میں گزرتی ہے۔ صدیقیوں کی زندگی، جو بے چون و چرا اقتدا میں گزرتی ہے اور باقی لوگوں کی زندگی، خواہ وہ عالم ہوں یا جاہل ہوں، زاہد ہوں یا عابد ہوں۔ ان سب کی کھانے پینے میں گزرتی ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتے۔ ”ضرورت نبیوں کے لیے ہے، قیام صدیقیوں کے لیے، قوت مومنوں کے لیے اور اہل چوپایوں کے لیے۔“

آپ کی ان باتوں نے آپ کو علمائے متکلمین میں شامل کر دیا ہے اور اہل تفسیر ہمیشہ اس بات پر نازاں رہے کہ ان کے وطن کے بھل بن عبد اللہ ایک بہت بڑے صوفی ہی نہیں، بہت بڑے حکم بھی تھے۔

خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری۔ معارج الاولیاء، قلمی بحوالہ خزینۃ الاصفیاء۔ حقیقۃ الفقر،

بحوالہ خزینۃ الاصفیاء۔ مفتاح العارفین (قلم)، عبدالفتاح بن نعمان۔ حسنات العارفین، شہزادہ داسراش کوہ

ساختات

کیرٹن کے سامنے گاڑی روکتے ہی تک ویلوٹ کی نظریں ایک مرتبہ پھر معنی مہر پیش کرنے والے آئینے کی طرف اٹھ گئیں جہاں کسی گاڑی کی ہیڈ لیمپس کی روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

چند سیکنڈ بعد ہی سیاہ رنگ کی ایک سیڈان ان کی گاڑی کے قریب سے گزرتی ہوئی چند گز آگے ایک موڑ پر غائب ہو گئی۔ یوں تو اس سڑک پر ٹریفک کا ایک نہ رکنے والا سیلاب رواں تھا لیکن اس سیڈان کو شناخت کرنے میں تک سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تقریباً پون گھنٹے سے اس

گاڑی کو اپنے تعاقب میں دیکھ رہا تھا اور یہ تعاقب اس وقت شروع ہوا تھا جب وہ ساحل سے لوٹے تھے۔ راستے میں دو مرتبہ اس سیاہ سیڈان نے ان کی گاڑی کو اوور ٹیک کیا تھا لیکن ہر مرتبہ کسی نہ کسی طرح وہ پھر ان کے پیچھے آ گئی تھی۔ پہلے تو تک نے اسے محض اتفاق سمجھا تھا لیکن بالآخر اسے یقین کر لیا پڑا کہ وہ گاڑی ان کا باقاعدہ تعاقب کر رہی تھی۔

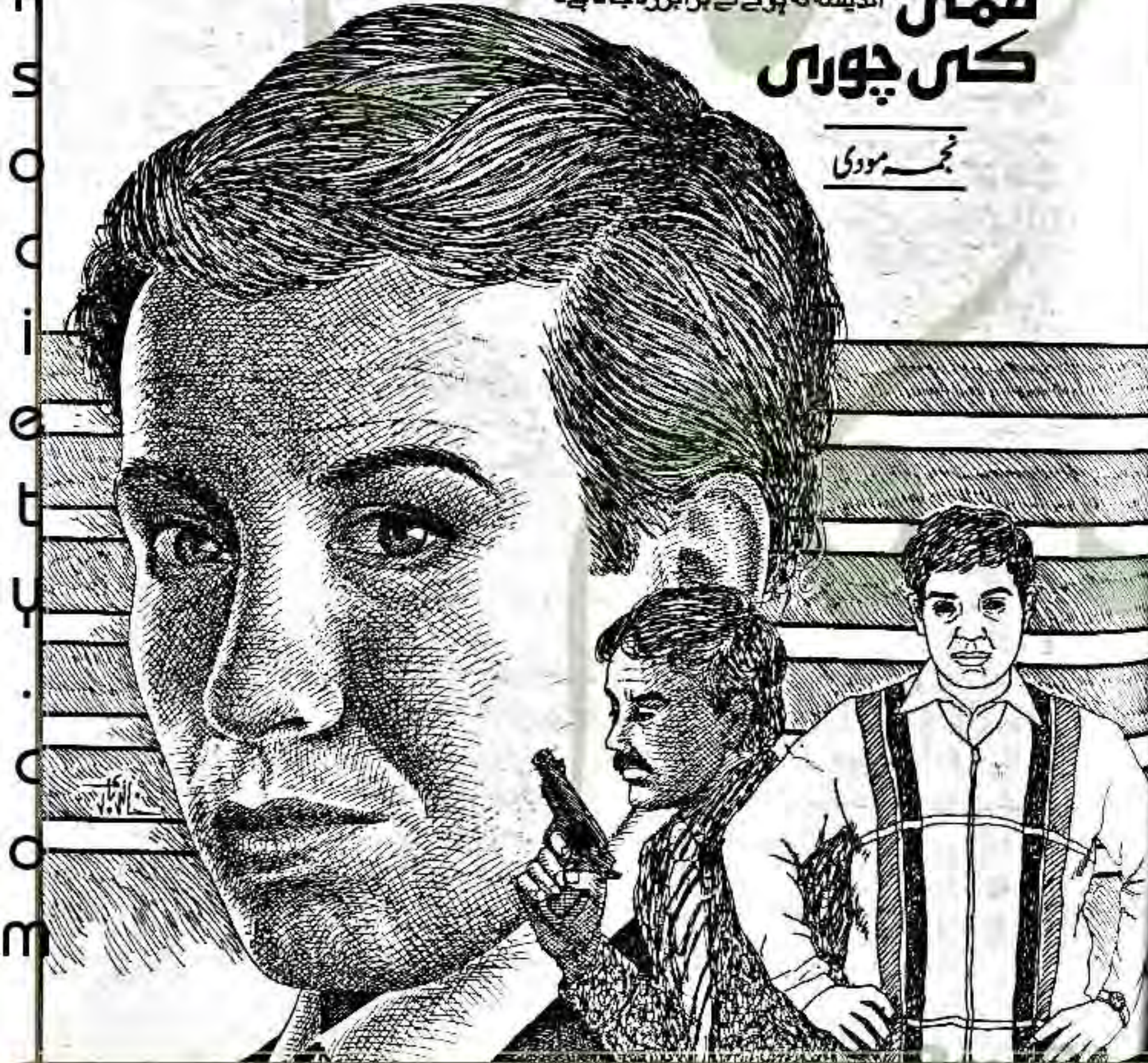
تک ویلوٹ اپنے ایک دوست کی دعوت پر چند روز پہلے لاس اینجلس آیا تھا۔ ان دنوں چونکہ اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے اس کے خیال میں چند روز تفریح

بے شمار وارداتوں اور دلچسپ واقعات میں سے ایک کا انتخاب

یوں تو کوئی بھی مجرم ارتکاب جرم کے دوران کسی نیکی کو بھی ذہن میں نہیں رکھتا مگر... یہاں تو زندگی سے محروم مردہ بدن کی بھی ایسی تجارت ہو رہی تھی کہ دل پریشان ہو گیا... لیکن یہاں یہ بات قابل غور نہیں تھی کہ چوری شدہ مال کی نوعیت کیا ہے۔ البتہ یہ اہم تھا کہ چوری کرنے والا کون ہے... اور جب نام تک ویلوٹ کا آجائے تو نقصان کا اندیشہ نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔

میں کسی چور کی

نجمہ مودی



کر لینے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی تفریحی پروگرام ہو اور گور یا اس کے ساتھ نہ ہو۔ انکشاف تو لاس انجنز پہنچ کر ہی ہوا تھا کہ بک کا دوست والٹر دراصل شادی کرنے والا تھا۔ محض تجسس پیدا کرنے کے لیے اس نے خط میں شادی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ بہر حال شادی کے چوتھے روز والٹر اپنی بیوی کے ساتھ ہنی مون منانے کے لیے فلوریڈا چلا گیا تھا اور گور بک اور گور یا کے حوالے کر گیا تھا۔ والٹر کی اس حرکت پر بک کو غصہ تو بہت آیا تھا لیکن اس نے جلد ہی غصہ تھوک دیا کیونکہ وہ تو آیا ہی تفریح کے لیے تھا اور تفریح والٹر کے بغیر بھی ہو سکتی تھی۔

آج شام ساحل پر گزرنے کے بعد رات گیارہ بجے کے قریب وہ واپس لوٹ رہے تھے کہ اس سیاہ سیڈان کو اپنے تعاقب میں دیکھ کر بک نے راستہ بدل دیا۔ گور یا نے اس کی وجہ بھی دریافت کی لیکن بک نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا کم از کم اس وقت تک جب تک کہ اسے یقین نہ ہو جاتا کہ واقعی ان کا تعاقب کیا جا رہا تھا، دوسری صورت میں اسے گور یا کے سامنے عداوت اٹھانا پڑتی۔ بک کی عادت تھی کہ وہ اس وقت تک کوئی بات نہیں کہتا تھا جب تک کہ خود اسے اس کا یقین نہ ہو جاتا۔

”کیا بات ہے، تم نے یہاں گاڑی کیوں روک لی؟“ گور یا نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں تمہیں اتنا بھی کوڑھ مغز نہیں سمجھتا تھا۔“ بک ویلٹ نے انجن بند کرتے ہوئے اسے گھورا۔

”میں ایسی ہوں بھی نہیں۔“ گور یا نے تڑ سے جواب دیا۔ ”میں تو اسی وقت سمجھ گئی تھی جب تم نے راستہ تبدیل کیا تھا۔ کیا یہ غلط ہے کہ تمہارے راستہ تبدیل کرنے اور یہاں رکنے کی وجہ۔۔۔ وہ سیاہ سیڈان ہے جو ابھی ابھی اگلے موڑ پر مڑی ہے؟“

”ٹھیک سمجھیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے اور پون گھنٹے سے ہمارا تعاقب کیوں کر رہا ہے۔“ بک نے جواب دیا۔

”گاڑی قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ گاڑی میں اکیلا ہی تھا۔ سر پر سفید بالوں کی جھالری تھی۔“ گور یا نے کہا۔

”یہ تم نے کون سا تیر مار لیا۔ سفید بالوں کی جھالری تو میں نے بھی دیکھی تھی لیکن گاڑی میں تاریکی کی وجہ سے اس کا چہرہ نظر نہیں آ سکا تھا۔ بہر حال، اگر وہ واقعی ہمارا تعاقب کر رہا تھا تو چند منٹ میں پتا چل جائے گا۔“ بک بولا۔

”لاس انجنز تم کئی مرتبہ آچکے ہو۔ یہاں کوئی ایسا آدمی تو نہیں جو تم سے کسی قسم کا انتقام لینا چاہتا ہو؟“ گور یا کے لہجے میں تشویش تھی۔

”میرا خیال ہے امریکا کا کوئی شہر ایسا نہیں جہاں میری جان کے گاہک موجود نہ ہوں۔ لیکن تم اطمینان رکھو۔ تمہارا گئی کسی کے لیے ترنوالہ ثابت نہیں ہوگا۔ چلو، اب اس ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔ چند منٹ بعد ہی صورت حال مکمل کر سامنے آجائے گی۔“ بک نے کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول لیا۔

گور یا بھی دروازہ کھول کر پیچھے اتر آئی۔ وہ دونوں ادھر ادھر دیکھے بغیر نیچے تلے قدم اٹھاتے ہوئے کیرٹن میں داخل ہو گئے۔ یہ اونچے طبقے کا ایک پرسکون ریسٹورنٹ تھا۔ وسیع ہال تین حصوں میں مقسم تھا۔ ایک حصہ چائے کافی وغیرہ پینے والوں کے لیے مخصوص تھا اور دوسرے حصے میں بار..... کاؤنٹر بنا ہوا تھا جبکہ تیسرے حصے میں چھوٹے چھوٹے پرائیویٹ کیمین بنے ہوئے تھے۔

بک نے ایک ایسی میز سنبھال لی جہاں سے داخلی دروازے پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ ان کے بیٹھنے کے فوراً بعد ہی ایک دروازہ قامت ویٹریس ان کے سر پر مسلط ہو گئی۔ وہ لوگ کھانا ساحل کے ایک ریسٹورنٹ میں کھا چکے تھے۔ اس لیے بک نے گور یا کے مشورے کے بغیر کافی کا آرڈر دینے میں کسی جھجک کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ویٹریس جیسے ہی کافی سرو کر کے گئی بک کی نظریں داخلی دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ایک طویل قامت ادیبہ عمر آدمی تھا۔ بک کے اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ صحت اگرچہ قابل رشک تھی لیکن سر کے بیشتر بال جھڑ چکے تھے۔ سفید بالوں کی ایک جھالری وہ گئی تھی جو گھوڑی کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ بک نے اس طرح نظریں پھیر لیں جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ دوسرے ہی لمحے اسے اپنی دائیں پنڈلی پر گور یا کے چہرے کی ہلکی سی ٹھوکر محسوس ہوئی۔

”ہاں، میں نے اسے دیکھ لیا ہے لیکن یہ چہرہ میرے لیے قطعی اجنبی ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس شخص کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔“ بک نے کافی کا کپ اپنی طرف سرکاتے ہوئے اس انداز سے کہا جیسے وہ پہلے سے گور یا سے باتیں کر رہا ہو۔

وہ شخص دروازے کے قریب کھڑا چند لمبے تجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر سیدھا ان ہی کی میز کی

طرف چلا آیا۔ ”مسٹر بک ویلٹ؟“ اس شخص نے میز کے قریب رک کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”تقریباً ایک ہفتہ پہلے شادی کی ایک تقریب میں تمہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد کوشش کے باوجود تم سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ آج اتفاق سے ساحل کے ایک ریسٹورنٹ میں تمہیں دیکھ لیا لیکن تم سے ملاقات سے پہلے میں یقین کر لینا چاہتا تھا کہ کوئی اور شخص میرا تعاقب کر رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے ہم پہلے ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے۔“ بک ویلٹ نے اسے گھورا۔ ”اور پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص میرا تعاقب کیوں کرنے لگا؟“

”دراصل میں بہت احتیاط پسند آدمی ہوں۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہر پہلو کا جائزہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔“

”اسے تمہید سمجھتے ہوئے اب میں یہ جانتا چاہوں گا کہ تم کون ہو اور ہمارا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟“ بک ویلٹ نے اسے گھورا۔ ویلے اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ شخص بھی اس سے کوئی چیز چوری کرنا چاہتا ہے۔

”میرا نام الفرید مائیکل ہے اور ایک معاملے میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔“

”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں تو تمہیں یہ بھی علم ہوگا کہ میں کن شرائط کے تحت کام کرتا ہوں۔“

”کیا بکواس ہے؟ ہم یہاں تفریح کے لیے آئے ہیں۔ کام کی تلاش میں نہیں۔“ گور یا نے مداخلت کرتے ہوئے اسے گھورا۔

”اگر تفریح کے دوران آمدنی کا کوئی وسیلہ بھی نکل آئے تو میں اسے برا نہیں سمجھتا۔“ بک نے کہا پھر الفرید کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”ہاں تو مسٹر الفرید! مجھے امید ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہو گے؟“

”اچھی طرح۔“ الفرید نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تمہاری تمام شرائط مجھے منکھور ہیں۔“

”تو پھر شروع ہو جاؤ۔ کیا چیز چوری کرنا چاہتے ہو؟ لیکن ایک منٹ، پہلے میں تمہارے لیے کافی منگوا لوں، تاکہ تم ہمارا منہ نہ بکتے رہو۔“ بک نے کہتے ہوئے ویٹریس کو ایک اور کافی لانے کا آرڈر دیا۔ چند سیکنڈ بعد جب ویٹریس کافی رکھ کر چلی گئی تو بک سوالیہ نگاہوں سے الفرید کی طرف دیکھنے لگا۔

الفرید نے کافی کی ایک چمکی لی اور کپ میز پر رکھ کر چند لمبے مختاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا پھر مدغم

لہجے میں کہنے لگا ”مجھے ایک عورت کی لاش چوری کرنا ہے۔“ ”لاش؟“ بک اور گور یا نے بیک وقت حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”معاف کرنا دوست! تم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے تو تمہیں کسی گورکن کی خدمات حاصل کرنا چاہئیں۔“

”تم غلط سمجھے۔“ الفرید بولا۔ ”لاش کسی قبرستان سے نہیں ایک مکان سے چوری کی جائے گی۔ دراصل بات یہ ہے کہ تقریباً دو ماہ پہلے میری بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ جولیا کی موت کے بعد میں اس کی محبت کو دل سے نہ نکال سکا۔ میں ایک ماہر سرجن ہوں اور لاشوں کو حوط کرنے کے علم میں بھی مہارت رکھتا ہوں۔ میں نے متعدد نایاب جانوروں کی لاشیں حوط کر کے نیشنل میوزیم کو تحفے کے طور پر دی ہیں جواب بھی وہاں پر موجود ہیں۔ جولیا کی جدائی میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ زندگی میں بھی میں نے بھی ایک لمحے کو اسے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو حوط کر لیا تاکہ وہ ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہے۔“

”عشق کی ایک لازوال داستان ہے۔“ بک اس کے خاموش ہونے پر بولا۔

”مذاق نہیں۔“ الفرید نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا یہ اقدام اگرچہ سراسر غیر قانونی تھا لیکن میں اس سے باز نہ رہ سکا اور جولیا کی لاش کو حوط کر کے ایک شوکیس میں سجاد یا، لیکن تقریباً دو ہفتے قبل ایک رات جب میں گھر لوٹا تو لاش غائب تھی۔“

”اسے وہ شوکیس پسند نہیں آیا ہوگا۔“ اس مرتبہ گور یا نے لقمہ دیا۔

”میں سنجیدہ ہوں مس!“ الفرید کا لہجہ ایک بار پھر ناخوشگوار ہو گیا۔

”بات جاری رکھو مسٹر الفرید! میں پوری توجہ دے رہا ہوں بلکہ اب تو کچھ دلچسپی بھی لے رہا ہوں۔“ بک بولا۔ ”لاش کو غائب یا کر مجھ پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔“ الفرید نے بات جاری رکھی۔ ”لیکن ظاہر ہے کہ میں پولیس میں چوری کی رپورٹ نہیں لکھوا سکتا تھا اس لیے میں نے اپنے طور پر اس کی تلاش شروع کر دی۔“

”تمہارے خیال میں لاش چرا لی گئی تھی؟“ بک نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ظاہر ہے، وہ خود چل کر تو کہیں جانے سے رہی۔“ الفرید بولا۔ ”تقریباً دس روز پہلے مجھے پتا چلا کہ جولیا کی می

اسی شہر میں موجود ہے۔ کسی نامعلوم شخص نے اسے چوری کر کے مصری می کے طور پر فروخت کر دیا تھا۔
”اوہ، میرے خیال میں یہ لاش میٹشل میوزیم نے خریدی ہوگی؟“

”نہیں۔“ الفریڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میوزیم والے اتنے احمق نہیں ہیں کہ صدیوں پرانی می اور دو مہینے پہلے مرنے والی کسی عورت کی لاش میں فرق نہ کر سکیں۔ اس شہر میں تمہیں دو چار ایسے آدمی ضرور مل جائیں گے جو نوادرات جمع کرنے کے جنون میں مبتلا ہیں۔ ایڈورڈ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا ذاتی میوزیم ہے۔ اسے نوادرات جمع کرنے کا خطبہ ہے۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے وہ ہر سال لاکھوں ڈالر خرچ کر ڈالتا ہے۔ اس کے میوزیم میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو چور بازار سے خریدی گئی ہیں۔ اگرچہ قانوناً یہ بھی جرم ہے لیکن اسے دولت کی آڑ حاصل ہے۔ کبھی وجہ ہے کہ آج تک ان معاملات میں اس سے بھی باز پرس نہیں کی گئی۔ جولیا کی لاش بھی اس نے خریدی ہے۔ اسے یقین ہے کہ یہ لاش قدیم مصری کسی شہزادی کی ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو تم اسے صورت حال سے آگاہ کر کے لاش کی واپسی کا مطالبہ کر سکتے ہو۔“ نک نے کہا۔
”اس میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ جولیا کی لاش کو حوطہ کر کے میں خود جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔ اگر میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا تو وہ اتنا مجھے ہی اندر کر دے گا۔ اس کے علاوہ میں لاش کی بے حرمتی نہیں چاہتا اس لیے اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی طرح لاش حاصل کر کے اسے مذہبی رسوم کے تحت دفن کر دیا جائے تاکہ جولیا کی روح اور میرے دل کو سکون مل سکے۔“
”ہوں۔“ نک ویلیٹ نے اس کے خاموش ہونے پر ہنکارا بھرا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ واقعی کوئی مصری می نہیں بلکہ تمہاری بیوی جولیا ہی کی لاش ہے؟“

”ہاں، میں ثبوت فراہم کر سکتا ہوں۔ میرے پاس جولیا کی تصویریں موجود ہیں جو میرے بیان کی تصدیق کریں گی۔“ الفریڈ نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لافانہ نکال لیا اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر تک کی طرف بڑھادی۔

نک ویلیٹ غور سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ یہ تصویر غالباً کسی پورٹریٹ سے کاپی کی گئی تھی۔ خوب صورت نقش و نگار والی اس عورت کی عمر تک کے خیال میں زیادہ سے زیادہ تیس

برس رہی ہوگی۔ چند لمحوں بعد اس نے تصویر لوٹا دی۔
”ٹھیک ہے، میں تمہارا یہ کام کرنے کو تیار ہوں لیکن اگر کوئی قانونی الجھاؤ پیدا ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہوگی۔“

”اسی لیے میں تمہاری معاوضے پر تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تم ایسے کاموں کے ماہر ہو۔ مجھے یقین ہے کہ لاش کی چوری کا انکشاف ہونے کے بعد ایڈورڈ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے وہ خود قانون کی گرفت میں آتا ہو۔“

”سٹر ایڈورڈ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے اس کا پتا وغیرہ؟“ نک نے پوچھا۔

الفریڈ نے مطلوبہ پتا بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی جیب سے پھولا ہوا لافانہ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اس میں کچھیں ہزار ڈالر کی رقم کے علاوہ میرا پتا اور فون نمبر بھی موجود ہے لیکن کام پورا ہونے سے پہلے تم مجھ سے رابطہ قائم نہیں کرو گے نہ ہی لاش کو لے کر اس پتے پر آؤ گے۔ لاش حاصل کرتے ہی مجھے فون کر دینا میں مقررہ جگہ پر پہنچ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے، اس کے لیے تمہیں شاید ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑے۔“ نک نے لافانہ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔
”ایک ہفتہ کیوں؟“

”انسانی لاش کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جسے جیب میں ڈال کر لایا جاسکے۔ اس کے لیے مجھے خصوصی تیاری کرنا پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن زیادہ تاخیر نقصان دہ ہوگی۔ ممکن ہے اس دوران ایڈورڈ لاش کہیں اور غفل یا فروخت کر دے۔“ الفریڈ اٹھتے ہوئے بولا۔

”مطمئن رہو۔ لاش خواہ کہیں بھی ہو تمہیں مل جائے گی۔“ نک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

الفریڈ کے جانے کے بعد تک نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے گھور پائی طرف دیکھا اور اسے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی کرسی چھوڑ دی۔

☆☆☆

ویسٹ ووڈ بے وارڈ کی تیسری سڑک کے موڑ پر سرخ پتھر والی وہ عمارت اگرچہ چند سال قبل ہی معرض وجود میں آئی تھی لیکن اس کا طرز تعمیر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کم از کم ایک صدی قبل تعمیر کیا گیا ہوگا۔ گیٹ پر ایک باورچی دربان بھی موجود تھا جس سے مکینوں کی اقتصادی حالت کا

اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ عمارت کے چاروں طرف ایک وسیع رقبے پر خوب صورت لان پھیلا ہوا تھا۔ دن کے وقت یہ پر شکوہ عمارت یقیناً قابل دید رہی ہوگی لیکن اس وقت پائین باغ اور عمارت کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ پر دونوں طرف برقی قلعے روشن تھے جن کی روشنی ایک محدود رقبے کو اجاگر کر رہی تھی۔ اس سے تقریباً پچاس گز آگے عمارت تک جانے والی سڑک تاریک تھی۔ عمارت کا برآمدہ روشن تھا۔ گراؤنڈ فلور کی ایک کھڑکی اور بالائی منزل کی دو کھڑکیوں میں بھی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے علاوہ وسیع و عریض عمارت کے کسی حصے میں بھی روشنی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

جنوبی سمت سے آنے والی وہ گاڑی متوسط رفتار سے چلتی ہوئی عمارت کے گیٹ کے سامنے سے گزرتی چلی گئی لیکن تقریباً سو گز آگے ایک موڑ گھومتے ہی گاڑی رک گئی۔ اسٹیرنگ ایک عورت کے ہاتھ میں تھا جس نے گاڑی روکے ہی تمام بتیاں بجھا دیں اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نک ویلیٹ نے کلائی پر بندھی ہوئی ریڈیم ڈائل والی گھڑی دیکھی۔ رات کا ایک بجنا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی جیبیں ٹٹول کر ان کا جائزہ لیا۔ پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں بولا۔

”تم ٹھیک دو بجے اس جگہ پہنچ جانا گھور یا! اگر میں یہاں نہ ملتا تو زیادہ سے زیادہ ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد واپس چلی جاتا۔“

”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟“ گھور یا نے پوچھا۔
”گڑبڑ کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کوشش کے باوجود میں آج دن میں عمارت کے اندر داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس وقت جو بھی کام ہوگا محض اندازوں پر ہی ہوگا۔ مجھے ان معلومات پر بھروسہ کرنا پڑے گا جو گزشتہ دو دن میں حاصل کر سکا ہوں۔“ نک کہتا ہوا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

گھور یا نے ایک بلکے سے جھگے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ نک ویلیٹ اس وقت تک وہیں کھڑا رہا جب تک کہ گاڑی کی حتمی سرخ بتیاں اگلے موڑ پر نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئیں۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی اور سڑک کے سڑک پر چل دیا جو گھومتی ہوئی سرخ پتھر والی عمارت کی پشت کی طرف چلی گئی تھی۔

گزشتہ دو دنوں میں نک ویلیٹ نے مختلف ذرائع سے اس عمارت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو اگرچہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھیں لیکن بہر حال ان کے سہارے کام چلایا جاسکتا تھا۔ عمارت کی چاروں طرف پائین باغ اور عمارت کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ پر دونوں طرف برقی قلعے روشن تھے جن کی روشنی ایک محدود رقبے کو اجاگر کر رہی تھی۔ اس سے تقریباً پچاس گز آگے عمارت تک جانے والی سڑک تاریک تھی۔ عمارت کا برآمدہ روشن تھا۔ گراؤنڈ فلور کی ایک کھڑکی اور بالائی منزل کی دو کھڑکیوں میں بھی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے علاوہ وسیع و عریض عمارت کے کسی حصے میں بھی روشنی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

جنوبی سمت سے آنے والی وہ گاڑی متوسط رفتار سے چلتی ہوئی عمارت کے گیٹ کے سامنے سے گزرتی چلی گئی لیکن تقریباً سو گز آگے ایک موڑ گھومتے ہی گاڑی رک گئی۔ اسٹیرنگ ایک عورت کے ہاتھ میں تھا جس نے گاڑی روکے ہی تمام بتیاں بجھا دیں اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نک ویلیٹ نے کلائی پر بندھی ہوئی ریڈیم ڈائل والی گھڑی دیکھی۔ رات کا ایک بجنا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی جیبیں ٹٹول کر ان کا جائزہ لیا۔ پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں بولا۔

”تم ٹھیک دو بجے اس جگہ پہنچ جانا گھور یا! اگر میں یہاں نہ ملتا تو زیادہ سے زیادہ ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد واپس چلی جاتا۔“

کی کوشش کی تھی جو اگرچہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھیں لیکن بہر حال ان کے سہارے کام چلایا جاسکتا تھا۔ عمارت کی چاروں طرف پائین باغ اور عمارت کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ پر دونوں طرف برقی قلعے روشن تھے جن کی روشنی ایک محدود رقبے کو اجاگر کر رہی تھی۔ اس سے تقریباً پچاس گز آگے عمارت تک جانے والی سڑک تاریک تھی۔ عمارت کا برآمدہ روشن تھا۔ گراؤنڈ فلور کی ایک کھڑکی اور بالائی منزل کی دو کھڑکیوں میں بھی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے علاوہ وسیع و عریض عمارت کے کسی حصے میں بھی روشنی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

عمارت کی پشت پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ دیوار کے قریب جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جھاڑیوں میں رینگتا ہوا دیوار کے قریب پہنچ گیا اور جب سے پینسل ٹارچ نکال کر اس کی مدد و روشنی میں دیوار کے نچلے حصے کا جائزہ لینے لگا۔ روشنی جلد ہی ایک جگہ پر رک گئی۔ زمین کی سطح سے تقریباً ایک فٹ اوپر دیوار میں ایک روشندان نظر آ رہا تھا۔ اس روشندان کی چوڑائی دو فٹ اور لمبائی چار فٹ کے قریب تھی۔ اندر کی طرف شیشہ اور باہر کی طرف لوہے کا جھنگلا لگا ہوا تھا۔ یہ عمارت کے ترخانے کا روشندان تھا۔ نک کی اطلاعات کے مطابق اس ترخانے میں ایڈورڈ کا ذاتی میوزیم تھا جہاں اس نے دنیا بھر کے نوادرات جمع کر رکھے تھے اور اس کے مطابق الفریڈ کی بیوی جولیا کی حوطہ شدہ لاش بھی اسی ترخانے میں ہونی چاہیے تھی۔ نک کے خیال میں کوئی لاش چرا کر لے جانا واقعی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے لمبی چوڑی پلاننگ کی ضرورت تھی۔ آج وہ لاش چرانے کی نیت سے آیا بھی نہیں تھا۔ اس وقت وہ محض حفاظتی انتظامات اور چوری کے امکانات کا جائزہ لینے آیا تھا۔ اس میں اگرچہ یہ خطرہ بھی تھا کہ آج کی مداخلت سے وہ لوگ ہوشیار ہو کر حفاظتی انتظامات میں تبدیلیاں پیدا کر دیں جس سے خود تک کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو سکتی تھیں لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

روشندان کے قریب بیٹھ کر نک کچھ دیر تک لوہے کے جھگے کا جائزہ لیتا رہا پھر جب سے الیکٹریک ٹیسٹر نکال کر جھگے کو چیک کرنے لگا۔ اس کا غرض بے بنیاد نکلا۔ جھگے میں کرنٹ نہیں تھا۔ اس نے الیکٹریک ٹیسٹر جیب میں ڈال لیا اور فولاد کاٹنے والی ایک چھوٹی سی آری نکال کر جھگے کی سلاخیں کاٹنے لگا۔ آری کے چلنے سے ہلکی سی آواز ابھر رہی تھی لیکن وہ آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ اسے چند قدم کے فاصلے پر بھی سنا جاسکتا۔

تقریباً پندرہ منٹ میں چند سلاخیں کٹنے سے جھگے میں اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ وہ آسانی سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ آگے شیشہ تھا جسے بے آواز کاٹنے میں بھی اسے زیادہ

دشواری پیش نہیں آئی۔ کئے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ ڈال کر اس نے روشندان کھول دیا۔ اب وہ اندر کودنے کے لیے تیار تھا۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ روشندان زمین کی سطح سے کتنی بلندی پر تھا۔ پوزیشن ایسی تھی کہ وہ نارنج کی روشنی میں اندر کا جائزہ بھی نہیں لے سکتا تھا کیونکہ روشندان میں داخل ہونے کے لیے پہلے اس نے ٹانگیں اندر کو نکالی تھیں اور دونوں ہاتھ روشندان کے فریم پر بجائے اندر کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ خلا میں جھول رہا تھا چھوڑ دیے۔ ایک لمحوں کو تو یوں محسوس ہوا جیسے پاٹال میں گرنا چلا جا رہا ہو لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ب کی ہلکی سی آواز سے اس کے سر پر فرش سے ٹکرائے۔ وہ تقریباً بارہ فٹ کی بلندی سے کودا تھا، اس لیے نیچے آتے ہوئے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا لیکن یہ بھی قیمت تھا کہ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔

گرنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ پر دبکا رہا۔ مکان کے اندر کسی محافظ کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کئی منٹ تک جب کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تو اس نے نارنج چلائی اور اس کی محدود روشنی میں ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ایک مختصر سا کمر تھا جس میں فرنیچر نام کا ایک تنکا تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرش پر دھول جی ہوئی تھی جو اس امر کا واضح ثبوت تھا کہ یہ کمر اطویل عرصے سے استعمال میں نہیں ہے۔ وہ اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جو بائیں طرف نظر آ رہا تھا۔

دروازہ بند تھا۔ وہ ہاتھ کے دباؤ سے کچھ دیر تک اسے آزمانے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب کامیابی نہ ہوئی تو اس نے جیب سے ایک مخصوص بناوٹ کا آہنی تار نکال کر تالے کے کی ہول میں داخل کر دیا اور اسے مخصوص انداز میں دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی کلک کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس نے تار نکال کر وینڈل کھما دیا۔ دروازہ آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔ سنائے میں چرچراہٹ کی آواز اس طرح گونجی تھی جیسے مشین گن سے فائرنگ کی جارہی ہو۔ دروازے کے قبضوں میں غالباً بہت عرصے سے تھل نہیں دیا گیا تھا۔

دوسری طرف ایک راہداری تھی جو چند قدم آگے جا کر بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ اس راہداری کے آخری سرے پر مدہم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ تک نے نارنج بجھا کر جیب میں ڈال لی اور وہ بے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ راہداری میں چند قدم آگے دائیں

طرف ایک دروازہ دیکھ کر وہ رک گیا۔ یہ دروازہ بھی اگرچہ متقل تھا لیکن تک کو اسے کھولنے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔ چند لمحوں کی تاریکی میں گھورتا رہا پھر جیب سے نارنج نکال کر چلائی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

یہ ایڈورڈ کا میوزیم تھا جو ایک وسیع ہال پر مشتمل تھا۔ اس کے چاروں طرف زمین سے چھت تک شیشے کے دروازوں والی الماریاں سجی ہوئی تھیں۔ ان الماریوں سے ہٹ کر مناسب فاصلوں پر متعدد شوکیس بھی رکھے ہوئے تھے۔ تک ویلوٹ گھوم پھر کر نارنج کی روشنی میں الماریوں اور شوکیسوں کا جائزہ لینے لگا جن میں مختلف چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ہر چیز کے ساتھ ایک تختی بھی موجود تھی جس پر اس چیز کے بارے میں وضاحت کی گئی تھی۔ تک حیرت و تعجب سے ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ بعض چیزیں تو ایسی بھی تھیں جنہیں واقعی تاریخی ورثہ کہا جاسکتا تھا اور جن کی مالیت اس وقت کروڑوں ڈالرز ہو سکتی تھی۔

تک ویلوٹ کو حیرت تھی کہ ایسی نادر روزگار چیزوں کی حفاظت کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کی طرح کوئی بھی تہ خانے میں داخل ہو کر اس میوزیم کا صفایا کر سکتا تھا۔ ممکن ہے ایڈورڈ کو یہ یقین ہو کہ کوئی اس کے میوزیم میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بہر حال، تک نے یہ سوچتے ہوئے سر جھٹک دیا کہ یہ اس کا درد سر نہیں تھا۔ وہ ہال میں گھوم پھر کر مختلف شوکیسوں کا جائزہ لینے لگا لیکن پورے ہال میں کوئی بھی ایسی چیز نظر نہیں آئی جسے لاش یا مکی کا نام دیا جاسکتا۔

وہ چند لمحوں میں گھڑا بھی ہوئی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ہال سے باہر آ کر دے قدموں دوسرے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ دروازہ متقل نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ یہ کمر دفتر کے طور پر آراستہ تھا۔ یہاں بھی اگرچہ دیواروں کے ساتھ ایستادہ الماریوں میں کچھ نوادرات سجے ہوئے تھے لیکن مکی کا وجود کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ ظاہر ہے ساڑھے پانچ فٹ کی عورت کی لاش کو میز کی دراز میں تو نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ وہ دفتر سے نکل کر دوبارہ بڑے ہال میں آ گیا اور ایک شوکیس کے قریب کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ مکی کو کہاں رکھا جاسکتا ہے۔

دفعتاً اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ تقریباً نے بتایا تھا کہ ایڈورڈ چوری کے نوادرات بھی خریدتا ہے اور

جولیا کی مکی بھی ایک قدیم مصری مکی کی حیثیت سے اس کے پاس فروخت کی گئی تھی۔ ظاہر ہے چوری میں خریدی ہوئی چیزوں کو فوری طور پر منظر عام پر نہیں لایا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے اس خیال کے تحت ایڈورڈ نے بھی اس مکی کو وقتی طور پر کسی دوسری جگہ رکھا ہو۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ ممکن ہے اس ہال میں کوئی ایسی خفیہ جگہ بھی موجود ہو جہاں ایسی کوئی چیز چھپائی جاسکتی ہو لیکن اس جگہ کا سراغ لگانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

تک ویلوٹ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی نارنج کی روشنی نے شوکیس میں آراستہ ایک قدیم مصری رقاصہ کے مجسمے کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ بھول کی لکڑی سے تراشا ہوا یہ مجسمہ تقریباً آٹھ اونچا تھا۔ اس کی موٹائی ڈھائی اونچے سے زیادہ نہیں تھی۔ اس رقاصہ کا تعلق تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کے بالائی مصر سے تھا۔ یہ مجسمہ اس خوب صورتی سے تراشا گیا تھا کہ رقاصہ کے چہرے پر پائے جانے والے تاثرات دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ ابھی بول اٹھے گی۔ یہ فن پارہ دیکھ کر تک کو یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی کہ تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال قبل مصر کے باشندے فنون لطیفہ میں کس قدر ترقی کر چکے تھے۔

وہ چند لمحوں میں اس مجسمے کو دیکھتا رہا پھر شوکیس کا جائزہ لینے لگا۔ شیشہ آسانی سے ہٹایا جاسکتا تھا۔ اس کے دل میں بے اختیار یہ خواہش چلی کہ ہزاروں سال قبل از تاریخ کے اس فن پارے کو ہاتھ میں لے کر دیکھے، اس خیال کے ساتھ ہی اس نے شوکیس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا مگر اس کی انگلیوں نے جیسے ہی شیشے کو چھوا پورا ہال الارم کی خوفناک آوازوں سے گونج اٹھا۔ اب یہ بات تک کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ ان نوادرات کی حفاظت کا ظاہری انتظام اتنا موثر کیوں نہیں تھا۔

الارم کی آواز کو سنے ہی تک نے نارنج بجھا کر دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ چند سیکنڈ کے اندر اندر کوئی نہ کوئی محافظ یہاں پہنچ جائے گا، جو اسے دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بروقت دروازے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر اسے ایک لمحوں کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چوہے کی طرح اندر ہی پھنس کر رہ جاتا کیونکہ الارم بجنے کے صرف تین سیکنڈ بعد دروازہ الیکٹرونک انتظام کے تحت خود بخود بند ہو گیا تھا اور اس وقت تک نہیں کھل سکتا تھا جب تک کہ الارم سے اس کا کنکشن ختم نہ کیا جاتا۔ یہاں تک کی پھرتی کام آ گئی تھی۔

ہال سے نکلے ہی وہ اس کمرے کی طرف دوڑا جہاں وہ روشندان سے کودا تھا۔ خالی ہونے کی وجہ سے اس

کمرے کے دروازے میں الیکٹرک نظام نہیں تھا۔ اس لیے اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ الارم بجنے کے بعد پانچ سیکنڈ کے اندر اندر وہ روشندان سے باہر پہنچ چکا تھا لیکن اسے فوراً ہی جھاڑیوں میں دبک جانا پڑا۔ کچھ دیر پہلے تاریکی میں ڈوبی ہوئی عمارت اب پوری طرح روشنی کے حلقے میں تھی۔ یہ روشنی لان میں جا بجا نصب سرچ لائٹس سے خارج ہو رہی تھی۔ عمارت کے چاروں طرف لان کا بیستر حصہ بھی اب روشنی کی زد میں تھا اور عمارت کے بعض حصوں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

ایسی صورت میں کسی کی نظروں میں آنے بغیر نکل جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ جھاڑیوں میں دبکا ایک طرف کو بڑھتا رہا۔ ایک طرف اسے ایسی جگہ نظر آئی تھی جہاں درختوں کی وجہ سے قدرے تاریکی تھی۔ وہ سینے کے بل اسی طرف رینگنے لگا۔ یہاں رکے رہنے کا خطرہ بھی مول نہیں لیا جاسکتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ چند منٹ بعد ہی محافظ چاروں طرف پھیل جائیں گے اور وہ کسی چوہے کی طرح پکڑ لیا جائے گا۔ درختوں کے نیچے پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

ایک آدمی عمارت سے نکل کر تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ تک نے گھڑی دیکھی۔ دو بجتے میں چار منٹ باقی تھے۔ اگر وہ مقررہ وقت پر یہاں سے نکل کر گلی میں نہ پہنچ سکا تو یہ خدشہ بھی تھا کہ گوریلا کی گاڑی کہیں ان لوگوں کی نظروں میں نہ آجائے۔ اس طرح اس کے ساتھ گوریلا بھی مصیبت میں پھنس سکتی تھی۔ اس نے ایک لمحہ سوچنے میں ضائع کیا پھر اٹھ کر باؤنڈری وال کی طرف دوڑ لگا دی۔ گھاس پر قدموں کی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ اس کے علاوہ اسے تاریکی کی آڑ بھی حاصل تھی۔ چار دیواری سے باہر آ کر وہ بے تحاشا اس طرف دوڑتا رہا جہاں گوریلا کے ملنے کی توقع تھی۔

گلی میں داخل ہوتے ہی اسے گاڑی کا ہیولا دکھائی دیا۔ انجن کی گھر گھر اہٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ قریب پہنچتے ہی پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر وہ اندر گر گیا۔ اس وقت اس کی کلائی پر بندھی ہوئی ریڈیم ڈائل والی گھڑی کی سوئیاں دو بج کر دو منٹ کا وقت بتا رہی تھیں۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آئی اور تیز رفتاری سے ایک طرف دوڑنے لگی۔ تک سیٹ پر اوٹھ رہا تھا اب بے ربط شخص پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خیریت ہوئی مسٹر ویلوٹ! اگر میں یہاں نہ ہوتا تو

چند منٹ کے اندر اندر تمہیں ان گلیوں میں گھیر لیا جاتا۔
تک ویلٹ اس طرح اچھل پڑا جیسے بچھونے ڈنک
مار دیا ہو۔ وہ سیدھا ہو کر پچھلی پچھلی سی آنکھوں سے اگلی سیٹ
کی طرف دیکھنے لگا جہاں گلو یا کے بجائے الفرید بیٹھا ہوا
تھا۔ اس کی کھوپڑی پر سفید بالوں کی جھال اس کی شناخت
کے لیے کافی تھی۔

”تم..... تم.....“ تک ہٹکایا۔ ”گلو یا کہاں ہے؟“
”تم نے شاید غلط میں دھیان نہیں دیا، یہ گاڑی بھی
تمہاری نہیں ہے۔ تمہاری دوست ایک بچ کر اٹھاؤں منٹ
پر یہاں پہنچی تھی اور ٹھیک دو بج کر ایک منٹ پر یہاں سے
رخصت ہوئی۔“

”تم یہاں کیسے پہنچے؟“ تک نے پوچھا۔ اب وہ
اپنے حواس پر مکمل طور پر قابو پا چکا تھا۔
”جب سے جولیا کی لاش کی بازیابی کا کام تمہیں سونپا
ہے میں اس وقت سے تمہاری نگرانی کر رہا ہوں۔“
”گو یا تمہیں شبہ ہے کہ میں تمہاری رقم لے کر غائب
نہ ہو جاؤں۔“ تک کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”یہ بات نہیں۔ اگر اعتماد نہ ہوتا تو میں تم سے رابطہ
بھی قائم نہ کرتا۔ تم میری اندرونی کیفیت کا اندازہ نہیں
لگا سکتے۔ میں تمہاری نگرانی اس لیے کر رہا تھا کہ کسی گڑبڑ کی
صورت میں تمہاری مدد کر سکوں مثال کے طور پر اس وقت
یہاں میری موجودگی تمہارے کام آگئی۔ میں نہیں چاہتا کہ
کسی وجہ سے مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑے جب تک جولیا
کی لاش مجھے واپس نہیں مل جائے گی، اس وقت تک مجھے
سکون نہیں ملے گا۔“

”اب صورت حال یہ ہے مسٹر الفرید!“ تک کے
لہجے میں یہ دستور ناگواری تھی۔ ”تمہیں یہ تو پتا چل گیا ہوگا
کہ میری رہائش کہاں ہے۔ اس وقت تو مجھے کہیں بھی
ڈراپ کر دو لیکن صبح میرے گھر پر آ کر اپنی رقم واپس لے
لیتا۔ میں اس طرح کام کرنا پسند نہیں کرتا کہ ایک آدمی
میرے سر پر مسلط ہو۔ رہا مدد کا سوال تو میں اپنی مدد آپ
کے اصول پر کام کرتا ہوں۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت
نہیں۔ گاڑی میں روک دو اور صبح کسی وقت آ کر اپنی رقم
لے لیتا۔“

”مم..... میرا مطلب یہ نہیں تھا مسٹر ویلٹ!“
الفرید یکدم گڑبڑا گیا۔ اسی بدحواسی میں اس نے اسٹیکسٹر
سے ہٹ کر بریک پیڈل دبا دیا۔ جس سے چند گز آگے
جا کر گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

”اگر تمہارا یہ مطلب نہیں تھا تو آئندہ مجھ سے دور
رہنا۔ سمجھے؟“ تک نے کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔
”ایک منٹ مسٹر ویلٹ!“ الفرید جلدی سے بولا۔
”تم تقریباً ایک گھنٹہ ایڈورڈ کے مکان میں رہے ہو۔ تم نے
جولیا کی لاش بھی دیکھی ہوگی۔ ایسے حفاظتی انتظامات کی
موجودگی میں لاش وہاں سے کیسے نکالو گے؟“

”یہ میرا دوسرا ہے اور دوسری بات یہ کہ لاش ایڈورڈ
کے میوزیم ہال میں نہیں تھی۔“ تک کہتا ہوا گاڑی سے
اتر گیا۔ الفرید کا چہرہ دھواں ہو گیا لیکن تک ویلٹ اس کے
چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لیے وہاں رکنا نہیں تھا۔

یوں تو پورے شہر میں رات گئے تک زندگی کے
ہنگامے جاری رہتے تھے لیکن جس جگہ تک ویلٹ گاڑی سے
اترا تھا، یہ شہر کاریں علاقہ تھا جو متوسط طبقے کی آبادی پر
مشتمل تھا۔ یہاں رات کو بھی دن کا سا سماں رہتا تھا۔ زندگی کی
ہما بھی کود دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا تھا کہ رات کب
ختم ہوئی اور دن کب شروع ہوا۔ چھوٹے چھوٹے قمار خانوں
اور شراب خانوں میں ہر وقت بھیڑی لگی رہتی تھی۔

چند قدم چلنے کے بعد تک ویلٹ ایک شراب خانے
میں گھس گیا۔ الفرید نے اس کا موڈ آف کر دیا تھا اور یوں وہ
کچھ پینے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ بار کاؤنٹر کے سامنے ایک
اسٹول پر بیٹھتے ہوئے اس نے باریئڈر کو دھکی کا آرڈر دیا۔
وہ گلاس پینے کے بعد وہ شراب خانے سے باہر نکل
آیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی ٹیکسی مل گئی۔ جب وہ گھر پہنچا
تو گلو یا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”تم کہاں رہ گئے تھے گی؟ میں پریشان ہو رہی
تھی۔“ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔
”تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ میں دو بج کر دو منٹ پر
وہاں پہنچا تو تمہارے بجائے الفرید کو اپنا خطرہ پایا۔“
”الفرید!“ گلو یا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔“ تک نے کہا اور پھر اسے الفرید سے
ملاقات کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں بولا۔ ”اب ہمیں محتاط
ہو کر کام کرنا پڑے گا۔ یوں بھی میرے خیال میں یہ کیس
خاصا عجیبہ ثابت ہوگا۔ ایڈورڈ خاصا محتاط آدمی ہے، اس
نے جولیا کی لاش کسی ایسی جگہ چھپا رکھی ہے جہاں کسی عام
آدمی کا پہنچنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔“
”تم انکار کیوں نہیں کر دیتے۔ بلاوجہ تفریح کا بیڑا
غرق کر رہے ہو۔“ گلو یا بولی۔

”یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ ایک مرتبہ کیس
ہاتھ میں لینے کے بعد انکار میری توہین ہوگی۔“ تک کہتا ہوا
بستر پر گر گیا۔

چند منٹ بعد ہی کمرے کی فضا میں اس کے ہلکے ہلکے
خراٹے سنائی دینے لگے۔

☆☆☆

صبح کے اخبارات میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی جس سے
ایڈورڈ کے مکان پر گزشتہ رات ہونے والے ہنگامے کا کچھ
پتا چلتا۔ اس سے تک کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ایڈورڈ نے
پولیس کو بھی اس واقعے کی اطلاع نہیں دی ہوگی۔ گو یا وہ اس
معاملے کی تشہیر نہیں چاہتا تھا۔ تشہیر کی صورت میں ممکن ہے
نوادرات سے دلچسپی رکھنے والے اس کے مکان کی طرف
دور پڑتے اور اس طرح ممکن ہے جولیا کی می کی بات بھی کسی
طرح نکل آتی۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ ایڈورڈ
اس می کو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

اخبار میں تک کی دلچسپی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ اخبار
ایک طرف رکھتا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر ایک چھوٹی سی خبر
پر اٹک گئی۔ اندر کے صفحے پر سنگل کالم کی مختصر خبر تھی۔ خبر
پڑھتے ہی اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔
”کوئی خاص خبر؟“ گلو یا نے سوالیہ نگاہوں سے
اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، خاص ہی سمجھ لو۔“ تک کے ہونٹوں کی
مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”آج شام آٹھ بجے نیشنل اسٹیڈیم
میں مصری نوادرات کے موضوع پر ایک مختصر سیمینار ہو رہا
ہے جس میں اس ریاست کے بعض ایسے لوگ شریک ہو
رہے ہیں جنہیں مصریات پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ ان میں
ایڈورڈ کا نام بھی شامل ہے۔ خبر کے مطابق مسٹر ایڈورڈ آج
سہ پہر تک اپنے وہی مکان سے یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”اوہ، اس کا مطلب ہے کہ گزشتہ رات ایڈورڈ اپنے
مکان پر موجود نہیں تھا۔“ گلو یا بولی۔

”ہاں، اور شاید اسی لیے گزشتہ رات کی گڑبڑ کی
پولیس کو اطلاع نہیں دی گئی۔ ممکن ہے ایڈورڈ کے آنے کے
بعد کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے۔“ تک بولا۔

”تو پھر کیا خیال ہے۔ میرا مطلب ہے اس خبر سے
تمہیں کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟“ گلو یا نے پوچھا۔

”یہ بعد میں سوچا جائے گا۔ فی الحال ناشتے کے بعد
نیشنل میوزیم جاؤں گا اور ضروری معلومات حاصل کرنے
کے بعد شام کو اس اجلاس میں بھی شرکت کروں گا۔“ تک

نے کہتے ہوئے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

گلو یا ناشتا تیار کرنے لگی۔ اس دوران تک خاموش
بیٹھا سوچتا رہا۔ اخبار میں سیمینار کی خبر پڑھنے کے بعد اس کے
ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا تھا لیکن ابھی کوئی بات واضح نہیں
ہو سکی تھی اس لیے اس نے گلو یا کو فی الحال کچھ بتانا مناسب
نہیں سمجھا تھا۔ شام کو سیمینار میں شرکت کے بعد ہی وہ اپنے
خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی منصوبہ بنا سکتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ساڑھے دس بجے کے قریب
وہ نیشنل میوزیم پہنچ گیا۔ اس میوزیم میں مصریات پر ایک
الگ گیلری تھی جس میں قدیم مصری نوادرات کے علاوہ
مصری علوم پر اچھا خاصا لٹریچر بھی موجود تھا۔ تک ویلٹ
کچھ دیر تک نوادرات کا جائزہ لیتا رہا پھر لٹریچر کا مطالعہ
کرنے لگا۔ لچ کے وقت کے دوران بھی وہ اپنی جگہ سے
نہیں اٹھا تھا۔

چار بجے کے قریب جب اس نے سیٹ چھوڑی تو
اپنے بارے میں وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ مصریات پر اتھارٹی
نہیں تو اتنا علم ضرور رکھتا ہے کہ اس موضوع پر کسی بڑے
سے بڑے ماہر کو بھی متاثر کر سکے۔ مصری گیلری سے نکل کر
وہ سیدھا میوزیم کے ڈائریکٹر کے پاس پہنچ گیا۔

میوزیم کا ڈائریکٹر رابرٹ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔
تک نے ایک فرضی نام سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا
کہ اسے قدیم مصری علم سے گہرا لگاؤ ہے اور آج شام اس
میوزیم میں جمع ہونے والے ماہرین کی گفتگو سے کچھ فائدہ
اٹھانا چاہتا ہے۔

”کیوں نہیں مسٹر جنیور!“ میوزیم کے ڈائریکٹر
رابرٹ نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”سیمینار میں
آنے والوں کو آپ سے ملاقات کر کے یقیناً بہت خوشی
ہوگی۔ دراصل اس سیمینار کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایک دوسرے
کے خیالات سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ یہ کارڈ رکھ لیجیے۔
ٹھیک آٹھ بجے سیمینار شروع ہو جائے گا۔“ رابرٹ نے
میوزیم کا ایک کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”شکریہ مسٹر رابرٹ!“ تک کارڈ جیب میں رکھتے
ہوئے بولا۔ ”میں نے سنا ہے کہ یہاں کسی صاحب کا ذاتی
میوزیم بھی ہے۔ کیا اس سیمینار میں ان صاحب سے بھی
ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”مسٹر ایڈورڈ یہاں کی ایک معروف شخصیت ہیں۔
ان کے میوزیم میں بعض ایسے نوادرات موجود ہیں کہ ہمیں
بھی رشک آتا ہے۔ وہ آپ سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوں

گے۔“ رابرٹ نے کہا۔

نک ویلٹ تقریباً ایک گھنٹے تک اس سے باتیں کرتا رہا پھر آٹھ بجے واپس آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ میوزیم سے نکل کر وہ شہر کے مختلف مقامات پر گھومتا رہا۔ سات بجے کے قریب اس نے ایک ڈرگ اسٹور سے گھور یا کوفون کیا اور پھر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ہلکا سا ناشا کرنے کے بعد میوزیم کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ میوزیم میں داخل ہوا تو آٹھ بجتے میں پانچ منٹ تھے۔ سیمینار کے تمام شرکاء پہنچ چکے تھے۔ رابرٹ نے سب سے اس کا تعارف کرایا۔ نک، ایڈورڈ سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ایڈورڈ بھی خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے جب اجلاس شروع ہوا تو نک کو سیٹ بھی ایڈورڈ کے ساتھ ہی ملی تھی۔ ماہرین کی تعداد آٹھ تھی جن میں سے دو کا تعلق تو لاس اینجلس ہی سے تھا اور باقی مختلف علاقوں سے آئے تھے۔ وہ ایک خاص موضوع پر باری باری اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ آخر میں نک ویلٹ کو بھی تقریر کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ ایک ماہر اسکا لری طرح بے ٹکان بول چلا گیا۔

دس بجے کے قریب اجلاس کی کارروائی ختم ہو گئی۔ نک ایک بار پھر ایڈورڈ کے ساتھ چپک گیا تھا۔ اس نے جب ایڈورڈ کا میوزیم دیکھنے کی درخواست کی تو وہ انکار نہ کر سکا۔ وہ ایڈورڈ ہی کی کامیابی اس کے گھر پہنچ گیا۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے نک کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ رات اس مکان میں داخل ہونے کے لیے اسے کتنے پاپڑیلے پڑے تھے۔

کچھ دیر نشست گاہ میں بیٹھ کر وہ نے نوشی کے ساتھ ساتھ مصریات کے موضوع پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ پھر ایڈورڈ اسے لے کر تہ خانے میں میوزیم والے ہال میں پہنچ گیا۔ نک اس دوران دیکھ چکا تھا کہ مکان کے اندر تین چار محافظ موجود تھے لیکن ان کی موجودگی برائے نام ہی تھی کیونکہ میوزیم کی حفاظت کے لیے اندر کا الیکٹرونک نظام ان سے زیادہ کارآمد تھا۔ نک نے یہ بات بھی خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ اس دوران ایڈورڈ نے گزشتہ رات کی گڑبڑ کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اس واقعے کی تشہیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایڈورڈ شوکیسوں میں آراستہ مختلف چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا کہ ان کے حصول کے لیے اسے کتنی دولت خرچ کرنا پڑی تھی۔ ایک شکستہ کھوپڑی کے بارے

میں اس نے بتایا کہ یہ اسے قاہرہ میں ایک مصری مزدور سے نہایت سستے داموں مل گئی تھی۔ بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ طوطا آسن کے دربار کے ایک امیر کی کھوپڑی تھی جسے کھدائی کے دوران مصری مزدور نے غائب کر دیا تھا۔

”مسٹر ایڈورڈ!“ نک ویلٹ نے اس کے میوزیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک خاص مقصد کے تحت لاس اینجلس آیا تھا۔ مجھے قدیم مصر کی میسوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ چند روز پہلے میسوری میں مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ آپ نے حال ہی میں کوئی می وغیرہ خریدی ہے۔“

”تمہاری اطلاع غلط ہے مسٹر جیمز!“ ایڈورڈ نے اسے گھورا۔ ”میں نے کوئی می نہیں خریدی۔“

”میری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی مسٹر ایڈورڈ!“ نک نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”مطمئن رہیے۔ اگر آپ اس می کو راز میں رکھنا چاہتے ہیں تو مجھ سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ میں دراصل ایک اور می کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کسی می؟“ ایڈورڈ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”تقریباً تین ماہ قبل مجھے طوطا آسن کے دربار کی ایک رقامہ سیری اوس کی می ملی تھی۔ یہ می بھی مقبرے کی کھدائی کے دوران ہی برآمد ہوئی تھی لیکن چند روز بعد چوری ہو گئی تھی۔ کئی برس تک مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی سیری اوس کی می چھ ماہ قبل مجھ تک پہنچی ہے۔ اس کا سودا کرنے سے پہلے میں نے پوری طرح اطمینان کر لیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں ہو رہا ہے لیکن بھاری رقم خرچ کرنے کے بعد اب میں بڑی شدت سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ چھوٹے نوادرات جمع کرنا اور بات ہے لیکن کسی می کو اپنے قبضے میں رکھنا میرے خیال میں ہاتھی پالنے سے کم نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ می کسی میوزیم کو فروخت کر دوں گا لیکن اس صورت میں مجھے سب کچھ بتانا پڑے گا جس کا مطلب ہے کہ کچھ قانونی پیچیدگیاں بھی ہوں گی۔ میسوری میں جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ آپ نے کوئی می خریدی ہے تو یہ سوچ کر یہاں چلا آیا کہ ممکن ہے میرے مسئلے کا بھی کوئی حل نکل آئے۔“

”گویا آپ وہ می فروخت کرنا چاہتے ہیں؟“ ایڈورڈ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔ اگر آپ اسے خریدنا پسند کریں تو؟“ نک مسکرایا۔ ”آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں آپ کو کسی قسم کا دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ می ایک ہفتہ آپ کے پاس رہے گی۔

اس دوران آپ اپنے طور پر اور دوسرے ماہرین کے ذریعے اس کے بارے میں اطمینان کر لیں۔ سودا اس کے بعد ہوگا۔“

”ہوں۔“ ایڈورڈ نے پرسوج انداز میں ہنکارا بھرا۔ ”میں اس سلسلے میں صبح آپ سے بات کروں گا مسٹر جیمز! آپ صبح دس بجے تشریف لے آئیے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں صبح آ جاؤں گا۔“ نک کہتا ہوا اس کے ساتھ میوزیم ہال سے باہر نکل آیا۔

صبح ٹھیک دس بجے تک ویلٹ ایک بار پھر ایڈورڈ کے عالی شان مکان میں پہنچ گیا جہاں ایڈورڈ نے پرجوش انداز میں اس کا استقبال کیا۔ بے نوشی کے دوران چند منٹ کی رمی گفتگو کے بعد وہ جلد ہی اصل موضوع پر آ گئے۔

”مسٹر جیمز!“ ایڈورڈ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”گزشتہ رات میں نے فون پر اپنے ایک دوست سے بات کی تھی۔ اگرچہ اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ طوطا آسن کے مقبرے کی کھدائی میں اس کے دربار کی ایک رقامہ سیری اوس کی می دریافت ہوئی تھی جس پر چند ہفتے کام بھی ہوا تھا لیکن پھر یکا یک وہ می غائب ہو گئی۔

تقریباً دو سال بعد اتھنز میں اس می کی موجودگی کا پتا چلا لیکن اس کے بعد اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا۔ اب بقول آپ کے وہ می آپ کے پاس ہے اور آپ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ می آپ کے پاس کن ذرائع سے پہنچی؟ میں اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کروں گا البتہ اگر یہ سیری اوس کی می ثابت ہوئی تو میں منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ اتفاق سے چند ہفتے پہلے میں نے جو می خریدی تھی، اس کا تعلق بھی طوطا آسن ہی کے دور سے ہے۔ آپ نے کسی راس کے بارے میں سنا ہوگا۔ یہ می تقریباً چھ ماہ پہلے ویانا کے سرکاری عجائب گھر سے چوری ہو گئی تھی۔“

”جی ہاں، کچھ عرصہ قبل میں بھی اس کی تلاش میں تھا اور اس تلاش کے دوران سیری اوس کی می میرے ہاتھ لگ گئی۔ کیا میں کسی راس کی می ایک نذر دیکھ سکتا ہوں؟“ نک ویلٹ نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے۔ فی الحال یہ ممکن نہیں کیونکہ می یہاں موجود نہیں۔ میرے علاوہ صرف دو آدمی اس کے وجود سے آگاہ ہیں۔ گزشتہ سے بیوستہ رات میری عدم موجودگی میں کوئی نامعلوم چور میرے میوزیم میں داخل ہو گیا تھا۔ اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ جس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا

ہوں کہ وہ جو کوئی بھی تھا اسے کسی راس کی تلاش تھی۔“ ایڈورڈ نے کہا اور پھر اس رات کے واقعہ کی تفصیلات بتانے لگا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو حفاظتی انتظامات میں کچھ تبدیلیاں کر لینا چاہئیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کسی روز آپ کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے۔“ نک نے مشورہ دیا۔

”میرے یہاں جدید ترین حفاظتی نظام موجود ہے۔“ ایڈورڈ نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”میں آج بعد دوپہر اپنے دیکھی مکان پر جا رہا ہوں۔ اگر آپ کل صبح سیری اوس کی می وہاں لے آئیں تو ہم اطمینان سے بات کر لیں گے۔“

”آپ جانتے ہیں کہ ایسی چیزوں کو ساتھ لیے پھرنا ممکن نہیں اس کے لیے آپ کو کم از کم دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔ می میسوری میں ہے۔ میں آج ہی اپنے سیکریٹری کوفون کر لیتا ہوں۔ وہ خصوصی طیارے کے ذریعے می یہاں لے آئے گا۔ میں پرسوں دوپہر تک آپ سے رابطہ قائم کر سکوں گا۔“ نک نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا۔ کسی راس کی می بھی میرے دیکھی مکان پر ہے۔ اس طرح آپ اسے بھی دیکھ سکیں گے۔“ ایڈورڈ نے کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا جو ملاقات ختم ہونے کا اعلان تھا۔

نک ویلٹ نے گرجبوشی سے معافہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایڈورڈ بیدرونی گیٹ تک اسے رخصت کرنے کے لیے آیا تھا۔

☆☆☆

چاروں طرف سے بند سیارہ رنگ کی وہ وین درمیانی رفتار سے پہاڑی راستے طے کر رہی تھی۔ وین کا پچھلا حصہ مکمل طور پر ایئر کنڈیشن تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وین میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جس کے گرمی سے خراب ہو جانے کا احتمال ہو۔ ڈرائیونگ کین میں اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے نک ویلٹ کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اسٹیرنگ پر جما ہوا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رومال سے وہ بار بار چہرے کا پسینا پونچھ رہا تھا۔

سڑک بتدریج بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ اسے لاس اینجلس سے روانہ ہونے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور ایڈورڈ کے کہنے کے مطابق اسے اس سڑک پر حریہ ایک گھنٹہ سفر کرنا تھا۔ اس کے بعد اسے وہ بورڈ نظر آتا جس سے ایڈورڈ کی دیکھی رہائش گاہ کی طرف جانے والے راستے کی نشاندہی

ہوتی تھی۔
روانگی سے پہلے تک ویلوٹ نے ایڈورڈ سے فون پر بات کر لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایڈورڈ کا کوئی نہ کوئی آدمی اس کے استقبال کے لیے سڑک پر موجود ہوگا۔ تقریباً پانچ میل کا مزید راستہ طے کرنے کے بعد سڑک ڈھلوان ہوئی۔ اسٹیرنگ پر تک کی گرفت کچھ اور بھی مضبوط ہوئی۔ بل کھاتی ہوئی اس سڑک پر ڈیڑھ گز سے زیادہ پر دوڑی بھی کسی خوفناک حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔

ڈھلوان ختم ہونے کے بعد سڑک ایک مرتبہ پھر بلندی کی طرف جانے لگی۔ تک نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اس کے سٹرکاتیرا گھنٹا پورا ہونے لگا تھا۔ اس کی نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کسی ایسے بورڈ کا متلاشی تھا جس سے ایڈورڈ کے مکان کی طرف جانے والے راستے کی نشاندہی ہوتی ہو اور پھر ایک موڑ گھومتے ہی اسے بڑی پھرتی سے بریک پیڈل دبا دینا پڑا۔ سڑک کے عین وسط میں ایک آدمی کھڑا اسے روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ گاڑی روکتے ہوئے تک کی نظریں اطراف کا جائزہ لینے لگیں۔ چند گز آگے دائیں طرف ایک کچا راستہ مڑتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسی موڑ پر وہ بورڈ بھی نظر آ گیا جس کی ایڈورڈ نے نشاندہی کی تھی۔
”مسٹر جیمز؟“ سڑک پر کھڑا ہوا آدمی اسٹیرنگ سائڈ کی گھڑی کے سامنے رک کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں، لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ تمہارا مطلوبہ آدمی میں ہی ہو سکتا ہوں؟“ تک اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔
”مجھ سے اب تک صرف تین گاڑیاں اس راستے سے گزری ہیں اور آپ تو ٹھیک اس وقت یہاں پہنچے ہیں جو مسٹر ایڈورڈ نے بتایا تھا۔“ وہ شخص کہتا ہوا اوپر سے گھوم کر تک کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

تک نے گاڑی اسی کچے راستے پر موڑ دی۔ تقریباً نصف میل آگے بڑھنے کے بعد اسے درختوں میں گھری ہوئی قلعہ نما وہ عمارت دکھائی دی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ اس عمارت میں پہنچ چکے تھے۔ پورچ میں گاڑی رکتے ہی ایڈورڈ بھی ایک دروازے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ رکی سی گھنگھو کے بعد تک ویلوٹ نے وین کا پیچلا دروازہ کھول دیا اور ایڈورڈ کے آدمیوں نے وین سے وہ تابوت اتار لیا جس میں بہ قول تک ویلوٹ، طوبیخ آسن کے دربار کی ایک رقاصہ سیری اوس کی مٹی موجود تھی۔ تابوت کو عمارت کے اس ہال میں پہنچا دیا گیا جو کسی میوزیم سے کم نہیں تھا۔ تابوت اس

جگہ رکھ دیا گیا جہاں تابوت سے ملتا جلتا شیشے کا ایک بکس پہلے ہی سے موجود تھا۔ تک کی نظریں شیشے کے اندر موجودی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ قدیم طرز کے لباس کے میں لپٹی ہوئی اس عورت کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ چہرے پر گلاب ایسی تازگی تھی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے گھری نیند سو رہی ہو اور ابھی انگڑائی لے کر اٹھ جائے گی۔ یہ کسی اس کی مٹی تھی جیسے ایڈورڈ نے چند ہفتے قبل لاکھوں ڈالرز خرچ کر کے حاصل کیا تھا اور الفریڈ کے کہنے کے مطابق یہ اس کی چھٹی بیوی جولیا کی لاش تھی جسے مرنے کے بعد اس نے حوطہ کر لیا تھا اور کسی نے اسے چرا کر قدیم مصری مٹی کی حیثیت سے ایڈورڈ کو فروخت کر دیا تھا۔ اسی مٹی کی خاطر تک ویلوٹ کو یہاں تک آنا پڑا تھا۔

چند لمحوں میں اس کی کو دیکھنے کے بعد تک ویلوٹ نے اپنے ساتھ لائے ہوئے تابوت کا ڈھکنا اٹھا دیا اور جب اس نے رنگین چادر کا کونا اٹھایا تو اس کے قریب کھڑے ہوئے ایڈورڈ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔ اس کی کاچہرہ تو شگفتہ پھول کی طرح تازہ تھا، اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی سوئی ہو۔ ایڈورڈ تابوت پر جھک گیا اور ہلال نما نیلے رنگ کے اس نشان کو یہ غور دیکھنے لگا جو مٹی کے دائیں رخسار پر نظر آ رہا تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹا گزر گیا۔ ایڈورڈ بعض دستاویزات کی مدد سے مٹی کا موازنہ کرتا رہا پھر وہ اس طرح سیدھا ہو گیا جیسے اس ابتدائی معائنے سے کسی حد تک مطمئن ہو گیا ہو۔
”ٹھیک ہے مسٹر جیمز! آؤ ہم اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“ وہ کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے ایڈورڈ والی مٹی کے شوکیں پر سیاہ رنگ کی ایک بھاری چادر تان دی۔ تک نے بھی اپنی مٹی کے چہرے پر چادر درست کر کے تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا۔

”بات یہ ہے مسٹر جیمز!“ ایڈورڈ نے نشست گاہ میں ایک صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”مٹی کے سرسری معائنے سے کوئی بات واضح نہیں ہو سکی لیکن میرے خیال میں اس میں شے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ میں نے اپنے دو دوستوں کو بلایا ہے جو اس موضوع پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ لوگ کل صبح یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ہی کوئی حتمی رائے قائم کی جائے گی۔“
”لیکن مجھے افسوس ہے مسٹر ایڈورڈ!“ تک نے

شیری کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا جو ابھی ابھی ایڈورڈ کا ایک ملازم میز پر رکھ کر گیا تھا۔ ”میں مٹی کو یہاں نہیں چھوڑ سکتا، نہ ہی خود رہ سکتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ ایڈورڈ نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا جو آدمی اس مٹی کو لے کر آج صبح میسوری سے یہاں پہنچا ہے اس کی اطلاع کے مطابق کچھ لوگ اس مٹی کو حاصل کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگ چکے ہیں۔ میں بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے یہاں رک سکتا ہوں اس کے بعد ایک مختلف راستے سے کسی خفیہ مقام پر چلا جاؤں گا جس کا انتظام میں نے پہلے ہی کر لیا ہے۔ میں نے اپنے ٹھکانے کا پتہ پیش میوزیم کے ڈائریکٹر مسٹر رابرٹ کو سمجھا دیا ہے۔ آپ کل کسی وقت اپنے دوستوں کو لے کر وہاں پہنچ جائیں تو کسی مداخلت کے خدشے کے بغیر زیادہ اطمینان سے بات ہو سکے گی۔ یہ مٹی اس وقت یہاں لانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کسی قسم کا شک نہ کریں۔ مگر نہ فون پر بھی آپ سے بات ہو سکتی تھی۔“

”لیکن، میرے خیال میں آپ کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ محفوظ ترین جگہ ہے۔“ ایڈورڈ نے کہا۔

”میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں مسٹر ایڈورڈ! وہ لوگ دوسرے پہلے بھی اس قسم کی کوشش کر چکے ہیں۔ اس لیے میں اس مٹی کو فروخت کرنا چاہتا ہوں۔“

”یہ تو بڑی تشویش ناک خبر سنائی ہے آپ نے مسٹر جیمز! لیکن بہر حال میں آپ کو کسی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔“ ایڈورڈ نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

تک چند لمحوں خاموش رہا پھر اسے اس مٹی کے بارے میں فرضی قصے سناتے لگا۔ اسی طرح باتوں میں دو گھنٹے گزر گئے اور پھر وہ جانے کے لیے اٹھ گیا۔ ایڈورڈ کی ہدایت پر اس کے آدمیوں نے تک والا تابوت ہال سے نکال کر دین میں رکھ دیا۔ دین کا پچھلا حصہ بند کرنے سے پہلے تک نے تابوت کا ڈھکنا اٹھا کر اطمینان کر لیا تھا۔ پھر اس نے گرجوٹی سے مسٹر ایڈورڈ سے ہاتھ ملایا اور اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

وین مٹی سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی چٹان کا موڑ گھومتے ہی اس نے گاڑی روک دی۔ سامنے سڑک پر گھوڑیاں کھڑی تھیں۔ گاڑی رکتے ہی وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر تک کے پہلو میں بیٹھ گئی اور دوسرے ہی لمحے گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھ

گئی۔ راستہ خطرناک ہونے کے باوجود تک ویلوٹ وین کی رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔

”کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی تھی؟“ تک نے رومال سے چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے گھور یا سے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔ تم نے دو گھنٹے کا وقت دیا تھا لیکن میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے ہی میں اپنے کام سے نمٹ چکی تھی۔ ہال کے عقبی دروازے سے باہر نکلنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن اگر کوئی مل جاتا تو میرا جغرافیہ پوچھنے کی کوشش ضرور کرتا۔ ایسی صورت میں مجھے اپنا ہی کوئی حربہ استعمال کرنا پڑتا۔“ گھور یا مسکرائی۔

”گڈ۔“ تک ویلوٹ بھی مسکرا دیا۔ ”ویسے میں تمہارے فن کا قائل ہو گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کسی موقع پر پول نہ کھل جائے اس لیے میں نے ایڈورڈ کو زیادہ دیر تابوت کے قریب رکھنے نہیں دیا تھا۔ جب وہ تمہارے رخسار پر ہلال نما نشان کو چھو کر دیکھ رہا تھا تو میرا دل..... بے اختیار اچھل پڑا تھا۔ اگر وہ تمہارا سر، بازو یا شانے ٹوٹنا شروع کر دیتا تو یقیناً تمہارے جسم کی حرارت محسوس کر کے چونک جاتا۔“ تک چند لمحوں خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارا جسم اگر چہ سن کر چکا تھا لیکن یہ خدشہ بہر حال موجود تھا کہ دوا کا اثر وقت سے پہلے زائل نہ ہو جائے مگر میں نے یہ منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر ہی بنایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہم ایڈورڈ کی بے وقوفی سے قائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس رات اس کے مکان کے نہ خانے میں واقع میوزیم میں بھرا ہوا کاٹھ کیا ڈیکہ کر میں سمجھ گیا تھا کہ لوگ اسے بے وقوف بنا کر اس کی عینیں ہلکی کر رہے ہیں۔ دولت مند شخص ہے۔ نوادرات جمع کرنے کے شوق میں لٹ رہا ہے اور اپنے آپ کو مصریات کا ماہر سمجھ کر خوش ہو رہا ہے۔ دولت خرچ کرنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ تو ہونا چاہیے۔ ایسے خود ستائش لوگ اپنی حماقتوں پر تو لاکھوں ڈالرز خرچ کر دیتے ہیں لیکن کسی غریب کو ایک وقت کا کھانا کھلانا بھی بوجھ سمجھتے ہیں لیکن..... اس کے میوزیم میں ایک دو چیزیں ایسی بھی تھیں جنہیں واقعی نوادرات میں شمار کیا جاسکتا ہے اور مجھے حیرت ہے کہ یہ چیزیں اس کے ہاتھ کیسے لگ گئیں۔“

”اب مزہ تو اس وقت آئے گا جب وہ شوکیں میں سے اپنی مصری مٹی کو غائب پائے گا۔“ گھور یا نے ہلکا سا ہتھکڑا لگایا۔

تک ویلوٹ بھی اس کے قہقہے میں شامل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے وین شاہراہ سے ہٹا کر ایک ذیلی سڑک پر

ڈال دی۔ لاس انجلس پہنچنے کے لیے یہ راستہ قدرے مختصر تھا۔ جب وہ شہر کی حدود میں داخل ہوئے تو شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ ایک وہ راستے اختیار کر رہا تھا جہاں ٹریفک کم سے کم تھا۔ بالآخر کسی حادثے یا قابل ذکر واقعے کے بغیر وہ بننے والے یونیورسٹی کے ایک مکان میں پہنچ گئے۔ وین کو گیارہ بجے بند کرنے کے بعد تک نے گھوڑیا کی مدد سے می والا تابوت ایک کمرے میں پہنچا دیا اور کمرہ بند کر کے دونوں باہر نکل آئے۔ کچھ دیر بعد گھوڑیا کو والٹر کے مکان پر چھوڑ کر تک چند ضروری کام نمٹانے کے لیے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

رات دس بجے تک ویلوٹ بننے والے مکان میں داخل ہوا تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ الفرید بھی تھا جس کی آنکھوں پر سیاہ رنگ کی پٹی بندھی ہوئی تھی کچھ دیر پہلے الفرید سے رابطہ قائم ہونے پر تک اسی شرط پر اسے یہاں لانے پر آمادہ ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جائے گی۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد تک نے الفرید کی ہٹی کھول دی۔ تیز روشنی میں کچھ دیر تک تو وہ آنکھیں میچ جلاتا رہا چند سیکنڈ بعد جب آنکھیں روشنی سے مانوس ہوئیں تو کمرے کے وسط میں تابوت دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر تابوت کا ڈھکنا اٹھالیا اور می کے چہرے سے چادر ہٹاتے ہی اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ اس کی کیفیت اس بچے کی سی تھی جسے اس کا پسندیدہ کھلونا مل گیا ہو۔

”شکر یہ مسٹر ویلوٹ!“ الفرید، تک کی طرف گھوم گیا۔ ”اس می کی حفاظت کے لیے مسٹر ایڈورڈ نے جو حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے، ان کے پیش نظر مجھے امید نہیں تھی کہ تم اس کے حصول میں کامیاب ہو سکو گے۔ کیونکہ دوسرے میں خود بھی ایسی کوشش کر چکا ہوں جن میں ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔“

”لیکن تم نے پہلے اپنی ان کوششوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔“ تک نے اسے گھورا۔

”ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن بہر حال، اس کارنامے پر تم معاوضے کے علاوہ انعام کے بھی مستحق ہو۔ جولیا کی تدفین کے بعد میں تم سے ملوں گا۔“

”تدفین یا فروخت کے بعد؟“ تک نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ الفرید بری طرح چونک گیا۔

”میری بات کا مطلب تم اچھی طرح سمجھتے ہو مسٹر

الفرید!“ تک نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”تم نے مجھے اپنی بیوی کی جو تصویر دکھائی تھی وہ یقیناً اس می سے ملتی جلتی تھی۔ جس آرٹسٹ نے وہ تصویر بنائی تھی اس نے واقعی کمال کر دیا تھا کہ صدیوں پرانی لاش کے چہرے میں زندگی کی تمام تر رحمتیاں پیدا کر دی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ تصویر تمہاری بیوی جولیا کی نہیں اس می کی تھی جس کا تعلق قدیم مصر سے ہے۔“

”کیا بکواس ہے۔“ الفرید غرایا۔

”بکواس نہیں یہ حقیقت ہے مسٹر الفرید!“ تک نے

اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ مصری می پچاس سال پہلے مغربی جرمنی کے ایک عجائب گھر سے چوری ہوئی تھی۔ تمہارا کاروبار بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ تم اپنی زندگی میں بے شمار نوادرات مختلف عجائب گھروں سے چوری کر کے ان لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہو جو دولت کے بل بوتے پر ذاتی شہرت کے خواہاں ہیں۔ چند سال قبل ایک میوزیم گزٹ میں تم نے اس می کی چوری کا حال پڑھا تو اس کی تلاش میں لگ گئے۔ چند ماہ قبل تمہیں پتا چلا کہ یہ می ویانا میں ایک شخص کے قبضے میں ہے۔ تم نے می حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اس دوران وہ شخص مختلف لوگوں سے اس می کا سودا کرنے کی کوشش کر رہا تھا بالآخر ایڈورڈ سے اس کی بات ملے ہوئی اور تقریباً دو ماہ قبل یہ می اس کے قبضے میں آگئی۔ بقول تمہارے تم دوسرے یہاں بھی اس می کے حصول کی ناکام کوشش کر چکے ہو۔ اس نے ایسے حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں کہ کوئی ماہر سے ماہر چور بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پھر تم نے میری خدمات حاصل کیں۔ ایڈورڈ کے میوزیم کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہاں سے کوئی چیز چرانے کے لیے باقاعدہ پلاننگ کی ضرورت ہوگی۔ اس دوران میں یہ بھی معلوم کر چکا تھا کہ می اس مکان میں نہیں ہے۔ اتفاق سے دوسرے روز ایڈورڈ سے ملاقات کا ایک وسیلہ پیدا ہو گیا۔ اسے شیشے میں اتارنے کے بعد میں نے اسے ایک اور قدیم مصری می فروخت کرنے کی پیشکش کی۔ اسے اعتماد میں لینے کے بعد ہی مجھے یہ پتا چلا تھا کہ تمہاری مطلوبہ می اس کے دیہی مکان میں ہے چنانچہ میں نے منصوبہ بندی شروع کر دی۔“ تک چند لمحے خاموش رہ کر

الفرید کے چہرے کے بدلنے ہوئے رنگ دیکھتا رہا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہیں نہیں معلوم کہ یہ می حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنی اور اپنی دوست گھوڑیا کی زندگی خطرے میں ڈالنا پڑی تھی۔ میں نے اس

کے جسم کو سن کر کے ایک دستاویز کی مدد سے اس کے چہرے پر ایک قدیم مصری می کا میک اپ کیا اور اسے تابوت میں ڈال کر ایڈورڈ کے دیہی مکان پر لے گیا۔ میں نے گھوڑیا کا جسم سن کرنے کے لیے جو دوا استعمال کی تھی وہ انتہائی خطرناک تھی جس سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر..... پول کل گئی تو ایڈورڈ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بہر حال، ایڈورڈ میری توقع سے کچھ زیادہ ہی بے وقوف ثابت ہوا۔ وہ اپنے طور پر گھوڑیا کو قدیم مصری می تسلیم کر چکا تھا لیکن دوسرے روز اپنے دوستوں سے اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ایک اور ٹچ دیا کیونکہ میرے پاس صرف دو گھنٹے کا وقت تھا۔ ایک مقررہ وقت کے بعد گھوڑیا کے جسم سے دوا کا اثر ناکل ہو جاتا اور اس کے بعد یہ راز چھپانا مشکل ہو جاتا کہ وہ کوئی می نہیں زندہ عورت ہے۔ میں نے ایڈورڈ کو نشست گاہ میں باتوں میں الجھائے رکھا۔ اس دوران ایڈورڈ شیشہ ہال میں تابوت کے اندر گھوڑیا کے جسم سے دوا کا اثر ناکل ہوتے ہی وہ ہوش میں آگئی۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایڈورڈ والی می کو اپنے تابوت میں منتقل کیا اور ہال کے عقبی دروازے سے غائب ہو گئی۔ میرا خیال ہے اب تک ایڈورڈ کو اپنی می کے فرار کا علم ہو چکا ہوگا اور اس کے آدی خونخوار کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔“

”چلو مان لیا کہ تمہاری کہانی درست ہے لیکن اب کیا مسئلہ ہے۔ میں تمہاری محنت کا معاوضہ ادا کر چکا ہوں۔ اگر تم چاہو تو آئی ہی رقم انعام کے طور پر بھی دے سکتا ہوں۔“ الفرید نے پیشکش کی۔

”نہیں مسٹر الفرید!“ تک مسکرایا۔ ”میں تمہیں پہلے ہی اپنی شرائط سے آگاہ کر چکا تھا یعنی میں کوئی ایسی چیز نہیں چراتا جس کی کوئی تاریخی اہمیت ہو۔ یہ می تو تاریخی ورثہ ہے۔ اس کی جگہ کسی مکان کا خفیہ خانہ نہیں میوزیم ہے جہاں تاریخ کے طالب علم اس سے کچھ حاصل کر سکیں اور لوگ یہ جان سکیں کہ قبل از تاریخ کے باشندوں کی تہذیب کیا تھی۔“

”تم بلاوجہ ضد کر رہے ہو مسٹر ویلوٹ!“ الفرید بولا۔ ”ضد نہیں، میں تو قدیم علوم و فنون سے دلچسپی رکھنے والوں پر ایک بہت بڑا احسان کر رہا ہوں جس کے لیے میں تمہارا بھی بہت شکر گزار ہوں۔ ٹھیک بارہ بجے میوزیم کا ڈائریکٹر رابرٹ چند آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔ ایک گناہ آدمی کی طرف سے یہ تحفہ پا کر اسے یقیناً بہت خوشی ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ یہ می سامنے آنے کے بعد اس کے

سلسلے میں مسٹر ایڈورڈ بھی اپنی زبان بند رکھیں گے اور تمہارے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے مفاد میں تمہاری زبان سے بھی ایسا کوئی لفظ نہیں نکلے گا جو میرے یا مسٹر ایڈورڈ کے لیے کسی الجھن کا باعث ہو۔ ہوش میں آنے کے بعد تم کہہ سکتے ہو کہ بعض نامعلوم آدمی تمہیں یہاں باندھ کر ڈال گئے تھے اگر تم نے می سے کوئی تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی تو طویل عرصہ کے لیے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاؤ گے۔“

”کیا مطلب؟“ الفرید نے اسے گھورا۔

”مطلب۔“ تک کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور پھر اچانک ہی اس نے الفرید کی کپٹی پر بھرپور ہاتھ رسید کر دیا۔ وار کچھ اس قدر جچا تھا کہ الفرید منہ سے آواز نکالنے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

تک ویلوٹ نے اسے تابوت کے قریب ہی ایک کرسی پر باندھ دیا اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا تاکہ ہوش میں آنے کے بعد شور نہ مچا سکے۔ اس کام سے قانع ہونے کے بعد اس نے کمرے کا تحقیقی جائزہ لیا اور تمام دروازے بند کر کے باہر نکل گیا۔ ایک ڈرگ اسٹور سے اس نے چند منٹ فون پر کسی سے کوئی بات کی اور پھر والٹر کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا جہاں گھوڑیا اس کی منتظر تھی۔

صبح آٹھ بجے ہی تک ویلوٹ نے اخبار اٹھالیا۔ صفحہ اول پر دو دلچسپ خبریں تھیں۔ پہلی خبر تو اس گناہ شخص سے متعلق تھی جس نے ایک قدیم مصری می میٹشل میوزیم کو تحفے کے طور پر پیش کی تھی اور دوسری خبر ایڈورڈ کے دیہی مکان سے ایک مصری می کے فرار سے متعلق تھی۔ اخبار کے مطابق شہر کے لوگ ان دونوں واقعات میں کوئی تعلق تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تک ویلوٹ نے اخبار رکھ کر گھوڑیا کی طرف دیکھا جو چائے لے کر آرہی تھی۔ ”ہیلو می!“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”بکومت۔“ گھوڑیا غرائی۔ ”اب تم چند روز تک اس مکان سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ایڈورڈ کے آدی کتوں کی طرح شہر کے گلی کوچوں میں تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھی دو چار روز مکمل آرام کرنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ سوچ کر ہی ہول اٹھ رہے ہیں کہ یہ عرصہ مجھے ایک می کے ساتھ گزارنا پڑے گا۔“ تک ویلوٹ مسکرایا۔

گھوڑیا نے تاؤ میں آکر گرم گرم چائے اس پر انڈیل دی۔ وہ تو تک کی قسمت ہی اچھی تھی کہ اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا تھا ورنہ اس وقت کمرے میں اس کی چیخیں گونج رہی ہوتیں۔

بے روزن گنبد

ناصر ملک

دل جب بوجھل ہو جائے تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے... افسردگی اور اضمحلال کے تسلسل سے نہ صرف سفر کنٹین لگتا ہے بلکہ پیروں کے آبلے منزل سے بھی بھٹکا دیتے ہیں۔ اتنا سا فلسفہ اس کی سمجھ میں بہت دیر بعد آیا کیونکہ اپنوں کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے ستم نے اس پر گویا سکتہ طاری کر دیا تھا اور... جب تک یہ سکتہ ٹوٹتا... اس وقت تک سارے گلابی موسم، مدھرتاروں بھری رات کافسوں... برکھارتوں کی سوغاتیں، جوانی کی جولانیوں کا طلسم... کسی کی خوب صورت آنکھوں میں بسنے کا خواب اور... کسی دل میں اترنے اور دھڑکنے کا ارمان... سب کچھ تو اس سے کہیں گم ہو چکا تھا... اور اب اسے وقت کے دھارے سے ٹکرانا اور ریگ روان پر پاتوں چمانا بہت مشکل لگ رہا تھا... منجھداروں سے ناٹو بچانا اور طوفانوں میں ساحل پانا اگرچہ اس کے بس کی بات نہ تھی مگر اس پر ایک روز قسمت کی دیوی کچھ یوں مہربان ہوئی کہ صدیوں سے جمی برف قطرہ قطرہ پگھلنے لگی... پھر محبت کی دھیمی دھیمی آہ نے اسے پیار کی بازی کھیلنے پر مجبور کر دیا۔ ہار یا جیت کی پروا کیے بغیر وہ تو بس اس کے دل میں ایک روزن کی تلاش میں تھا جبکہ خود اس کی ذات بے روزن گنبد کے مانند تھی جہاں اس کی آرزوئیں، خواہشیں بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ کسی نے کیا خوب تجزیہ کیا ہے کہ جب پیار کے متوالوں کو جنگ سے واسطہ پڑ جائے تو وہ اپنی ذات کے گنبد میں بند ہو جاتے ہیں لیکن تقدیر مہربان ہو جائے تو روزن بھی مل جاتا ہے اور محبت کی زنجیر بھی۔ بالآخر اسے بھی ایک دن وہ روزن مل گیا اور اپنے وزن کا بھی احساس ہو گیا۔

تدبیروں سے تنجیروں کا راز پانے والی ایک فکرمند گروالی کی اذیتوں کی لازوال داستان

دارسوٹ بہن رکھا تھا جس پر صاف مطلع کے شریر تاروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے تھے اسچنگ پرل جگہا رہے تھے۔ اس رنگ کا لباس میری کمزوری تھی اور وہ میری کمزوری سے کھیل رہی تھی۔ آبتار کی طرح چمکدار بال کندھوں پر سے سرک کر سینے پر پھیلے ہوئے اور گلابی گلہبی تھیر ہونٹ زمین عشق کو لکھوں میں سیراب کرتے تھے۔

”گڈ مارنگ... سس... سس! میں مریم ماہ ویش ہوں۔“ وہ جھینپ گئی۔ سر جھکا کر اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ مہاوا کچھ غلط ہو گیا ہو۔

اس کے بے ساختہ پن کی بدولت مجھے اپنی آنکھوں میں اچانک بھر جانے والی عید کی کا فوراً احساس ہو گیا۔ میں نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور گھوم کر اپنی چیز کی طرف بڑھا۔

اس کی طرح جلد کی تاب نے میری آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ میں نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھی، بلا وجہ

میں اپنی پینتالیس سالہ بیوی کے انتخاب کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ وہ بے حد خوبصورت اور زندگی سے بھرپور تھی۔ اگر ہماری پہلی ملاقات کے پس منظر میں بیگم مہر النساء کے انتخاب کا عنصر موجود نہ ہوتا تو میں یقینی طور پر اس لڑکی کے شوخ اور جان لیوا حسن کو دیکھ کر حیران ہونے کے بجائے ٹھنک جاتا کیونکہ اپنی عمر سے پانچ سال زیادہ دکھائی دینے والی بیگم مہر النساء صرف خود بے تحاشا فربہ اور بد صورت تھی بلکہ اس کا ذوق انتخاب بھی مضحکہ خیز ہوا کرتا تھا۔ یہ صرف میری ہی رائے نہیں تھی بلکہ اس کی تمام ملنے جلنے والیاں بھی اس پر دورائے نہیں رہتی تھیں۔

وہ میری آفس ٹیبل کے عقب میں دیوار پر لگی سینفلز کے سامنے کھڑی تھی اور وہ دروازہ کھلنے کی مدد سے آواز سن کر ہلٹی تھی۔ درمیان میں میز حائل ہونے کی وجہ سے وہ آدمی بھی ہوئی، آدمی دکھائی دے رہی تھی اور سانسوں کو مٹھی میں لینے کے لیے آدمی ہی کافی تھی۔ اس نے رائل بیوولیٹ کا پھول

آنکھیں رگڑیں اور کہا۔ ”اچھا! تو تم انٹرویو میں کامیاب قرار پائی ہو۔ حیرت ہے اتنی کم عمری میں تم نے اتنا تجربہ کیسے حاصل کر لیا؟“

وہ مودبانہ لہجے میں بولی۔ ”سرا! گریجویشن کے بعد میں نے تین سال کا عرصہ اخبار کی ملازمت میں گزارا ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ لڑکیاں عموماً انیس برس کی عمر میں گریجویشن کر لیتی ہیں۔ ملازمت کے تین سال شامل کرنے سے اس کی عمر کا ہندسہ بائیس بنتا تھا۔ مجھے اپنی نظر پر شبہ ہوا۔ وہ دیکھنے میں بیس کی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اپنی ٹینک دوبارہ آنکھوں پر لگالی اور بے اختیار بولا۔ ”یعنی تمہاری عمر بائیس سال ہے۔“

”نہیں! میری عمر ستائیس سال ہے۔“ اس نے فوراً میری تصحیح کی۔

مجھے حیرت ہوئی۔ لڑکیاں اپنی عمر گھٹاتی ہیں۔ وہ بڑھا رہی تھی۔ میں نے کرسی گھمائی۔ اُسے دیکھا۔ لگا کہ اُس نے جھوٹ کہا تھا۔ حیرانی آمیز مصحوبیت سے بولی۔ ”سرا! میں نے جھوٹ نہیں کہا۔“

”اوکے!“ اس کی شفاف آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے میں نے اپنی کرسی واپس گھمائی۔ ”مریم! تمہیں اس جانب کی نیچر تو سمجھا دی گئی ہے نا؟“

”ہیں! سرا! مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے معیار پر پوری اُتروں گی۔“ وہ بولی۔

اس کی آواز باریک نہیں تھی۔ بھرائی ہوئی، ہولے ہولے لرزتی ہوئی۔ انتہائی جذبات انگیز۔۔۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ لڑکیوں کی باریک آواز مرد کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ اس کی آواز پر غور کرنے کے بعد میں نے آواز کے حسن کے معیار کو بدلتا ہوا پایا۔ میری بیگم کی آواز اس کے جسم کے برعکس بہت نفیس تھی۔ اس نے لڑکیوں کے کئی گیت یاد کر رکھے تھے۔ جب وہ اپنی موج میں بیٹھ کر گنگنائی تو یقیناً نہیں آتا تھا کہ آواز اُسی کے بڑے سے حلق سے نکل رہی ہے۔ آواز کے اتار چڑھاؤ کو ظلم دینے کا ہنر اس نے از خود حاصل کر رکھا تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے اس کی آواز بھی بھلی نہیں لگی تھی۔

مریم کی آواز باریک نہیں تھی مگر دل کے تاروں کو چھیڑتی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر وہ اپنی سیٹ پر چلی گئی اور سیاہ رنگ کے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی پھر مستفسرانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

اس سے نظریں اور توجہ ہٹانا بہت مشکل تھا مگر میں نے

دلیرانہ انداز میں سر جھٹک کر اپنا انتہاک آفس کی طرف رخ کر لیا۔ آج شاید دنیا کی تمام سڑکیں حیرتیں مجھے گنگ کرنے پر کمر بستہ تھیں۔ یہ سوچ کر کہ دفتر کی جلد آرائش میری بد ذوق بیوی مہرالنسا کے ذہن کی اختراع تھی، میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دل ہی دل میں اُسے سرا ہے بنانہ رہ سکا۔

وال تو وال کا رہٹ، ریشہ دار پتھر کو تراش کر بنائے گئے امپورٹڈ ٹیبل سیٹ سے آراستہ جہازی سائز کی شاہانہ میز اور آرام دہ ریوالونگ چیئر کے علاوہ مریم ماہوش، جو میرے غیر مطبوعہ میگزین کی ایڈیٹر تھی، کے استعمال کا فریضہ اور پردے۔۔۔۔۔ کہیں کوئی سقم نہیں تھا۔ ڈائننگ روم کو بیگم مہرالنسا نے آرام دہ میٹرز بیڈ اور پورٹبل فریج سے آراستہ ریٹائرنگ روم بنا دیا تھا۔ فلیٹ اسکرین ٹی وی اور ٹیٹے چھتہ ہوا ایرانی قالین۔۔۔۔۔ ہاتھ روم کا مزاج بھی شاہانہ پایا۔

ایک دیوار پر ڈیڑھ ضرب پانچ فٹ سائز کا ٹیکسٹائل شیشے کا بڑا ٹیس ریک نصب تھا جس کے پانچ خانوں میں میری شاعری پر مشتمل پانچ کتابیں بڑے قرینے سے رکھی تھیں۔ میں نے ریک کھولا۔ پہلا مجموعہ کلام اُٹھایا۔ چھپنے کے بعد آج پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ چند ورق پلٹے۔ دیا چہ دیکھا، پڑھا نہیں البتہ کتاب کے دو چار اشعار زیر لب پڑھے۔ رومانی عمر کی رنگین شاعری۔۔۔۔۔ بجا طور پر میری تخلیق کے شہ پارے تھے مگر اچھے نہ لگے۔ میں نے کتاب بند کر کے ریک میں رکھ دی اور میں خالی الذہنی کی سی کیفیت میں ہولے ہولے چلتا ہوا اپنی چیز میں آ بیٹھا۔

مریم نے پوچھا۔ ”سرا! کیا آج کوئی مسودہ کمپوز کرنا ہے؟“ میں نے اُسے دیکھا، سوچنے کی کوشش کی، پھر قدروں سے بے بسی سے کہا۔ ”نوا ایڈیٹر! میرا خیال ہے کہ آج میں آپ سیٹ ہونے کی وجہ سے کوئی ڈیکٹیشن نہیں دے پاؤں گا۔“

”خیر تو ہے سرا؟“ اس کی آواز میں بے حد اچھائی تھی۔ میں نے کہا۔ ”ہم کل سے کام کا باقاعدہ آغاز کریں گے۔ چونکہ ہمارا دفتر دو افراد پر مشتمل ہے اور دونوں زندگی میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ تعارف کی رسم ادا ہو جائے۔ کیا خیال ہے؟“

وہ بولی۔ ”آپ کی آدمی بات سے مجھے اتفاق ہے۔ آپ مجھے نہیں جانتے، میں آپ کو جانتی ہوں۔ میں نے آپ کی شاعری پڑھ اور سن رکھی ہے۔ گزشتہ برس ایک ماہنامہ میں آپ کا تفصیلی انٹرویو چھپا تھا۔ کلام بھی تھا۔ آپ کو یاد ہے؟“

بے روزن گنبد

میرا سینہ احساسِ قفاخر سے پھول گیا۔ یہ ظاہر ہے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں شاید!“ وہ بولی۔ ”میں جس اخبار میں کام کرتی تھی، اس کے ایڈیٹر صاحب بھٹ کم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ڈی انٹرویوز شائع کیا کرتے تھے۔ میں اس کام میں ان کی معاونت کرتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے آپ کا انٹرویو تیار کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپے ہوئے مضامین کو ملا کر میں نے ایک انٹرویو تیار کیا تھا جس میں سوال بھی میرے تھے اور جواب بھی میرے۔ اس طرح مجھے آپ کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔“

میں اُسے دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ باتوں کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔ ”سرا! کمپیوٹر میں چند سوفٹ ویئر انسٹال کرنا پڑیں گے، پھر اس پر میگزین کی کمپوزنگ کی جاسکے گی۔“

میں نے کندھے اُچکائے۔ ”کمپیوٹر کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کیا سوفٹ ویئر بازار سے خریدنا پڑیں گے؟“

اس نے اپنے لب اسٹک سے پاک گلابی ہونٹ سکڑے، بولی۔ ”نہیں! سرا! یہ چیز دنیا کی کارآمد چیزوں میں شمار ہوتی ہے۔ ہزاروں میں بکتی ہے مگر ہمارے ملک میں مفت ملتی ہے کیونکہ یہاں کاپی رائٹ ایکٹ فعال نہیں۔ میرے سی ڈی ویلٹ میں سارے سوفٹ ویئر موجود ہیں۔ کل لیتی آؤں گی۔ اگر آپ مجھے میگزین میں شامل کیے جانے والے مواد کے بارے میں بریفنگ دے دیں تو میں انٹرنیٹ سے کچھ ڈاؤن لوڈنگ کر سکتی ہوں۔ آپ انتخاب کر لیجئے گا۔“

”مریم پلیز! میں نے کہا نا کہ آج ہم صرف باتیں کریں گے۔ کام کو کل پرٹالنا اچھا نہیں ہوتا مگر میں یہی چاہتا ہوں۔“ اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ ”آل رائٹ! سرا!“ اس کی انگلیاں بے دستور کی بورڈ پر تھرکتی رہیں اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اسکرین پر چلی رہیں۔

میں نے اپنی میز کی دراز کھولی۔ ایک فائل دکھائی دی۔ اُسے نکال کر کھول کر دیکھنے لگا۔ فائل میں مریم ماہوش کے ایسٹ منٹ لیٹر اور سی ڈی کے ساتھ ذاتی دستاویزات کی نقول لگی ہوئی تھیں۔ اس کے پرس ڈیٹا کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اس کی ذات سے متعلق ابتدائی معلومات حاصل ہو گئیں۔ وہ بالا کوٹ کی رہنے والی تھی۔ بے اختیار میری نگاہیں پھسلتی ہوئیں اس کے سراپا میں الجھ گئیں۔ اتنے مکمل

حسن کا تعلق یقینی طور پر بالا کوٹ جیسے قدرتی حسن سے ملا مال علاقے سے ہونا چاہیے تھا۔ بلاشبہ اس کی ذات میں پہاڑوں کا جھان خیز اتار چڑھاؤ، پھولوں کی تازگی، شریر ندی کی شوخیاں، دھوپ کی تمازت، برف کی پاکیزگی اور سرد کاغذ اور شائل تھا۔ اچانک اُس نے میری جانب دیکھا، کچھ کہنے کے لیے ”سرا!“ کہہ کر تمہید باندھی مگر اپنے وجود پر میری نظروں کے غیر معمولی ارتکاز کو دیکھ کر گڑبڑا گئی اور اس نے آنکھیں چرائیں۔ میں شرمندہ ہو کر فائل پر جھک گیا۔ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی تھی۔ اگر بولتی تو اس کی آواز یقیناً زیادہ لرز رہی ہوتی۔ اس کی فائل بولنے لگی۔ اس نے گریجویشن تک ہر امتحان میں اچھے نمبر حاصل کیے تھے۔ اردو کے مضمون میں اس کی غیر معمولی دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔ ایک مقامی اخبار کا تین سالہ تجرباتی لیٹر بھی فائل میں موجود تھا۔

میں نے مریم سے اس کی سادہ لوگری کے بارے چند سوالات کیے تو اس نے بتایا۔ ”سرا! لطیف صبا کی صاحب کے ساتھ کام کرنا اچھا تجربہ ثابت نہیں ہوا کیونکہ وہ کسی بھی معمول کے عادی نہیں تھے۔ کام کی کوئی روٹین نہیں تھی۔ عمومی طور پر پورا ہفتہ فارغ رہتے گزر جاتا اور آخری دن میں سارے ہفتے کا کام کرنا پڑ جاتا تھا۔ چونکہ اخبار کا نیوز نیٹ ورک نہیں تھا۔۔۔ اس لیے ایک ہی دن میں قومی اخبارات اور انٹرنیٹ سے خبریں منتخب کر کے کمپوز کرنا پڑتی تھیں۔“

”کیا تم اُسے ناکام ادارہ قرار دیتی ہو؟“

”یقیناً سرا۔۔۔۔۔ نہ صرف ادارے کو، بلکہ چیف ایڈیٹر کو بھی۔“

”ناکامی کی بنیادی وجوہات؟“

”ادارے کا بجٹ نہیں بنایا جاتا تھا۔ جو آمدنی ہوتی، کھا پی لی جاتی، پھر خالی ہاتھ بیٹھ کر اشتہارات کا تھکا دینے والا انتظار۔۔۔۔۔ بیگم صاحبہ کا انداز بہترین ہے۔“

میرے دل میں حسد کا کاغذ اُٹھ چھا۔ جی چاہا کہ اُسے کہہ دوں کہ بیگم صاحبہ اپنی عملی زندگی میں ناکام ترین عورت ثابت ہوئی ہیں مگر کہہ نہ سکا اور ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ وہ بولتی ہوئی بہت بھلی لگ رہی تھی اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بونہی بولتی رہے، میں سنتا رہوں۔ وہ میری خواہش پوری کرنے لگی۔ میرا انتہاک اُسے بار بار مضطرب کر رہا تھا۔ بھی آنکھیں چرائی، بھی کن آنکھوں سے دیکھتی مگر اپنی لرزتی ہوئی غماز بار آواز میں بولتی رہی۔ بھائی کے لٹنے والے لوگ نندیدوں کی طرح مجھے گھورتے رہتے تھے جس سے مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اس ملازمت کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ مجھے دفتر میں کیا رہ بجے دن پہنچنا پڑتا

تھا اور پانچ بجے تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑتا تھا۔
 ”مگر یہ تو سبھی دفاتر کا معمول ہے۔“
 ”ہے تو ایسا ہی مگر اس شیڈول پر آنا جانا میرے لیے بڑا
 تکلیف دہ ہے۔“
 ”کیوں؟“ مجھے اچھا ہوا۔
 ”وہ دراصل.....“ وہ کہتے کہتے پھر قہقہہ مٹی۔ ”کوئی خاص
 وجہ تو نہیں مگر..... بس ایسے ہی مرا۔“
 ”تم نے کسی اچھی ملازمت کے لیے کوشش نہیں کی؟“
 میری دانست میں وہ اخبار کی معمولی سی نوکری سے کہیں بہتر
 جاب حاصل کر سکتی تھی۔
 ”بہت ساری کوششوں کے بعد میری ایک کوشش بار آور
 ثابت ہوئی ہے جس کے نتیجے میں، میں یہاں پہنچی ہوں۔“
 ”یہاں بھی خواہ تو اتنی ہی ہے۔“
 ”مگر یہاں کا ڈیوٹی شیڈول میری مرضی کا ہے۔“
 میں نے کبھی انداز میں سر ہلایا۔ ”تمہارا علاقہ بہت
 خوبصورت ہے۔ ہے ناں؟“
 ”خوبصورت تھا۔ زلزلے سے پہلے، اب
 نہیں۔“ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔
 ”زلزلہ قدرتی حسن پر اثر انداز تو نہیں ہوا تھا۔“
 اس نے یہ نظر شکایت مجھے دیکھا۔ جواب نہ پا کر میں
 نے موضوع بدل دیا۔ ”شاعری پڑھتی ہو؟“
 ”بس سراسر خبریں کپور کرنے سے طبیعت میں پیدا
 ہونے والی بیزاری کا میرے پاس سوائے شاعری پڑھنے
 کے، کوئی حل نہیں تھا۔“
 ”مجھے پڑھا؟“
 ”بس سراسر!“
 ”کیسا پاپا؟“
 وہ بولی۔ ”سچ کہوں؟“
 ”جھوٹ سنا کوئی پسند نہیں کرتا۔“
 اس نے بے چینی سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ دنیا
 تعریف کی جھوٹی میز می پر بہ خوشی چڑھتی ہے۔ تنقید کی کڑوی
 گولی کوئی نہیں لگتا۔
 چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔ ”سچ تو یہ ہے کہ مجھے
 آپ کی شاعری اچھی نہیں لگی۔ آپ کو بھوک، انقلاب کی
 ضرورت اور معاشرتی ناہمواریوں کے علاوہ دنیا میں کوئی دکھ
 نظر نہیں آتا حالانکہ آپ کا بگلا اور آفس دیکھ کر پتا چلتا ہے
 کہ آپ بہت امیر آدمی ہیں۔ آدمی شاعری کی کتاب میں
 ایسا کچھ تلاش کرتا ہے، جیسا اُسے معاشرے میں دکھائی نہیں

دیتا۔ آپ کی شاعری پڑھ لی جائے یا اخبار..... ایک سی
 کڑواہٹ ملتی ہے۔“
 آج تک میں نے اپنی شاعری کو اس رخ سے دیکھنے کی
 زحمت نہیں کی تھی کہ کوئی قاری اخبار کی متبادل شاعری کو
 پڑھنے کی زحمت کیوں کرے گا؟..... میرے ذہن کے بے
 روزن گنبد میں عجیب سی سرسراہٹ گونجنے لگی۔ آج تک کسی
 نے یوں میرے منہ پر تنقید کا طمانچا نہیں مارا تھا۔ سوچا تو
 اُس کا تجزیہ درست لگا۔
 اس نے میرے بدلتے ہوئے تاثرات کو نکلی سمجھا اس
 لیے معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ”سراسر یہ میری رائے ہے۔
 اور ضروری نہیں کہ درست بھی ہو۔ میں رومانی شاعری پڑھتی
 ہوں کیونکہ مجھے خوابوں کی دنیا اچھی لگتی ہے۔ سچی اور اجڑی
 ہوئی دنیا سے دل اوڑھنے لگتا ہے۔“
 میں نے جلدی سے کہا۔ ”چونکہ تم جوان ہو اور تمہارے
 دل میں امید و شوق کی دنیا آباد ہے، اس لیے تمہیں رومانی
 شاعری اچھی لگتی ہے۔ عمومی طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میری
 ابتدائی شاعری بھی حسن و عشق کی بھول بھلیوں میں چکر لاتی
 رہی تھی میں بھی پکرا تا رہا۔ جو نئی زندگی کے حقیقی رخ دیکھے،
 مصائب اور الجھنیں، میں زندگی کے نشیب و فراز میں ہی
 الجھتا چلا گیا۔ رومان بہت پیچھے رہ گیا۔“
 وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور مہرالنسا کا
 بھاری بھر کم وجود نظر آیا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر میری
 طرف آنے کے بجائے مریم کے عقب میں جا کر کھڑی ہو گئی۔
 جو نئی مریم کو اپنے عقب میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ
 ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ مہرالنسا بولی۔ ”بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔“
 وہ احتراماً کھڑی رہی۔ مہرالنسا نے اُس کے سر اٹکا کر
 نظر اشتیاق جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں نے مریم کی طرف
 توصیف اُچھالی، لبوں پر سوال اُبھرا۔ ”مریم! تمہیں اپنے
 چیف ایڈیٹر کیسے لگے؟“
 وہ بولی۔ ”سرسببت اچھے ہیں۔“
 مہرالنسا نے کن آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہا۔
 ”ہوں! اس میں کوئی شک بھی نہیں..... اور دفتر؟“
 ”میری سوچ سے بھی زیادہ خوبصورت ہے بیگم
 صاحبہ! یہاں کام کرنے کا واقعی مزہ آئے گا۔ آپ نے
 درست کہا تھا۔“
 مہرالنسا سر ہلاتے ہوئے میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔
 ارد گرد دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پہلی دراز میں چیک بک پڑی
 ہے۔ پینٹس شیٹ بھی رکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ

بے روزن گنبد

میگزین کے معاملات کو سائنسی بنیادوں پر استوار کریں
 گے۔ خاص طور پر آپ کو مالی معاملات پر زیادہ توجہ دینا ہو
 گی۔ چھ ماہ تک میگزین منافع نہیں دے گا اس لیے میں نے
 چھ ماہ کا بجٹ بنا کر اکاؤنٹ میں رقم جمع کرادی ہے تاکہ
 آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔“
 وہ مجھے ”تم“ کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ دفتر میں آپ کہہ کر
 مخاطب کرتے ہوئے تھوڑی عجیب لگی۔ ہدایات دے رہی
 تھی مگر اس نے ادب کا پہلو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ چونکہ مہر
 النسا نے اپنی زندگی کے پچیس سال ڈسٹرکٹ اکاؤنٹ
 آفس میں گزارے تھے، اس لیے کاغذی کارروائی کو بہت
 اہم خیال کرتی تھی۔ وہ مگر کے نظم و نسق کو بھی اپنے دفتری
 معمول کے مطابق سنبھالنے کی عادی تھی جس پر میں بھی
 معترض نہیں ہوتا تھا۔
 ”کوشش کروں گا کہ تمہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔“
 میں نے تہ دل سے کہا۔
 وہ حسب معمول بے حد سنجیدہ تھی۔ ارد گرد تنقیدی نظر
 ڈال کر کرسی چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ رک کر پلٹی
 اور بولی۔ ”آپ کو جب بھی چائے یا کچھ کھانے پینے کی
 طلب ہو، انٹرکام پر حکم دیجیے گا۔ ملازمہ پہنچا دیا کرے گی۔
 میں آپ کے دفتر میں کم آیا کروں گی تاکہ آپ کے کام میں
 خلل نہ ہو۔ صرف ہر کم تاریخ کو آ کر میگزین کے شعبہ
 مالیات کو منظم کرنے کے لیے آیا کروں گی۔ اب آپ اپنا
 کام کیجیے۔ اللہ حافظ!“
 اس کا بچوں کے کھلونے بھالو جیسا ہاتھ تھوڑا بلند ہوا۔
 میں نے ممنونانہ نظروں سے اُسے دیکھا تو مجھے ایک دم جھٹکا
 لگا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے رنگ رقصاں تو تھے مگر
 آنکھیں بالکل خالی تھیں۔ پندرہ سالہ طویل رفاقت میں پہلی
 مرتبہ اس کی آنکھوں میں ایسا غلا دکھائی دیا تھا۔
 وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر گئی۔ میں کافی دیر تک بند
 دروازے کو دیکھتا رہا پھر پلٹی وراڑ سے بیگم مہرالنسا کا تیار
 کردہ اکاؤنٹ چارٹ نکال کر پڑھنے لگا۔ مہر و جیسی دکھائی
 دیتی تھی، ویسی نہیں تھی۔ بہت اچھی تھی۔ بے اختیار میرا دل
 اس کا زیر بار ہو گیا۔ اس کے تیار کیے ہوئے چارٹ کے
 مبینہ وار شیڈول میں بیس ہزار روپے میگزین کی اشاعت کے
 لیے، پانچ ہزار مریم ماہ ویش کی تحواہ کے، دو ہزار ساڑھ خرچ
 کے عنوان سے جبکہ تین ہزار روپے میرا جب خرچ درج تھا۔
 اس نے میرے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ اسی ہزار روپے جمع
 کرادیے تھے۔

شاید..... زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے مہرالنسا پر پیار آیا
 جسے میں شادی سے پہلے بڑی آبی اور شادی کے بعد ہر
 جذبے سے عاری لہجے میں مہر و کہا کرتا تھا۔ یکبارگی میرا
 جی چاہا کہ میں دفتر سے نکل کر بیٹکے میں جاؤں اور اپنی بیگم
 کے بھالوؤں جیسے لوتھڑے ہاتھ چوم لوں جس نے میرے
 خوابوں کی تکمیل پر اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی لٹا دی تھی۔
 سوچا، شام کو شکر یہ ادا کروں گا۔ شام آئی تو یہ بات بھول گیا
 اور اُس کی خنجر نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیڈ کی تکی
 کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔
 ”یہ جگہ بہت خوبصورت ہے ناں؟“
 ”ہوں۔“ میں نے دوسرا پردہ بھی کھسکا دیا۔
 ہوا خاصی ٹھنڈی تھی مگر ناگوار نہیں لگ رہی تھی۔ تاحذ
 نگاہ سبزے سے ڈھکی ہوئی ناہموار اترائی پھیلی ہوئی تھی جو
 ایک چھوٹے سے زگ زبک نالے پر سج ہوئی تھی۔ اس
 کے پار چھوٹی پہاڑی تھی جو دیکھنے میں سبز نخل سے ڈھکی
 محسوس ہوتی تھی۔ میرے بیٹکے کے پہلو سے نکل کر ایک
 پگڈنڈی ناگن کی طرح تل کھاتی ہوئی نالے تک اترتی جاتی
 تھی۔ مہر و مجھے ساتھ لے کر اس پگڈنڈی پر ہرج چہل قدمی
 کیا کرتی تھی۔ دو تین سو گز کے فاصلے پر مٹی اور بے تحاشا
 سبز جھاڑیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ ان جھاڑیوں پر
 آج کل جامنی، سفید اور ہلکے گلابی رنگ کے پھول کھلے
 ہوئے تھے جو بے حد جاذب نظر تھے۔ یہ اسلام آباد کا
 مضائقہ گاؤں تھا جو اپنی فطری دل کشی کی وجہ سے مری
 جانے والی شاہراہ پر سے گزرنے والوں کی آنکھوں میں کئی
 سنے بھرتا تھا۔ اسلام آباد بہ مشکل بیس پچیس منٹ کے
 ڈرائیو دے پر واقع تھا۔ زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ
 چنیوٹ جیسے غربت زدہ علاقے سے نکل کر کسی دن یہاں
 قتل ہو جاؤں گا مگر یہ ناممکن کام مہر و نے کر دکھایا تھا۔
 میرا کھڑکی سے دکھائی دینے والے مناظر سے بٹنے کوئی
 نہیں چاہ رہا تھا۔ مہر و بیڈ پر دراز تھی۔ میگزین پر نظر بس
 جمائے اس علاقے کے حسن پر میری رائے طلب کر رہی تھی
 اور میں اُسے حسب عادت نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ بیڈ سے اتر
 کر میرے عقب میں آ گئی، بولی۔ ”وسیم! کیا تمہیں یہ سب
 کچھ اچھا لگتا ہے؟“
 میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہاں!“
 ”یہی تمہارا خواب تھا نا؟“ اس کی آواز میں ایک طلب
 جھللا رہی تھی کہ میں اس کے سرانجام دیے گئے کارنامے کو
 سراہوں۔ مگر میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے اپنے

دلوں ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیے اور بولی۔ ”وسیم! پہاڑ بڑے کھردرے ہوتے ہیں۔ بھلا ناہموار جگہ میں بھی کوئی حسن ہوتا ہے؟ نہیں ناں..... بے ترتیبی عدم توازن کو جنم دیتی ہے۔ یہاں نہ تو درختوں میں کوئی ترتیب ہے، نہ پھول پودوں میں، اور تو اور..... یہاں موسم میں بھی کوئی توازن نہیں ہے۔ سبھی بہت شوخ، کبھی سرد اور کبھی بخار سے ہوا میں، کبھی برف تو کبھی تیز دھوپ..... کیا یہ عدم توازن بھی دل کو اچھا نہیں لگ رہا؟“

وہ میرا دھیان بانٹنے میں کچھ کامیاب ہو گئی تھی۔ میں چونک کر بولا۔ ”میں شاعر ہوں۔ فطرت سے بہت زیادہ انسائزیشن لیتا ہوں۔ تم نے ساری زندگی اعداد و شمار میں بسر کی ہے مگر اس عدم توازن کو پسند کر رہی ہو، یہی حسن کا اعتراف ہے۔“

اس کی آواز میں اندوہ بار سنجیدگی شامل ہو گئی۔ ”یعنی میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حسن بھی توازن پر نکلے نہیں کرتا؟“

میں نے ہنکارا بھرا۔ وہ بولی۔ ”پھر ایسا کیوں ہے کہ میرا جسم سڈول نہیں، متوازن بھی نہیں..... بہت موٹی اور سائولی ہوں مگر تمہاری آنکھ میرے وجود کی بے ترتیبی سے کسی خوبصورتی کو کھوجنے کی کوشش نہیں کرتی۔ ہوں؟“

میرا اتنا ہوا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے بڑے کمال سے ایسے موضوع کو چھیڑ دیا تھا جس پر میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بولا۔ ”بچے سو گئے ہیں؟“

اس کے حلق سے لمبی سانس خارج ہوئی اور شکست خوردہ آواز میں بولی۔ ”ہاں! پہاڑی راستوں کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے تھک کر جلد سو جاتے ہیں۔ نصیم کو ہلکا سا نمبر بچر تھا۔ میں نے سیرپ پلا کر سرشام سلا دیا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔“

اس نے میری عدم دلچسپی کو بھاتپ کر چھیوٹ والے گھر کا تذکرہ چھیڑا۔ اُسے رہ رہ کر اپنے بہن بھائی، والدین اور میرے والدین یاد آتے تھے۔ مجھ سے چمٹ کر کھڑی یادیں تازہ کرتی رہی پھر شکوہ بھرے اعزاز میں بولی۔ ”مگر تمہیں کیا؟ تم نے تو بھی بھول کر کسی کو یاد نہیں کیا۔ یوں جیسے تمہارا ان سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ چچا جان تمہیں کتنا مس کرتے ہوں گے۔ وہ تو ہر شام کو تمہیں دیکھنے اور چومنے کے عادی تھے۔“

میں نے بیزارگی سے کہا۔ ”سب فراڈ تھا۔“

اس نے آہ بھر کر خاموشی اختیار کر لی۔ تھوڑی دیر بعد پھر بول پڑی۔ ”میگزین کے نام کا فیصلہ ہو گیا؟“

میں نے اپنے پسندیدہ ناموں کی فہرست پر پس لامہ برائے کو بھیج رکھی تھی۔ آج کل میں آنے والی ہے۔ اُسے علم تھا، پھر بھی پوچھ رہی تھی، محض بات بڑھانے کے لیے۔ میں نے کہا۔ ”وہیکس، کون سا نام ادا کے ہوتا ہے۔“

”کچھ دے دلا دینا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”کیونکہ جب تک رشوت کا ٹانک نہ پلایا جائے، فائل تھابت کے مارے ایک میز سے دوسری میز کا قاصد ملے نہیں کر سکتی۔“

”آفس کے ایک آدمی کو چند ٹوٹ تھما دیے تھے۔“

”ڈیٹیکشن کا پراس کتنا لمبا ہے؟“

”دو چار دنوں کا..... اگر دام خرچ کیے جائیں تو۔“

”تو کر دینا۔ میں چاہتی ہوں کہ پہلے شمارے کی اشاعت سے قبل ڈاکو منٹس مکمل ہو جائیں۔ اور ہاں! تم اپنے میگزین میں سیاست اور کرائمر پورٹس شامل نہ کرنا۔“

”کیوں؟“ میں بے ساختگی سے مستفسر ہوا۔

”نہیں وسیم! وہ خاصے انجمن اور دشمنی والے کام ہیں جبکہ میں تمہیں پرسکون اور خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔“

مجھے سیاست اور کرٹ افیئرز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے ہنکارا بھرا، کہا۔ ”میں لکچر اور لٹریچر پر کام کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ خوش ہو گئی۔

میں اس موضوع سے بھی اکتا گیا، بولا۔ ”فرض کیا، میگزین غلاب ہو جاتا ہے۔ تب؟“

شاید میں دل ہی دل میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اتنی بڑی رقم داؤ پر لگے اور وہ اپنے معمول کی شکایات میں ایک اور باب کا اضافہ کر لے۔

”تم بے فکری سے اپنا کام کرو۔ مجھے یقین ہے کہ میگزین بہت جلد اپنی سرکولیشن مضبوط کر لے گا۔ جس کام کا انسان کو شوق ہو، اس کو پاپے تک پہنچا ہی لیتا ہے۔ کئی صوبائی اور وفاقی ادارے ثقافتی اور ادبی رسائل کی بھرپور مالی اعانت کرتے ہیں۔ تم اپنے ملنے جلنے والوں سے رابطہ کرو۔ وسیلہ ڈھونڈو اور ہر ایسے ادارے میں اپلائی کر دو۔ میں اپلائی فائل بنانے میں مریم کی مدد کروں گی اور اُسے پراسیس سمجھا دوں گی۔“

میرا جی چاہا کہ میں اس کا عملی نہ سہی، زبانی شکریہ ادا کروں مگر عجیب سی جھجک آڑے آ گئی۔ میں نے اُسے کہہ کر گفتگو سے پھر من چرایا۔ وہ بولی۔ ”یاد آ یا وسیم! تمہیں مریم کیسی لگی؟“

میں نے پہلو جھکی کی۔ ”کام دیکھ کر ہی کوئی رائے قائم کر سکتا ہے۔“

”اس کی شخصیت پر ہی رائے زنی کر دو۔“ مہر کی آواز میں موہوم سی التجا تحلیل ہو گئی۔

”ٹھیک ہے۔“

”بس ٹھیک؟“

”تو اور کیا کہوں؟“ میں نے مصنوعی بیزارگی کا مظاہرہ کیا۔ ”خود پر زیادہ توجہ دینے کی عادی معلوم ہوتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ اپنے آپ پر ذرہ بھر توجہ نہیں دیتی۔ اس نے تو ٹھیک سے میک آپ نہیں کیا ہوتا۔“ اس نے اپنے انتخاب کی دانستہ حمایت کرنا چاہی۔

”شاید ایسا ہی ہو۔“ میں نے پہلو جھکی کی۔

”میں نے اپنے علاقے میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔“ اس کا لہجہ تحسین آمیز ہو گیا۔ ”انٹرویو کے لیے جتنی بھی لڑکیاں آئی تھیں، حسین حسین۔ مریم حسین تھی۔ اس کی اردو پر دسترس بھی اچھی تھی میں نے اُسے منتخب کر لیا۔“

”تم مجھے آفس میں آپ کیوں کہہ رہی تھیں؟“ میں نے اپنی عادت کے مطابق اچانک پلٹا کھایا اور جواب گول کر دیا۔

”تم اس چھوٹی سی سلطنت کے بادشاہ ہو اور بادشاہ کو تعظیم سے مخاطب کیا جاتا ہے۔“ اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا، پیار تھا۔

باتوں میں ہمیں دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ باہر کا منظر اندھیرے میں گم ہو گیا تھا اور ہوا بے حد سرد ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے کھڑکی سے ہٹ جانے کا مشورہ دیا اور میرا شانہ چھوڑ کر بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے بیڈ لیپ آن کیا۔ ٹیوب لائٹ آف کرنے سے پہلے اس نے ملحقہ بیڈ روم میں جھانک کر بچوں پر نگاہ ڈال لی تھی۔

میں کھڑکی بند کر کے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ وہ اپنا بھاری بازو آنکھوں پر رکھے لمبی لمبی سانس لے رہی تھی جو کچھ ہی دیر بعد خاصے دہشت ناک خراٹوں میں بدلنے والی تھیں۔

میں بے دھیانی میں اس کی کبھی ہوئی بات کو ذہن میں دہرانے لگا۔

اس نے کہا تھا کہ اس کے پینتالیس سال پرانے بدن کی بے اعتدالیوں اور عدم توازن میں سے میری آنکھ نے آج تک حسن کو کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے کوشش کی۔ بھدے بھدوں سے لے کر گنے جتنے بالوں پر مشتمل پٹیا تک، دائیں ہاتھ کی بڑی انگلی کی آخری پور سے

دائیں ہاتھ کی پور تک آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کا سارا بدن ٹھولا..... نہیں، کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ وہ بنجر وجود کی بالک تھی۔ میں نے آج تک ازدواجی عمر میں اس کا موازنہ کسی سے نہیں کیا تھا مگر آج اُسے مریم کے پہلو میں کھڑا کر کے دیکھ رہا تھا۔

مریم کے وجود سے حسن کو کھوجنا نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ سراپا حسن تھی۔ اس کے ہونٹ غلاب ایسے نہیں تھے۔ غلاب اُس کے ہونٹوں جیسا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھیل نہیں تھی، جھیلیں اُسے دیکھ کر اپنی گیرائی مانتی تھیں۔ ایک لمبی سانس حلق میں اُتاری اور کروٹ بدل کر پہلو کے بل ہو گیا۔ اس کو دیکھنے سے نہ دیکھنا بھلا تھا۔ میں خاما تھک گیا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے آج دسواں دن تھا۔ ان دنوں میں میرا ذہن مسلسل حیرانیوں کے جھکوں پر لرزاں تھا۔ ہر لمحہ مجھے استغراب زدہ کر دیتا تھا اور مہر کا ہر نیا اقدام مجھے پریشان کرنے والا ثابت ہوتا تھا۔

اگلی صبح میں نے طویل عرصہ کے بعد اپنے بناؤ پر خصوصی دھیان دیا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں شکل و صورت میں گمراہ تھا یا مجھے احساس کسری لاحق تھا مگر میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں اُسے اچھا دکھائی دوں جو میری آنکھوں میں زندگی کی نئی جوت جگا کر پرس جھلاتی دفتر سے رخصت ہو گئی تھی۔ میری تیاری کے دوران مہر النساء نے ڈائمنگ ٹیبل پر ناشا لگا دیا۔ مجھے بتانے آئی۔ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ گہری نظروں سے سرتاپا دیکھنے کے بعد فریڈ اطمینان سے گویا ہوئی۔ ”ایک دم ڈشنگ..... بالکل ایسے لگ رہے ہو..... جیسے میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے رخ پھیر لیا۔ قانکہ نہ ہوا۔ اس کی جاگتی ہوئی آنکھیں آئینے میں دکھائی دینے لگیں، بولی۔ ”پرفیوم ادھر رکھا ہے۔ وہی..... جو تمہیں بہت پسند ہوا کرتا تھا۔ یاد ہے ناں؟“

میں نے اس کی نشاندہی پر ڈریسنگ ٹیبل کی دروازہ کھینچی۔ کالی ڈوری والی ٹھیلیں تھیلی جس پر لیڈریج لگا ہوا تھا۔ اس ننھے سے لیڈریج پر فائل کرنے کے الفاظ کھدے ہوئے تھے۔ یہ میرا پسندیدہ پرفیوم تھا۔ میں نے ڈوری کی گرہ کھول کر شیشی نکالی۔ آدمی دیکھ کر سوالیہ نظروں سے آئینے میں مہر کو دیکھا۔ وہ جھٹ سے بولی۔ ”پڑی پڑی اڑ گئی ورنہ میں نے تو بڑی سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔“

میرا سر جھک گیا۔ سوچنے لگا۔ لگاؤں؟ نہ لگاؤں؟.....

سراٹھا کر امید بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی آنکھوں پر ایک طرح کا ترس آیا۔ میں نے خوشبو چھڑکی۔ کمراسوس

مہک سے ایک دم محط ہو گیا۔ ایک لمبی سانس بھینچوں میں اتاری۔ کوئی بوجھ سارے ہٹا ہوا محسوس ہوا۔ مہر نے تھوڑا قریب ہو کر سنجیدگی سے کہا۔ ”وسیم! ادھر ہو جائے گی۔ آئیں دیر سے پہنچنے والے باس کا مینج اچھا نہیں جتا۔“

میں نے پلٹ کر اسے ایک اچھٹی ہوئی نظر سے دیکھا اور ڈانٹنگ ٹھیک کا رخ کیا۔ بچوں نے مجھے گڈ بارتنگ کہا۔ میں نے دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔ ”نہیں..... صبح بخیر کہا کرو۔“

دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

نصیم بولا۔ ”بابا! آپ بولے؟“

علیم کی استعجاب آلود آنکھیں چھیں۔ ”بابا! آپ نے پہلی مرتبہ ہمیں ٹوکا ہے۔ ٹوکے جانے پر دل پر بوجھ پڑتا ہے مگر نجانے کیوں آپ کا ٹوکنا بہت اچھا لگا۔“

میں نے ان کے ریمارکس سے ان سے کرتے ہوئے کرسی کھینچی اور سر جھکا کر ناشا کرنے لگا۔ مہر نے ٹھیک کہا تھا کہ مجھے وقت پر پہنچ کر اپنے دفتر کی اکوٹی کارکن پراچھا تاثر چھوڑنا چاہیے تھا جو جتنی طور پر مجھ سے پہلے دفتر پہنچ چکی تھی۔

مہر نے مارملیڈ کا جار اٹھانا چاہا۔ ہاتھ جکڑتے تھے۔ جام پھسل کر چینی کی پلیٹ پر گرنا۔ پلیٹ جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔ سکوت کی من بھاؤنی سطوت درہم برہم ہو گئی۔ میں نے ایک ذرا ناگواری سے اسے دیکھا پھر سر جھکا کر بریڈ ٹیس پر شہد اور مکھن لگانے لگا۔

وہ بولی۔ ”وسیم! میں آج پنڈی جاؤں گی۔ کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ بچوں کو لوز ٹوپ اسکول میں داخل کرادوں۔ سنا ہے کہ وہاں داخلہ آسانی سے نہیں ملتا۔ بھائی کا ایک قریبی دوست میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ پنڈی میں رہتا ہے۔ اس سے ملوں گی۔“

اس کا انداز اجازت طلب تھا۔ میں نے کندھے اچکائے اور آنکھوں کے اشارے سے اجازت دے دی حالانکہ اسے مجھ سے اجازت مانگنے کی احتیاج تھی نہ مجھے کھوکھلا احسان کرنے کی۔ جب میں ٹشو پیپر کھینچ کر ٹھیل چھوڑ رہا تھا، اس نے بتایا کہ وہ دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ سچ تک آگئی تو ٹھیک ورنہ میں اور مریم اپنا کھانا دفتر میں منگوا لیں گے۔

پندرہ برس کا طویل عرصہ میں نے اپنی واجبی شکلوں والی کزنز کے درمیان گزرا تھا۔ انیس بیس کے فرق سے کبھی مہر جیسی تھیں۔ چار دن جوانی کی موج میں تپ کر خوبصورت لگتی تھیں۔ پھر سب ایک جیسی ہو جایا کرتی تھیں۔ لمبی مدت

کا قیدی جیل سے نکلنے کے بعد ہر شے کو اجلی آنکھ سے دیکھتا ہو، شاید میری کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ مریم میری آنکھوں کے سامنے مائیکر کی اسکرین پر نظریں جمائے مطلوبہ سوئٹ ویزز انشال کرنے میں مگن تھی۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے اپنی پشت کرسی سے نکالی اور طویل سانس لے کر بولی۔ ”سر! کمپیوٹر اوکے ہو گیا ہے۔ اب اس پر میں اپنا کام کر سکتی ہوں۔“

ایسے ہی وقت میں اسے میرے اٹھناک کی خبر ہوئی۔ جھینپ سی گئی، دروازہ کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔

میں نے اپنی دراز سے فائل نکالی اور کھول کر دیکھنے لگا۔ وہ تجسس کے مارے کرسی چھوڑ کر میز پر جھک گئی۔ مہر التسا کو ہر کام کو دستاویزی شکل دینے میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے میگزین کی جملہ تفصیلات ترتیب وار فائل کر رکھی تھیں۔ ایک سوچا لیس صفحات کی ڈی میری نظروں کے سامنے تھی۔ مٹی پٹیل سے خالی سرورق پر لکھا تھا۔ ایڈیٹر اس ڈی کے مطابق میگزین کے مضامین کو تقسیم کر سکتا ہے۔ میں نے مریم کی طرف دیکھا۔ وہ میرا سوال بھانپ کر ایک کاغذ اور قلم اٹھا لائی۔ میں نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ڈی کو میز کے وسط میں رکھ کر اس پر جھک گیا۔ بولا۔ ”مس مریم! ہمارا میگزین خالصتاً ادبی ہے اور شاعری پر مشتمل ہوگا۔ اس کی تقسیم میں میری مدد کرو۔“

وہ بولی۔ ”نہیں سر! اگر آپ محسوس نہ کریں تو یہ ڈی مجھے عنایت کر دیں۔ مجھے بھرپور سنا ہے کہ میں آپ کی خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کام کو بخوبی سرانجام دوں گی۔“

میں نے خوش دلی سے ڈی اس کی طرف کھسکا دی۔ اس نے لیڈ پٹیل اور آر یز بھی اٹھا لیا۔ اٹھ کر اپنی نشست پر جانا چاہتی تھی مگر میں نے اسے وہیں بیٹھ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ وہ گڑبڑائی۔ ”سر! میں آپ کے سامنے بیٹھ کر کام نہیں کر سکتوں گی۔ وہ کیا ہے کہ میں نروس ہو جاتی ہوں ناں۔ پلیز.....“

اس کے نتیجہ نہ سوال کو رد کرنا بہت مشکل تھا۔ میں نے سر کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ اپنی چیز پر چلی گئی اور میں فائل میں رچھ گیا۔

مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اگر میرے بجائے مہر التسا میگزین کی چیف ایڈیٹر ہوتی تو وہ اسے اپنی محنت اور اعداد و شمار میں غیر معمولی صلاحیت کے ثمرات پر نہایت مختصر وقت میں ملک کے صف اول کے جرائد میں کھڑا کر سکتی تھی۔ میرے سامنے اس نے اپنے عمل سے چیلنج کی بلندیوں پر کھڑی کر دی تھی جسے عبور کرنے میں ہی میرے مقام کی بقا تھی۔

بے روزگاری گھبراہٹ

میں نے کہا۔ ”نہیں مریم! شعر کا حلقہ بہت بڑا ہے۔ کافی حصے نہیں گے مثلاً انسانیت، شعرا سے متعلقہ خبریں، نظم، غزل، نثریے، ہائیکو..... ماضی کے ایک شاعر ایک حال کا۔ منتخب کلام، تازہ مجموعوں پر تبصرے، تنقید، تحقیقی مضمون، مراسلہ جات، اردو اور عالمی ادب سے.....“ میں نے شعر سے مشک کئی عنوانات اسے گوا دیے اور اس پر یاد کرایا کہ میگزین کی اشاعت کا حقیقی محرک میری شاعری تھی۔ اس نے لیڈ پٹیل سے تمام موضوعات اپنے رف پیڈ پر لکھ لیے۔

میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم میرا نسخہ نظر جان چکی ہو۔“

”نہیں سر! آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“ اس کی نظریں ابھی تک اپنے خاموش سوال کے جواب کی مستلشی تھیں، بولی۔ ”ہمیں پہلے دو تین شماروں کا مواد خود تیار کرنا پڑے گا۔ جب خطوط اور ای میل کا سلسلہ چل نکلے گا، تب انتخاب میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ آپ مجھے بتادیں کہ میگزین میں کس نوع کی شاعری شامل کی جائے گی، تاکہ میں انٹر نیٹ سے مواد منتخب کر کے ڈاؤن لوڈ کر لوں۔“

میرا مزاج انقلابی تھا۔ سوچ مزدوروں کی آواز رکھتی تھی۔ معاشرتی مسائل پر میں نے بہت کچھ لکھا تھا مگر کچھ گڑبڑ ہو گئی اور میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”رومانی شاعری..... کچھ حصہ انقلابی سوچ پر مشتمل ہوگا۔“

اسے اچھینچا ہوا۔ ”واقعی سر؟“

میں نے اسے تائیدی نظر سے دیکھا، پھر اس کا مسرت سے مالا مال چاند سا چہرہ بہ نظر شوق دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ڈی میری میز پر چھوڑ کر اپنی چیز پر جا بیٹھی۔ سیاہ کی بورڈ پر اس کی محرومی انگلیاں لرزے لگیں۔ یوں لگا جیسے اس نے دل کے تاروں پر ہاتھ رکھ دیے ہوں اور کوئی نغمہ چھیڑ دیا ہو۔ اس کی لانی می پلکوں والی آنکھیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ اسکرین سے پھوٹی ہوئی روشنی آنکھوں سے منعکس ہو رہی تھی۔ حسن توازن کا نام ہے۔ کبھی کاپی پر چینی ہوئی سیدھی اور مسلسل لائن بھی نظروں کو بھٹی لگتی ہے۔ اس کی آنکھ کا سفید حصہ بے حد سفید تھا، کسی بھی دھبے کے بغیر سیاہ حصہ بے حد چمکدار..... کسی بھی دھند کے بغیر۔ یہی توازن تھا۔ یہی حسن تھا۔

عجیب بات تھی۔ جب مریم سامنے آتی، مہر کی شبیہ بھی چشم تصور میں سج جاتی۔ مہر اور میری تنہائی میں مریم آن حائل ہوتی تھی۔ میں بے اختیار دونوں میں موازنہ کرنے لگتا۔ مہر کے سامنے جاتا تو لفظ مجھ سے روٹھ جاتے تھے۔ مریم کی

میں اپنے سامنے نصب فی وی پرایک نیوز چینل دیکھنے لگا۔ کہیں ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں کئی افراد قتل اجل بن گئے تھے۔ کئی افراد شدید زخمی ہو کر اسپتالوں میں پہنچائے جا رہے تھے۔ ایسیو لیس کے ہوڑ اور اینکر پرسن کی بیجانی آواز مجھے بری لگنے لگی تو میں نے چینل بدل دیا۔ کبھی کبھہ میں آیا کہ میری شاعری پر مریم ماہوش کی رائے کتنی صادق تھی..... ایک بارگی میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ آئندہ میں خواہوں، دنیا کی رعینوں اور رومانی مناظر کو اشعار میں ڈھالوں گا۔

میری انگلیاں ایسی ہی کوئی وادی تلاش کرنے کے لیے بار بار چینل بدل رہی تھیں۔ اس گاؤں میں کیبل کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اس لیے مہر کو سیٹلائٹ ریسیور نصب کروانا پڑا تھا۔ سرکاری چینل پر چولستان کی ثقافت پر مبنی وڈیوز کلپ چل رہے تھے جنہوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ میں تب چونکا، جب مریم نے ڈی میرے سامنے میز پر رکھی اور دونوں تھیلیاں میز پر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے ڈی دیکھی۔ اس نے پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک اپنے طور پر مضامین کی موزوں ترین تقسیم کر رکھی تھی۔ میں صفحہ صفحہ دیکھتا ہوا ایک جگہ پر رُک گیا۔ اس کے لکھے ہوئے لفظ کو پڑھ نہ پایا تو پٹیل لفظ پر رکھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ تھوڑا جھکی۔ بالکل کر ڈی اور میرے ہاتھ پر گر گئے۔ دل میں گدگدی سی ہوئی۔ نرم بالوں سے پھوٹی ہوئی خوشبو نے میری فائل گرنے کا طغیہ ہوا میں اڑا دیا۔ میں نے ارادی طور پر پٹیل کی نوک ایک بال پر رکھ دی۔ ایسے ہی وقت میں اس نے بالوں کو بازو پر لے کر اوپر جھکا۔ کبھی سی سسکی نکلی۔ بال ٹوٹ کر سفید کاغذ پر زخمی سانپ کی طرح لہرا کر گر گیا۔

اس نے بال کو چنگی میں پکڑا۔ کھینچ کر کاغذ سے ہٹانا چاہا مگر میں نے پٹیل کی نوک پر تھوڑا دباؤ بڑھا دیا۔ نظریں اٹھائیں تو اسے اپنی طرف دیکھتا پایا۔ اس کے چہرے پر خفت اور شکایت کا ملا جلا سا پرتاؤ اور آنکھوں میں نہ سمجھنے کا تاثر موجزن تھا، بولی۔ ”یہ..... یہ لفظ میں نے کاٹ دیا تھا۔“

میں نے پٹیل اٹھائی۔ ورق پلٹا۔ کہا۔ ”میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا کہ اس میں افسانے وغیرہ شامل نہیں ہوں گے۔ صرف شاعری ہوگی۔ شاعروں کی خواب ناک دنیا ہوگی۔“

وہ استعجاب آمیز انداز میں بولی۔ ”بس؟“

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا۔ ”نہیں!“

”یعنی میگزین کے دو حصے بناؤں، غزلیں اور نظمیں۔“

موجودگی میں خاموشی بڑی لگنے لگتی تھی۔ میں نے گلا کھنکارا،

کہا۔ ”کیا تمہارے والدین بالاکوٹ میں رہتے ہیں؟“

وہ ایک دم چونکی، بولی۔ ”نہیں سر! فوت ہو چکے ہیں۔“

”اوہ نو..... مجھے دکھ ہوا یہ سن کر۔ بھائی بہن؟“

”بڑی بہن تھی۔ چھوٹا بھائی تھا۔ وہ بھی ماں باپ کے

ساتھ اللہ کے پاس چلے گئے۔ میں اکیلی بچ گئی۔“ اس کے

لہجے میں دکھ کا عنصر طویل ہو گیا۔

”کوئی رشتہ دار؟“ مجھے تجسس ہوا۔

”کہا ناں، میں اکیلی بچ گئی۔“ عیاں تھا کہ وہ اس

موضوع کو سمیٹ دینا چاہتی تھی۔ ”زلزلہ میرے پورے گاؤں

کو چاٹ گیا تھا۔ سوائے طبعے کے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔“

مجھے بے اختیار چند سال پہلے آنے والے خوفناک

زلزلے کا خیال آ گیا جس نے ہزاروں افراد کو لقمۂ اجل بنا

دیا تھا۔ کئی گاؤں صفحہ ہستی سے نابود کر دیے تھے۔ اس کے

چہرے پر رقص کرنے والی غم بار پر چھائیوں نے میرے دل

میں تاسف بھر دیا۔ موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا۔ ”اخبار

کی ملازمت سے پہلے کیا کرتی تھیں؟“

”گاؤں کے اکلوتے اسکول میں پڑھاتی تھی۔“

”سرکاری نوکری تھی؟“

”نہیں سر! وہ نجی اسکول تھا، پرائمری کلاسز کے لیے،

جس میں بہت معمولی تنخواہ پر بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ مجھے

پیسے کی ضرورت نہیں تھی، بس خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی۔“

اس نے کی بورڈ سے ہاتھ اٹھا کر گود میں رکھ لیے۔

”کیا اس علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے؟“

اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو

”اگر توجہ نہ دی جاتی تو میں گریجویشن کیسے کر لیتی؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ وہاں کا

معاشرہ بہت قدامت پسند ہے۔“

وہ بولی۔ ”ایسا ہی ہے مگر میرے بابا اسکول ٹیچر تھے۔

انہوں نے کویستانی روایات کے برعکس ہم دونوں بہنوں کو

پڑھنے کا بھرپور موقع دیا۔ میری باجی لیکچرر تھی۔ میں ماسٹرز

کرنے چاہتی تھی مگر..... ایک لمحے میں ساری دنیا بدل

گئی۔ نہیں سر! بدل نہیں گئی، اُجڑ گئی۔“

”اب تم کہاں رہتی ہو؟“

”ویمین ہاسٹل میں..... یہاں سے دس کلومیٹر کے

فاصلے پر، پنڈی کے قریب۔“ اس نے کرسی گھمائی۔ اپنا

رُخ میری جانب پھیر لیا۔ گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ”ہاسٹل کی فیس کیا ہے؟“

”میس سمیت بائیس سو روپے۔ میرے ساتھ کمرے

میں ایک لڑکی اور بھی رہتی ہے جو ایک بڑے ریسٹوران کے

مکین میں شبانہ ڈیوٹی کرتی ہے۔“ وہ آنکھیں جھپکے بغیر مجھے

دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ویمن پر آتی جاتی ہوں۔ دو طرفہ کرایہ

سات آٹھ سو روپے بنے گا۔ ماہانہ۔“

”ہوں۔“ میں نے دل ہی دل میں شمار کیا، کہا۔

”آدمی سے زیادہ تنخواہ رہائش اور ٹرانسپورٹ میں چلی گئی۔

باقی کیا بچا؟“

اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے حیرانی آمیز تاثر سے بچا

چلا کہ وہ میری گفتگو کا نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”میرا کہنے کا مطلب ہے کہ تم نے اتنی کم تنخواہ

والی نوکری کیوں قبول کر لی؟“

اس کے لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ ابھری،

بولی۔ ”جب آپ کو اس بات کا احساس ہے تو بیگم صاحبہ

سے میری سفارش کر دیں۔ وہ میری تنخواہ میں تھوڑا بہت

اضافہ کر دیں گی۔“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کا چیف ایڈیٹر میں تھا، مہرو

نہیں مگر اس نے مجھے مہر و کاراستہ کیوں دکھایا تھا؟ میں نے

حیرانی سے پوچھا۔ ”تم میری ماتحتی میں کام کر رہی ہوناں کہ

بیگم صاحبہ کی۔ میں اگر چاہوں تو تمہاری تنخواہ میں اضافہ کر

سکتا ہوں اور.....“

اس نے سوالیہ نظروں سے اُور کے آگے چھپے رہ جانے

والے سوال کو کریدا۔

میں نے کہا۔ ”اور چاہوں تو نوکری سے فارغ بھی کر

سکتا ہوں۔“

”نہیں سر! آپ تنخواہ بڑھا سکتے ہیں مگر مجھے نکال

نہیں سکتے۔۔۔ اور نہ تنخواہ میں کمی کر سکتے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے

مجھے چھ ماہ کی تنخواہ کے چیک دے دیے ہیں۔ میری نوکری کو

تحفظ دینے کے لیے۔“

میں دم بخود رہ گیا۔ ایک لمحے کو مہرو پر بے تحاشا غصہ آیا

پھر آپوں آپ تحلیل ہو گیا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”وہ کیا ہے کہ بیگم صاحبہ نے میرا

انٹرویو لیا تھا ناں..... میں سمجھی شاید وہی ان معاملات کو

دیکھیں گی۔ ورنہ تو انہوں نے بھی مجھے بتایا تھا کہ آپ

میرے چیف ایڈیٹر ہیں، باس ہیں۔“

میں نے ہنکارا ابھرا۔ اس نے ایک بہت بڑا چیلنج میرے

سامنے رکھ دیا تھا۔ میں نے فوراً فیصلہ سنایا۔ ”ٹھیک ہے۔

آئندہ تمہارے آنے جانے کا کرایہ میگزین ادا کرے گا۔“

اس نے ممنون نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ”شکریہ سرا میں خود کو اس کا اہل ثابت کروں گی کہ آپ کا فیصلہ میگزین کے لیے مفید ہے۔“

مجھے اُس کے چہرے پر خوشی کی کہکشاں اچھی لگی۔ جی جابا کہ وہ ایسے ہی میرا شکریہ ادا کرتی رہے، دیکھتی اور مسکراتی رہے۔

بولی۔ ”سرا! آپ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہیں؟“

میرے ذہن میں جھپکا کا سا ہوا۔ ایک دم شرمسار ہو کر رخ بدل گیا۔ یہ وقت کہا۔ ”ویسے ہی..... دراصل دفتر میں کوئی کام بھی تو نہیں ہے۔ اس فراغت میں دیکھا اور بولا ہی تو جاسکتا ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اُسے دیکھا۔ وہ خاموش تھی مگر اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ”سرا! آپ کا جواب مجھے مطمئن نہیں کر پایا۔ کوئی اور جھوٹ بولیں۔“

اس نے رخ پھیرا، پرستار آن کیا، چند پرنٹ نکالے اور پچر کلب لگا کر میرے سامنے رکھ دیے، بولی۔ ”سرا! میں نے انٹرنیٹ سے کچھ شاعری لی ہے، اس کا مطالعہ کر لیں۔ آپ کی منتخب شاعری ٹائپ کر لوں گی۔“

اس کی لرزتی ہوئی آواز میری سماعت میں اتر کر معانی بدل گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے کہا ہو۔ ”لیں! میں نے آپ کو مصروف کر دیا ہے۔ اب مجھے نہ دیکھیے گا۔“

میں نے کاغذوں کا پلندا اٹھا لیا۔ میری انگلیاں کانپ رہی تھیں اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اپنے عامیانہ برتاؤ پر تاؤ آیا اور میں نے سلگتے ہوئے ذہن کو کاغذوں میں رجمانے کی کوشش کی۔ بھی میں نے جمائی لی اور کاغذ اٹھائے ریٹائرنگ روم میں آ گیا۔ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو گیا۔ آنکھوں پر بانہ رکھ کر اپنے غیر شائستہ رویے اور مرمیم ماہ ویش کے رد عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔

گھنٹا بھر کے بعد اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا، پوچھا۔ ”سرا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“

میں نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں۔ وہ دروازہ تھامے کھڑی تھی۔ میں نے کہا۔ ”ہاں! مگر میں چائے پینا چاہوں گا۔ انٹرکام پر کہہ دو۔“

اس نے ”جی سرا“ کہا اور پلٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرے اٹھائے ریٹائرنگ روم میں آئی جسے اُس نے تپائی پر رکھ دیا اور قالین پر بیٹھ کر چائے تیار کرنے لگی۔ چینی اور دودھ ڈالنے سے پیشتر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ”ڈیڑھ چمچ..... دودھ کم ڈالنا۔“

اس نے اپنے لیے بھی چائے تیار کی اور قالین پر آگئی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ چائے کا تنہا سا گھونٹ بھر کر بولی۔ ”آپ ناراض ہیں؟“

میں نے مصنوعی استغاب چہرے پر ثبت کیا، کہا۔ ”کیوں؟ میں بھلا تم سے کیوں ناراض ہوں گا۔“

اس نے سر جھکا لیا۔ ”بادل جوں جوں بلند ہوتا جاتا ہے، حساس ہوتا جاتا ہے۔ تھوڑے سے موسمی تغیر پر ہلنے لگتا ہے۔“

مجھے اس کی بات نے واقعتاً مزہ دیا۔ اٹھ بیٹھا۔ چائے کے بھر پر گھونٹ کا حلقہ کشید کیا، کہا۔ ”مگر میں تو معمولی آدمی ہوں۔“

”نہیں سرا! آپ بڑے آدمی ہیں۔“ اس نے محل سے جواب دیا۔

میں بھول گیا کہ تھوڑی دیر قبل میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اپنے تئیں خود کو بے پروا ثابت کرنے کے لیے کیا لالچ عمل ترتیب دے رہا تھا، بولا۔ ”مریم! میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں خاص ہوں مگر میری عادات عام آدمی سے تھوڑی مختلف ہیں اس لیے مجھے عام انداز میں نہ لیتا۔“

”کیا آپ کی محبت کا انداز بھی مختلف ہے؟“ اس نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میرے پورے بدن میں عجیب سی سنسنی سرایت کر گئی۔ مجھے اس سوال کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ”اس بارے میں میری رائے محفوظ ہے کیونکہ میں زندگی کے اس محل میں داخل نہیں ہوسکا جس کی غلام گردشوں میں محبت کے نغمے یا نوے بازگشت پیدا کرتے ہیں۔“

اس کے چہرے پر حیرانی رقم ہو گئی، بولی۔ ”میں نے آپ کی بات کا اپنی استعداد کے مطابق یہ مطلب نکالا ہے کہ آپ کو محبت کرنے کا موقع نہیں ملا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بے حد مصومیت سے بولی۔ ”کیا میں یقین کر لوں؟“

میں چونکا۔ ”کیوں؟ کیا میں نے اتنی ہی عجیب بات کر دی ہے کہ تمہیں یقین نہیں آ رہا؟“

اس نے سر جھکا کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ دل کی دنیا کو آشکار ہونے سے بچانے کے لیے یہ ایک بہترین انداز تھا، بولی۔ ”آپ دو بچوں کے باپ ہوتے ہوئے بھی اتنے رینڈم لیا، امیر ہیں..... اور پھر معروف شاعر بھی ہیں..... نہیں سرا! میرا دل ہرگز نہیں مانتا کہ آپ کو محبت کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔“

چائے پینا مشکل ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے کپ رکھ

دیا۔ اس کے شانوں پر سایہ فگن زلفوں کے بیچ و خم پر نگاہ ڈالی، کچھ سوچا، پھر کہا۔ ”اگر محبت کرنے سے انسان کی قلبی تشنگی ہوتی ہو تو انسان موقع تلاش کر لیتا ہے۔ مجھے دراصل محبت کے ہونے کا انتظار تھا..... نہیں ہوئی۔“

”اوہ.....“ اس کے لبوں پر ایک زندہ مسکراہٹ حیر مئی، بولی۔ ”اب سمجھی..... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں واقعی غلطی پر تھی۔“

میں تمام تر پیش بندیوں سمیت اُسے بنظر شوق دیکھتا رہا وہ مسکرائی۔ ”میں نے یہی پوچھا تھا کہ آپ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہیں؟ آپ میری بات کا برا مان گئے۔ کیا مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا؟“

اس کی آنکھیں زندگی سے بھرپور تاثر لیے ہوئے تھیں جبکہ ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ وہ ناراض نہیں تھی۔ وہ تو بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس سینے میں اتاری اور کہا۔ ”ہوں..... میں تمہیں کیوں دیکھتا ہوں؟..... پتا نہیں..... بس تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں، دیکھ لیتا ہوں۔ شاید میں اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا۔“

”نیگم صاحبہ نے مجھے کہا تھا کہ آپ بہت سنجیدہ اور کم گو ہیں۔ ہر سوال کا جواب ہوں، ہاں اور نہیں میں دیتے ہیں۔ میں ڈر گئی تھی۔ آپ کو دیکھنے تک میں نے اپنے ذہن میں آپ کی نہایت مشکل ایج بنائی تھی مگر جب آپ سے ملی تو حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ آپ تو بہت بولتے ہیں اور بولتے ہوئے اچھے بھی لگتے ہیں۔“

”اور دیکھتے بھی ہیں؟“ میں نے بے ظاہر سنجیدگی سے کہا مگر میرے اندر شرارت بھری ہوئی تھی۔

”جی سرا!“ اس نے فوراً تائید کی۔ ”پھر میں نے سوچا کہ نیگم صاحبہ نے اپنے طور پر مجھے بے حد محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔“ اس نے چائے ختم کر لی تھی۔ برتن سمیٹتے ہوئے اس کی نگاہ میرے کپ پر پڑی، بولی۔ ”سرا! آپ نے چائے نہیں پیا؟“

میں نے غیر ارادی طور پر کپ اٹھایا اور دو چار بڑے بڑے گھونٹوں میں خالی کر کے ٹرے میں رکھ دیا۔

”سرا! ایک ریک میں آپ کی پہلی کتاب پڑی ہے۔ سرسری انداز میں دیکھنے پر اچھی لگی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اُسے اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ دو تین دنوں بعد لے آؤں گی۔“

اس کتاب میں میرے اُس دور کی شاعری شامل تھی،

جس دور میں مجھے محبت کے ہونے کا انتظار تھا۔ اُس کی عمر ایسی ہی شاعری سے بھل سکتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تمہارے مطلب کی ہے، اس لیے پڑھنا چاہتی ہو؟“

اس نے کوئی جواب دیا نہ سر ہلا کر اقرار کیا مگر چہرے کے اتار چڑھاؤ نے چٹکی کرتے ہوئے میرے خیال کی توثیق کر دی۔

میں نے کہا۔ ”نہیں پڑھ لیا کرو۔“

”میں اسے رات کو پڑھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ میں نے اجازت دے دی۔

یہ خیال بڑا کیف آور تھا کہ میرے اشعار بھی اس کی باگی رات کی دیوانی بانہوں میں مچنے والے تھے۔ سوچا، تو آنکھیں یک لخت بند ہو گئیں اور میں نے اتنی زور کی سانس لی کہ سینہ پھٹنے کو آ گیا اور میرا جسم اس کی آواز کی طرح ہولے ہولے لرزنے لگا۔

شاید وہ میرے ساتھ بیٹھ کر لچ نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے جب ملازمہ نے کھانا سرو کیا، اس نے یہ کہہ کر مجھے لا جواب کر دیا۔ ”میں دوپہر میں کھانے کی عادی نہیں ہوں۔“

انجی مہرا لٹا بچوں سمیت لوٹی نہیں تھی، جب مریم نے ڈائری، پرس اور کتاب سنبھالی، کریم کلر کی جینٹوں جیسے موتیوں سے بھری شال اوڑھی اور مجھ سے اجازت چاہی۔ میرا جی چاہا کہ اُسے گیٹ تک الواوے کہنے جاؤں مگر جھجک آڑے آئی۔ وہ رخصت تو ہو گئی مگر یوں کہ اپنا سراپا دروازے میں آویزاں کر گئی۔

میں چوبیس گھنٹے ایک کمرے میں محبوس رہ کر وقت گزارنے کا عادی تھا مگر آدھے دن میں ہی دل میں جس پیدا ہونے لگا تھا۔ بے اختیار کمرے سے نکل کر پھولوں بھرے لان میں آ گیا جس کے درمیان میں ایک سرخ ٹاپ دالی چھتری نصب تھی۔ لان ناہوار مگر گہرے سبز شنیل سے ڈھکا ہوا تھا۔ پتھلے کا اگلا حصہ مختلف رنگوں کی پھولدار بیلوں سے چھپا ہوا تھا۔ یہ تو اتنا فضا کا اثر تھا، ماحول کی تہذیبی کا یا میرے اندر پیدا ہونے والے تغیر کا، کہ کھلی فضا میں بیٹھنے کی وجہ سے میرے سر میں درد نہیں ہوا اور نہ یہاں آنے سے پہلے میں چند منٹوں سے زیادہ کمرے سے باہر رہتا تھا تو سردی سے پھٹنے کو آ جاتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں جب میں ایک ننھے سے پیلے گلاب کی پتھریوں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، اس کی شوخیوں پر مریم ماہ ویش کا وجود استعارہ بنا کر اُتار رہا تھا، مین گیٹ مخصوص آواز کے ساتھ کھلا۔ میرا چھوٹا بیٹا دکھائی دیا جو گیٹ

کو دھکیل رہا تھا۔ گیٹ کھلنے پر مہرو کی سفید شیراز اندر داخل ہوئی۔ پورچ شیڈ تلے کار کھڑی کرنے کے بعد بیٹوں میرے قریب آئے۔ بچوں نے سلام کیا، مہرو بولی۔ ”تمہیں یہاں بیٹھا دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔“

بچوں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ بابا کا یہاں بیٹھنا تو کوئی عجیب بات نہیں ہے، پھر خوشی کا ہے کی؟ میرا جواب نہ پا کر مہرو نے انہیں سامان اٹھا کر اندر جانے کا حکم دیا اور میرے دائیں ہاتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بچوں کے جانے کے بعد میرا ہاتھ تمام کر سہلانے لگی، پوچھنے لگی۔ ”وہ چلی گئی؟“

فطری طور پر مجھے اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ کون چلی گئی؟ مگر میں نے جواب دیا۔ ”ہاں!“

ایسے میں مجھے مریم کی بات یاد آئی۔ اُسے مہرو نے کہا تھا کہ میں ہاں اور نہیں میں جواب دینے کا عادی ہوں۔ مجھے اپنے اختصار پسند غیر مساویانہ رویے پر ایک ڈرا دکھ ہوا۔

وہ بولی۔ ”آج اُس نے کوئی کام کیا؟“

”ہاں!“

”کیا؟“ وہ سر اپا سوال بن گئی۔

”مسودے پر کام کرتی رہی۔“

”اس نے کچھ کہا بھی؟“

”ہاں.....“ میں نے کچھ تامل سے کہا۔ ”ویگن کے کرایے کا رونا روایا۔“

”پھر؟“ اس کا اشتیاق مجھے بے جا لگا۔

”میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔“

”اپنے یا میگزین کے؟“ اس نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ جلدی سے اصلاح کی۔

”میگزین کے۔“

”یہ اضافی رقم سائز خرچ میں ڈالو گے؟“

اس کے لہجے میں کچھ نیا پن تھا جسے میں کوئی عنوان نہ دے پایا۔

”ایڈ جسٹ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”ہاں! کیونکہ میں میگزین کا بجٹ ہرگز نہیں بڑھاؤں گی۔“

”اوکے!“ اس کے بے لاگ سوالات نے مجھے بیزار کر دیا۔ میں نے پیشانی سہلائی، کہا۔ ”چائے کا ایک کپ بھجوا دو۔“

”یہیں؟“

”ہاں! میں ابھی کچھ دیر یہیں بیٹھنا چاہوں گا۔“

وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپنگ بیگ جھلاتی تھل تھل کر رہے وجود کے ساتھ چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ مجھے چائے کا گگ تھما گئی۔

چائے پینے کے دوران میں اُس شام کے بارے میں سوچنے لگا جو یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھا کرتی تھی اور دن کے کسی بھی وقت میرے کمرے میں وارد ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا نام اس کی سالونی رنگت کی ترجمانی کرتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ نہر کے کنارے چلتے ہوئے اُس سے پوچھا تھا۔ ”شام! تمہارا نام تو صبح ہونا چاہیے تھا، پھر نام رکھنے والے نے تمہارے ساتھ یہ زیادتی کیوں کی؟“

وہ تھم گئی۔ میرا بازو تمام کر رہی، بولی۔ ”وسیم! جھوٹ مت بولو۔ میں صبح نہیں، شام ہوں۔ شام کا دھندلا منظر ہوں۔ اپنے نام سے مطمئن ہوں کیونکہ یہ نام میرے نانا جان نے رکھا تھا۔“

وہ کبیر کی گیلی ٹیپ کی طرح ٹپکی ٹپکی تھی۔ اپنی موج میں لہراتی تو دیکھنے والے کے بدن میں عجیب سردی لہر دوڑ جاتی تھی۔ دھوپ میں اُس کا چہرہ تھما کر سرخی مائل ہو جاتا تھا اور تب وہ بہت پیاری لگتی تھی۔ میں نے اُسے ایک مرتبہ کہا تھا۔

”جی چاہتا ہے کہ تمہیں دھوپ میں سورج کے زرخ بٹھا کر سارا دن دیکھتا رہوں۔“

اس نے جھٹ سے جواب دیا تھا۔ ”تاکہ میں مزید کالی ہو جاؤں اور شادی کا رہا سہا چانس بھی مارا جائے۔ خدا کے لیے ایسا ڈراؤنا رومان اپنے پاس رکھا کرو۔“

وہ بہت تیز طرار لڑکی تھی۔ اس سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی جہاں جذبات تنگے پیر دوڑتے رہتے تھے اور بالائی بدن بانہوں میں تھمے رہتے تھے۔ آنکھیں باؤلی اور لب مخمور..... اُس نے اپنی جوانی کی ایک بھرپور رات میرے لیے نکالی تھی۔ اُس رات کی تہائی میں اُس نے بہتیرا چاہا کہ

میری آنکھوں سے گزر کر دل میں اتر جائے مگر نہ جانے کیا ہوا کہ میں اُس سے بیزار ہو گیا۔ بہت بد صورت لگنے لگی حالانکہ اُسے خوبصورت سمجھنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ اور جب

جب برہنہ پا اکیلے دوڑتے دوڑتے ہانپ گئی، بولی۔ ”تم ڈرتی ہو اے ہو..... آئی ہیٹ یو!“

میں نے سر جھکا کر الزام قبول کر لیا تھا۔ کوئی شام چلتی نہیں مگر وہ شام کسی رات کا بیجان اتارے بغیر صبح دم واپس چلی گئی۔ چند دن روٹھی رہی پھر از خود مان گئی۔ ایسی غیر فطری رجحان کا انجام ایسا ہی غیر فطری ہوتا ہے۔ پھر کبھی کبھی نہر کے کنارے چھل قدمی کرتے ہوئے پوچھا کرتی تھی۔ ”تم نے

اُس رات مجھے مسر د کیوں کر دیا تھا؟ کیا میں ایسی ہوں؟“

میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں ہوتا تھا، بس ایک شرارتی سا قہقہہ ہوا میں اُچھال دیا کرتا تھا۔ میں یہ کہہ کر کہ ہاں! تم مجھے خوب صورت نہیں لگتی ہو اُس کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اکثر سوچا کرتا تھا کہ میں اس کی دوستی کی چھاؤں میں کیوں رہتا ہوں جب وہ مجھے خوب صورت ہی نہیں لگتی تھی۔ پھر ایک دن جب وہ یونیورسٹی نہیں آئی اور میں نے تمام دن اُس کی آواز نہیں سنی، تب پتا چلا کہ میں اُس کی آواز کا دیوانہ تھا۔ وہ بولتے ہوئے بہت اچھی لگتی تھی۔ جب جھکتی تھی، تب اچھی نہیں لگتی تھی۔ ٹیپ پر جھکے ہوئے سرو والا گلاب بھی اچھا نہیں لگتا۔

”کیا انسان کی ایک خوبصورتی سے تباہ کرتے ہوئے اس کی دوسری خامیوں پر آنکھ پردہ ڈال سکتی ہے؟“ میں نے اپنا اندر ٹھولا۔

جواب میں گہرا اندھیرا ملا۔

دماغ نے ایک اور سوالیہ نشان میری نظروں کے سامنے ایستادہ کر دیا۔ ”کیا تم مہرو کو آج تک صرف اس لیے قبول نہیں کر پائے کہ اس کا رنگ کالا، نقوش بھدے اور جسم فربہ ہے؟“

☆☆☆

جس دن میگزین کا نام ”بین السطور“ طے پایا، اُس دن ہی مریم نے پہلا شمارہ تیار کر لیا۔ پروف پرنٹ نکال کر میری ٹیبل پر رکھ دیے، بولی۔ ”سر! صفحہ نمبر چار آپ کے ادارے کے لیے خالی ہے جو آپ نے ابھی تک تحریر نہیں کیا۔“

وہ مجھے کئی مرتبہ یاد دلا چکی تھی۔ میں نے فائل ایک جانب رکھ دی۔ لیڈ چنل تمام لی۔ لکھنے لگا۔ ایک کھٹے تنک لکھتا رہا، مٹاتا رہا پھر مطمئن انداز میں کاغذ اُس کی طرف کھسکا کر بولا۔ ”اس کا پرنٹ نکال کر فائل میں شامل کر دو۔“

اس نے کاغذ کلپ بورڈ پر آویزاں کر دیا۔ انگلیاں تھرکتے لگیں۔ پھر زک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میری آنکھوں کے استفسار پر بولی۔ ”کچھ نہیں سراپاں تھک گئی ہوں۔“

عیاں تھا کہ وہ جھوٹ بول کر ٹال رہی تھی۔ میں نے اصرار نہیں کیا۔ اس نے کلپ بورڈ پر نظریں جمائیں اور اپنی مخصوص لرزتی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ”میں پہلے حسن کو دیکھنے والے شخص کے متحیرانہ اظہار کو دنیا کا پہلا شعر قرار دیتا ہوں کیونکہ وہ دل کی بے ساختہ آواز تھی۔“

اس کا جاوداں انداز گویائی میری تحریر کو لازوال حیات عطا کر رہا تھا اور میں دم بخود اُسے دیکھ رہا تھا۔ مہرو کبھی

تھی کہ حسن محض توازن کا نام نہیں..... کہیں کہیں نظام کی گڑبڑ ایسے حسن کی داغ بیل رکھ دیتی ہے جس سے نظریں چراغا ممکن نہیں رہتا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ پڑھتے پڑھتے اچانک زک گئی تھی اور میری نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے زرخ پھیر چکی تھی۔ بولی۔ ”سر! کیا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ نے میری رائے پر اپنی شاعری کا زرخ بدل لیا؟“

ایک پر اسرار چمکا ہوا۔ یوں لگا جیسے میں اچانک خلا میں جا کھڑا ہوا تھا کہ میرا وزن ختم ہو گیا تھا۔ اُس نے اعادہ کیا۔ ”سر! میری وجہ سے ناں؟“

میں نے بہ وقت تمام اپنے آپ پر قابو پایا اور کہا۔ ”تمہاری وجہ سے؟..... نہیں نہیں! ایسا نہیں ہے۔“

”تو پھر کیسا ہے؟“ اس کا لہجہ اُمید سے عاری ہو گیا۔

”میں میگزین کو کامیاب کرنا چاہتا ہوں۔“

”یعنی صرف کاروباری ضرورت کے لیے آپ نے اتنی بڑی قربانی دے دی؟“

”ہاں شاید.....“ مجھے احساس ہو گیا کہ میری آواز سے اعتماد کا عنصر غائب ہو گیا تھا۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کشا کیے، پھر تھم گئی اور اپنے کام میں از سر نو مہمک ہو گئی۔

میں نے ادارے سمیت تمام مواد پڑھا۔ اسی بہانے پروف ریڈنگ ہو گئی۔ اس نے میری سوچ سے کہیں بہتر انداز میں میرے شوق کی بساط سجادی تھی۔ میں نے ’اوکے‘ کر دیا مگر اگلی صبح مہرو نے اُس میں کئی خامیاں نکال کر رکھ دیں۔ میری موجودگی میں ہی اُس نے مریم ماہ ویش کو ہدایات سے نوازا اور مطمئن ہونے کے بعد بولی۔ ”آپ دونوں نے اپنا کام دس دنوں میں ختم کر لیا۔ اگلے بیس دن کیا کریں گے؟“

مریم بولی۔ ”اگلے شمارے کی تیاری کریں گے۔“

وہ لٹی میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں! آئندہ آپ لوگ پہلے کے بجائے دوسرا عشرہ میگزین کی تیاری پر صرف کریں گے۔ پہلے عشرے میں سرکولیشن جبکہ دوسرے میں اشتہارات حاصل کریں گے۔ اس شمارے میں سے بھی کچھ میٹرنگ ٹالنے پڑے گا جہاں اشتہارات لگائے جائیں گے۔“

”اشتہارات؟“ مریم چوکی۔ ”بھلا ہمیں کون اشتہار دے گا؟ ہمارا تو میگزین ہی ادبی ہے اور ادبی رسائل کو اشتہارات نہیں ملتے۔“

مہرو بولی۔ ”تمہاری معلومات درست ہیں مگر ادبی

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کستوری غیر زعفران سے ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دوبالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت (جسٹ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

ڈائری کی چری جلد کو ہولے ہولے کھرچتی رہی پھر میری طرف بڑھا کر بولی۔ ”دیکھ لیجئے۔“
میں نے خشک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ مجھے ڈائری دکھانے کی خواہش اس کے دل میں جاگ اٹھی تھی۔ پہلا انکار محض میرے تجسس کو ہوا دینے کے لیے تھا۔ میں نے کچھ تامل سے کام لیا تو اس نے پلیز سرز کہہ کر ڈائری میری گود میں رکھ کر کھول دی۔ اپنا ہاتھ پھیلا کر دونوں صفحوں پر رکھا، پھر ایک ادا سے اٹھایا اور فرحت انگیز احساس میرے دل میں جا گزیر کر دیا۔
میری نظر اس کے ننھے ننھے لفظوں میں الجھنے لگی۔ ابتدائی چند صفحات کو سرسری دیکھنے کے بعد میں ایک صفحے پر ٹھہر گیا۔ اس نے ”عید“ کے عنوان سے ایک نثری نظم لکھ رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کس نے لکھی ہے؟“
”یہ..... میں نے لکھی تھی سہرا“
”میرا پوچھنے کا مطلب ہے کہ اس نظم کا خالق کون ہے؟“
”میں نے لکھی ہے۔ اسی عید پر۔“
اُسے میری حیرانی نے مفلوظ کیا، بولی۔ ”میں نے اس نوٹ بک میں بہت کچھ لکھ رکھا ہے جسے پڑھنے والے اچھی شاعری قرار دیتے ہیں مگر وہ کیا ہے کہ میرا دل نہیں مانتا۔“
اس کے جملے نے میرا تجسس بھیز کر دیا۔ میں نے صفحہ پلٹا۔ آٹھ سانسے دو غزلیں رقم تھیں۔ دونوں غزلیں یہ غور پڑھ لینے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اُسی کے اعجازِ قلم کی شہنائیاں تھیں۔ باوجود کہ کلام بے وزن تھا اور عروضی نفاستوں سے پوری طرح آراستہ نہیں تھا، پر خوب تھا۔ وہ ردیف اور قافیے کے قواعد سے آگاہ تھی مگر عروضی دسترس سے محروم تھی۔ میری آنکھوں میں رہی ہوئی بے یقینی نے اُس سے تصدیق چاہی تو وہ بے ساختہ بولی۔ ”جی سہرا اس میں لکھا ہوا لفظ لفظ میرا اپنا ہے۔“
مجھے احساس تھا کہ وہ اس دوران میرے چہرے کے تاثرات کا بہ نظر احتیاط جائزہ لینے میں مصروف تھی اور اپنی تحریروں کی حیثیت اور قدر جان رہی تھی۔
میں نے کہا۔ ”تم نے اتنا کچھ کہاں سے سیکھا؟“
وہ بولی۔ ”میرا باپ کوہستانی تھا مگر ماں شین تھی۔ گلگت سے سوکھو میٹر کی دوری پر واقع ضلع دیامیر کے گاؤں نیات سے بیاہ کر بالا کوٹ آئی تھی۔ وہ شینا زبان بولتی تھی۔ میرے نانا عبدالغفار شاہ شینا اور قاری زبانوں کے معروف شاعر تھے۔ ان کی دو کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں جن کی ایک ایک کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔ ہم لوگ چھٹیوں میں نیات جایا کرتے

ٹائن سیکٹر۔“

میں نے شادی سے پہلے اسلام آباد دیکھا تھا۔ اچھا تھا تھا مگر یہ سولہ سترہ سال پرانی بات تھی۔ زمانے نے اس دوران طویل مسافت طے کر لی تھی۔ مجھے نہ تو رستوں کا علم تھا، نہ شہر کا اور نہ کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا پتا تھا۔ مریم پچھلی نشست پر میرے بائیں پہلو میں بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ ہمارے درمیانی فاصلے کو اُس کی کریم کلر کی چادر نے پر کر رکھا تھا۔ میں بلاوجہ اس کی چادر پر چپکتے ہوئے ننھے ننھے موتیوں کو دیکھنے لگا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ چادر کے نیچے اُس نے اپنا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر چادر ہٹائی، دیکھا۔ فائل پر اس کا ہینڈ بیگ، ڈائری اور چند پیپرز پڑے تھے۔ میں نے فائل اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لی۔ اس نے چونک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر جواب نہ پا کر شیشے کے پار دیکھنے لگی۔
جب میں نے اس کا پرس کھولا، مجھے پوری طرح احساس تھا کہ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے۔ اس دوران اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ اچھے اچھے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرے دیکھنے پر پھر رخ پھر گئی اور اونچے نیچے سبز ٹیلیوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے پرس میں چند نوٹ اور اس کے ذاتی استعمال کی اشیائیں۔ میں نے اُسے بند کیا اور اس کی چادر کے پھیلے ہوئے دامن پر رکھ دیا۔ پیپرز اوپر نیچے کر کے دیکھے۔ اس نے میگزین کے پیچ سائز میں نمونے کے چند اشتہارات ڈیزائن کیے تھے تاکہ اشتہاری ایجنسی کو دکھا کر بات چیت کر سکے۔
میں نے دوسری غیر اخلاقی حرکت کرتے ہوئے اُس کی ڈائری کھول لی۔ ایسے ہی وقت اُس کی برداشت جواب دے گئی اور اس نے احتجاجی انداز میں اپنا ہاتھ ڈائری پر رکھ دیا۔ ملتجیانہ انداز میں بولی۔ ”پلیز سہرا“
اس نے انہی دو لفظوں میں اپنی استدعا اور مزاحمت سمو دی تھی۔ میں نے ڈائری بند کر دی۔ اسے شکوہ کتنا نظروں سے دیکھا۔ وہ ڈائری اپنی گود میں رکھتے ہوئے بولی۔
”آپ نے برا تو نہیں مانا سہرا؟“
میں نے انکار میں سر ہلایا، کہا۔ ”میں سمجھا تھا کہ ڈائری میں تم نے میگزین کے متعلقہ نوٹس لکھ رکھے ہوں گے۔“
وہ بہت حساس واقع ہوئی تھی۔ ان الفاظ کو بھی پڑھ لیتی تھی جسے میری زبان کے بجائے آنکھوں نے ادا کیا ہوتا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں ہویدا ہونے والے موہوم سے شکوے کو بھی پڑھ لیا۔ کچھ دیر سوچتی رہی۔ انگلیوں سے

رسائل کو اشتہار نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں کوئی اپنی مصنوعات کی تشہیر دیتا نہیں، بلکہ وہ اشتہارات دینے والے اداروں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ صرف ادیب ہوتے ہیں، بزنس مین نہیں۔“
”کیا ہمیں مل جائیں گے؟“ مریم کی آنکھوں میں بے چینی رہی ہوئی تھی۔
”وائے ناٹ!“ مہرود نے کہا۔ ”ٹک کے تجارتی مراکز تین بڑے شہر ہیں جن میں کئی تشہیری ایجنسیاں کام کرتی ہیں۔ ہمیں ان سے رابطہ کرنا ہوگا۔ انہی سے اشتہار ملیں گے۔ میں نے اس پر ہوم ورک کر لیا ہے۔ آؤ، تمہیں سمجھاتی ہوں کیونکہ یہ کام بھی تمہیں ہی کرنا ہے۔“
مہرود نے میری دراز سے ایک سبز رنگ کی فائل نکالی جس پر ”شعبہ اشتہارات“ لکھا ہوا تھا اور مریم کو لے کر ریٹائرنگ روم میں چلی گئی۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں نے اس فائل کو دیکھنے کے باوجود اب تک کھول کر پڑھنے کی زحمت نہیں کی تھی ورنہ اس پر کچھ نہ کچھ کام سرانجام دے چکا ہوتا۔
انہوں نے مجھے سمجھانے میں کافی وقت لیا۔ جب مہرود اُسے پہلو میں چپکائے باہر آئی، میں آنکھیں بند کیے کرسی میں جمبول رہا تھا۔ مہرود بولی۔ ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آج ہی پنڈی کی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو ٹیچ کیا جائے۔ کیا آپ مریم کے ساتھ جائیں گے؟“
مہرود کے بے تاثر مگر مودبانہ لہجے نے مجھے الجھا دیا۔ خالی نظروں سے اُسے دیکھا رہا، پھر بولا۔ ”کیا تم بھی جاؤ گی؟“
”جی نہیں..... یہ آپ کا دفتری کام ہے۔“
میں نے کن انکھیوں سے مریم کی طرف دیکھا، کہا۔ ”ہاں!“
مہرود نے ایک نظر مریم کو دیکھا، پھر مجھے۔ تب پھر مجھے اُس کی آنکھوں کا غیر معمولی خلا دکھائی دیا۔ ایک دم جمر جمری سی آگئی۔ میں نے آج تک اتنی خالی آنکھیں کسی بھی چہرے پر نہیں دیکھی تھیں۔ وہ بائے کہہ کر دفتر سے نکل گئی۔ میں اور مریم رہ گئے۔
اس نے پوچھا۔ ”کیا ابھی چلنا ہے سہرا؟“
میں نے ایک طویل سانس پھینچوڑوں میں اتاری اور اثبات میں سر ہلادیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اسلام آباد جانے کے لیے مہرالنسا کی سفید شیراڈ میں بیٹھ چکے تھے۔ عبدالکریم بیک وقت ڈرائیور اور گھریلو ملازم کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ مین روڈ پر آتے ہی اُس نے پوچھا۔ ”کس طرف چلنا ہے صاحب؟“
میرے بجائے مریم نے بتایا۔ ”اسلام آباد..... جی

تھے جہاں میں اور میری بڑی بہن ناناجی کو اپنی شاعری سنایا کرتی تھیں اور وہ ہماری اصلاح کر دیا کرتے تھے۔

میری حیرت فزوں تر ہو گئی، کہا۔ ”تمہاری بہن بھی لکھتی تھی؟“

”جی سرا“ وہ ایک سرو آہ بھر کر بولی ”وہ نہ صرف بہت خوب صورت لکھتی تھی بلکہ بہت زیادہ خوب صورت بھی تھی مگر موت اندھی ہوتی ہے۔ ہے ناں سرا؟“

میں اُسے کوئی جواب نہ دے پایا۔ ایک قلم پڑھنے کے بعد میں نے کہا۔ ”تمہارے نانا اگر فارسی کے شاعر تھے تو تمہارا کلام موزوں ہونا چاہیے تھا۔“

”میں اور پانچ اپنی اپنی علمی استعداد کے مطابق نانا جی سے سیکھا کرتی تھیں۔ پانچ کی غزلوں میں بہت زیادہ روانی اور سلاست ہوا کرتی تھی۔“

”تمہاری بہن کا نام کیا تھا؟“

”راحت دل آویزا“ اس کی آواز کی لرزش بتدریج بڑھ رہی تھی۔ زلزلے کی نذر ہونے والے خاندان کا تذکرہ اس کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا اس لیے میں نے فوراً موضوع بدل دیا، پوچھا۔

”کیا تمہیں بھی محبت ہوئی؟“

”جی؟“ وہ بری طرح چوکی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے جواب دیے بغیر سر جھکا لیا۔ اعتراف کر لیا۔

میں نے کہا۔ ”کیا تمہیں اس محبت پر فخر نہیں کہ تمہارا سر نہ صرف جھک گیا بلکہ چہرہ بھی بجھ گیا؟“

اس نے اپنا سر ایک جھکے سے اٹھایا۔ مجھے دیکھا۔ آنکھوں میں شکایت اور ہلکی سی برہمی مترشح تھی، بولی۔

”نہیں..... وہ یقیناً اس قابل نہیں تھا کہ اُسے یاد کرتے ہوئے میرا دل شادمان ہو جائے۔“

”اوہ!“ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا اور دل میں عجیب نوع کا جس بھر گیا۔ میں نے ایک ذرا سنبھل کر پوچھا۔

”کیا وہ بالاکوٹ میں رہتا تھا؟“

”نہیں..... ادھر بالو سر میں رہتا تھا۔ دیار اور کائل کے دیس میں۔ وہاں کے درخت سدا بہار ہیں مگر لوگوں کی محبت پائیدار نہیں۔“ مجھے اس کا بھجا ہوا لہجہ ناناؤں سا لگا۔

”وہ تمہیں کیوں چھوڑ گیا؟“

”وہ نہیں..... میں اُسے چھوڑ آئی تھی۔“ اس نے فوراً میری اصلاح کی۔

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ اس قابل نہیں تھا۔“

”پہلے اُسے قبولیت کی سند کیونکر عطا ہوئی تھی؟“ مجھے

احساس ہوا کہ میرے لہجے میں اس حد کی سزا اندھیل ہو گئی تھی جو اچانک میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔

”وہ باہر سے بہت اجلا تھا اس لیے میری نظریں دھوکا کھا گئیں۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا اور چہرے پر تاسف کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ ناخنوں سے کھینچتے ہوئے بولی۔ ”سر پیز اوہ اس قابل نہیں تھا کہ ہم اس پر مزید گفتگو کریں۔“

شاید اُس نے درست کہا تھا۔ میں نے بھی انداز میں سر ہلایا اور ڈائری دیکھنے لگا۔ اس دوران عبدالکریم نے ایک فیول پمپ پر کارروک دی اور نیچے اتر گیا۔

ایک منٹ پر پھر بے اختیار اُڑ کنا پڑا۔ ”موسم کے عنوان تلے موجود ایک ادھوری نثر نے میری آنکھیں پکڑ لیں۔

میں لفظوں کے زینے پر اوپر اُٹھتا گیا، اچانک ڈک گیا۔ سیزھیاں ایک خلا میں جا کر ختم ہو گئی تھیں۔ میرے خیال میں اُس نے میگزین کے لیے انٹائیپ لکھنے کی کوشش کی تھی اور بجا طور پر موتیوں کی خوب صورت مالا پرو ڈالی تھی۔

میرے استفسار پر اُس نے میرے اندازے کی تائید کی اور کہا۔ ”دراصل میں نے سوچا تھا کہ آپ کو کئی مرتبہ یاد دلانے کے بعد مجھے ہی انٹائیپ لکھنا پڑے گا اس لیے میں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس دوران آپ نے لکھ دیا۔ یوں یہ ادھورا رہ گیا۔“

میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے خوش دلی سے کہا۔

”تم اسے کسی وقت مکمل کر دینا۔ اگلے شمارے کے لیے۔“

وہ بچوں کی طرح چبکی۔ ”بچ؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پھر بولی۔ ”آن میرٹ؟“

”ہاں! بلاشبہ یہ اچھا آغاز ہے۔“ میں نے کہا۔

اس دوران کار میں ڈیزل ڈال دیا گیا اور عبدالکریم نے بل کی ادائیگی کے بعد ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں نے ڈائری بند کر کے آنکھیں موند لیں مگر اس کی تحریر بند آنکھوں کے اندرونی پردے پر جھلک گئی۔ اس نے کمال سادگی سے دنیا کے سب سے طاقت ور جذبے پر قلم اُٹھایا تھا۔

مجھے خود پر اختیار رہا، نہ دل کو ڈرائیونگ کی موجودگی کی جھجک، میں نے مریم کا ہاتھ تھاما اور دفور شوق سے چوم لیا۔ وہ میری اس غیر اضطرابی حرکت کو جب تک سمجھتی، تب تک حیرت کمان کو چھوڑ چکا تھا۔ شکوہ آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”یہ تمہارے حسن کا نہیں، ہنر کا اعتراف تھا۔ تمہارے اندر چھپی ہوئی بہادر شاعرہ دنیا سے اپنا آپ منوانا چاہتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد کامیاب ہو جائے گی۔“

اس نے حذبذب انداز میں میرا ہنکر یہ ادا کیا اور

روٹھے طوڑ سے پہلو بدل کر مجھ سے بہت دور ہو گئی۔ پہلے بوسے نے میرے ہونٹوں پر سنسنی مثبت کر دی تھی۔ اس کی مزاحمت کی بدولت میرے دل میں ایک ذرا اثر مساری بھی گھر گئی تھی۔

ڈرائیور اور مریم نے تھوڑی دیر کے بعد ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا دفتر تلاش کر لیا۔ مریم پر اعتماد بھی جبکہ مجھے بے عنوان سی جھجک آڑے آرہی تھی۔ بیسٹ کی سیزھیاں اُتر کر مطلوبہ دفتر پہنچے۔ میں شاید ایجنٹ کے سامنے اپنا مدعا بھی پیش نہ کر پاتا مگر مریم نے اعتماد سے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ ایجنٹ کو میگزین کی اشاعت، سرکولیشن اور اس میں اشتہار دیے جانے کی ممکنہ افادیت پر گفتگو کی۔ وہ کسی مجھے ہوئے سیزھیاں کی طرح برہنگ دے رہی تھی اور میں حیرت بھری آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا جو لمحہ مکمل کر برسوں کی مسافت طے کرتی جاتی تھی۔ اس کی شخصیت کا ظاہری تاثر تھا، گفتگو کا کمال یا ایجنٹ کی ضرورت، اُس نے شیپو بنانے والی ایک محروف کمپنی کا اشتہار دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈیٹنگ کے بعد دونوں نے پیپر سائن کیے اور میٹنگ برخاست کر دی۔ اس تمام وقت میں، میں نے دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لیا تھا۔

پہلی کامیابی کا غماز لیے ہم دفتر سے نکلے۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر رڑکے، وہ بولی۔ ”سرا! کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے، کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے میں نے یہ انگریسٹ کیا ہے۔ بیگ صاحبہ کا یہی حکم تھا۔ ایجنٹ نے بہت کم نرخ دیا ہے مگر ہمارے لیے یہ خوش آئند بات ہے کہ اس نے کامیاب ٹیسٹ کے دو تین اشتہار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس وعدے کی تکمیل تب ہوگی جب اُسے ہمارا میگزین پسند آئے گا۔“

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس کے بعد ہم نے دو گھنٹے کے دورانیے میں تین ایجنٹوں سے ملاقاتیں کیں۔ ایک نے مشروط اعانت کا وعدہ کیا، ایک نے اندرونی صفحات کے لیے تین اشتہارات دیے جبکہ آخری نے پیشہ دارانہ انداز میں نئے چھپنے والے میگزین پر اعتماد نہ کرتے ہوئے ہمیں ٹر خا دیا۔ اس ملاقات کے مابین کن اختتام پر میں نے ایک دم واپسی کا اعلان کر دیا، وہ مسکرائی۔ ”سرا! آپ کا رویہ کاروباری نہیں ہے۔“

میں نے بیزار سی کہا۔ ”اگر تم چاہو تو مجھے کسی ہوٹل پر اتار کر اپنا کام جاری رکھ سکتی ہو۔ واپسی پر مجھے پک کر لینا۔“

وہ میری اکٹا ہٹ سے لطف اندوز ہوئی، بولی۔ ”آپ بزنس میں ہیں جبکہ میں تنخواہ دار ملازمہ ہوں۔ ست مدی کو چست گواہ کے ساتھ چلنا ہوگا۔“

میں نے اُسے مدد طلب نظروں سے دیکھا مگر اس کی ستم ظریفانہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ میں نے جیترا بدلا اور کچھ دیر ہوٹل میں گزارنے پر مصر ہو گیا تاکہ تازہ دم ہو کر آگے بڑھا جائے۔ اس نے میری بات مان لی اور ہم نے ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ جدید طرز پر تعمیر کیا گیا ہوٹل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ کھانے کی طلب نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے چائے اور سینڈویچز کا آرڈر دیا اور پرسکون گوشے میں کرسیوں پر آسٹے سائے بیٹھ گئے۔ اس نے سینڈویچ کھا لیا۔ میں ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا۔ اُسے دیکھتا رہا۔ اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔ ایسے میں مجھ پر نگاہ پڑی، بولی۔ ”سرا! لبیں ناں!“

میں چونکا۔ اُسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ وہ جھینپ سی گئی، بولی۔ ”سورج اپنے مقام پر رہے تو اچھا لگتا ہے۔ نیچے اترنے لگے تو جلانے لگتا ہے۔ جلانے والی چیز ہر کسی کو بری لگتی ہے۔“

میری سماعت میں خشکی اُتر گئی۔ اپنی سطح سے اترنے کا قلق بے چین کرنے لگا تو میں نے بے اختیار سر جھکا لیا اور بے رغبتی سے سینڈویچ کھانے لگا۔ سوچتے لگا کہ میں نہ صرف ایک بیوی کا شوہر ہوں بلکہ دو نو عمر بیٹوں کا باپ بھی ہوں۔ وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھی کہ مجھے اپنی سچ سے گرتا نہیں چاہیے ورنہ میرا وجود اس سمیت کئی دوسرے لوگوں کے لیے ضرر رساں بن جائے گا اور ایسے لوگوں کو معاشرہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

یکبارگی میرا جی چاہا کہ میں اسے کہہ دوں کہ میں سورج نہیں ہوں۔ پیاس کا دریا ہوں۔ جی چاہا کہ اُسے سچ کر کہہ دوں کہ تم اپنی آنکھوں کی سے کا قطرہ قطرہ میرے حلق میں ٹپکا کر مجھے امر کر دو۔ نئی زندگی دے دو۔

ہماری میز ہال کے نسبتاً پرسکون گوشے میں تھی۔ ساتھ والی میز پر چمپلیں کرتا ہوا یورپین جوڑا بھی اُٹھ گیا۔ اپنے درمیان حامل طویل خاموشی سے گھبراہٹ ہونے لگی تو میں نے اُسے دیکھے بغیر پوچھا۔ ”مریم! تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے؟“

وہ یہ ظاہر بے پروائی سے بولی۔ ”میرا حال اور مستقبل ایک سا ہے۔“

”یعنی ملازمت؟“

”جی سرا!“ اس نے کہا۔ ”میں سرکاری نوکری کے

حصول کے لیے ہاتھ پیر مارتی رہتی ہوں۔ کمپیوٹر کا ایک سالہ ڈیپلوما بھی کر رکھا ہے۔ امید ہے کہ کئی نہ کئی چانس لگ جائے گا۔“

”اور شادی؟“ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ میری توقع کے برعکس اس کی آنکھوں میں برہمی یا خلی مترشح نہ ہوئی بلکہ ناموس سا ٹھہراؤ حائل ہو گیا، بولی۔ ”میں شادی نہیں کروں گی۔“

میں چونکا۔ ”کیوں؟“

اس نے ٹشو پیپر ہونٹوں پر رکڑ کر پلیٹ میں رکھا اور کندھے اچکا کر بولی۔ ”کیونکہ میں ماں نہیں بن سکتی۔“

”پھر؟“ میں نے ہونٹوں کی طرح اُسے دیکھا۔

وہ بولی۔ ”پھر کیا؟..... جب میں ماں نہیں بن سکتی تو مجھے کسی کی بیوی بننے کی کیا ضرورت ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں بے شرم بیوی تو کرائی تو بن سکتی ہے مگر کی مالک نہیں۔ شوہر کو باپ نہیں بنانا پڑاؤں کی تو وہ مجھے نظر انداز کر کے دوسری عورت سے چپک جائے گا۔ تب مجھے دکھ ہوگا اور میں اُس دکھ کو جھیلنا نہیں چاہتی۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

اس نے عام سے انداز میں بہت بڑی بات کہہ کر مجھے لب بستہ کر دیا۔ دم بخود بیٹھا اُسے کئی لمحوں تک دیکھتا رہا، الفاظ منتخب کرتا رہا، پھر پوچھا۔ ”کیا تم میڈیکل ان فٹ ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی اختیار کر لی۔

ناگاہ وہ مجھے جھوٹی دکھائی دی۔ اتنی مکمل تخلیق کے ساتھ فن کار ایسی نا انصافی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ”تمہیں شدید قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے یا تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو۔“

اس کا لہجہ تھوڑا سا گستاخ ہوا۔ ”کیا مطلب؟ میں یہ جھوٹ کیوں بولنا چاہوں گی؟“

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ تم یہ جھوٹ بول کر مجھ سے گلو خلاصی کرنا چاہتی ہو مگر اپنی تھکی نہ کر پایا۔

اس نے ہنکارا بھرا، طنزیہ مسکراہٹ سے لیوں کے گوشے ایک گال میں بچھنے اور میز پر دونوں ہاتھیں پھیلا کر بولی۔ ”بالکل نہیں سرا غلط فہمی یا جھوٹ..... نہیں۔ میں نے سچ کہا ہے۔ میں اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اُس دن پرسنل کی خواہش پر گھر سے جلد نکل کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ہفتہ کا دن تھا جس کی صبح زلزلے نے خون سے سرخ کر دی تھی۔ میں پرسنل کے آفس میں داخل ہونا ہی چاہتی تھی کہ عمارت لرزنے لگی۔ ڈر کر قہم گئی۔ ایسے ہی وقت میں دفتر کا بڑھا ہوا چچا گر گیا اور اس کا لکھا ہوا سر یا میرے پیٹ میں کھب گیا۔“

آہ میں اُس تکلیف کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی جس نے اُس وقت مجھے ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔“

اس نے اپنا سر ہاتھوں میں بچھ لیا۔ چند لمبی لمبی سانس لینے کے بعد گویا ہوئی۔ ”سرا میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ جب ہوش آیا تب پتا چلا کہ میرا کوئی ساتھیان نہیں رہا تھا، گھر اور گھر والے بھی، سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اور فوجی کیمپ اسپتال میں میرا علاج ہو رہا تھا۔ میرے زخم سلتے سلتے باوجود خراب ہو گئے تو مجھے پنڈی کے فوجی اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے کیمپ اسپتال سے لانے والی کشتی کا نام مسز فردوس تھا۔ وہ ایک سوئٹل ورکر تھیں۔ این جی او چلائی تھیں اور انسانی خدمت کا جذبہ لے کر بالاکوٹ پہنچی تھیں۔“

انہوں نے میرا بہت علاج کروایا مگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں مجھے لاہور کے میو اسپتال میں ریفر کر دیا گیا۔ مسز فردوس ہی مجھے لاہور لے گئیں۔ وہاں میرا آپریشن کیا گیا۔ اس آپریشن نے مجھے نئی زندگی تو دے دی مگر مجھ سے ماسٹا جینین لی۔ سر یہ کا زخم مجھے کنگال کر گیا۔“

وہ اپنے اس دکھ سے بہت پہلے کہیں مفاہمت کر چکی تھی مگر نہ بیان کرتے ہوئے زندہ جانی اور یوں نہایت ظالمانہ سنجیدگی سے خود پر بیٹنے والی قیامت کا احوال نہ بتاتی۔ میرا سر جھک گیا۔ ڈھارس کا دامن خالی ہو گیا۔ لفظ روٹھ گئے۔

آہ بھر کر اُسے ہمدردی آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ جھمی انداز میں انگلی تان کر بولی۔ ”نہیں سرا مجھے ہمدردی کے جذبے سے شدید نفرت ہے۔“

میں میز پر دونوں ہتھیلیاں ٹکا کر اٹھا اور اُس کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ ”چلیں! دیر ہو رہی ہے۔ مہر و ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔“

ہم ہونٹ سے نکل کر گاڑی میں آ بیٹھے۔ کام کو پھر کسی دن پر ملتوی کر دیا اور ڈرائیور کو گھر چلنے کا حکم دیا۔ میں تمام راستے خواہش کے باوجود اُسے دیکھ سکا، نہ مخاطب کر پایا۔

اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ پنڈی سے نکلتے ہی اس نے ڈرائیور کو ایک لنک روڈ پکڑنے کا حکم دیا۔ یہ سنگل سڑک ایک اونچے ٹیلے کا گول چکر کاٹ کر اتراتی تھی اور قلعہ سفید رنگ کی بڑی سی دو منزلہ عمارت کے پارکنگ ایریا میں داخل ہو گئی۔ مریم نے بتایا۔ ”سرا یہ میرا ہاسٹل ہے۔ میں سیکینڈ فلور پر واقع کرانیمیر بائیس میں رہتی ہوں۔“

میں نے جھمی انداز میں سر ہلایا۔ وہ گاڑی سے اتری اور ہاتھ لہرا کر بجری کی روش پر چلنے کے بجائے لان میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیور نے شیرا ڈ موڑی۔ ابھی ہم پارکنگ

ایر یا میں ہی تھے کہ ایک چھ سات سال کی خوبصورت بچی، جس نے گلابی اور سفید جالی دار فریک پہن رکھی تھی دور سے چلائی۔ ”ماما! اتنی دیر لگا دی آپ نے؟“

وہ ایک کیاری میں اپنی ہم جولیوں کے ساتھ ری پھانہ رہی تھی۔ مریم کو دیکھتے ہی اُس نے چھلانگ لگائی اور پودے پھلانگی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ مریم کی ہانہوں میں لاڈ سے جھول رہی تھی۔

میری سانس سینے کی پھانس بن گئی اور میں سرکتی ہوئی گاڑی کے شیشے سے بچتی بچتی آنکھوں سے مریم کی پشت کو گھورنے لگا۔ وہ بچی خاموش ہو گئی تھی مگر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سڑک کے دونوں اطراف ایسا تادہ بلند قامت درخت چلانے لگے ہوں۔ ”ماما! اتنی دیر لگا دی آپ نے؟“

ٹیلے کا موڑ مڑتے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں نے طویل سانس لے کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ مجھے اپنی ہتھیلیوں کے گیلے ہونے کا احساس فوری طور پر ہو گیا تھا۔

☆☆☆

مہر انسا کافی بہتر ڈرائیونگ کر لیتی تھی۔ اس لیے اُسے اپنے ساتھ عبدالکریم کو لے کر جانے کی احتیاج نہیں تھی۔

میرے انکار پر وہ مریم کو ساتھ پنڈی لے گئی۔ اس نے میگزین چھپنے کے لیے پریس پر دینا تھا۔ ڈاک خانے جا کر میگزین کی بذریعہ ڈاک ترسیل کا نظام استوار کرنا تھا۔ پورے ایل نمبر لینا تھا۔ اور بھی کئی چھوٹے موٹے کام اُس کی ڈائری میں درج تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں لان میں سرخ ٹاپ والی چھتری کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔

شب بھر سو نہ پانے کی وجہ سے میں خاصا نڈھال تھا۔

رہ رہ کر مریم کا رویہ اور اس کی مزاحمتی باتیں مضطرب کر رہی تھیں۔ حسن کی ایک کرن ذات کے سبھی اندھیروں کو اجال نہیں کر سکتی تھی۔ بے حد حسین ہونے کے باوجود اپنی ذات میں پھیلے ہوئے بانجھ پن کے اندھیروں کو ختم نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہ اندھیرا تھا جس کی نشاندہی اس نے بہ زبان خود کی تھی۔ دوسرے اندھیرے کی طرف اُس تھکی سی بچی نے اشارہ کیا تھا جو اُسے ”ماما“ کہہ کر اُس کی طرف دوڑی تھی۔

اس نے باپوسر کے کسی جوان کو دل سے چاہا تھا۔ والہانہ محبت کی تھی۔ مگر اُسے کسی وجہ سے چھوڑ آئی تھی۔ اُس نے چھوڑا تھا، یا اُسے چھوڑا گیا تھا، یہ بحث الگ مگر یہ طے تھا کہ وہ اُن چھوٹی نہیں تھی۔ محبت اپنی جگہ پر اس کی انگلی سے اپنی نشانی باندھ کر رخصت ہوئی تھی۔

سبے روزن کنہد

ہوا خوشگوار تھی مگر بدن میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ میں نے عبدالکریم کو بلایا۔ وہ لان کے پودوں کی گوڑی میں مصروف تھا۔ ہاتھ جھاڑتے ہوئے میرے قریب آ کر مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُسے چائے بنالانے کا حکم دیا اور کندھوں سے ڈھلکتی ہوئی مثال درست کر کے تن آسان بیٹھ رہا۔ ایسے میں آنکھوں کے سامنے ایک سرخ رنگ کا بڑا سا سوالیہ نشان ابھر آیا۔ کیا مریم کے جواں سال تپتے ہوئے بدن پر شجر قناعت سایہ فگن ہو سکے گا؟

غیر ممکن نہیں تھا مگر ممکن بھی کس طرح تھا۔ اپنی جبلت سے نکرانا اور پھر جیت بھی جانا بڑا جان جو کھوں کا کام تھا۔ میں بے ساختہ بڑبڑایا۔ ”نہیں..... وہ اتنی مضبوط نہیں کہ اپنے آپ کو شکست سے دوچار کرتے ہوئے آسودہ اور مطمئن رہے۔ میں مضبوط مرد ہوتے ہوئے بھی اپنی خواہشوں اور خواہوں کے مقابل میں ٹھہر نہیں پا رہا تھا۔ پندرہ سالہ خود ساختہ قید چھائی کے بعد بھی مفاہمت نہیں کر پا رہا تھا حالانکہ اتنے لمبے عرصے میں تنہائی اور مفاہمت کی عادات پختہ ہو جاتی ہیں۔ نہیں..... وہ عورت ہے۔ عورت کمزور ہوتی ہے۔ جذبات کی منہ زور طغیانی میں ہار جاتی ہے۔ وہ بھی اپنی جوانی سے ہار جائے گی۔“

اپنے ہی سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے میری سانس تیز ہو گئی۔ یوں لگا جیسے میں کسی بیاباں جنگل میں پانی کی تلاش پر برہنہ پا دوڑ رہا ہوں۔

اجانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک خیال برقی کوندے کی طرح ذہن میں لپکا اور بدن کی تمام تر توانائیوں کو اُن واحد میں خاکستر کر گیا۔ کیا ایسا تو نہیں تھا کہ مریم کو وہ تمام خام لذتیں میسر تھیں جو شادی کی طویل اور بے شمر ریاضت کا حاصل ہوتی تھیں؟

میرے ساموں نے پینا اگلنا شروع کر دیا۔ مریم کا روشن چہرہ چشم تصور میں آن سجا۔ آپوں آپ سرانکار میں ہلنے لگا۔ اس کی رنگت دودھ کی طرح ہر آلائش سے پاک تھی اور چہرہ تقدیس کی قدرتی آماجگاہ۔ ایسے باریک پردے کے پیچھے کوئی سیاہ دھبہ چھپا نہیں رہ سکتا۔ کوئی گنہگار اتنا بے ساختہ اور معصوم بیان نہیں ہو سکتا۔ ایک نئے سوال نے سر اٹھایا۔ ”کیا وہ واقعی معصوم تھی؟“

اگر ایسا تھا تو پھر اس کی گفتگو اتنی چابکدست کیوں تھی؟ وہ ایک تو خیز بیٹی کی ماں ہوتے ہوئے بھی ماں کیوں دکھائی نہیں دیتی تھی؟ وہ کس طرح کسی بھی تکلیف دہ تجربے کے

بغیر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتی تھی؟

میں نے اپنے طور پر کئی مرتبہ مریم کے خیال دل فکار کو جھٹکنے کی کوشش کی مگر نام کام رہا۔ مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ وہ میری ضرورت میں چکی تھی اور میں اُسے اپنی سوچوں سے الگ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے چائے ختم کی اور ننگے پیروں گیت سے نکل آیا۔ میرا رخ پہاڑی نشیب کی طرف تھا۔ میں چادر جھلاتا ہوا چہل قدمی کے انداز میں چلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد کھنی جھاڑیوں کی باڑ کو عبور کر کے اس چٹان پر پہنچ گیا جو مجھے کی صورت میں باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ میں اس شاخ کے نیچے سے جبک کر گزرا اور چٹان کے آخری سرے پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے علاقے کے روایتی انداز میں شال کو کمر اور پنڈلیوں کے گرد لپیٹا اور آگے پیچھے جھولنے لگا۔ فحشی ڈبیلوں کی طرح بکھرے ہوئے رنگ بہ رنگ چھتوں والے گھروں کا نظارہ مجھے بھلا لگتا تھا۔ دل پھر کچھ کے لگنے لگا۔ ”کیا مجھے واقعی محبت ہو گئی ہے؟“ پڑھا سنا تھا کہ محبت جنسی تسکین کا ملوث عنوان ہے۔ تو پھر مجھے مہر و سے محبت کیوں نہیں تھی؟ مریم ہی کیوں میرے دل میں برا بھان ہوئی تھی؟

پڑھا سنا تھا کہ محبت کا جذبہ فراغت میں پلتا ہے۔ تو پھر ایسا کیا تھا کہ مجھے پندرہ سالہ طویل فراغت میں اس جذبے سے روشناسی نہ ہوئی اور ہوئی تو تب جب مجھے اپنی سن پسند معروفت میرا آئی تھی۔

میں نے محبت کے موضوع پر بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ اپنے خیالات پر وہ سارے قاعدے نافذ کیے مگر سنبھالا نہ ملا۔ کوئی اطمینان بخش دلیل ہاتھ نہ لگی۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی مگر اندازہ تھا کہ چار بجے کا عمل تھا جب میرے تھکے ہوئے ذہن پر سکون آور غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ یہی وقت تھا جب میرے عقب میں قدموں کی چاپ ابھری۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ ایک دم ساری تن آسانی کا فور ہو گئی۔ مریم ہاتھروں پر سنبھل کر چلتی ہوئی میری طرف آرہی تھی۔ میں بے اختیار کھڑا ہو گیا اور میری شال میرے پیروں میں گر گئی۔

وہ قریب آ کر پھولی ہوئی سانسوں میں بولی۔ ”نیگم صاحبہ آپ کے لیے بہت فکر مند ہیں۔ کھر چلیں۔“ مہر و بتا کر گئی تھی کہ دو بجے گھر پہنچ جائے گی۔ گھر پہنچ کر دو گھنٹے کے انتظار کے بعد اس کا فکر مند ہونا قدرتی بات تھی۔ میں نے کہا۔ ”ہاں! مگر ابھی بیٹھنا چاہتا ہوں۔ تم جا کر نیگم صاحبہ کو بتا دو۔“

اس نے ضد نہیں کی۔ چلتی اور واپسی کی راہ پر چل دی۔

ایسے میں اچانک رُکی۔ مڑے بغیر بولی۔ ”سردی بڑھ رہی ہے سر! آپ کی صحت خراب ہو جائے گی۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پلٹ پڑی۔ مجھے جوں کا توں کھڑا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت تیر گئی۔ بولی۔ ”آپ ایسے ساکت کیوں کھڑے ہیں؟“ میں بے ارادہ بولا۔ ”زندگی کو اتنا قریب آتے اور پھر بے سبب پلٹے دیکھ کر ڈر گیا ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں برہمی کا تاثر مترشح ہو گیا، بولی۔ ”میں آپ کے اس رویے کو کیا نام دوں؟“ میری نظریں اُس کے وجود میں اُلگی ہوئی تھیں۔ فوراً جبک گئیں۔ رُخ پھیر کر سرخ کنوپی والے ایک گھر کو دیکھنے لگا۔ وہ جواب نہ پا کر میرے عقب میں آئی، شانے پر ہاتھ رکھ کر قدرے نرمی سے بولی۔ ”سردی سر! اپنے انداز پر نادم ہوں مگر وہ کیا ہے کہ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ شاید آپ مذاق کر سکتے ہیں جبکہ میرا دل دکھ جاتا ہے۔“

میں اُسے بتا نہیں سکتا تھا کہ اُسے پہلی نظر دیکھنے کے بعد سے اب تک میں ضبط اور تحمل کے کن عذاب ناک مراحل سے گزرا تھا۔ کم بلند پہاڑی کے پس منظر میں اڑتے ہوئے بادلوں کے سفید ٹکڑوں سے سرخ شعلے نکلنے لگے اور میں اپنے چہرے پر سختی سے ہاتھ رکھ کر سکے لگا۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ تیزی سے میرے سامنے آئی۔ دونوں ہاتھ تمام کر چہرے سے الگ کرنا چاہتی تھی مگر کامیاب نہ ہو پائی۔ یقیناً میری جتنی گرفت نے میرے ہاتھوں کی رکیں تنگ ابھار دی تھیں۔ وہ روہاکی ہو کر بولی۔ ”سر! تسکین کریں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ پلیز! ایسا نہ کریں، میرا دل بیٹھنے لگا ہے۔“

وہ سمجھ نہیں پاری تھی کہ میری اس غیر متوقع کیفیت پر اس کا رد عمل کیا ہونا چاہیے تھا، بھی نروس ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے دل ہی دل میں اُسے پریشان کرنے پر ملال ہوا۔ پلٹا، رُخ پھیرا، پیروں سے لپٹی ہوئی شال اٹھائی اور اس کے ایک گوشے سے آنکھیں پونچھنے لگا۔ پھر ایڑیوں پر گھوما اور اُسے ہر اسان آنکھیں لیے چٹان پر اپنی حالت میں پھیلے ہوئے تنے کے پاس کھڑے دیکھا۔ بے بسی سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

میں نے اُلگی اٹھائی، ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا۔ ”ہاں! تم نے سچ کہا کہ میں مذاق کرتا ہوں کیونکہ میرا یہ مقام نہیں جہاں کھڑا ہو کر تمہیں دیکھتا ہوں۔ میں بڑا آدمی

ہوں۔ بڑا آدمی ایسی چھوٹی حرکتیں نہیں کر سکتا۔ میں شاعر ہوں۔ شاعر اتنا چھپورا نہیں ہوتا۔ میرے شانے ننگے ہیں۔ شاعر کے شانوں پر شعور کا جھنڈا بلند ہوتا ہے جس کی آن بجائے رکھنا اس کا فرض ہوتا ہے۔ ہے نا؟..... مگر تم سن لو! یہی میرا جرم ہے۔ پندرہ برس قبل میں نے اپنی بہنوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں پر ترس کھایا تھا۔ بڑی بہن نے کہا تھا کہ بھائی سر کی چادر ہوتا ہے۔ چادر دھوپ اور گرمی سردی سہتی ہے مگر اوڑھنے والے کو بجائے رکھتی ہے۔ تم بھی سختی جھیلو اور ہمیں دکھوں سے بچاؤ۔ چھوٹی بہن نے کہا تھا کہ تم کیسے شاعر ہو کہ تمہیں اپنی بہنوں کی خوشی اور بھائی ذات کی قربانی کا شعور تک نہیں۔ تب میں نے سر جھکا لیا تھا کیونکہ میں تصور دار تھا ناں!“

میری آواز زندہ گئی۔ ”ہاں! باپ کے سامنے اونچی آواز میں بات کرنا، ماں کی حکم عدولی کرنا، بہنوں کی خوشیوں کا احترام نہ کرنا اور بھائیوں کو انکار کی تدبیر دینا..... یہ سب کچھ ایک شاعر کے شایان شان نہیں تھا۔ بھی میں نے جان دے دی مگر اپنے اس جھوٹے اعزاز کی آن بچالی۔ آج..... پندرہ سال قید خانے کے بعد بھی وہ سزا درپیش ہے۔ شاعر کو جتنا جاہار ہے کہ تمہارا دیکھنا معیوب، تمہارا بولنا محتوب اور سوچنا شعور کا متقاضی..... آہ! تم مجھ سے آٹھ سال چھوٹی ہوتے ہوئے بھی سمجھنے کے انداز میں مخاطب ہوتی ہو اور میرے رویے کا عنوان مجھ سے دریافت کرتی ہو..... ہاں..... شاعری جرم ہے، میں مجرم اور سزا کا ہر دروازہ مجھ پر کھلا ہے۔“

میری آواز فرط جذبات سے سمپنے لگی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے عین سامنے جا ٹھہرا، اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کر حلق کے بل چچکا۔ ”ہاں! مجھے تمہاری آنکھیں اچھی لگتی ہیں۔ ان آنکھوں سے دنیا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہی جرم ہے۔ تمہارے بھرے بھرے گال مجھے متوجہ کرتے ہیں اور میں ان پر اپنے جذبات کا تاج محل تعمیر کرنا چاہتا ہوں، یہی جرم ہے۔ مجھے گھیری چھاؤں کی طلب ہے اور تمہاری زلفوں کی چھاؤں میں دو گھڑیاں سونا چاہتا ہوں یہی جرم ہے۔ میں مذاق کرتا ہوں کہ تم سے خوبصورت لڑکی دنیا میں نہیں ہے۔ مگر..... یہ بھی تو سوچو ناں! میں شاعر ہوں۔ رومان لکھ سکتا ہوں۔ دلوں کے تاروں کو چھیڑنے والے لفظ تراش سکتا ہوں تو محبت کی سلطنت میں قدم کیوں نہیں رکھ سکتا؟ میرا شعور اگر میرے جذبات کو ابھارے تو جرم..... اگر لوگوں کی لغزشوں پر رومان کے دبیز پردے

ڈالے تو ہنر..... کیا یہ نا انصافی نہیں ہے؟“ سردی کے باوجود میرا تمام تر وجود پسینے میں نہا گیا۔ گھا بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کی حیرانی بتدریج خوف اور دہشت میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے پیچھے کی جانب بدن کو جھکا دیا۔ میری گرفت سے نکل گئی۔ تنے سے ٹک لگا کر ہانپنے لگی۔ سر اٹھکی میں بولی۔ ”سر پلیز! مجھ سے دور رہیں۔ قریب مت آئیں۔ آپ اس وقت ہوش میں نہیں ہیں۔“ اس کی حسیہ میرے بڑھتے ہوئے قدم نہ روک پائی۔ میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں جتنا قریب آ رہا ہوں، اتنا ہی دور ہو جاؤں گا۔ اتنا کہ مٹ جاؤں گا۔ آج دیکھنے دو، کل نہیں دیکھوں گا کیونکہ مجھے اپنے مقام کی طرف لوٹنا ہے۔“

”سر! آپ نارل نہیں ہیں۔ پلیز! مجھے چھوڑ دیں۔“ اس نے بیزاری آمیز استدعا میرے منہ پر دے ماری۔ میں نے اُسے فوراً چھوڑ دیا اور بے جان انداز میں گھٹنوں کے بل چٹان پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا لیا۔ ٹھکست خوردہ انداز میں بولا۔ ”مریم! تم بلاوجہ خوفزدہ ہو رہی ہو۔ میں نارل نہیں ہوں مگر یقین کرو کہ میں ایب نارل بھی نہیں ہوں۔ اگر میں پاگل ہوتا تو اپنے آپ کو ہاتھ پاؤں باندھ کر تاریک کمرے میں نہ پھینکتا جہاں مجھے پندرہ سال رہنا پڑا۔ میں ایسا بھی نہیں تھا، جیسا تمہیں نظر آ رہا ہوں۔ میں کسی بھی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر ایسے پاؤں نہیں ہوتا جیسے تمہیں دیکھ کر بے اختیار ہو جاتا ہوں۔ مگر یہ بھی اچھا ہوا کہ تم نے میری پیش رفت کو تھیلیوں پر روک دیا ہے۔“

اچانک میرا دل ٹٹٹی میں آ گیا۔ تھیک کا دھواں سینے میں بھر گیا۔ وہ میری پوری بات سنے بغیر تنے کے نیچے سے گزر کر واپس چل دی تھی۔ میں حلق کے بل چچکا۔ ”رکو! میری بات تو سنی جاؤ۔ پھر جانے لگو گی تو ہر گز نہیں روکوں گا۔“ وہ بولی۔ ”میں یہیں رکوں گی۔ آپ وہیں رہ کر بات کریں گے۔ کہیں!“

فاصلہ زیادہ تھا۔ اس کا چہرہ دکھائی دیتا تھا مگر نقوش اور تاثرات کی دنیا اوجھل تھی۔ ایسے دل کی بات نہیں کی جاسکتی تھی مگر میں چیخنے پر مجبور تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ یونہی سہی۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ میرا دل ہر بندش کو خاطر میں لائے بغیر تمہیں دیکھنے پر مجبور ہے۔“ وہ بولی۔ ”آپ کی نظر خوب صورت ہے اس لیے آپ کو دنیا بھلی لگتی ہے مگر دنیا آپ کو تب خوب صورت قرار دے

کی جب آپ کی زبان اور رویہ بھلا ہوگا۔“

”میری آنکھ میلی اور زبان کڑوی نہیں ہے۔ پھر ایسا مشورہ کیوں دے رہی ہو؟“

”شاعر عام لوگوں سے ارفع ہوتا ہے مگر مجھے آپ کے دیکھنے سے الجھن ہونے لگی ہے۔ ہر دل پیچیدگی مرد اتنا ہی ندیدہ ہوتا ہے جتنے آپ ہیں۔“

میری روح تک اس تازیانی کی چہن اتر گئی۔ کھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر حید جھک گیا اور بے چارگی سے بولا۔ ”نہیں نہیں! میں ندیدہ نہیں ہوں۔ سچ یہ ہے کہ تمہی زمانے سے مختلف ہو۔“

اس کی طنزیہ ہنسی فضا میں کوٹھی۔ لرزیدہ آواز میں استہزا کا عنصر شامل ہو گیا۔ ”میں لاوارث ہوں۔ آپ مجھے جس نظر سے دیکھیں، کوئی روکنے والا نہیں۔ آزادی کا احساس باعث شر ہے۔ میری جگہ پر اگر کوئی اور جوان لڑکی کھڑی ہوتی، آپ یہی جملہ اُس کی طرف اچھال دیتے۔ نجانے آپ نے اظہار محبت کرتے ہوئے نیگم صاحبہ کے وجود کو کیوں فراموش کر دیا جو نہ صرف آپ کی شریک حیات ہیں بلکہ آپ کے دو بیٹوں کی ماں بھی ہیں۔“

میں تھملا یا مگر مجھ سے کوئی جواب نہ بن پایا۔

”سرا! مجھے معاف کر دیں۔ آپ کو پیش کے چند لمحات دینے سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا، آپ اپنے مقام سے بہت نیچے گر جائیں گے۔ اپنے پیدا کردہ جس میں مرا جائیں گے۔“

میرے کانوں کے پردے پھٹنے کو آگئے۔ میں نے مٹھیاں جھنجھکیں اور دانت چس کر کہا۔ ”تم بہت بے رحم ہو۔ میں کوئی عیاشی نہیں کرنا چاہتا۔“

”تو کیا مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟“ اس کے جملے میں کھلا چیلنج تھا۔

میں ہاں کہتے کہتے رک گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر تک میرے جواب کی منتظر رہی پھر طنز آہولی۔ ”آپ کے پاس کوئی جواب نہیں کیونکہ آپ محض دل بنگلی کا سامان ڈھونڈ رہے تھے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ میں نے ابھی تک اس موضوع پر سوچا نہیں تھا۔ اب سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے تم سے شادی کر لینی چاہیے۔“

”کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں جوان اور خوب صورت ہوں؟“ اس کی لرزیدہ آواز میں نمایاں کاٹ گئی۔

”ہاں! مگر میں نے اس کے علاوہ بھی کچھ دیکھا ہے۔“ میرا جھوٹا غم کیا تھا۔ لہجہ بھی کھوکھلا نہیں رہا تھا، کہا۔ ”تمہوڑا اقرب

آ جاؤ میں اونچی آواز میں بولتے بولتے تھک گیا ہوں۔“

وہ مان گئی۔ ہولے ہولے چلتی ہوئی تھک آئی۔

”تم پر دونوں باتیں رکھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”مریم! تم شاعرہ ہو، حساس دل ہو۔ تمہیں سمجھانے کے لیے سنا ضروری نہیں۔ تم وہ بات سمجھ لیتی ہو جو میری زبان پر آ کر شرما جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے شادی سے پہلے جو سہانے خواب دیکھے تھے، تم ان کے ہر چوکھٹے میں فٹ بیٹھتی ہو۔“

اسے میرے لہجے کے تین نے ہلا دیا۔ سوچے پر مجبور کر دیا۔ ایک ٹک دیکھتی رہی، بولی۔ ”سرا! زندگی اتنی غیر سنجیدہ اور غفلانہ مزاج کی مالک نہیں ہوتی۔ اسے سچائی کی بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے۔ سچائی یہ ہے کہ ہم دونوں شادی کے لیے موزوں نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں بری طرح چوٹا۔ ”تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟“

”مگر آپ میری جگہ پر ہوتے تو بالکل ایسے ہی انداز میں سوچتے۔ میں اپنی حیثیت کا تعین کرتی ہوں۔ غور سے سنیں۔“ اس نے الفاظ کو ترتیب دینے میں بہت کم وقت لیا۔ بولی۔ ”سرا! میں بانجھ ہوں۔ بانجھ زمین میں خلیق کا کوئی بیج نہیں نہیں پاتا۔ میں غریب بھی ہوں۔ غربت بذات خود دھرتی کے بدن کا کوڑھ ہے۔ نیگم صاحبہ کی طرح آپ کی ناز برداریاں نہیں کر سکتی۔ مرد فطر تا جابر اور تشدد پسند ہوتا ہے۔ اس کا راستہ طاقت اور اختیار روکتا ہے۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ کوئی میرے دکھ پر ترپنے والا نہیں ہے۔ یعنی آپ میرے ساتھ کوئی بھی سلوک کریں، آپ کو کوئی روکنے نہیں آئے گا اور میں ہمیشہ عدم تحفظ کا شکار رہوں گی۔ اور ہاں! میرے شانوں پر ایک سات سالہ بیٹی کا بوجھ بھی لدا ہے جسے دنیا کا کوئی مرد برداشت نہیں کرے گا۔ وہ ایک دم لاوارث اور ناکارہ ہو جائے گی۔ جی! آپ نے سنجیدگی سے میری حیثیت کا جائزہ نہیں لیا مگر نہ آپ مجھے پرو پوز نہ کرتے۔“

میں حیرت پاش نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ زود گو اور صاف بیان نگہ۔ کچھ دیر کھردرے سنے سے ہاتھ رگڑتی رہی، ہونٹ چبا کر آنسو روکتی رہی، پھر بولی۔ ”سرا! اب آپ اپنی حیثیت پر نظر ڈالیں۔ آپ وینڈم اور جوان ہیں۔ معروف شاعر ہیں۔ لفظ آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں مگر یہ ظاہر ہے۔ باطن مختلف ہے۔ آپ کمال ہیں۔ دو بیویوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ بگلا، کار، دفتر اور بینک بیلنس۔۔۔۔۔ سب کچھ

موٹاپا کریں کم...
slim! فٹ اور Young!!

طیبی
عرق
مہزل

موٹاپے میں کمی کی قدرتی دوا
100 فیصد قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ معوی رنگ اور بیکل ہے پاک
• جسم سے زائد چربی خالص کرتا ہے • ہاضمہ درست اور تھک کو فوری کرتا ہے
• اجابت صاف لاتا ہے • آنکھوں کی سوزش دور کرتا ہے
• ہاتھ اور پاؤں کی سوجن میں فائدہ مند ہے



طیبی
www.tayyebi.com.pk



تو بیگم صاحبہ کا ہے۔ آپ کا کیا ہے؟..... اگر وہ آپ کو نکال باہر کریں تو؟..... اور یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ پھر آپ کا تو کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں کہ دو وقت کی روٹی کھا سکیں۔ بیگم صاحبہ سرکاری عہدے پر فائز تھیں۔ مگر میں تو چند لوگوں کی ملازمہ ہوں..... سراسر بھوک میں مشق نہیں ہوتا اور..... عشق میں بھوک نہیں ہوتی۔“

وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ فضا میں اُس کے کڑوے جلوں کی بازگشت اور دہلی دہلی سسکیاں رہ گئیں۔ وہ تنے پر بازو اور بازوؤں پر پیشانی ٹکائے ہچکیاں لے رہی تھی۔ میں نے اس کے بالوں کو چھوا، بہت نرمی سے اور کہا۔ ”مریم! اپنے بے رحم تجزیے کے مقابلے میں مجھے صفائی کا موقع دو۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ آنسوؤں سے دھلی شفاف آنکھیں سوال کناں تھیں..... چہرے پر پھیلی ہوئی سرفی، آنسوؤں کی چھوڑی ہوئی عارض پر چمکتی ہوئی نمی اور بے تحاشا سرخ متورم ہونٹ دیکھ کر میرے لفظ لب پر دم توڑ گئے۔ میں بولا تو مجھے اپنی آواز بھی اجنبی سی لگی۔ ”مریم! میرے ارد گرد امارت کے جتنے بھی نقوش اجاگر ہیں، سب مہرہ کے ہیں۔ پانتا ہوں..... ہاں! مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ناکارہ شخص ہوں۔ میں صاحب جاکدا ہوں۔ صاحب ہنر ہوں۔ کما اور کھلا سکتا ہوں۔ اور ہاں! میں نے اُسے پندرہ برس اپنی دنیا میں برداشت کیا ہے، اب اُسے تمہارا وجود برداشت کرنا ہوگا۔“

”اور آپ کے خاندان کا ردِ عمل؟“ اس کے ادھر سے سوال میں پورے جہاں کا اضطراب شامل تھا۔

”وہ معاملہ پندرہ برس پرانا ہے۔ مٹی میں دب گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بغاوت کا ان کی زندگیوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“

وہ یک ٹک مجھے دیکھتی رہی، بولی۔ ”کیا آپ کی بغاوت بیگم صاحبہ سے بے وفائی کے زمرے میں نہیں گئی جائے گی؟“

میں نے ایک طویل سانس لی، کہا۔ ”مگر میں اس قید سے نکلنا چاہتا ہوں جو مہرہ کے وجود نے میری قسمت کر رکھی ہے۔“

”چلیں..... مان لیا۔ مگر آپ میرا کیا کریں گے؟“

”جہیں اپنی شریک سفر بناؤں گا۔“ میں نے عزم سے کہا۔ ”اپنے من مندر کی رانی!“

”وہ رانی جو ولی عہد کو جنم نہیں دیتی، محل سے ایک دن

ارتھی کی صورت اٹھادی جاتی ہے۔“

”اگر راجا کو جان نشینوں کی طلب نہ ہو یا میرے ہوں تو ایسا نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اللہ نے دو بیٹوں سے نوازا رکھا ہے۔“

”اور میری سدرہ؟“

”وقت بتائے گا کہ اس کے وجود نے میرے اندر موجود بیٹی کے خلا کو پر کر دیا ہے۔“

میرا لہجہ پر اعتماد ہو گیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرا ذہن بکسر خالی تھا اور زبان پر آپوں آپ جملے ترتیب پاتے چلے جا رہے تھے۔ ایسے ہی وقت میں نے درخت کے تنے پر پھیلے ہوئے اس کے خوش نما بال ہاتھوں میں سمیٹے، بے اختیار لبوں سے لگائے، پھر آنکھوں سے.....

کہا۔ ”مریم! محبت بھیک میں نہیں ملتی۔ ملے تو لینی نہیں چاہیے۔ یہ دو انسانوں کے درمیان ضرورت کی بنیاد پر ملے پانے والا معاہدہ نہیں ہے۔ اگر تم میرے بڑھے ہوئے ہاتھ تمام لوتو یقین دلاتا ہوں کہ کبھی افسردہ نہیں کروں گا۔ کبھی چھوڑوں گا نہیں۔ جھٹک دو تو تمہاری مرضی، دوبارہ عشق کے دسترخوان پر مدعو نہیں کروں گا۔ مجھے بس یہی کہنا تھا۔“

میں نے فیصلہ سنا کر ہاتھ پھیلا دیے۔ اس نے مجھے پھر میرے ہاتھوں کو دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”سراسر! آپ بہت اچھے ہیں۔ شاید میں ہی آپ کو پہچاننے میں غلطی کرتی رہی۔“

میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ مگر وہ ایک دم پلٹی اور میرے ہاتھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے چل دی۔ چٹان سے اتر کر دوڑنے لگی۔

☆☆☆

وہ اس لحاظ سے خاصا اہم دن تھا کہ اس دن میں میگزین لینے پٹنڈی جانا تھا کیونکہ پرنٹز نے میگزین کی طباعت کا کام مکمل ہونے کی اطلاع فون پر دی تھی۔ میں تیار ہو کر دفتر پہنچا تو مریم کو اپنی سیٹ پر موجود نہ پا کر حشر ہو گیا۔ کچھ دیر انتظار کیا مگر وہ نہ آئی۔ آج اس کا دفتر نہ آنا نہایت غیر متوقع تھا۔ اس نے اب تک ایک بھی چھٹی نہیں کی تھی۔ مجھے وہم ہوا کہ وہ میرے اظہار عشق سے خفا نہ ہو گئی ہو۔ وہ مہرہ کے کہنے پر مجھے بلانے کے لیے شیب میں چٹان پر گئی تھی۔ میں نے اُس پر اپنے دل کی دنیا آفکار کرنے کی کوشش کی جسے اُس نے قبول نہیں کیا تھا۔ اُس کی ناراضی بجا تھی مگر اس واقعے کو تین چار روز گزر چکے تھے۔ اس دوران اُس نے ناراضی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اُس نے اپنے بے نیاز

روپے سے ظاہر کیا تھا کہ اُس نے میری باتوں کو دل پر نہیں لیا تھا۔ میرے بھوتانہ اظہار محبت کو سرے سے اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ گویا تسلی تھی کہ وہ ناراض نہیں تھی۔

وہ نہ آئی، مہرہ آگئی۔ ارد گرد دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا مریم ابھی تک نہیں آئی؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ رسٹ وایج پر نگاہ ڈال کر پریشانی سے بولی۔ ”کیوں نہیں پہنچی؟ شاید بیمار پڑ گئی ہے۔ تم اس کی فائل کھولو۔ اس میں ویمن ہاسٹل کا نمبر لکھا ہے۔ اس پر رابطہ کرو۔“

میں نے کہا۔ ”یہ مناسب نہیں ہوگا۔“

”نہیں وسیم! وہ یقیناً بیمار ہے۔ اسے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دو۔ تاکہ وہ جہیں ہاسٹل کے باہر تیار ملے۔ میگزین لانے کے ساتھ ساتھ اُسے کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس بھی لے جانا۔ ادارے کے ورکرز کا خیال رکھا جائے تو وہ ادارے کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔“

مجھے دراز کھولتے دیکھ کر مہرہ مطمئن ہو گئی۔ چلی گئی۔

مریم کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ فائل میں ہاسٹل کا نمبر درج تھا۔ میں نے فون اپنی جانب کھسکا لیا۔ ہاسٹل کی ریسپنڈنٹ نے کسی سز علیلہ سے میری بات کرا دی۔ اس نے بتایا کہ مریم اپنے وقت پر دفتر کے لیے نکل چکی ہے۔

میں جلدی سے بولا۔ ”وہ میرے دفتر میں ہی کام کرتی ہے۔ اسے معمول کے مطابق دو گھنٹے قبل یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ ابھی تک نہیں پہنچی جبکہ سز علیلہ مشکل نصف گھنٹے کا ہے۔“

اس نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ ”اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ مجھے وایج مین نے بتایا ہے کہ وہ دفتر جبکہ اُس کی بیٹی سدرہ اسکول جا چکی ہے۔ ریسپنڈنٹ نے بھی یہی رپورٹ دی ہے۔“

میں رابطہ منقطع کر کے سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ مہرہ کو بتایا۔ اس کی پیشانی پر سلو نہیں ابھر آئیں، بولی۔ ”یہ بات دل کو نہیں لگتی۔ میں نہیں سمجھتی کہ مریم ایسی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ اللہ نہ کرے، اُسے کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔ کیا تم ہاسٹل جا کر پتا نہیں کرو گے؟“ اس کے لہجے میں ترغیب تھی۔ ”ویمن میں آتی جاتی ہے، کہیں روڈ ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔“

میں نے اُسے ایک ذرا برہمی سے دیکھا۔ بات کو خوا خواہ طول دے کر ہنگڑ بنارہی تھی۔ وہ مہرہ کوئی تو مجھے ناچار ہاسٹل جانا پڑا۔ عبدالکریم میرے ساتھ تھا۔ استقبالی کاؤنٹر پر ایک جواں سال فربہ بدن لڑکی کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور مریم ماووش کا پوچھا۔ اُس نے انٹرکام پر کسی سے رابطہ کر کے میری آمد کی اطلاع دی پھر پیشہ دارانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میڈم اپنے آفس میں آپ کی منتظر ہیں۔ آپ کا فون انہوں نے ہی اٹینڈ کیا تھا۔ اس طرف تشریف لے جائیے۔“

اس نے گیلری میں جس کمرے کی نشاندہی کی تھی، اس کے باہر ہاسٹل وارڈن..... سز علیلہ قدرت کی نیم پلیٹ آویزاں تھی۔ چند لمحوں بعد میں سز علیلہ قدرت کے سامنے کرسی پر براجمان تھا۔ وہ دبیلے پتلے جسم کی مالک تھی۔ سادہ لباس میں باوقار اور متین دکھائی دے رہی تھی۔ مریم کے لیے مشک تھی۔ اپنی پیشانی کو ہتھیلی سے رگڑتے ہوئے خود کلامی کرنے لگی۔ ”مجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟“

پھر مجھے مخاطب کر کے بولی۔ ”وسیم صاحب! وہ بڑی ذمے دار اور جینکس ہے۔ آج تک اُس نے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ضروری اور فوری کام کے سلسلے میں کہیں گئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سز فردوس کے ہاں چلی گئی ہو۔“

میری دلچسپی پر اُس نے مجھے بتایا کہ سز فردوس شہر کی معروف سوشل ورکر تھی۔ ایک فعال این جی او کی چیئر پرسن تھی۔ یہ ہاسٹل اُس نے خواتین کی فلاح کے ارادے سے تعمیر کرایا تھا۔ اس سے پہلے مریم نے مجھے بتایا تھا کہ سز فردوس نے پنڈی اور لاہور کے اسپتالوں میں اُس کا علاج کروایا تھا۔

میں نے کہا۔ ”آپ سز فردوس سے رابطہ کر کے کنفرم کر سکتی ہیں۔“ میں نے زور دیا۔ ”اگر علم ہو جائے کہ مریم انجی کے ہاں ہے، تو میری پریشانی ختم ہو جائے گی۔“

اس نے انٹرکام پر ریسپنڈنٹ سے سز فردوس کا رابطہ مانگا۔ مجھ سے بولی۔ ”یہ ہاسٹل انجی کا ہے۔ وہ مریم ماووش سے غیر معمولی انس رکھتی ہیں اور انہوں نے مریم کو یہاں مفت رہائش دے رکھی ہے۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ دل میں ایک کانٹا سا چبھا۔ مریم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ میس سمیت ہائیکس سو روپے ہاسٹل فیس ادا کرتی تھی۔ میں نے اس موضوع سے پہلو تھکی کی، پوچھا۔ ”سز فردوس کہاں رہتی ہیں؟“

”ادھر اسلام آباد میں.....“ اس نے چنل انگلیوں پر گھماتے ہوئے بتایا۔ ”وہ ہفتے میں ایک ادھ بار مریم کو اپنے ہاں بلاتی ہیں۔ ان کا ڈرائیور اُسے لینے کے لیے آتا ہے۔ آج ڈرائیور نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ ڈرائیور اُسے لینے

کے لیے آیا ہو اور اس نے ویکن اسٹینڈ پر مریم کو کھڑے دیکھ کر پک کر لیا ہو۔

اسٹرکام پر اسے بتایا گیا کہ مسز فردوس کا سیل نمبر پاورڈ آف جا رہا ہے۔ مجھے پتہ چل گیا کہ بے گھر ہوئی۔ آپ بے فکر ہو کر گھر جائیے۔ وہ کل ڈیوٹی پر آ جائے گی۔

میں کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”عطیہ صاحبہ! آپ مجھے مسز فردوس کے آفس یا گھر کا ایڈریس دے دیجئے۔ میں وہاں جانا چاہوں گا کیونکہ جب تک مجھے مریم کی خیریت کی خبر نہیں مل جائے گی، میں تب تک بے چین رہوں گا۔“

وہ چونکی۔ ”مگر کیوں؟“

”میں بے حد حساس واقع ہوا ہوں۔“

”اوکے.....“ اس نے اپنا ہنڈ بیگ کھولا۔ ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میز پر رکھا، انگلی کی ضرب سے میری جانب دھکیلا، بولی۔ ”ایک ورکر کے لیے آپ کا اتنا پریشان ہونا اُن نہ چل ہے۔ بہر حال! ٹیک کیرا“

میں نے مسز عطیہ قدرت کا شکریہ ادا کیا اور تیز تیز قدموں چلتا ہوا پارکنگ ایریا میں کھڑی اپنی شیراڈ کی طرف بڑھ گیا۔

عبدالکریم مسز فردوس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ تین چار سال اُس کے ہاں یہ طور ڈرائیور کام کر چکا تھا۔ محتاط انداز میں بتانے لگا۔ ”صاحب! وہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میری مائیں تو اُس کے پاس ہرگز نہ جائیں۔“

مجھے اچھا لگا۔ اُسے کہہ کر پتا تو چلتا چلا کہ وہ یہ ظاہر سوشل ورکر تھی مگر حقیقت میں بہت پختہ ہوئی شخصیت تھی۔ چالاک اور موقع پرست تھی۔ ڈرائیور اُس کے ہتھکنڈوں سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا مگر اس کے سادہ لوح ذہن میں بس یہی نقش تھا کہ وہ بہت خطرناک اور بہت اثر و رسوخ والی عورت تھی۔ اُس کی باتوں نے مجھے کش مکش میں مبتلا کر دیا کیونکہ اس کی رائے کے برعکس مریم اور مسز عطیہ قدرت نے اُسے فرشتہ قرار دیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں اندازہ تو ہوگا کہ وہ اس وقت ہمیں کہاں مل سکتی ہے؟“

وہ ذہن پر زور دے کر بولا۔ ”اس وقت وہ بہت مصروف ہوگی۔ کسی میٹنگ یا کسی کانفرنس میں۔ البتہ گھنٹا بھر کے بعد دفتر پہنچ جائے گی۔ وہ ہر صبح گیارہ بجے گھر سے نکلتی ہے اور رات ایک ڈیڑھ تک مصروف رہتی ہے۔“

”اس کے دفتر چلو۔ میں وہیں بیٹھ کر اُس کے آنے کا

انتظار کروں گا۔“

آدھے گھنٹے بعد ہم ایک ہائی کلاس سوسائٹی کے قلاب میں واقع اٹالین طرز پر تعمیر کیے گئے بینک کے سامنے پہنچے۔ گیٹ پر پتیل کا وہی مونوگرام آویزاں تھا جو مسز فردوس کے وزٹنگ کارڈ پر چھپا ہوا تھا۔

میں گاڑی سے اتر کر بینک میں داخل ہو گیا۔ پارکنگ میں کئی قیمتی گاڑیاں موجود تھیں۔ این جی او کے مونوگرام والی سفید یونیفارم میں ملیوس دومرد اور ایک سالونی سی لڑکی استقبال کا ڈنٹر پر موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے مطلوبہ معلومات حاصل کیں اور وزٹنگ روم میں بیٹھنے کا مشورہ دیا۔

مسز فردوس خانم مجھ سے آدھا گھنٹا پہلے پہنچ چکی تھی مگر یوں گھنٹے کے اعصاب شکن انتظار کے بعد مجھے اذیت بار پائی ملا۔

نہایت آراستہ آفس کی جہازی سائز کی میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی خاتون کو دیکھتے ہی عبدالکریم کا کھینچا ہوا شخص خاکہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ وہ کم و بیش پچاس کے سن میں تھی۔ اس نے سبک آپ کی دیڑھ تہوں میں اپنی عمر چھپانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ مجھے دیکھنے کے بعد اس نے میز پر پڑے ہوئے انفارمیشن کارڈ پر نظر ڈالی۔ فحوت سے بولی۔ ”اچھا! تو یہ تم ہو..... وسیم بھروانہ..... چیف ایڈیٹر ماہنامہ بین السطور!“

مجھے اُس کا انداز مخاطب پسند نہیں آیا مگر میں نے جمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”میں مسز فردوس!“

وہ بولی۔ ”میری معلومات کے مطابق تم نہ صرف اعلیٰ پائے کے شاعر ہو۔ دیکھنے میں خاصے وضع دار انسان معلوم ہوتے ہو۔ پھر کیا تمہارے منصب کو یہ زیب دیتا ہے کہ ایک لڑکی کے لیے اتنے تردد کا مظاہرہ کرتے پھر و؟“

میں نے جلدی سے اصلاح کی۔ ”دیکھیں مسز فردوس! وہ صرف ایک لڑکی ہی نہیں، میرے میگزین کی ایڈیٹر بھی ہے۔“

اس نے طنزیہ مسکراہٹ اچھالی۔ تنقیدی اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگی۔ مجھے اس سے ناروا اور استہزاء یہ رویے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ چند لمحوں تک انگلیاں چٹکتا رہا، پھر بولا۔ ”مس مریم.....“

وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ”تو..... مسز مریم!“

اس کا ٹوکنا نہایت تھکیک آمیز تھا۔ میں خون کا گھونٹ پی کر بولا۔ ”اوکے..... مسز مریم باقاعدگی سے دفتر آتی تھی۔ آج کسی شعلی اطلاع کے بغیر دفتر نہیں پہنچی تو فکر دامن گیر ہوئی۔ ہاسٹل سے پتا کیا۔ وہ اپنے معمول کے وقت پر وہاں سے دفتر کے لیے نکل چکی تھی۔ اس کی کوئی خبر نہیں کہ وہ کہاں

ہے؟..... اور ایسے حالات میں اپنی ایڈیٹر کے لیے میرا

فکر مند ہونا میرے منصب کے خلاف نہیں ہے۔“

”مان لیا۔ مگر یہاں آنے کا مقصد؟“

مجھے اُس کی آنکھیں الجھن میں مبتلا کر رہی تھیں۔ سوال الگ۔ شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا مگر اب تو آ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں صرف یہ کفرم کرنے کے لیے آیا ہوں کہ وہ آپ کے پاس ہے یا آپ کے علم میں ہے کہ وہ کہاں گئی ہے؟“

اس نے مجھے گھورا۔ ”اگر میرا جواب انکار میں ہو تو؟“

میں گڑبڑا گیا۔ ”تو کیا؟ میں اُسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔“

اُس نے کرسی میری جانب گھمائی۔ چند لمحوں کے بعد دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”مسٹر وسیم بھروانہ! تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ مریم کی سرپرست میں ہوں۔ اُسے تلاش کرنا میرا کام ہے ناں کہ تمہارا۔ جاؤ! اپنا کام کرو۔ وہ جہاں بھی گئی ہے، وہاں آ جائے گی۔“

اس کا دل شکن رویہ برداشت کرنا بہت مشکل کام تھا مگر میں یہ کام کر گزرا۔ دروازے میں زکا، اُسے شکوہ بار نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”خدا کرے کہ وہ بخیریت ہو۔“

وہ میز پر انگلیاں بجاتی رہی اور مجھے بنا کچھ کہے دیکھتی رہی۔ میں گاڑی میں بیٹھنے اور عبدالکریم کو واپس چلنے کا حکم کے بعد اُس غیر مہذب عورت کے بارے میں سوچنے لگا جس نے میری عزت نفس بخروا کر دی تھی۔ مریم نے اُس کا نقشہ بہت مہربان اور شائستہ خاتون کے طور پر کھینچ کر دکھایا تھا۔

جھوٹ تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے مہر کو عطیہ قدرت اور فردوس خان کی ملاقاتوں کا احوال شکوہ کناں انداز میں سنایا۔ وہ میری تھکیک کو سرے سے نظر انداز کر کے بولی۔ ”مگر تم میگزین کیوں نہیں لائے؟“

”کل لینے جاؤں گا۔“

”آج ہی لے آتے تو اچھا ہوتا۔ ابھی بینک، سیل پوائنٹس تک ترسیل اور پوسٹ کا کام باقی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میگزین یکم تاریخ کو ہر اُس جگہ پہنچ جائے، جہاں اُسے پہنچنا چاہیے۔“

میں نے اس موضوع میں حسب معمول دلچسپی نہیں لی تو وہ بھی خاموش ہو گئی۔ اس نے چائے تیار کی۔ پینے کے بعد ملتجیانہ انداز میں بولی۔ ”وسیم! میں نشیب کی طرف جانا چاہتی ہوں۔ کافی دنوں سے اس طرف نہیں نکلی۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟“

میرے انکار پر مائل بہ اصرار ہو گئی۔ ناچار اُس کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلا مگر بے جان انداز میں یوں جیسے میری کوئی مرضی شامل حال نہ ہو۔ اس نے ایک لمبا چکر کاٹا اور چٹان پر آ کر بیٹھ گئی۔ مٹاپے کی وجہ سے بری طرح ہانپنے لگی۔ میں دانستہ کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

وہ بولی۔ ”وسیم! یہ علاقہ بڑا خوب صورت ہے مگر اپنا وطن یاد آتا ہے۔ کیا تم بھی گھر والوں کو یاد کرتے ہو؟“

میں چونکا۔ ”گھر والے؟“

اس نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا مگر خاموش رہی۔ سرد چٹان پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ توقف کے بعد بولی۔ ”تم نے بھی بچوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لی۔ تمہیں اچھا باب ثابت ہونا چاہیے۔“

میں نے اُسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے جتانے کی کوشش کی ہو کہ میں نے پہلے بھی دلچسپی لی تھی جواب لوں گا۔ وہ لمبی سانس لے کر بولی۔ ”لیکن تمہیں اب وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو آج تک مجھے کرنا پڑا رہا کیونکہ گھر کے سربراہ تم ہو میں نہیں۔ میں تھک گئی ہوں۔“

میں پھر بھی خاموش رہا تو اُس نے بیزاری سے کچھ کہنا چاہا۔ ”کیا تمہیں مریم کے معاملے میں کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہوتا؟“

”اگر ہو بھی تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میرا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

”کیوں؟“ وہ سراپا سوال بن گئی۔ ”وہ تمہارے میگزین کی ایڈیٹر ہے۔ شروعات میں ہی اس کا خیاب اچھی بات نہیں ہے۔“

”یہ میرا سبکیٹ نہیں ہے۔“

”ویسے تو ہماری زندگی میں کسی سبکیٹ کا عمل دخل نہیں ہے مگر.....“

”پلیز! خاموش رہو۔“ میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”کہیں تم نے کسی بات پر اُسے ناراض تو نہیں کر دیا؟“

”نہیں۔“

”وہ اپنا ہر مسئلہ مجھ سے شیر کرتی تھی۔ معمولی بھی، غیر معمولی بھی۔ اگر وہ فون پر اپنے نہ آنے کی اطلاع دے دیتی تو میں اتنی پریشان نہ ہوتی۔“

اچانک ایک سردی لہر میرے بدن میں پھر گئی۔ کہیں اس نے اپنا اور میرا وہ تعلق جو ابھی استوار بھی نہیں ہوا تھا، مہر و پریاں تو نہیں کر دیا تھا؟

”کیا تمہیں اس کی کمی محسوس ہوئی؟“
”نہیں۔۔۔۔۔۔“

ایسے ہی وقت میں میری نگاہ نالے کے پار سرخ کنوپی والے گھر سے نکلتے ہوئے ایک جوڑے پر پڑی۔ وہ ڈھلان پر سنبھل کر چلتے ہوئے نالے کی طرف جا رہے تھے۔ دیکھنے میں میاں بیوی لگتے تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کی تسبیحی چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔ ان کی حرکات ان کی اندرونی خوشی اور جذباتی اتار چڑھاؤ کا مظہر تھیں۔ ہم دونوں نے عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اُس نہال جوڑے پر نظریں جمادیں۔ مہر کی آنکھیں زندگی کے جذلوں سے معمور تھیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس جوڑے کی جگہ پر مجھے اور اپنے آپ کو فٹ کر کے جسم تصور سے دیکھ رہی تھی۔ میری فراری کیفیت بھانپ کر مہر نے گھر چلنے کا فیصلہ سنا دیا۔

پانچ بجے تک میری لائقیت شکست و ریخت کا شکار ہونے لگی۔ رگ و پے میں بے چینی بھرنے لگی۔ بے بسی کا احساس ہونے لگا تو عبدالکریم کو آواز دی اور گاڑی نکالنے کا حکم دیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر مریم کے ویکن ہاسٹل چلنے کا کہا۔ ساڑھے پانچ بجے میں ویکن ہاسٹل کے پرفیولان میں مسز عطیہ قدرت کے سامنے تھا۔ وہ لان کے نسبتاً سکون گوشے میں ایڑی چیر میں بیٹھی جھول رہی تھی اور گود میں رکھے ہوئے فیشن میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اس نے میرے لیے کرسی منگوائی اور کولڈ ڈرنک لانے کا آرڈر دے دیا۔

لان میں مختلف عمروں کی کئی عورتیں چھل قدمی کر رہی تھیں۔ چند تھک کر دائرہ بنائے بیٹھی تھیں۔ بچے کھیل کود رہے تھے۔ سدرہ چند بچوں کے ہمراہ اسپائیڈر پر کھیل رہی تھی۔ خوشی سے چلا رہی تھی، یوں کہ اُسے مریم کے غیاب کی کوئی فکر نہیں تھی۔

مسز عطیہ نے میگزین بند کر دیا، پوچھا۔ ”مریم ماوش ابھی تک نہیں آئی؟“
”نہیں۔ کیا آپ نے مسز فردوس سے دریافت کیا تھا؟“
”جی ویس صاحب! انہوں نے حسب توقع درستی سے جواب دیا کہ مجھے مریم کے بارے میں متردد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“
”یعنی وہ انہی کے پاس ہے؟“ میرے لہجے میں امید کا پرتو غالب تھا۔

”میرا خیال بھی ہے مگر انہوں نے مجھے ایسا کچھ کہا نہیں تھا۔“ اس نے تذبذب میں کہا۔ ”چونکہ مریم ان کے

بہت قریب ہے، اس لیے میں اس کے معمولات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی۔ یقیناً مجھے اتنی اچھی جا ب اور کہیں نہیں ملے گی۔“ اس کے جملے نے مریم کی اہمیت آشکار کر دی۔

میں نے اس پر پندرہ بیس منٹ صرف کیے۔ حاصل گفتگو یہی تھا کہ وہ میری طرح لاعلم تھی۔ میں شب بھر سو نہ پایا۔ بھی کھڑکی میں کھڑا ہو جانا، بھی دفتر کی چھت پر نکل آنا تو بھی مہر کی طرف پشت کیے آنکھیں کھلی رکھ کر لیٹ جانا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ وہ وہ کر مریم کی طرف دھیان چلا جاتا تھا۔

یہ امید بڑی قوی تھی کہ اگلی صبح جب میں دفتر پہنچوں گا، وہ پہلے کی طرح اپنی سیٹ پر براجمان ہوگی مگر کچھ ایسا تھا کہ یہ امید بھی طبیعت کو سونے پر مائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ مہر و خراٹے نہیں لے رہی تھی۔ یعنی جاگ رہی تھی مگر سونے کی اداکاری کر رہی تھی۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی اُسے شب بھر مخاطب نہیں کیا۔ اُس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ میری اکثر رائیں ایسے ہی گزرتی تھیں۔

فجر کی اذان سنائی دی۔ وہ انگڑائیاں لیتی اٹھی۔ جھامپاں لیتی میرے پہلو میں آ کر تنگ گئی۔ میرے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”وسم! پیاس اور رت چگا صحت کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ سو جاؤ۔۔۔۔۔۔ میں پنڈی جا کر میگزین لے آؤں گی۔“

میں نے اُسے خالی نظروں سے گھورا۔ اُس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا۔ ”نہیں وسم! کچھ مت سوچو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سو جاؤ۔ تم نے ساری رات اٹھتے بیٹھے گزار دی ہے۔“

میں نے پوچھنا چاہا کہ میں تورت جگوں کا بیٹا ہوں۔ مگر تمہیں کیا ہوا؟ تم کیوں جاگتی رہیں؟..... خواہش کے باوجود نہ پوچھا اور آنکھیں موند کر رہی بسی سانس لینے لگا۔ وہ بولی۔ ”اگر مریم آج بھی دفتر نہیں آئی تو میں اُس کا پتا کرنے جاؤں گی۔ مسز فردوس سے ملوں گی اور صورت حال جاننے کی کوشش کروں گی۔“

اس کی آواز میں جذبات کی آمیزش ہرگز نہیں تھی۔ ہولے ہولے کھانسی، بولی۔ ”اس نے میگزین پر بڑی محنت کی ہے، اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ پہلی کاپی کھول کر دیکھنے کا کریڈٹ اُسے ملنا چاہیے۔ کیا تم میری بات سے متفق ہو؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کافی دیر تک میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی پھر بیڈروم سے نکل گئی۔ مگر میں جا کر برتن کھنگالنے لگی۔ اس کی گفتگو سے حیاں تھا کہ وہ

میری پریشانی کا تعلق مریم کی عدم موجودگی سے جوڑ چکی تھی۔ سمجھ چکی تھی۔ یہ بات میری ازدواجی زندگی کے لیے نہایت نقصان دہ تھی مگر میرے دل کی فضا میں کوئی بہت بڑا تغیر رونما ہو گیا تھا کہ مجھے اُس کی ناراضی کی پروا نہیں رہی تھی۔ دس بجے اُس نے بیڈ پر ہی ناشتے کے لوازمات سجا دیے۔ چیک کوئی کوزی سے ڈھانچتے ہوئے بولی۔ ”مریم نہیں آئی۔ میں پنڈی جا رہی ہوں تاکہ میگزین اور مریم کی خبر لے آؤں۔“

میں نے کہا۔ ”میگزین مت لانا۔“
”کیوں؟“ وہ چونکی۔

میں نے جواب نہ دیا تو وہ گہری نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ پھر تنہی انداز میں سر ہلاتے ہوئے، برس جھلاتی بیڈروم سے نکل گئی۔ میں بھی ناشتا کرنے کے بعد گھر سے نکل آیا۔ کچھ دیر دفتر میں رہا۔ مریم کی عدم موجودگی دفتر کی تمام تر دلچسپی کو نگل چکی تھی۔ شال اوڑھے نشیب کی طرف نکل گیا۔

تین بجے کے قریب جب میں واپس گھر پہنچا تو مہر کو مکن میں مصروف پایا۔ مجھے دیکھ کر امپرن درست کرتے ہوئے برآمدے میں آ گئی، بولی۔ ”میں ویکن ہاسٹل کی مسز عطیہ اور مسز فردوس خانم سے مل آئی ہوں۔ دونوں کو اُس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

میں نے ہنکارا بھرا، وہ بولی۔ ”اور تو اور ویکن ہاسٹل، مسز فردوس کے گھر اور ہمارے دفتر کے بعد..... مریم کے چوتھے ٹھکانے کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہوں۔ شاید ہم مریم کو سمجھ ہی نہیں پائے۔ یوں لگتا ہے جیسے کہیں بہت بڑی گڑبڑ موجود ہے کیونکہ سوائے ہمارے، اس کے یوں چلے جانے پر کوئی بھی پریشان نہیں ہے..... اس کی بیٹی بھی۔ یعنی اچانک غائب ہو جانا مریم کے معمول کا حصہ ہے۔“

اس کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ میں نے کوشش کی کہ میرا قلبی اضطراب میری آنکھوں تک نہ پہنچ جائے۔ ایسے ہی وقت مکن میں اُس کے فون کی کھنٹی بجی۔ مکن میں گئی۔ چند لمحوں بعد فون اٹھائے باہر آئی۔ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”مریم کا فون ہے۔“

”تو سن لو ناں!“
”نہیں..... وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ اس کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

میں نے فون تھا۔ کان سے لگا کر ’رئیں‘ کہا۔ مریم کی مخصوص بھرائی ہوئی، لرزتی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو سر! میں

مریم بات کر رہی ہوں۔“

”ہاں اسن رہا ہوں۔“ میں نے بہ مشکل اپنا قصہ دہرایا۔ ”وہ سر..... بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں شاید دفتر نہیں آ سکوں گی۔“ وہ کچھ جلدی میں تھی۔
”کتنے دن بعد آؤ گی؟“ کوشش کے باوجود میرے لہجے میں تسلی کھل گئی۔

”نہیں سر..... میں کبھی نہیں آؤں گی۔ وہ..... دراصل میں..... پلیز سر! ناراض نہ ہوں۔ میں یہ جاب جاری نہیں رکھ سکتی۔ فکر نہ کیجئے گا، میں نے تنخواہ کے پانچ چیک ضائع کر دیے ہیں۔“ اس کی آواز زیادہ لرزنے لگی۔

”کیا مطلب؟ اگر تمہیں کوئی شکایت تھی تو بتا دیا ہوتا۔“
”ایگرینٹمنٹ کے مطابق.....“

اس نے میری بات کاٹ دی، کہا۔ ”میں معافی چاہتی ہوں کہ میں نے ایگرینٹمنٹ کی خلاف ورزی کی۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت ہے اور نہ مجھے کوئی اور نوکری ملی ہے۔“

”تو کیا براہِ علم ہے؟“ میرا لہجہ سخت ہو گیا۔
”مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ آپ متبادل انتظام کر لیجئے گا۔“ اس کی آواز واضح طور پر آنسوؤں سے رندھ گئی اور میرے کچھ کہنے سے قبل رونے لگی۔ میں نے بے جان انداز میں فون مہر کی طرف بڑھایا اور پلٹ کر تیز قدموں سے چلتا ہوا بیڈروم میں آ گیا۔ گزشتہ صبح سے رگ و پے میں پھیلے ہوئے انتظار اور اضطراب کے جذبے کو برہمی کا عنوان مل گیا تھا۔ مجھے مریم پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے غصے کو مہر کی موجودگی میں ظاہر کر کے اپنی پوزیشن مزید ابتر کر لوں۔ اسی وجہ سے اپنی پسندیدہ خاموشی کی چادر اوڑھ کر بیڈروم کی بڑی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے میں جس چٹان پر بیٹھا تھا، اُس پر چند لوگ گھوم رہے تھے۔ وہ شاید پکنک منانے کی غرض سے آئے تھے۔

میں بے سبب ان کی حرکات کا بغور مشاہدہ کرتا رہا۔ چند منٹوں بعد مہر و میرے عقب میں آئی، بولی۔ ”وسم! وہ بے چاری نہ آنے پر مجبور اور بہت شرمسار ہے۔“

میں تیزی سے پلٹا۔ غصے میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ پایا۔ وہ میرا بازو تھام کر بولی۔ ”وسم! غصے میں نہ آؤ۔ اس بے چاری نے مجھ پر ایہ قدم اٹھایا ہے۔ زار و قطار رو رہی تھی اور بار بار معافی مانگ رہی تھی۔“

”کیا اُس نے بتایا کہ وہ کہاں ہے؟“
”نہیں۔“ مہر نے مایوسی سے ٹپٹی میں سر ہلایا، بولی۔ ”میری کوشش کے باوجود اُس نے کچھ نہیں بتایا۔“

میرے اعصاب تن گئے۔ مٹھیاں بھیج گئیں۔ جی چاہا کہ مہر پر برس پڑوں۔ ذہنی تناؤ حد سے تجاوز کر گیا تو میں ایڑیوں پر گھوما۔ کھڑکی کے پھول دار شیشے پر زور دار مکارا۔ شیشہ ٹوٹ گیا۔ ہاتھ زخمی ہوئے سے بچ گیا۔ مہر نے مجھے ہانپوں کے حلقے میں بھر لیا اور کھینچ کر بیڈ تک لائی۔ سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”وسیم! خود پر قابو پاؤ۔ مریم محض ادارے کی ملازمہ تھی۔ جیسے میں نے اُسے مقرر کیا تھا، ایسے ہی کسی اور کو چند دنوں میں اُس چیز پر لا بٹھاؤں گی۔ فکر نہ کرو۔“

”نہیں.....“ میں نے پوری سختی سے کہا۔ ”مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے میگزین بھی شائع نہیں کرنا۔ تم نے یہ سارا گورکھ دھند ا فضول میں پھینک رکھا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں بجائے شکوے یا برہمی کے، ایک ذرا مسرت کی لہر دوڑی۔ جاں کسل انداز میں مسکرائی، بولی۔ ”جب تک مریم یہاں تھی، یہ گورکھ دھند ا فضول نہیں تھا۔ اب تمہارے نزدیک فضول ہو گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟“

وہ جو کہنا چاہتی تھی، وہ اپنی مسکراہٹ میں کہہ چکی تھی۔ طنز اچھا چلکی تھی۔ میں نے اُسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا اور بیڈ پر ڈھسے گیا، بولا۔ ”مجھے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنی۔“

وہ بولی۔ ”مگر مجھے بہت کچھ سنا ہے۔“

میرے پاس عاقبت کی ایک ہی کھولی بیٹی تھی جس میں اپنا چہرہ چھپا کر اُس کی شکوہ بار باتوں کے دار سے محفوظ رہ سکتا تھا..... وہ خاموشی کی سلطنت تھی جس میں پناہ گزین ہونے میں محض ایک یا دو لمحے لگے۔ خاموشی کے جس ریشم کو میں نے پندرہ برسوں میں بنایا تھا، اُسی میں بند ہو گیا۔

رات گھر میں اُتر آئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کے لیے نکلتا چاہتی تھی مگر میں نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اپنا موبائل فون اٹھاتا بھول گئی اور مجھ پر ایک شکایت بھری نگاہ ڈال کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد اس کے فون کا بزر بجنے لگا۔ میں نے بے ارادہ فون اٹھایا۔ اسکرین پر غیر محفوظ شدہ نمبر جگمگا رہا تھا۔ میں نے کبھی مہر کے لیے آنے والی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ آج بھی کوئی ارادہ نہیں تھا مگر جب دوسری مرحلہ بتل گئی تو میں نے کال ریسیو کر لی۔ کانوں میں مریم کی شناسا آواز گونجی۔ ”نیگم صاحبہ! یہ میں ہوں..... مریم ماہوش.....“

میں نے بے دلی سے کہا۔ ”نیگم صاحبہ! باہر گئی ہیں۔“

”آپ؟ میں آپ کو ہی فون کرنا چاہ رہی تھی۔ شکر ہوا، آپ مل گئے۔“ اس کی آواز کسی گہرے دکھ کی غمازی تھی۔

”کیوں؟“ میں نے دہچکی لی۔

”آپ ناراض ہیں ناں؟“

”میری چھوڑو اپنی کہو۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں کیونکہ میں نے بغیر بتائے آپ کی ملازمت چھوڑ دی اور آپ کو میری وجہ سے بہت پریشانی اٹھانا پڑ رہی ہے۔“ وہ بولی تو حیاں ہوا کہ اس کا لرزتا ہوا لہجہ غم تھا۔ ”میں آپ کو اپنی پرالیم بتانا چاہتی ہوں تاکہ آپ کا دل میری طرف سے میلانہ ہو۔“

”مگر اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”مجھے میگزین سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”میں سمجھتی ہوں سر!“ وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ میری بات سن لیں۔ ہو سکتا ہے پھر زندگی بھر مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہے کہ آپ کے نزدیک میری وضاحت کی کوئی اہمیت نہیں مگر میں کیا کروں؟ میں آپ کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کوشش میں، میں اپنی نظروں سے بھی کر جاؤں گی۔“

”اچھا۔ ٹھیک ہے، کہو۔“ میں نے کہا۔ میں فون بند کرنا بھی چاہ رہا تھا اور اُسے سنا بھی چاہتا تھا۔ گو گو کی کیفیت سے من میں بیزاری پیدا ہو رہی تھی جو میرے رویے سے بھی حیاں تھی۔

”میں نے آپ کو مسز فردوس کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ مجھے فوجی کیمپ اسپتال میں ملی تھیں۔ سر! آپ میری بات سن رہے ہیں ناں؟“

”سن تو رہا ہوں مگر یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ جن باتوں سے میرا تعلق نہیں، وہ سنانے پر تم کیوں بھند ہو؟“

”سر پلیز..... آپ نے میری بہت سی باتیں سنی ہیں۔ ایک یہ بھی سن لیجئے۔ پھر شاید آپ کو بھی یہ تکلیف نہیں دوں گی۔“ اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ”سر! میں بتا رہی تھی کہ مسز فردوس مجھے ملیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ پنڈی لے آئیں۔ یہاں علاج معالجہ کرواتی رہیں، پھر لاہور لے گئیں۔ انہوں نے میرے علاج پر بہت پیسا خرچ کیا تھا۔ کوئی بھی شخص بغیر کسی مقصد کے اتنی بڑی قربانی نہیں دیتا۔ جب میں ٹھیک ہو گئی تو انہوں نے اپنے کسی ملنے والے سے میری شادی کا منصوبہ بنایا۔ میرے انکار پر انہوں نے مجھے ایک سال کی مہلت دے دی۔ ایک سال بعد پھر کوئی اور امیدوار میدان میں آ گیا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ میرے پُر زور اصرار پر پھر مہلت دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ اب پھر وہی مرحلہ درخشاں ہے۔“ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی لکھی ہوئی

تحریر پڑھ رہی تھی۔ ایک ذرا سانس لے کر بولی۔ ”مگر اس مرتبہ وہ میری بات ماننے پر ہرگز آمادہ نہیں ہو رہیں۔ میری پوزیشن کمزور ہے۔ میں انہیں ناراض نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ہفتہ کے روز شادی کا فیصلہ کرتے ہوئے مجھے اپنی کوٹھی میں محدود کر دیا ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتی ہوں کہ آپ کو بروقت مطلع نہ کر سکی۔“

میرا خاصہ تحلیل ہو گیا۔ دل مٹھی میں آ گیا۔ سانس لینی محال ہو گئی اور فون میرے ہاتھ میں لرزنے لگا، وہ بولی۔ ”سر! کیا آپ سن رہے ہیں؟“

میں نے جی کڑا کیا، کہا۔ ”ہیں؟“

وہ بولی۔ ”جی سر!“

”میں نے تمہاری معذرت قبول کر لی۔ کچھ اور؟“

وہ رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں اٹھوڑوں کی طرح میرے ذہن میں ضربیں لگانے لگیں۔ میں اُسے دلاسا دینا چاہتا تھا، کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زبان گنگ ہو گئی۔ فون بند ہو گیا۔ میں نے بے جان انداز میں فون گود میں رکھ دیا۔ ڈیپلے تاریک ہو گیا۔ یوں لگا جیسے میری زندگی بھی تاریک ہو گئی۔ خیال آیا کہ وہ مسز فردوس کی خوشی پر سر جھکا رہی تھی مگر دل سے افسردہ تھی۔

میں نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ مہر ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ بے اختیار فون سیٹ کو دیکھا۔ دل میں خیال پیدا ہوا کہ اُسے فون کر کے بتائے کہ دوں۔ اسی نمبر پر کال بیک کی۔ اُس نے پہلی ٹون پر ہی کال انیڈ کر لی۔ وہ ابھی تک رو رہی تھی۔ پوچھ رہی تھی کہ میں نے اُسے کیوں فون کیا تھا۔ میں جو کہنا تھا، بھول گیا، جو نہیں کہنا چاہتا تھا، کہہ گیا۔ ”مریم! تم نے میرے کام میں حرج پیدا کیا، اس کی معافی مانگ لی۔ مگر تم نے اُس مشکل کو چھیننے پر عداوت کا اظہار نہیں کیا جو تمہارے وجود نے میری اندھیری زندگی میں روشنی کی تھی۔ کیوں؟ بھلے تم نے میرا ہاتھ نہیں ٹھاما تھا، مگر تمہیں علم تو تھا کہ میں کتنی شدت سے تمہیں چاہنے لگا تھا۔ کیا تم اس پر عداوت کے دو چار الفاظ دے کر مجھے تھوڑا سا اعتبار نہیں دے سکتی تھیں؟“

میری آواز میں اتنی تلخی تھی کہ میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”تو کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نوکری چھوڑنے پر رو رہی ہوں؟“

اس نے اتنے بے ساختہ انداز میں کہا تھا کہ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ میں نے بے اختیار اپنا سینہ مسلا۔ تو انا نیاں جمع گئیں، کہا۔ ”مریم! یہ تم نے کیا

کہہ دیا۔ کیا واقعی تم مجھے چھوڑنے پر دھمکی ہو؟“

اس کی تاپ گویائی ماند پڑ گئی۔ سسکیاں صرف دکھ کا اظہار کرتی رہیں، کوئی دلاسانہ دے سکیں۔

میں نے کہا۔ ”کیا تم سے مل سکتا ہوں؟“

”نہیں سر! مسز فردوس نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے۔“

”کیا تم اس شادی سے انکار نہیں کر سکتیں؟“

”نہیں سر! میں احسان فراموش نہیں بننا چاہتی۔“

”یہ ظلم ہے جسے برداشت کرنا از خود ظلم ہے۔“

”نہیں سر..... وہ مجھ پر ظلم نہیں کر سکتیں اور نہ ہی میں انہیں انکار کر کے اپنی ذات کی نفی کر سکتی ہوں۔“

بننا سوچے میرے منہ سے نکلا۔ ”مریم! میرا کیا ہوگا؟ یہ تم نے سوچا تک نہیں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”سر!“ اس نے ہمر پور مزاحمت کرنا چاہی مگر اس کی مزاحمت ایک ہی لفظ پر دم توڑ گئی اور اس نے فون بند کر دیا۔ میں خواہش کے یاد جو درمی کال نہ کر سکا اور فون ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھا رہا۔ مہر آ گئی۔ مجھے دیکھ کر چوکی۔ فون ہاتھ سے لے کر کال کاؤنٹر چیک کرنے لگی، بولی۔ ”کیا کہا اُس نے؟“

اس نے معاملے کی تہ میں پہنچنے میں بہت کم وقت لیا تھا۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا تو اُس نے مریم سے پوچھنے کے لیے فون کا سہارا لے لیا۔ کال ریسیو ہونے پر بولی۔ ”مریم ہوناں؟“

مریم کی آواز سن کر مہر نے مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھا اور بیڈ روم سے نکل کر بکن میں چلی گئی۔ شاید وہ میری موجودگی میں مریم سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فون اٹھائے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ اُس کے چہرے پر غصے کے آثار ہویدا تھے۔ بولی۔ ”تم نے اُسے ایسا کیا کہہ دیا کہ وہ روئے جارہی ہے۔ کچھ بھی بتا نہیں رہی۔“

میں نے کہا۔ ”اس نے معذرت کرنے کے بعد کہا تھا کہ ہم کسی اور کو ملازمت پر رکھ لیں۔“

”تو تم نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے اُس کی معذرت قبول کر لی۔“

”اور؟“ اس کی آنکھوں میں تشکیک کی پرچھائیاں لرزیں۔

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے آنکھیں چرائیں۔

”پھر وہ رو کیوں رہی تھی؟“ از دو اجی زندگی میں پہلی مرتبہ مہر کا رویہ شک آلود ہوا۔

”کہا تو ہے.....“

”مگر بہت کچھ چھپایا ہے۔ ہے ناں؟“

”میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا اور رخ پھیر لیا۔

اس نے کئی مرتبہ مریم کو کال کرنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ بے سود رہی تو فون کو ایک طرف اچھال کر بیڈ پر دراز ہو گئی۔ اس نے اپنا بھاری بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ یہ اُس کے سوچنے کا مخصوص انداز تھا۔

میں بھی سوچ رہا تھا۔ مریم نے اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ میرے دل میں جس کیوں پیدا ہو گیا تھا؟ کیوں سانسوں پر پڑمردگی چھا گئی تھی؟ میرا ذہن اذیت میں مبتلا تھا اور مریم کے مقابل میری حیثیت کا تعین کر رہا تھا۔ جب میرے روم روم میں جوانی کی لہریں دوڑتی تھیں، تب میں نے بزدلی کا مظاہرہ کر کے اپنا مستقبل تاریک کر لیا تھا۔ اس شام، جب میں جوانی کی دلہیز سے پندرہ برس آگے بڑھ گیا تھا، میں نے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ ایک دم کھڑا ہوا۔ شال اٹھائی۔ مہرونے چونک کر پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں مریم کی طرف جا رہا ہوں؟“

”اس وقت؟ مگر کیوں؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور تیز تیز قدموں سے چلا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔ عبدالکریم کو آواز دی۔ چند لمحوں بعد وہ میرے سامنے تھا۔ مہرونے میرے عقب میں آن کھڑی ہوئی تھی، بولی۔ ”وسیم! بے وقوفی نہ کرو۔“

میں نے اُس کی تنبیہ پر کان نہیں دھرا۔ عبدالکریم کو مخاطب کیا۔ ”گاڑی نکالو۔“

اس نے مہرونے کو اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ میں برہمی سے بولا۔ ”اُدھر کیا دیکھتے ہو؟ گاڑی نکالو۔“

مہرونے میرے شانے پر ہاتھ رکھا، نرمی سے بولی۔ ”وسیم پلیز! تم اس وقت مسز فردوس کے بیٹکے پر جا کر دانش مندی کا ثبوت نہیں دو گے۔“

عبدالکریم کو جوں کا توں کھڑا دیکھ کر میرا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ ”عبدالکریم! گاڑی نکالو اور نہ بہت برا نہیں آؤں گا۔“

بچی وہ لمحہ تھا جس نے مجھ سے سوچنے بجھنے کی طاقت چھین لی تھی۔ اگر پندرہ برس پیشتر یہی لمحہ مجھ پر اتر آتا تو شاید میں اپنی من چاہی دنیا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میری برہمی کو دیکھتے ہوئے مہرونے ہتھیار ڈال دیے۔ شکست خوردہ انداز میں بولی۔ ”عبدالکریم! صاحب کا حکم مانو اور ان کے ساتھ اسلام آباد جاؤ۔“

عبدالکریم کے اعضا میں برق دوڑ گئی اور وہ پوری طرف بھاگ گیا۔ میں نے بیٹکے سے نکلنے ہوئے پلٹ کر مہرونے کی طرف نہیں دیکھا تھا مگر قدموں کی چاپ سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شیراز کشادہ سڑک پر فرار لے بھر رہی تھی۔

میں بجایا طور پر اپنے حواس میں نہیں تھا ورنہ غیر دانشمندانہ انداز اختیار نہ کرتا۔ مسز فردوس کو میرا آنا بجایا طور پر اچھا نہیں لگا تھا۔ کچھ دیر تک شعلہ بار نظروں سے گھورتی رہی پھر بولی۔ ”میں یہ تو جانتی ہوں کہ تم مریم کے لیے آئے ہو مگر حیران اس بات پر ہوں کہ تم اُس میں اتنی دلچسپی کیوں لینے لگے ہو؟“

میں نے اس کے لہجے کی غیر معمولی کاٹ کو نظر انداز کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا۔ ”میں اُس سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔“

وہ بہت دلیر اور سخت گیر قسم کی عورت تھی۔ میرے سخت لہجے پر نہ تو جربز ہوئی اور نہ حیران۔ بے خوفی سے بولی۔ ”کیوں؟ کیا تم نے اُسے چپ اور راہ چلتی لڑکی سمجھ لیا ہے؟“

میرے ہونٹ ہنچ گئے۔ ”اگر ایسا سمجھتا تو دوسری مرتبہ آپ کے پاس نہ آتا۔“

وہ بجائے مزید پھرنے کے، مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ اپنی کھلی ہتھیلیوں کو ایک ادا سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”وسیم بھروانا! تم شاعر ہو۔ ہماری سوسائٹی میں ایک شاعر کا کیا مقام ہے؟ بخوبی جانتے ہو۔ میں بھی جانتی ہوں کہ جس شخص کی گزر بسر اپنی بیوی کی آمدنی پر ہوتی ہو، اُسے عملی زندگی میں کتنا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہوں ناں؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں صرف مریم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اُسے میری قطعیت ناگوار لگی، بولی۔ ”وہ تم سے نہیں مل سکتی کیونکہ اُس کی شادی طے پا چکی ہے۔ اگر تم یہ سوچ کر آئے ہو کہ اُس سے مل کر اُسے نوکری پر آمادہ کر لو گے تو صاف بتائے دیتی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔“

مجھے اُس کا انداز مخاطب کل رہا تھا۔ مارے غصے اور بے بسی کے میرا سر درد کرنے لگا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی حیثیت کا جائزہ لیا۔ اپنے آپ کو بے حد کمزور اور بے اختیار پاتے ہوئے اپنے مزاج کو ٹھوکر ماری اور اس بگڑی ہوئی امیر زادی کی منت سماجت کی مگر وہ لُس سے لُس نہ ہوئی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ میں ایک ہی لمحے میں فیصلہ کر گزرا۔

سر اٹھایا اور پختہ لہجے میں گویا ہوا۔ ”اُدکے مسز فردوس! یوں ہی سہی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اُس کی شادی کا فیصلہ کر لیا ہے مگر میں پھر بھی اُسے پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ سے تعاون کریں۔“

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ مجھے خوف محسوس ہوا، کہا۔ ”مجھے توقع ہے کہ مریم میری پیشکش قبول کر لے گی۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔“

اس کا ردِ عمل غیر فطری سا لگا۔ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئی یا اداکاری کرنے لگی۔ کئی لمحوں بعد لمبی سانس لے کر بولی۔ ”تمہاری مالی پوزیشن اس ارادے میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی؟“

میں نے یقین سے کہا۔ ”نہیں!“

”کیا تمہاری مسز کو اعتراض نہیں ہوگا؟“

”نہیں۔“ میرا لہجہ کھوکھلا نہیں تھا۔

”اُدکے..... میں جا کر مریم سے بات کرتی ہوں۔“ وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ مجھ پر ایک کڑی نگاہ ڈال کر اندر چلی گئی۔ اُس کے انداز سے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے مجھے مستقل طور پر بھگانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اس کے عقب میں مریم بھی سر جھکائے چلی آ رہی تھی۔ میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ مسز فردوس نے اُسے میرے سامنے صوفے پر بٹھایا، چلتی اور ایک ذرا رک کر بولی۔ ”تم دونوں مل بیٹھ کر کسی فیصلے پر پہنچنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں سونے کے لیے جا رہی ہوں۔ اور وسیم! اگر تم اپنا مقدمہ جیت جاؤ تو مریم مجھے مطلع کر دے گی۔ گڈ نائٹ!“

اس کے اعتماد نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے جانے کے کافی دیر بعد تک غمی غمی ٹھٹھوں والا شریر پردہ ہلتا رہا، موسیقی پھونپتی رہی اور میں سر جھکائے بیٹھی مریم کو دارفہ اور امید پھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ قطعی طور پر نارمل اور سنجیدہ تھی۔ فون پر دل فگار انداز میں رونے والی مریم اور میرے سامنے بیٹھی ہوئی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ میں نے کہا۔ ”مریم! کیا میں واقعی ایب نارمل ہوں؟“

اس نے میری طرف دیکھے بغیر نفی میں سر ہلایا۔

”اس کے باوجود تم مجھے چھوڑ آئیں؟“

”ہوں!“ وہ ہولے سے بولی۔

”خیر! جو ہوا، سو ہوا۔ اب میں تمہیں لینے کے لیے یہاں چلا آیا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟“

اس نے چہرہ اٹھایا۔ مجھے دیکھا۔ آنکھیں زندگی کے

تمام رنگوں سے آراستہ تھیں، بولی۔ ”کس حیثیت سے؟“

”میں اپنی زندگی کے لیے سہارا مانگتے آیا ہوں۔ تم شریک حیات بن کر میرے ساتھ چلو گی؟“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرا دیوانگی آمیز دعویٰ سن کر خوش ہوئی تھی یا محفوظ، بولی۔ ”کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟“

”نہیں..... مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا اور امید بھری نظریں اس کے خوب صورت چہرے پر مرکوز کر دیں۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ”مگر ہماری شادی نہیں ہو سکتی سراسیمہ مجبور ہوں۔“ اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ”تاہم مجھے تا عمر فخر رہے گا کہ مجھ بے شرم کے لیے اتنا بڑا آدمی بے چین اور مضطرب ہوا۔ شادی کا خواہش مند بھی۔ مگر سراسیمہ نے بتایا تھا ناں کہ میں مسز فردوس کی زیر بار ہوں۔ انہوں نے مجھ پر پانی کی طرح پیرسا بھیا تھا۔ کسی رشتے ناتے کے بغیر۔ مجھے فوجی کیمپ سے اٹھا کر نئی زندگی دی ورنہ تو اس کیمپ اسپتال سے کوئی بچ کر نہیں نکلتا تھا۔“

اس نے اپنا سر جھک لیا اور خشک لب کیلے کر لیے، کہا۔ ”سراسیمہ میں بھی مر چکی ہوتی اگر وہ مجھے پھنسی نہ لے آئی ہوتی۔ انہوں نے تیسری مرتبہ میری شادی طے کر دی۔ میں نے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ آپ کی محبت کے بارے بتا دیا اور چاہا کہ میں آپ کی شریک ذات بن جاؤں مگر انہوں نے ایسی شرط عائد کر دی جسے میں پورا نہیں کر سکتی تھی، آپ بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔ اس لیے میں نے اپنی خوابوں بھری آنکھیں بند کر لیں۔“

مجھے احساس ہوا کہ اس کے الفاظ اور لہجہ ہم آہنگ نہ تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ شرط کیا تھی؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ”کوئی فائدہ نہیں سراسیمہ آپ کی محبت ہمیشہ دلاسا اور تقویت دیتی رہے گی۔ آپ کے لیے دنیا اچھے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ اب آپ جاگیں اور مجھے اس غزل کی طرح بھلا دیں جو ذہن کے پردے سے کاغذ تک منتقل نہیں ہو پاتی اور شعور میں ہی تحلیل ہو جاتی ہے۔“

میں اٹھا۔ اس کے قریب جا کر پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کا سر اٹھا کر آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ محبت کی روداد میں ایسا ہونا ممکن ہے؟“

اس کی لرزیدہ آواز کانوں پڑی۔ ”سر پلیز!“

میری وحشت آنکھوں میں عود آئی۔ ”نہیں! مجھے وہ

شرط بتاؤ جو مسز فردوس نے تمہیں مجھ سے دور کرنے کے لیے عائد کی تھی؟“

اس نے پیش و پس سے کام لیا مگر میرے دیوانہ وار اصرار پر ہار گئی، بولی۔ ”سرا! دنیا اتنی آسان اور مہربان نہیں ہے جتنی دکھائی دیتی ہے۔ یہ آپ نے کہا تھا۔ کہا تھا ناں؟..... یہاں ہر جذبے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ مسز فردوس نے میرے علاج پر بہت بڑی رقم خرچ کی تھی۔ کوئی بلا وجہ تو اتنی بڑی قربانی نہیں دیتا ناں۔ اب وہ کہتی ہیں کہ اگر تم اپنی مرضی کی شادی رچانا چاہتی ہو تو میری رقم میری ہتھیلی پر رکھ کر میری زندگی سے نکل جاؤ۔“ مریم کی آواز بھرا گئی۔ آواز کی تال پر ہونٹ لرزنے لگے۔ ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر سسکتے ہوئے بولی۔ ”سرا! میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں، انہیں دس لاکھ روپے کہاں سے لا کر دے سکتی ہوں۔“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مسز فردوس کا حقیقی رخ میری نظروں میں گھوم گیا۔

”نہیں مریم! یہ انسانوں کی خرید و فروخت کا عہد نہیں ہے۔“

”مگر زندگی کے فیصلے ضرور بکتے ہیں۔“

”سرا! آپ نے اپنا سر تمام لیا۔ وہ مزید بولی۔ ”سرا! آپ نے شرط دریافت کر کے مجھے ہلکا کر دیا۔ اب آپ جائیں۔ میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھوں گی۔“ اس کی آواز میں بلا کا دکھ تھا۔

”ٹھیک ہے۔ ایک سوال کا جواب دے دو تا کہ مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی رہے۔ کیا تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی جگہ ہے؟“

اس کا سرا ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اس کی آنکھوں کے تاثر نے میرا پورا وجود سن کر دیا، بولی۔ ”سرا! آپ یہ جانے بغیر یہاں تک کیوں چلے آئے؟“

”جو پوچھا ہے، اس کا واضح جواب دو۔“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”تھوڑی سی جگہ؟ میرے دل میں؟..... نہیں سرا! میں نے تو پورا دل، اپنے احساسات سمیت آپ کو دے دیا تھا۔ تب بھی، اب بھی..... پر اپنی قیمت لگتی دیکھ کر ٹوٹ گیا۔ بس! اب آپ جائیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

میں اٹھا۔ میز کے گرد گھوم کر وال پیینٹنگ تک گیا۔ کمر پر ہاتھ باندھ کر سرو لہجے میں بولا۔ ”مجھے مسز فردوس کی شرط منظور ہے۔ اسے جا کر کہہ دو کہ میں دو تین روز تک دس لاکھ روپے لے کر تمہیں لینے پہنچ جاؤں گا۔ مگر یاد رہے کہ یہ

تمہارے دل کی قیمت نہیں ہے بلکہ اس لمحے کا خراج ہے جس میں انسان اپنی مرضی کا فیصلہ کرتا ہے۔“

وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ حیرت بھری آواز میں بولی۔ ”مگر آپ اتنی بڑی رقم میری خاطر کیوں ضائع کریں گے؟ آپ کو دنیا میں مجھ سے بہتر لڑکی مل سکتی ہے۔“

میں نے جواب نہ دیا۔ چند لمحے یک ٹک اُسے دیکھتا رہا پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں واپس آنے کے لیے جا رہا ہوں۔ انتظار کرنا۔ مسز فردوس سے کہہ دینا کہ میں دو تین دنوں تک اُسے رقم دینے اور تمہیں لے جا کر ہاسٹل چھوڑنے کے لیے آؤں گا۔ وہ تمہاری شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ ہاسٹل پہنچنے کے بعد اگر تم چاہو گی تو میری دنیا میں روشنی کرنے آ جاؤ گی۔ چاہو گی تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری دنیا سے نکل جاؤں گا۔“

اس کی آنکھوں نے مجھے رُکنے کی استدعا کی۔ میرے تھمنے پر قریب آئی۔ ہاتھ تمام کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ چند لمحے عشق کی آتش کی حدت کو محسوس کرتی رہی پھر جذبات سے مغلوب لہجے میں بولی۔ ”سرا! کیا آپ نے فیصلہ کرنے میں عجلت نہیں کی؟“

”ہاں مگر زندگی کو اس عجلت پر ہمیشہ غرر ہے گا۔“ اس کی گرفت کی طرح میری آواز بھی کپکپا گئی۔ اس کا تپا ہوا بدن ایک دم ڈھیلا ہوا اور میرے سینے میں سما گیا۔ میں نے اس کی دونوں بند آنکھوں کو فوراً اعتماد سے چوما اور اُسے خود سے علیحدہ کر دیا۔ اس میں شاید مجھے پھر روک لینے کی سکت نہیں رہی تھی اس لیے ساکت کھڑی دیمچتی رہی اور میں ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔ گیٹ وے پر کھڑی شیراڈ میں بیٹھ کر عبدالکریم کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”گھر چلو۔“

مہر و بیڈ روم میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر تن گئی، مستفسر ہوئی۔ ”کیا بتاؤ؟“

میں نے کہا۔ ”مسز فردوس نہیں مانی۔“

میرا جواب اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ لمبی سانس لے کر بولی۔ ”کیا کہا اس نے؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شال صوفے پر اچھالی اور بیڈ پر گر گیا۔ میری توقع کے مطابق اس نے مجھے کریدنے اور کچھ پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر ہمیشہ کی طرح ناکام ہوئی۔ دروازہ اور لائٹ بند کر کے سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس کی سانسوں کی آواز کمرے کے غیر معمولی سکوت میں گونجنے لگی تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور دس لاکھ روپوں کے حصول کے بارے سوچنا شروع کر دیا جو

مجھے دو تین دنوں میں مسز فردوس کے ہاتھ پر رکھتے تھے۔ اگلی صبح میرے رومی طور پر روکنے کے باوجود مہر و میگزین اٹھانے کے لیے پریس پر چلی گئی تو میں نے اس کی الماری کی تلاش لی۔ اپنی مطلوبہ فائل نکال کر بیڈ پر رکھ کر کھول دی۔ اس فائل میں اس نے ان تمام رقوم کا حساب لکھ رکھا تھا جو اسے گریجویٹ، جی پی فنڈ اور جامدادی بچتے پر میسر آئی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے تمام جامدادی ڈالی تھی یا کوئی باقی رہی۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی آمیز مسرت ہوئی کہ اس نے مجھ سے مختار نامہ حاصل کر لینے کے باوجود میری جامدادی کو فروخت نہیں کیا تھا۔ میرا دل مرے پر محیط تو تعمیر شدہ گھر بھی محفوظ تھا جو چنیوٹ شہر کے قلب میں واقع تھا۔ میں اگر صرف اسی مکان کو بیچ دیتا تو میرا ٹارگٹ پورا ہو سکتا تھا۔ مکان کی مالیت بجا طور پر دس لاکھ سے اوپر تھی۔ مکان کے علاوہ زرعی زمین بھی محفوظ تھی جو ٹھیکے پر دی جا چکی تھی۔

تجسس کے مارے میں نے مہر کی ترتیب دی ہوئی فائل پوری پڑھ لی۔ اس نے ہاتھ لگنے والی خطیر رقم خرچ کر دی تھی۔ تفصیل خرچ کے صفحے پر اس نے معمولی رقم کا اندراج بھی تفصیل کے ساتھ کر رکھا تھا مگر آخری خرچ شدہ رقم جو پندرہ لاکھ روپے تھی، کی تفصیل والا خانہ خالی تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اتنی بڑی رقم سے کیا خریدا تھا؟ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کی تفصیل لکھتا بھول گئی تھی۔ بجا طور پر اس نے اس خرچ کی نوعیت کو فائل دیکھنے والے سے چھپانا چاہا تھا۔ میں نے کندھے اچکائے اور فائل کو الماری میں رکھ کر چنیوٹ جا کر مکان بیچنے کا لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔

دوبچے کے قریب جب مہر لوٹی، میں چنیوٹ جانے کی تیاری کر چکا تھا۔ وہ میگزین کی ایک کاپی لہراتے ہوئے بیڈ روم میں آئی۔ خوشی سے بولی۔ ”وہیم! دیکھو تو کتنا خوبصورت ہے یہ!“

مجھ پر نظر پڑتے ہی چونک گئی۔ سرتاپا حیرت سے دیکھ کر ساکت ہو گئی۔ میگزین والا ہاتھ بے جان انداز میں نیچے گر گیا، بولی۔ ”تم کہیں جا رہے ہو؟“

”ہاں! میں چنیوٹ جا رہا ہوں۔“

”مگر کیوں؟“ استغاب آمیز آنکھوں میں تشویش کی لہر کھل گئی، بولی۔ ”گھر میں سب خیر تو ہے نا؟“

میں نے آنکھیں چرا لیں۔ ”سب خیر ہے۔ میں ضروری کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔“

”ضروری کام؟“ اس کے لبوں سے کھمبہ خیر نکلا۔ سوچ

میں پڑ گئی۔ میگزین کی خوشی ہوا ہو گئی۔ اوپر تلے کئی سوال کر کے ٹھک گئی اور سر ہٹام کر بیڈ پر ٹپک بیٹھی۔ شکست خوردہ انداز میں بولی۔ ”مجھے اپنی پریشانی میں شامل نہیں کرتے ناں! نہ سہی۔ میں پہلے بھی کب تمہاری دنیا کا حصہ تھی۔ جاؤ! یہ مدد شوق اپنا ضروری کام سرانجام دو۔“

میں اُسے کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ مسز فردوس کی شرط بن کر چونک جاتی اور خطرے کی بو محسوس کرتے ہی اکڑ جاتی۔ یوں میرا سفر آغاز میں ہی مسدود کر دیا جاتا۔ میں نے بہت سوچ کر فیصلہ کیا تھا کہ جب مریم کو فردوس کی تحویل سے نکال کر کورٹ میرج کر لوں گا، تب میرا لٹا کو بتاؤں گا تا کہ وہ میرے راستے میں حائل نہ ہو سکے۔ میں نے حکمانہ انداز میں کہا۔ ”عبدالکریم! مجھے پیرودھائی کے بس اسٹیڈ پر ڈراپ کر دو۔“

اس نے بغیر کسی پیش و پس کے گاڑی نکال لی۔ میں چار بجے سرگودھا جانے والی انٹرکنٹیننٹل بس میں سوار ہو چکا تھا۔ سرگودھا سے مجھے بے آسانی چنیوٹ جانے والی بس یا ویکن مل گئی اور توقع کے مطابق تو بجے گھر پہنچ گیا۔ اماں اور ابائی نے مجھے دیکھا۔ بے پناہ خوش ہوئے۔ اکیلے آنے پر شکریہ بھی ہوئے۔ پندرہ سالوں سے ذہن پر مسلط جھجک آڑے آئی اور میں بہت زیادہ باتیں کرنے کی خواہش کے باوجود ہاں اور ہوں تک محدود رہا۔ میری آمد کی اطلاع آنا قانا خاندان بھر میں پھیل گئی اور بھائی اور کزنز جمع ہونے لگے۔ انہیں مہر سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں میرے بدلاؤ کی توقع تھی مگر میں نے انہیں دانستہ طور پر مایوس کیا۔

کھانے کے بعد میں نے ابائی سے کہا۔ ”ابائی! میں اپنا مکان بیچنے آیا ہوں۔“

ابائی نے میری ماں کی طرف دیکھا۔ مکان کی فروخت کا دکھ اپنی جگہ، میرے بولنے کی خوشی دونوں کے چہروں پر رقصاں ہو گئی۔ بڑا بھائی بولا۔ ”شکر خدا کا، وہیم کی آواز تو کالوں میں پڑی۔“

چھوٹا بھائی بولا۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ باجی مہر ایک دن وہیم کا دل جیت لے گی۔“

میرے بھائی مہر کو بھائی کے بجائے باجی کہا کرتے تھے۔ بڑی بہن نے پوچھا۔ ”مگر تم اپنا مکان کیوں بیچنا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”مکان میرا ہے۔“

میں نے دانستہ طور پر ادھورا جواب دے کر سمجھانے کی

کوشش کی تھی کہ مکان میرا ہے اور میں جب چاہوں اُسے بیچ سکتا ہوں، کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود سبکی نے میرے اقدام کی مخالفت کی۔ باری باری مہر، لٹا، سونو، پر رابطہ کر کے صورت حال جاننے کی کوشش کی مگر مہر کا فون بند تھا۔ یہ خلاف معمول بات تھی کیونکہ مہر اپنا فون ہمیشہ آن رکھتی تھی۔ شاید میرے رویے نے اُسے ہرٹ کیا تھا۔

اماں نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں، پیار کیا اور کہا۔ ”پتر! اگر تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ۔ تمہارے بھائی رقم کا بندوبست کر دیں گے۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میں کسی کا احسان نہیں لوں گا۔“

”پتر! میں جانتی ہوں کہ تم آلنا (گھونسلہ) چھوڑ چکے ہو۔ کبھی لوٹ کر یہاں رہنے کی نیت سے نہیں آؤ گے۔ یہ مکان تمہارے کام نہیں آئے گا مگر میرا دل نہ دکھاؤ۔ میں اسے تمہاری نشانی سمجھ کر دل سے لگائے بیٹھی ہوں۔ آنکھیں بند کر لوں تو بھلے بیچ دیتا۔“ ماں کا دل بھرا یا اور اس نے میرا چہرہ گود میں رکھ کر آنسوؤں سے بھگو دیا۔ میں اُس کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا مگر دکھا رہا تھا اور دل ہی دل میں شرمسار ہو گیا تھا۔ مریم کے حصول کی خاطر اپنی ضد چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اگلے دن میں نے چنیوٹ شہر کے بڑے پراپرٹی ڈیلرز سے ملاقات کی۔ مکان پر ”برائے فروخت“ کا سائن بورڈ آویزاں کیا۔ کئی لوگوں سے ملا جو پراپرٹی پر انویسٹ منٹ کرنے میں شہرت رکھتے تھے مگر شام تک حوصلہ ہار چکا تھا۔ میرے بھائیوں اور کزنز نے میرے ارادے کے گرد بہت مضبوط حفاظتی دیوار کھینچ ڈالی تھی اور مجھے ناکام کرنے کا ہر حربہ اختیار کر لیا تھا۔ دوسرا دن بھی اکارت گیا تو میں نے شام کو اماں سے کہا۔ ”اماں! مکان نہیں بکا۔ اسے بیچنے میں کم دہش ایک مہینے کا وقت چاہیے۔ اتنا وقت میرے پاس نہیں ہے۔ میرا یہاں آنے کا، زندہ رہنے کا مقصد ہی فوت ہو گیا ہے۔“

ماں نے دکھ سے مجھے دیکھا، بولی۔ ”کیا بات ہے؟“

”مجھے دس لاکھ روپے چاہئیں۔“

”کیوں؟“

”زندہ رہنے کے لیے۔“ میں نے کہا اور اس کی گود میں سر رکھ دیا۔

”بس پتر!“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اماں کچھ سوچ کر بڑے

بھائی کے گھر گئی۔ عشا کے وقت اماں کا مہن بیٹوں سے بھر گیا۔ اماں نے دو ٹوک انداز میں حکم دیا کہ سبھی حصہ ملا کر دس لاکھ روپے وہیم کے حوالے کریں۔ پیسے دیتے ہوئے دل پر ہاتھ پڑتا ہے مگر میری ماں کا حکم ٹالنا کسی کو گوارا نہ ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی جب سبھی نے مجھ سے معارف جانے بغیر اگلے دن بارہ بجے تک بینکوں سے رقوم نکلوا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ میرا ٹارگٹ پورا کر دیا۔ اماں خوش ہوئی۔ ”شکر ہے میرے لعل کی نشانی بیچ گئی۔“

میرے بھائی اور کزنز متفق تھے کہ حالات درست نہ ہونے کی وجہ سے اتنی بڑی رقم لے کر سفر پر نہیں نکلتا چاہیے۔ اس لیے بڑے بھائی نے رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائی اور مجھے چیک بنا دیا۔ میں نے چیک جیب میں ڈالا اور ابائی کے ہاتھ چوم کر گھر سے نکل آیا۔ مجھے اپنے خاندان کے بے پایاں تعاون پر فخر و انبساط کا احساس ہوا، میں اُڑا جا رہا تھا اور چشم تصور میں مریم کا دمکتا ہوا چہرہ دھڑکنوں کو بے اعتدال کر رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ جو نیکی میرے خاندان کو علم ہو گا کہ میں نے ان سے یہ رقم کیوں حاصل کی تھی تو وہ آسمان سر پر اُٹھادیں گے مگر مجھے فکر نہیں تھی۔

مجھے فیصل آباد سے اسلام آباد جانے والی کوچ پر سیٹ مل گئی جس نے مجھے دس بجے رات جی ٹائن بس اسٹیڈ پر اتار دیا۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور مسز فردوس کے بیٹکے کا رخ کیا۔ سڑکی روایتی تھکن پر کامیابی کی مسرت غالب تھی اور مسز فردوس کے ڈرائنگ روم میں قدم رکھنے کا انداز قاتحانہ تھا۔

اس نے زیادہ انتظار نہ کروایا اور دس منٹ بعد سنجیدہ چہرہ لیے میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے رسا کچھ کہے بغیر چیک نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے چیک کا بہ نظر غور جائزہ لیا، بولی۔ ”اسے اکاؤنٹ میں جمع کرانا پڑے گا۔ تین چار دن مئی ٹرانسفرنگ میں لگ جائیں گے۔ اس دوران یہ چیک باؤنس بھی ہو سکتا ہے۔ اچھا ہوتا کہ رقم آن لائن کروا دیتے۔“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس آپ کا اکاؤنٹ نمبر نہیں تھا تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ باؤنس نہیں ہوگا۔ آپ اپنی تسلی کر سکتی ہیں۔“

اس نے چیک ایک ذرا فحوت سے میز پر اُچھال دیا اور مجھے حسب عادت گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شاعر کے پاس اتنی بڑی رقم کی موجودگی میرے لیے حیران کن ہے۔“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے پوچھا ہو۔ ”کیا

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ کچھ دیر تک پیشانی سہلاتی رہی، سوچتی رہی پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ جو بھی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہوئی، فون پر مطلع کروں گی۔ تم آکر مریم کو لے جانا۔“

میری آنکھوں میں تشکیک اور عدم اعتماد کے تاثرات دیکھ کر سخت لہجے میں بولی۔ ”وسم بھروانہ! یہ اتنی بڑی رقم نہیں ہے جس کی خاطر فردوس خانم اپنی زبان سے پھر جائے۔“

میں نے کہا۔ ”میرے نزدیک رقم کی نہیں، مریم کی اہمیت ہے۔ اگر آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا تو احسان ہوگا ورنہ.....“

میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ استہزاء سے انداز میں بولی۔ ”کیا ورنہ؟“

میں نے صوفہ چھوڑ دیا۔ اس پر ایک شعلہ بار نظر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایسے میں پلٹا اور انگلی اٹھا کر نہایت سرد آواز میں بولا۔ ”ورنہ میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا کیونکہ مجھے ہر حال میں مریم کو حاصل کرنا ہے۔“

میری درشت اور سنگدلانہ دھمکی خود میرے لیے بھی باعث استعجاب تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ڈرا خوف کی پرجھائیں لہرائی مگر فوراً سنبھل کر کھڑی ہوئے بغیر بولی۔ ”دھمکی مت دو۔ میں جو کہتی ہوں، پورا کرتی ہوں۔“

میں ایک جھٹکے سے پلٹا اور ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں بیڈ روم میں مہر کی مستفسرانہ نظروں کا سامنا کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک سوئی نہیں تھی۔ مجھ سے کچھ پوچھے بغیر کھانا تیار کرنے کے لیے کچن میں کھس گئی۔ میں نے بیڈ کے سر بالیں رکھا ہوا موبائل فون اٹھایا۔ دیکھا۔ ابھی تک بند تھا۔ مجھے اس کے رویے پر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ اس کی پریشانی کا سبب میری ذات ہی تھی۔

میگزین کی اشاعت میرا خواب تھا مگر نہ جانے کیوں میں نے تمام دن دفتر کے ریٹائرنگ روم میں گزارنے کے باوجود کارڈن کھول کر میگزین دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مریم کے بعد یہ سارا گورکھ دھند ابے معانی ہو گیا تھا۔ میری طبیعت میں عود کر آنے والی سرد مہری نے مجھے مہر وے پھر دور کر دیا تھا اور میرے جملوں پر برف لٹوف کر دی تھی۔ دو دن گزر گئے مگر مسز فردوس نے فون پر رابطہ نہیں کیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس کے نمبر پر رابطہ کروں اور دریافت کروں کہ چیک اوکے ہو گیا ہے یا نہیں مگر ایک عجیب نوع کی جھجک آڑے آئی اور میں اسے فون نہ کر سکا۔

شام کو جب میں بیڈ روم میں تھا اور مہر و کچن میں

معروف تھی، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دبی دبی آواز میں کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ دل میں تجسس پیدا ہوا اور میں دبے پاؤں بیڈ روم کے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ وہ میری طرف پیٹھ کیے کھڑی فون پر کھڑی تھی۔ ”وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ دس لاکھ والا معاملہ کہاں سے نکل آیا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تمہیں اگر پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو۔ مگر تب تم نے جواب دیا تھا کہ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ اب کیا ہوا، بھوک پڑ گئی؟“

مہر و کے منہ سے ”دس لاکھ“ کا تذکرہ سن کر میں بری طرح چونک گیا۔ وہ دوسری طرف سے کبھی جانے والی بات سن کر قدرے غصے میں یونے لگی۔ ”نہیں..... یہ فیر نہیں ہے۔ تم کہتی ہو ناں کہ اس سے کیا نقصان ہوا، میں بتاتی ہوں۔ نقصان یہ ہوا کہ میں جس بات کو اپنے خاندان سے چھپانا چاہتی تھی، وہ اُن پر کھل گئی ہوگی۔ وسیم نے اُن سب کو یا کسی ایک کو ضرور بتا دیا ہوگا۔ ایسے میں انہیں مطمئن کرنا میرے لیے مشکل ثابت ہو جائے گا۔“

میری گردن پر چھوٹیاں سی رہنے لگیں۔ ذہن بھک سے اڑ گیا۔ میں نے اپنا سر تھا مگر مہر و کی باریک آواز کا راستہ روک نہ پایا۔ ”ہاں! تم میری بہت اچھی دوست ہو۔ کلاس فیلو بھی ہو۔ میری مدد کرنا چاہتی ہو..... مگر تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اب بتاؤ، آئندہ کے لیے کیا سوچ رہی ہو؟“

جواب سن کر بولی۔ ”نہیں! میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ اگر تمہیں مجھ پر یقین ہے تو چند چھوڑ دو۔ چیک باؤنس نہیں ہوگا۔ اگر ہو جائے گا تو یہ رقم میں دے دوں گی۔“

اُس کے اگلے جملے نے عیاں کر دیا کہ وہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ مطمئن ہو کر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ کل دوپہر تک اسے بیاہ دو تا کہ تمہاری جان اُس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے۔ میری پریشانی بھی ختم ہو جائے۔ یقین مانو، میں کئی راتوں سے سو نہیں پا رہی۔ دو چار دن یہی حالت رہی تو بیمار پڑ جاؤں گی۔“

فون کے اسپیکر سے پھوٹنے والی آواز سننے کے بعد قدرے اطمینان سے بولی۔ ”کل ایک بجے..... بالکل ٹھیک ہے۔ میں بھی اس معاملے کو جلد نمٹانا چاہتی ہوں۔“

کال منقطع ہو گئی تھی۔ جو بھی اُس نے فون کان سے ہٹایا، میں اُلٹے قدموں چلتا ہوا بیڈ تک آیا اور سر تھا میری میٹریں پر گر گیا۔ مہر و کیا کر رہی تھی؟ پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ فون پر کس سے باتیں کر رہی تھی؟ مسز فردوس سے یا مریم

سے یا کسی اور سے؟..... میرا سر دھکنے لگا۔ چکرانے لگا۔ دل میں اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وہ میری راہ میں مزاحم ہو چکی تھی۔ بہت چالاک اور زود فہم تھی۔ میرے بڑے سے ہوئے قدموں کو نامراد لٹانے کے لیے پوری طرح کمر بستہ ہو چکی تھی۔

تو کیا میں جیت کر بھی ہار گیا تھا؟ میں نے اُس کی ایک طرف گفتگو سے اندازہ کیا کہ وہ مسز فردوس سے مخاطب تھی۔ چاہتی تھی کہ وہ مریم کو جلد از جلد شادی کے بندھن میں پرو کر اپنا گھر اُس کے شر سے محفوظ کر لے۔ وہ میرے لیے چائے لائی تو یکبارگی میرا جی چاہا کہ گرم چائے سے بھرا ہوا گپ اُس کے چہرے پر انداز ل دوں۔ اُس کا گلا گھونٹ دوں۔ وہ کل بھی میرے لیے عذاب رساں تھی، آج بھی۔ اُس کے سیاٹ چہرے کو دیکھ کر میرا منہ کڑوا ہو گیا۔ چائے حلق میں اُٹکتے لگی اور سر گھومنے لگا۔ میں نے چائے کا کپ رکھا اور جلدی سے اُٹھ کر اپنے دفتر آیا۔ مسز فردوس کا کارڈ نکال کر اُس کا پرسل نمبر دیکھا۔ رابطہ ہونے پر اُس کی آواز سنائی دی، ”ہیلو..... کون صاحب؟“

میں جلدی سے بولا۔ ”وسم بھروانہ بات کر رہا ہوں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کل مریم کی شادی کرنے جا رہی ہیں؟“

اس کی طنزیہ ہنسی انکارے کی طرح میرے بدن میں اتر گئی۔ بولی۔ ”تو کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے؟“

میں نے دانستہ کچکچائے خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ ”مگر میں معاہدے کے مطابق.....“

اس کی شورخ ہنسی نے میرے رویں رویں میں آگ بھر دی۔ میں نے اس کے خاموش ہونے کے انتظار میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ ”میں اس دھوکا دہی پر آپ کو معاف نہیں کروں گا۔ مریم کو کوئی بھی مجھ سے دور نہیں رکھ سکتا۔ آئی ایم جسٹ کنگ ٹو پو.....“

میری آواز مسلسل ناگ کی پھنکار کے مشابہہ تھی مگر اُس نے جواب دینے کے بجائے کال منقطع کر دی۔ میں نے غصے میں دو تین مرتبہ کال کی مگر وہ زچ کرنے پر تلی رہی۔ میں نے ریسور پوری قوت سے میز کے شیشے پر دے مارا۔ شیشہ بچ گیا۔ ریسور ٹوٹ گیا۔ شدید مایوسی کے عالم میں میں نے اس وقت مسز فردوس کے بنگلے پر جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور بنگلے سے باہر نکل گیا۔ نشیب کی طرف چل دیا۔

ذہن بری طرح سلگ رہا تھا۔ بے چینی اور اشتعال سنبھالے نہیں سمجھتا تھا۔ گھٹنا بھر دوڑنے کے انداز میں چلتا رہا، پھر پسینے میں شرابور ہو کر لوٹ آیا اور ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح بیڈ پر گر گیا۔

میری توقع کے عین مطابق میرے برابر لیٹی ہوئی مہر و النسا کی چیز سانسوں کی آواز نے خراٹوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ میں نے ایک شعلہ بار نظر اُسے دیکھا اور شال کندھے پر ڈال کر بیڈ روم سے نکل آیا۔ گیلری سے گزر کر بالکونی میں آن کھڑا ہوا۔ میرے سامنے ایک کشادہ گلی تھی جس کا فرش پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ گلی کچھ فاصلے پر جا کر ایک درخت میں گم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

میں اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافی پر کڑھ رہا تھا۔ دھوکا دہی پر کھول رہا تھا۔ مہر و کو اپنی بربادی کا ذمے دار ٹھہرا رہا تھا اور پتہ دل سے اُسے قتل کرنے کا سوچ رہا تھا، تب پہلی بار مجھے میرے ضمیر نے کچوکا دیا اور دل کو ملال ہوا۔ میں نے ایک خوبصورت وجود نہ ملنے پر اپنے بہترین پتھر برس افیت میں گزار دیے تھے۔ خود ساختہ قید تھانی میں زندگی کے قیمتی مرحلے ضائع کر دیے تھے۔ نہ صرف اپنے آپ کو، بلکہ بیوی بچوں، والدین اور رشتہ داروں کو ایسی افیت میں جھلا کے رکھا تھا جس کا ازالہ بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے تجزیہ کیا، کیا زندگی کی تمام تر خوشیوں کا انحصار خوب صورت عورت کے بدن پر منحصر ہے؟..... کیا میں دنیا بھر کا حسن ایک عورت کے بدن میں سمیٹ کر دیکھنے کی ہوس رکھتا تھا؟..... کیا ایک تاریک عورت کے چہرے کو دیکھنے کے بعد انسانی آنکھ کو کسی اچالے کی طلب نہیں رہتی؟..... کیا ایک جوان سالہ حسن خیز لڑکی کو مہر و النسا جیسی بیوی پر ترجیح دی جانی چاہیے؟

مسز فردوس کی دھوکا دہی نہ سمجھ میں آنے والا عقدہ نہیں تھا۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی، بجا طور پر مہر و کے ایما پر کر رہی تھی۔ یعنی مہر و کے نزدیک میرا وجود بے معانی تھا۔ دماغ چکرایا۔ میں نے ریٹنگ تمام لی۔

پندرہ سال کمرے میں قید رہنے کی وجہ سے میری جوانی باسی ہو گئی تھی۔ روپ اجڑ گیا تھا۔ اعضا کی بجلیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ کیا میں اپنی عمر کو لوٹا سکتا تھا؟..... نہیں..... گزر جانے والا وقت نہیں لوٹا مگر آنے والے وقت کو کوئی بھی رنگ دیا جاسکتا ہے۔ جوانی کا، امید کا یا جولا نیوں سے لبریز..... میں ریت کی دیوار کی طرح ڈھلکتا ہوا فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اپنا رخسار بے رنگ کی سلاخوں سے نکا دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ جی چاہا کہ جتنے اشعار میری انگلیوں کی زبان سے فضا میں پھیلے تھے، انہیں اپنی زبان دے دوں۔ حلق پھاڑ کر غزلیں سناؤں۔ شادی سے پہلے میرا دل رومانی گیتوں کی تال پر دھڑکتا تھا۔ روٹھ گیا اور انقلاب اور نا امیدی کی قبا اوڑھ کر اپنے عشاق کو زلزلے لگا..... مریم ماہوش نے کہا تھا

کہ اُسے میری شاعری اچھی نہیں لگتی۔ اُسے سامنے نہ پا کر بھی بتانے کوئی چاہا کہ میں نے وہ شاعری بھی کر رکھی ہے جو شباب گیر دلوں کے تاروں کو چمیز کر دیوانہ بنا سکتی ہے۔

ایسے ہی وقت میں کہیں چھٹا کا ہوا۔ کوئی شیشہ ٹوٹ گیا، یا شاید دل۔ آہنی سلاخوں پر میرے ہاتھوں کی گرفت جنونی ہو گئی اور بے اختیار میں چیخ اٹھا۔ ”نہیں..... نہیں..... میں شاعر نہیں ہوں۔ میں پاگل ہوں۔ سودا کی ہوں۔ آباجی ٹھیک کہتے تھے کہ شاعر پاگل ہوتا ہے، تارک دنیا ہوتا ہے..... ہاں! آباجی ٹھیک کہتے تھے۔ میں غلط کہتا تھا کہ شاعر نے فکر اور شعور کی بات کرتا ہے۔ ہاں! میں نے غلط کہا تھا۔ میں نے وہی کچھ کیا جو آباجی نے کہا تھا۔ مگر کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ انہوں نے اپنی دو بیٹیوں کی آنکھوں کو مسکراہٹ بخشنے کے لیے میرے تمام تر مناظر قربان کر دیے تھے۔ میں نے بھانک احتجاج صرف اس لیے کیا کہ مجھے میں قربانی کا حوصلہ نہیں تھا؟ ہائے! میں کتنا بزدل تھا۔ کتنا خود غرض تھا۔“

میں کل بھی بزدل تھا۔ آج بھی ڈر پوک تھا۔ مسز فردوس نے میری آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی۔ مہرو نے میرا راستہ کاٹ دیا تھا۔ میں قانون کی مدد لینے جاتا تو قانون خانے میں سب سے پہلے مجھ سے میری حیثیت پوچھی جاتی۔ میں اگر مریم کا مدی بننا اور وہ مجھے بیچ عدالت جھڑا دیتی تو میں کتنا نامحتر ہو جاتا۔ مسز فردوس مجھ سے کہیں زیادہ مضبوط حیثیت کی مالک تھی۔ بے بسی کے شدید احساس پر میرا دل بھر آیا۔ آگ اور پانی مل کر بدن میں جنوں بھر دیتے ہیں۔ میرا جنوں آنسوؤں میں گھلنے لگا۔ مرد ہوتے ہوئے بھی مجھے عار محسوس نہیں ہوا کہ میں کسی بگڑے ہوئے بچے کی طرح بلند آواز میں رونے لگا تھا۔ میں نے ریٹنگ پر دو تین کے رسید کیے، دو تین ٹکریں ماریں پھر بڑبڑانے لگا۔ ”کہاں گیا شعور کہ میں تو عام سا انسان تھا مگر میں نے مہرو کو ناکرہ جرم کی سزا دی، کتنی؟..... پندرہ سال قید تنہائی..... وہ دلہن بن کر میری زندگی میں آئی تھی مگر میں نے اُسے آج تک چوما، دیکھا، پرکھا نہ سوچا..... صرف اس لیے کہ میرے خاندان نے اُس کی خاطر میرے خواب جس جس کر دیے۔ خواب؟ خواب کیا ہوتا ہے؟..... ایک فریب یا شعوری خواہش؟..... اور وہ پاگلوں کی طرح میرے لیے خواب جننے کے لیے بازار میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی تمام تر چیخ پوچی، زندگی بھر کی ریاضت صرف اس لیے بے دریغ خرچ کر دی کہ میرے خواب میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی صورت ایک بار جگمگا جائیں۔ ہائے! میں کتنا ظالم ہوں۔

میں نے اس کے دل میں کتنا بڑا احساس کتری اور احساس محرومی بھر دیا ہے کہ وہ پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں دوڑتی پھرتی ہے.....“

سلاخوں کے سچ سے آنکھیں کھول کر گلی میں دیکھا۔ کبھی دروازے بند تھے۔ رات دیوانوں کی طرح آگن آگن چکراتی پھر رہی تھی کہ اگر کہیں کوئی دیوانہ جاگ رہا ہو تو اُسے سلا دے مگر میں جاگ رہا تھا اور وہ میری طرف نہیں آ رہی تھی۔ شاید روٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ریٹنگ سے ہاتھیں گزرا کر پوری وسعت میں پھیلا دیں۔

ہوا کا شور مچ گیا۔ میرے اندر شور مچا ہوا گیا۔ دل چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ”رونے والے کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ ہنس، ہنساؤ..... زندگی تحریک کا نام ہے جبکہ رُکے ہوئے قافلوں کو موت گھیر لیتی ہے۔“

میں نے کھلی ہاتھوں کو سمیٹ لیا اور ریٹنگ کی سلاخوں کو سینے میں اتارنے کے لیے ہاتھوں کا پورا زور صرف کر دیا۔ شاید مجھے سانس کی گھٹن کا شدید تر احساس ہوا تھا یا میں مریم کے غیر مرئی وجود کو ہاتھوں میں کس کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت مجھے کندھے پر ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں چونک کر پلٹا۔ دیکھا کہ مہرو مجھ پر جھگی ہوئی اندھیرے کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔ ڈھارس دیتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”چلو وسیم! اندر چلو ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“

میری آنکھوں تک میں جنبش پیدا نہیں ہوئی تو وہ بیروں کے مل بیٹھ گئی اور اس نے مجھے اپنے تھل تھل کرتے ہوئے نرم وجود میں چھپالیا۔ میں اُس سے شدید نفرت کرتا تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ رونے لگا۔ کسی ننھے بچے کی طرح مہرو بھی مجھے چھپا کر رونے لگی۔ بارش ہر چھوٹے بڑے پودے پر برستی ہے۔ برابر ہبلاتی ہے۔ برابر گرد و دھول اُٹاتی ہے۔ میں بھی دھل رہا تھا۔ مہرو بھی دھل رہی تھی۔

اچانک میرے لبوں سے لکلا۔ ”مہرو! تم کب آئی تھیں؟“

”تمہارے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔“ اس کے لہجے میں مجھے نادم کرنے والا کوئی عنصر شامل نہیں تھا۔ ”وسیم! آئی لو..... آئی کیڑا باؤٹ ہو..... تم دیکھی ہو۔ یہ دیکھ کر میرا دل رو رہا ہے۔ مگر خوشی ہے کہ تم زندگی کی طرف لوٹ آئے ہو۔ زندگی خواہشوں اور خوابوں کا ہی تو نام ہے۔ رونے اور چہننے کا ہی تو نام ہے۔ ہے نا؟“

”ہاں مگر تم نے مجھے ایک بار پھر مار ڈالا ہے۔“

”کیا کہا؟“ وہ چوکی۔ اچانک اُس کی ہاتھوں کے

حلقے میں برق کووند گئی۔ مجھے کس کر جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ ”یہ تم نے کیا کہہ دیا وسیم! میں تو تمہاری پہلی موت پر روتے روتے نہیں تھی۔ ازالہ کرنا چاہتی ہوں مگر قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ میں تمہیں دنیا بھر کے انسانوں کی طرح ری ایکٹ کرتے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے غمی میں سر ہلایا۔ اس نے پوری شدت سے مجھے بھینچ لیا، زندہ گئی، بولی۔ ”وسیم! صرف ایک دن کی مہلت دے دو۔ صرف ایک دن..... جہاں پندرہ سال تم نے خاموشی سے گزار دیے، وہاں ایک رات اور سہی.....“

میں نے ہنکارا بھرا۔ آرزو کی سے کہا۔ ”ہاں! تب تک تمہارا کام مکمل ہو جائے گا۔ مگر مہرو..... کیا میں اتنا ہی برا ہوں؟..... کیا میں انسان نہیں ہوں؟..... تمہیں اُس کھنڈرے لڑکے پر ترس نہیں آیا تھا۔ بچا۔ اس ٹوٹے ہوئے شخص پر بھی رحم نہیں کرتی ہو۔ آہ!“

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ میرے بے جان وجود کو سمیٹ کر بیڈ روم میں لے آئی۔ مجھے لٹا کر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ میں بے جان پڑا رہا۔ اس کے ہاتھ جھٹک گئے۔ آہستگی سے اٹھ کر بیڈ پر دراز ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سو گئی۔

میں اُس کا خیال جھٹک کر مریم کے بارے میں سوچنے لگا جو قریب آ کر چھٹی کی طرح پھسل گئی تھی۔ یوں کہ اُس کا یا اُس کی نام نہاد حسرت کا کچھ بھی بگاڑ نہیں جاسکتا تھا۔ میں کوئی بھی قدم اٹھاتا، سوائے اپنی رقم کے، کچھ حاصل نہیں کر سکتا تھا مگر وہ رقم تو میرے لیے بالکل بے معانی تھی۔

اچانک میرا ذہن پندرہ برس پیچھے چلا گیا جب میں ایک کھنڈر اور نہایت پر جوش جوان ہوا کرتا تھا۔ نت نئی شرارتیں، آوارگیاں اور شوخیاں میرے گھر والوں کے لیے پریشانی کا سبب بنتی رہتی تھیں۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ مجھ سے بڑے تین بھائی برس روزگار ہو چکے تھے۔ وہ فطرتاً بے حد سنجیدہ حراج داغ ہوئے تھے۔ مجھ سے نالاں رہتے تھے اور سنے درے آباجی سے میری شکایت کرتے رہتے تھے۔ آباجی سخت گیر تھے۔ وہ شروع سے اپنی منوانے کے عادی تھے۔ ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ والدین کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کو بے حد معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ مجھے یہ کثرت آباجی کی کڑوی سیلی باتیں سننا پڑتی تھیں مگر مجال تھی کہ تھل آتی۔ میں نے کالج میں داخل ہوتے ہی شاعری کو اپنا اور ہٹا چھوٹا بنا لیا تھا۔ بڑے بھائیوں کو جب میرے اس شوق کا پتا چلا تو وہ بہت جربز

ہوئے۔ انہوں نے گھر میں ہنگامہ مچا کر دیا۔ آباجی بھی میرے شوق کی آبیاری کے حق میں نہیں تھے۔ کبھی گھر والے اس رائے پر متفق تھے کہ شاعر معاشرے کا ناکارہ رکن ہوتا ہے جو صرف خواب دیکھتا ہے اور ناقابل تعمیر خوابوں کو اور راق کی زینت بناتا رہتا ہے۔

وہ شاید حق بجانب بھی تھے کیونکہ انہوں نے علاقے بھر میں جتنے بھی شاعروں کو دیکھا تھا، وہ ایسے ہی تھے۔ شراب، سگریٹ، محبت پر عدم توجہی، اہتر حلیہ اور غیر عملی زندگی گزارنے کے عمل نے معاشرے میں ان کی شخصیت کو ناپسندیدہ بنا دیا تھا۔ میں نے ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آباجی کو سمجھایا کہ یہ لوگ شاعر نہیں ہیں۔ شاعر تو سلجھے ہوئے شخص کو کہا جاتا ہے۔ میری تمام دلیلیں ان کی مضبوط دلیلوں کے سامنے ہار گئیں اور آباجی نے فیصلہ صادر کر دیا کہ تم یہ فضول شوق اختیار نہیں کرو گے۔

میں نے بے ظاہر ان کی بات مان لی مگر حقیقت یہ تھی کہ میں نے کالج کے شعبہ اُردو کے صدر شکیل ارمانی صاحب کی خدمت میں اپنی ریاضت پیش کر دی۔ انہوں نے نہ صرف میری راہنمائی کا بار اٹھایا بلکہ کھلے دل سے حوصلہ افزائی بھی کی۔ میں نے اپنے آباجی کے خیالات ان پر آشکار کیے تو وہ ہنس کر بولے۔ ”انہوں نے جو کچھ دیکھا، وہی سچ ہے۔ جو تمہارے اندر سچ ہے، وہ ان کی نظروں میں لاؤ گے تو وہ مانیں گے ورنہ نہیں۔ تم بطور شاعر خود کو اچھا انسان بنا کر پیش کرو۔ ایک دن وہ تمہارے ہم خیال ہو جائیں گے۔“

آرٹس گریجیشن کے لیے پنجاب یونیورسٹی پہنچنے تک میں شکیل ارمانی کی غیر معمولی توجہ کے سبب شاعری میں نمایاں مقام حاصل کر چکا تھا۔ نوجوان لسل میرے اشعار کی دلدادہ ہو گئی تھی۔ چند مقامی گلوکاروں نے میرے لکھے ہوئے گیت گائے۔ قسمت ساتھ دے گئی اور ان گیتوں کو عوامی پذیرائی نے مقبولیت کی سند عطا کر دی۔ پنجاب یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے مشاعروں نے نہ صرف میرے ہنر کو ہمیز کیا بلکہ مجھے فرش سے اٹھا کر شہرت کے عرش پر جا گزیر کر دیا۔

مجھے کالج کے ادبی میگزین کا ایڈیٹر بنا کر گویا میری خداداد صلاحیتوں کا پہلی مرتبہ خراج پیش کیا گیا۔ ایک دوست کے توسط سے مجھ پر پی وی کا گیت چل گیا۔ میری غیر معمولی وجاہت، گفتگو کی روانی اور خود اعتمادی کی بدولت مجھے کئی پروڈیوسرز نے ڈراموں میں کام کرنے کی پیش کش کی مگر میں صرف شاعری تک محدود رہا۔

جس دن میں گریجویشن کے فائل انکراہ سے فارغ ہو کر چھوٹ کے نواح میں واقع اپنی بڑی سی حویلی میں پہنچا، آبا جی نے کئی دیکیں چڑھا دیں۔ ارد گرد کے لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آئے۔ ہار لوگ مجھے اپنے اپنے انداز میں بتاتے رہے کہ مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھ کر ان کے قلبی جذبات کیا تھے؟ تب شاید پہلی مرتبہ میرے خاندان نے میری شاعری کو دل سے قبول کیا تھا۔

میں نہ صرف اپنے بہن بھائیوں بلکہ تمام کزنز پر شکل و صورت میں برتری رکھتا تھا۔ ہر وقت مائل بہ شرارت رہنے والے مزاج کی وجہ سے سبھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ شہرت نے میرے اندر مزید رومان اور شوخیاں بھر دیں۔ ہمارے ہاں ٹیکسی جوائنٹ سسٹم تھا۔ آبا جی کے بڑے بھائی، دو چھوٹے بھائی اور میری بیوہ پھولی اپنے اہل و عیال سمیت اس بائیس بڑے بڑے دیہاتی کمروں پر مشتمل حویلی میں مقیم تھے جس کی وجہ سے گھر بجائے خود ایک چھوٹا سا گاؤں بنا ہوا تھا جس کی آبادی اڑتیس نفوس پر مشتمل تھی۔ ہر وقت گھما گھمی لگی رہتی۔ میرے تمام کزنز پڑھے لکھے تھے۔ لڑکیاں بھی پڑھ رہی تھیں یا حصول تعلیم سے فارغ ہو کر مختلف نوکریاں کر رہی تھیں۔ زمین کی آمدن کم تھی مگر تنخواہوں کی برسات کی وجہ سے ہماری گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی۔

مجھے کوئی معاشی فکر لاحق نہ تھی، پزیرائی میری تھی، اس لیے میں عمر کے بیسویں سن میں ہی شہرت کی وہ معراج پانے میں کامیاب ہو گیا تھا، جو عمر لفظوں کی بحث میں گزار دینے پر بھی شاعروں کی اکثریت کو نہیں ملتی۔ ان تمام عوامل نے میرے مزاج پر بھی اثر ڈالا اور میں مغرور اور خود سر ہو گیا۔ جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے کا عادی اور اونچی اڑانوں کا رسیا بھی تھا۔ میرا رزلٹ آیا۔ میں نے حسب توقع فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ مارکس اچھے تھے۔ بہ آسانی اردو ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن مل گیا۔ جس دن میں پھر دو سال کے لیے حویلی سے نکلنے لگا، اسی دن آبا جی کے ایک خالمانہ فیصلے نے میرے پر کتر دیے۔

گزشتہ شام کو آبا جی اور گھر کے تمام بڑوں نے بند کمرے میں بیٹھ کر میری اور مہرالنسا کی شادی کا فیصلہ کیا تھا جس کا اعلان علی الصباح، عین اُس وقت جب میں بیگ اٹھائے لاہور جانے کے لیے گمن میں آن کھڑا ہوا تھا، کر کے میرے حیدروں تلے سے زمین کھسکا دی۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنی اماں کو دیکھنے لگا جس کے چہرے پر حزن و ملال ثبت تھا۔ میں جان گیا کہ اس فیصلے تک پہنچنے کے کسی بھی

مرحلے میں میری ماں کی رائے شامل نہیں کی گئی تھی مگر نہ وہ میرے حق میں ضرور سیدہ ہو جاتی۔

مہرالنسا میرے تایا جی کی بڑی بیٹی تھی۔ اس کی عمر تیس سال تھی۔ اُسے بی کام کے فوراً بعد اکاؤنٹ آفس میں اسسٹنٹ آڈیٹر کی جاب مل گئی تھی۔ اس کا رنگ گہرا سونولا تھا۔ نقوش جاذب نظر نہیں تھے البتہ اس کی آواز بڑی باریک اور خوب صورت تھی۔ جب ہم تمام کزنز رات کو مین میں چار پائیوں پر بیٹھ کر ہلا گلا کرتے، وہ لکھنوی لہجے کے گیت گاکر سب کو محظوظ کیا کرتی۔ میری بہنیں، جو اس کی بھابھیاں بھی تھیں، ڈھولک اور تھال پر اُس کی مدھرا آواز کو موسیقی سے نوازتی تھیں۔

وہ بد صورت ہونے کے ساتھ ساتھ عمر میں مجھ سے دس سال بڑی تھی۔ میں نے اُسے ہمیشہ باجی یا بڑی آپی کہا تھا۔ میں نے آبا جی کو مخاطب کر کے کہا۔ ”آبا جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں بڑی آپی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں؟“ وہ بولے۔ ”وسیم! یہ ہمارا مشترکہ فیصلہ ہے جس پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔“

میں نے باری باری تایا جی اور چچاؤں کو دیکھا۔ کسی چہرے پر میری ہمدردی کا کوئی عکس نہیں تھا۔ کافی دیر تک گنگ کھڑا رہا پھر بیگ وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ میرا ذہن بھائیوں بھائیوں کر رہا تھا اور میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اتنی بڑی نا انصافی پر مجھے کس رد عمل کا اظہار کرنا چاہیے۔ شام تک اپنے کمرے میں بند رہا۔ ماں اور بہنوں نے بیک وقت میری دلجوئی کی اور مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ آبا جی نے نہایت موزوں فیصلہ کیا ہے۔ شام تک سبھی کو میرے احتجاج کی خبر ہو گئی۔ چھوٹے چچا نے آکر سمجھایا۔ ”دیکھ پترا! ہمیں تمہاری زندگی اور مستقبل عزیز ہے۔ بڑوں کو اپنا دوست اور اس فیصلے کو اپنی خوش بختی سمجھو۔“

بڑے چچا نے پچکارا۔ ”وسیم بیٹے! مہر و گھر کی بیٹی ہے۔ اچھی تنخواہ لیتی ہے۔ تمہیں بھی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور تمہارے بچوں کو روشن مستقبل مل جائے گا۔“

تایا نے سر پر ہاتھ رکھا، بولا۔ ”یہ نہ صرف میری بلکہ میری دونوں بہنوں کی خوشی ہے۔ ویسے بھی میں نے اپنی بیٹی پر اتنا خرچ اس لیے نہیں کیا تھا کہ اٹھا کر کسی ایسے غیرے کے حوالے کر دوں۔ وہ ہزاروں میں تنخواہ لیتی ہے۔ اس نے پرائیویٹ پڑھ کر ماسٹر بھی کر لیا ہے۔ محکمہ طور پر بہت جلد ترقی کرے گی اور تم دونوں ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کرو گے۔“

گیارہ بجے تک گھر کے ہر فرد نے مجھے اپنے اپنے انداز میں بہلایا، سمجھایا اور احتجاج ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ میں سب کی سن رہا مگر بولنا بھول گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل کی تمام تر شوخیاں فیصلے کے لمحے کی نذر ہو گئی تھیں۔ سبھی نے خیال کیا کہ میں چند ہی دنوں میں سنبھل جاؤں گا اور اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آؤں گا۔

رات کے ڈیڑھ یا دو کا عمل تھا جب بند دروازے پر ہلکی سی دستک ابھری۔ میں جاگ رہا تھا مگر میں نے اٹھ کر دروازے تک آنے کی زحمت نہیں کی۔ چونکہ دروازہ غیر مقفل تھا اس لیے چاہتا تو دستک دینے والے کو آواز دے کر بلا سکتا تھا مگر چپ رہا۔ دروازہ دو تین بار کھٹکھٹایا گیا، پھر دھکیل کر کھول دیا گیا۔ رات کے اس رازدار پہر میں مہرالنسا کو سر جھکائے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔ اس کا اس وقت آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ منہ سے کچھ بولے بغیر سوا لہ نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔

وہ بیڈ کے پاس آ کر رک گئی۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”وسیم! میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے یہ سب نہیں چاہا اور نہ کسی سے کہا ہے۔ یہ فیصلہ میری مرضی کے بغیر کیا گیا ہے۔ تم چاہو تو انکار کر دو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

میرا دل یکبارگی سمجھ سا گیا۔ منہ پھیر کر بولا۔ ”بڑی آپی! تمہیں اس وقت میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ میرے ناراض لہجے پر جانے کے بجائے قریب آ گئی۔ ”میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تمہارے منہ سے یہی لفظ اچھا لگتا ہے۔ بڑی آپی۔ اس لفظ کی مٹھاس اپنی جگہ مگر آج تمہاری آواز میں غصہ اور ناراضی ہے جو مجھے اچھی نہیں لگ رہی۔ تم مجھ سے کیوں ناراض ہو؟“

میں چشم زدن میں پلٹا۔ اُس کا ہاتھ جھٹک کر برہمی سے بولا۔ ”کہہ تو دیا ہے کہ تم میرے کمرے سے نکل جاؤ۔“ مجھے احساس تک نہ ہوا کہ میری آواز غیر معمولی بلند تھی۔ متصل کمروں میں آواز دیواریں عبور کر کے دوسرے کانوں تک فی الفور پہنچ جاتی ہے۔ ایسا ہی ہوا۔ ابھی وہ ہاتھ جوڑے میرے قریب بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور تایا جی دھناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ کولہوں پر ہاتھ رکھ کر خشکی نظروں سے ہم دونوں کو باری باری گھورتے رہے، پھر بے حد درستی سے بولے۔ ”مجھے تم سے اس بے غیرتی کی توقع نہیں تھی۔“

انہوں نے بجا طور پر مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں نے بے

حدتگی سے جواب دیا۔ ”مجھ سے کسی کو توقع نہیں ہونی چاہیے مگر آپ کو یہ دیکھنا چاہیے کہ بڑی آپی میرے کمرے میں آئی ہے۔ ڈانٹا ڈپٹتا ہے تو اس کا رخ کیجئے۔“

تایا جی نے معاملہ فہمی کے بجائے چنگھاڑنے اور اپنا غصہ نکالنے پر سارا زور صرف کر دیا۔ ان کی پھری ہوئی آواز نے پورے گھر کو جگا دیا۔ میں مجرم نہیں تھا مگر تایا جی کے غیر ذمے دارانہ رویے نے مجھے ہر نظر سے گرا دیا۔ تایا جی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میرے آبا جی کو مخاطب کیا۔ ”دیکھ بھئی! اصغر علی! پہلے میرا پروگرام صرف ممکن تھا۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وسیم دو چار دن لاہور نہیں جائے گا اور اس دوران ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔“

تایا جی گھرانے کے سربراہ تھے۔ ان کے حکم کے مقابلے میں کسی میں تاب انکار نہیں تھی۔ جملوں، نظروں اور کچوکوں کے تیروں سے سبھی باری باری مجھے زخمی کرتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔ ایک دم کمرے میں میرا دم کھٹنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے رد عمل پر تایا جی نے یہ منصوبہ بنایا تھا اور اپنے منصوبے میں رنگ بھرنے کے لیے انہوں نے مہرالنسا کو میرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ میرے دل میں مہر و اور تایا جی کے لیے نفرت کا ایسا شعلہ جل اٹھا جسے بجھانا میرے بس سے باہر ہو گیا۔

مجھے گھر سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔ دیدہ دلیری سے سب کی نظروں میں نظریں ڈال کر انکار کر دینا چاہیے تھا۔ میں لڑکی نہیں تھا جس کا زبردستی نکاح پڑھایا جاسکتا تھا مگر اگلے تین دن اور راتیں فیصلہ کرنے میں ناکام رہا۔ میں بزدل نہیں تھا کہ میرے ساتھ زبردستی کی جاتی مگر میرے انکار میں حائل ہونے والی میری دو بڑی بہنیں تھیں جو تایا جی کے بیٹوں سے بیابھی گئی تھیں۔ دونوں کے ہاں بچے بھی پیدا ہو چکے تھے۔ تائی نے واضح کاف الفاظ میں مجھے باور کرا دیا تھا کہ اگر میں نے مہر و سے شادی نہ کی تو میری دونوں بہنیں کاغذ ہاتھ میں تھامے واپس آ جائیں گی۔ میرے ارمانوں کو بچانے والے ہی ارمان جلانے پر کمر بستہ ہو گئے تھے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ مجھے تایا جی کے مزاج کا بھی بخوبی علم تھا۔ وہ غصے میں اندھے ہو جایا کرتے تھے اس لیے سبھی اُن کے غصے سے ڈرتے تھے۔

پھر جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا انکار اس بھرے پرے خاندان کی بربادی کا سبب بن جائے گا، میں نے شکست تسلیم کر لی مگر اپنے اندر ہونے والی بے کراں شکست و ریخت پر قابو نہ پاسکا۔ میرے نکاح میں میری ہاں شامل

نہ ہو سکی۔ جس طرح کسی شرمیلی دلہن کی جگہ پر اس کی ماں یا باپ اقرار کرتا ہے، اسی طرح میری جگہ پر میری ماں نے نکاح کی اجازت دی۔ رات جب مجھے کزنز نے رواجی انداز میں میرے کمرے میں دھکیلا، مہر النساء سرخ عروسی غرارہ پھیلائے میرے بیڈ پر براجمان تھی۔ اس نے میری بے اعتنائی کو کھو کرنے کے لیے پہلی رات بہت سی باتیں کہیں۔ مجھ سے بار بار معافی مانگی۔ باور کرانے کی پوری کوشش کی کہ وہ کسی بدعتی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی صفائی پیش کرنے کی غرض سے میرے کمرے میں آئی تھی۔ میری آواز بلند تھی جسے سن کر اس کا باپ میرے کمرے تک آن پہنچا تھا۔ میں خاموش لیٹا، اس کی سنا رہا۔ وہ تھک کر رونے لگی۔ میں نے اُسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

یہ نہایت عجیب شادی تھی۔ وہ عورت تھی مگر دلہا تھی۔ میں مرد تھا اور دلہن تھا۔ وہ میری ناز برداریاں کرتی تھی۔ روٹھے ہوئے بچے کی طرح سنبھالتی تھی جبکہ میرے لیوں پر خاموشی چبک کر رہ گئی تھی۔ اس نے، پھر میرے والدین نے، پھر تمام گھرانے نے مجھے یونیورسٹی بھیجے پر ایڈی چوٹی کا زور صرف کر دیا مگر وہ نہ تو میرے لیوں سے انکار سن پائے، نہ اقرار اور نہ میں نے بیگ اٹھا کر کاندھے پر ڈالا۔ عجیب طرح کی سردمہری اور بے رخی میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

مہینا بھر کی لب بنگل کے بعد میں 'ہوں، ہاں' میں جواب دینے لگا تھا مگر گھر سے لکھنا موقوف رہا۔ مہر مجھے ناشتا کرانے کے بعد روزانہ ڈیوٹی پر جاتی۔ واپسی پر بقیہ تمام وقت میری دل جوئی میں صرف کر دیتی مگر وہ مجھے شوہر نہ بنا پائی۔ اس کا رونا دھونا، منت سماجت کرنا سب اکارت چلا گیا۔ مہینا بھر کے بعد میرا جمود ٹوٹا مگر میرے معمولات میں کوئی فرق واضح نہ ہوا۔ خاندان والوں نے اپنی ہی جت کر دیکھی، پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ کر پڑے ہٹ گئے۔

لیوں میری زندگی کمرے، قلم اور کاغذ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ میرا تعلق محدود حد تک مہر سے جبکہ ادھر اور اگھر مسلسل رابطہ خطوط کی دنیا سے جڑ گیا۔ قلمی رابطوں کو میں نے اپنی بے اعتنائی اور بے رخی کے ہتھیار سے سرحدوں کے پار محدود رکھا۔ مجھے بہت زیادہ جاننے والے بھی مجھ سے اتنا ہی دور تھے جتنا کہ مہر۔ بھائیوں کی کوششوں سے میری پانچ چھ جگہوں پر تعیناتی ہوئی۔ اچھی نوکریاں تھیں مگر میں نے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ بڑا بھائی کا روبرو کی دنیا کو اچھا خیال

کرتا تھا۔ اس نے دو چار مرتبہ مجھے اچھے بزنس کی ترغیب دی، معاونت کا وعدہ کیا مگر میں نے اُسے بھی مایوس لوٹا دیا۔ آخر کار مہر نے بھی کو یہ کہہ کر مجھ سے مزید بے پروا کر دیا کہ ویم کو نوکری کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ میں جو ہوں۔

وہ ہر روز رات کو میرے کمرے بکھرے ہوئے کاغذات جمع کرتی۔ میری سرور نظروں سے بچتے ہوئے تمام تر اشعار کو ایک نوٹ بک پر منتقل کرتی۔ خطوط لفافوں میں ڈالتی اور اگلے دن ڈیوٹی پر جاتے ہوئے پوسٹ آفس میں دے آتی۔ گھر کے ایڈریس پر کئی رسائل اور جرائد آتے رہتے تھے جن میں میرا کلام شائع ہوتا تھا۔ مہر نے ایک طرح سے میری شاعری پر بھی قبضہ کر لیا اور میں بے جان انداز میں اُس پر لہ گیا۔ وہ اٹھاتی، میں اٹھ جاتا۔ وہ بٹھاتی، میں بیٹھ جاتا۔ وہ کھلاتی، میں کھا لیتا۔ یوں جیسے میری کوئی مرضی ہی نہ ہو۔ میرا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد جب میرا بیٹا عظیم ویم پیدا ہوا، تب وہ بہت خوش تھی۔ چاہتی تھی کہ میں بھی ہنسون، خوشی مناؤں اور بچے کو اٹھاؤں مگر میں صوفے پر بیٹھا لفافوں سے کھیلا رہا۔ سال بھر بعد مہر نے میرا پہلا مجموعہ کلام شائع کرایا۔ خوشی خوشی پہلی کاپی گفٹ پیپر میں ملفوف کر کے دینے کے لیے لائی۔ میں کافی دیر تک گلاب کے پھول والے پیکٹ میں چھپے ہوئے مجموعہ کلام کو جھولی میں رکھ کر بیٹھا رہا پھر بیزاری سے اُسے سائڈ ٹیبل کی طرف اُچھال دیا۔ تب پہلی مرتبہ اس کی آنکھیں کھولیں ہوئیں۔ ایک خوفناک خلا دکھائی دیا اور میرے دل کو ایک ذرا اطمینان ملا۔

بے حد سرد لہجے میں بولی۔ "عجیب شاعر ہو، اپنے پہلے مجموعے کو دیکھنے کا شوق بھی نہیں رکھتے ہو۔"

"ہوں۔" میں نے سر جھکا لیا۔ وہ سائڈ ٹیبل کھینٹ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ تھوڑی پرانگی رکھ کر، میرا سراو پر اٹھا کر بولی۔ "ویم! آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

میں نے اُسے خالی نظروں سے گھورا اور شادی کے بعد پہلا جملہ بولا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

"زندگی کیسے گزرے گی؟" اس کی آواز بے حد سرد ہو گئی تھی۔ "خود بخود۔"

"میرا قصور کیا ہے؟" وہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی، تب نجاب نے کیا ہوا کہ میرا دل بھر آیا۔ اس کا چہرہ دھندلا گیا اور نہایت خاموشی سے میرے آنسو بہنے لگے۔ وہ ہٹا ہٹا کر مجھے دیکھتی رہی۔ شاید وہ چاہتی تھی

کہ میرا غم و غصہ آنسوؤں میں کھل کر نکل جائے اور میں نارمل ہو جاؤں مگر یہ اس کی بھول تھی۔ میں اپنی قسمت پر رورہا تھا۔ قسمت پر رونے والے کا غبار دل بھی ختم نہیں ہوتا۔

وہ شیشے کی میز پر بیٹھی تھی۔ اُسے پیچھے دھکیل کر میرے پیروں میں بیٹھ گئی۔ دونوں ہر تمام کر گزرتا لگی۔ "ویم! میں بہت بڑی ہوں۔ بد صورت ہوں۔ کالی ہوں۔ موٹی ہوں۔ عمر میں بڑی ہوں۔ تمہارے ساتھ بیٹھتی ہوں تو بیوی نہیں، ماں لگتی ہوں مگر تمہیں کیوں یقین نہیں آتا کہ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ میرے سر پر قرآن رکھ دو، بھلے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھو لو، سچ کہتی ہوں کہ تمہاری طرح میں بھی اس شادی کو اچھا نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ بے جوڑ ہے۔ تم پر غم ہے مگر....."

اس کی آواز زندہ گئی۔ ہچکیاں لیتی رہی، پھر بولی۔ "ہاں ویم! تم بہت خوب صورت ہو۔ جانتی ہوں کہ تمہاری شوخ آنکھوں میں کتنے خواب سجے ہوئے تھے۔ چاندی دلہن تمہارے سچوں کی رانی تھی۔ وہ..... جو شاعری کرتی ہو، سمجھتی ہو۔ تم اُسے جہاں لے کر جاؤ، لوگ اُسے پلٹ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہوں۔ ہے ناں؟ پر میں ایسی نہیں ہوں۔" وہ تھوڑے توقف کے بعد دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑنے لگی۔ "تم چپکتی ہو کی کار اور نزیڈ پوسٹ کی آرزو کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ کالے رنگ کی ٹنڈو گلاس والی نئی کار ہو، تمہاری دلہن نے گہرے نیلے ویلوٹ کا سوٹ پہنا ہو، تم نے سیاہ بیٹن اور سرخ شرٹ..... اور اس شان سے ہنی مون پر جانا چاہتے تھاناں تم؟..... تاکہ جو بھی تم لوگوں کو دیکھے، دانتوں میں انگلی کاٹ لے اور بے اختیار ماشاء اللہ کہہ کر دل تمام لے..... پھر ایک مرتبہ تم نے سب کزنز کو بتایا تھا کہ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا خواب ایک خوبصورت اور بڑی سرکولیشن والے میگزین کی اشاعت ہے۔ کہا تھا ناں؟..... بڑی سی ٹیبل، کارپنڈ آفس اور ریوالوگک چیز..... تم چیف ایڈیٹر..... تمہاری ہاتھ لگانے سے پہلے ہونے والی بیوی اس میگزین کی ایڈیٹر..... کمپیوٹر پر بیٹھ کر تم سے ڈکٹیشن لیتی ہوگی..... تم ایسے اُس کی کرسی کے عقب میں جا ٹھہرو اور اسے ہاتھوں میں بھر کر ڈانٹو..... اوئے یارا اُردو نہیں آتی کیا؟ ادارے کا کلاسک ہی برباد کر کے رکھ دیا ہے تم نے..... ہے ناں؟ یہی الفاظ تھے ناں تمہارے؟ یہی خواب تھے ناں تمہارے؟..... ہائے! مجھے علم ہے کہ تمہارے خواب کے کسی کونے کھدے میں مہر کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ مگر میرا کوئی قصور نہیں..... خدا کی

قسم..... پر ٹھیک ہے۔ مجھ سے مت بولا کرو۔ اپنے بیٹے کو تو اٹھا کر جھولی میں ڈال لو۔ وہ تو تمہاری تخلیق ہے۔" میری جھکی آنکھوں میں تب بھی امید کی کوئی رشتہ پیدا نہیں ہوئی تو وہ اٹھ کر بیڈ کی طرف چل دی۔ پیڈل مارنے کے سے انداز میں ٹانگیں چلاتے ہوئے عظیم پر جھک گئی۔ اس کا فیڈر منہ سے نکل کر گدے پر لڑھک گیا تھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر اسی سے باتیں کرنے لگی۔ "کا کے! تمہارے پاپا کا دل پتھر کا ہے۔ پتھر کے کان، پتھر کی زبان، پتھر کی آنکھیں۔ جیسی وہ کچھ سنا نہیں، بولتا نہیں، دیکھتا نہیں۔ تم جلدی سے بڑے ہو جاؤ اور اپنے پاپا کے کان کھینچنا۔" شام کو اُس نے عظیم کے ننھے ننھے ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں جوڑ دیے، بولی۔ "کا کے! پیارے پیارے لیوں سے دعا مانگو، اللہ میاں! میرے پاپا کا دل گلاب کی طرح نرم کر دے۔"

وہ مجھے جذباتی چمکے لگا لگا کر بھی تھک گئی تو ہمارے درمیان ایک بے عنوان مفاہمت پیدا ہو گئی۔ میں اس کے اکثر سوالوں کا جواب ہوں، ہاں یا آکھ کے بدلے ہونے کا اثر سے دیا کرتا تھا۔ وہ میرے کناہے سمجھنے لگی تھی۔ عظیم ویم کے بعد نعیم ویم پیدا ہوا۔ دوسرے بچے کی پیدائش میں کوئی جھجک پیدا ہو جانے کی بدولت اُسے اسپتال لے جانا پڑا۔ یہ فریضہ بھی میرے بھائیوں اور تایا جی نے سرانجام دیا۔ نارمل ڈیلیوری نہ ہونے کی بدولت اسے بڑے آپریشن کے عذاب سے گزرنا پڑا۔ جب نعیم ویم اور مہر کو میرے کمرے میں پہنچایا گیا، تب وہ خاصی لاغر تھی مگر ماستائی نور سے دمک رہی تھی۔ میں نے حسب عادت اس کی عیادت کی نہ بچے کو دیکھنے میں دلچسپی لی۔ اس نے از خود بچہ میری گود میں رکھا، پھر مایوس ہو کر اٹھا لیا۔ آپریشن کے بعد آٹھ دس ماہ بیمار رہی۔ علاج کرداتی رہی۔ تب ایک دن بڑے مایوسانہ انداز میں بولی۔ "ویم! ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ میں آئندہ ماں نہیں بن سکوں گی۔"

میں نے اُسے دیکھے بغیر کہا۔ "ہوں۔ ٹھیک ہے۔" وہ کراہی۔ "کیا ٹھیک ہے؟ یہی ناں کہ میں آئندہ ماں نہیں بن سکوں گی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے ویم؟ خدا کے لیے خود کو بدل لو۔ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ جاؤ، میں اچھی نہیں لگتی، نہ سہی..... دنیا میں اور تو بہت سی لڑکیاں موجود ہیں۔ تمہیں جو پسند آتی ہے، بیاہ لاؤ۔ نہیں..... بلکہ مجھے آکر بتاؤ۔ میں اُسے اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر جھولی میں لاؤں گی۔ پھر دیکھوں گی کون میرا راستہ روکتا ہے..... پُر خدا کے لیے مجھے

دو لاکھ کئی سو گزے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگرمی

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے پیسوں کے لیے بہترین تحفظ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیر III، سسٹمز ڈائجسٹ ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فکس: 35802551

کا چہرہ خوشی سے جھلکا رہا تھا۔ رات کو برابر میں لیٹ کر
بتانے لگی۔ ”وسیم! کیا تمہیں ادا کاڑہ والی زمین کی مالیت کا علم
ہے؟“ اس کی آواز میں غیر معمولی ارتعاش شامل تھا۔
میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ جوش سے اٹھ بیٹھی اور
قدرے رازدارانہ انداز میں بولنے لگی۔ ”اکرم علی کا رقبہ بنی
بننے والی بڑی شاہراہ کے کنارے پر تھا۔ قیمت ایک دم
دھند کی طرح اوپر اٹھ گئی۔ انہوں نے اپنا تمام رقبہ فروخت
کر دیا ہے۔ اب وہاں صرف چار رقبہ پڑا ہے۔ نئے بننے
والے شہر کا دل، کمرشل ایریا..... دائیں ہاتھ جدید طرز کی
ہاؤسنگ سوسائٹی، بائیں ہاتھ ملک پر اسسٹنگ پلانٹ جبکہ
عقب میں پورا شہر.....“ اس کی آنکھیں پوری وسعت میں
پھیلی ہوئی تھیں۔ ”اگر ہم وہ رقبہ آنکھیں بند کر کے پھینک
بھی دیں، تب بھی کم و بیش ستر اسی لاکھ دے جائے گا۔“
میں نے ہونٹ سکڑے، آنکھیں بند کیں اور ہنکارا بھر
کر روٹ بدل گیا۔

حویلی سے نکل کر شہر میں آن بسنے سے میرے مزاج
میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی تھی اور نہ ہی میں کسی کی کمی کو
محسوس کرتا تھا مگر وہ شدید نوعیت کی تنہائی کا شکار ہو گئی۔ اس
کی مصروفیات میں اچانک بے تحاشا اضافہ ہو گیا تھا۔ بچے
بڑے ہو گئے تھے۔ ان کی تعلیمی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔
چونکہ بچوں نے پیدا ہوتے ہی مجھے خاموش اور تارک دنیا
دیکھا تھا، اس لیے وہ میرے بارے میں زیادہ متفکر نہیں
ہوتے تھے۔ مہر نے اپنی سروس کے آخری سال ایل پی
آر لے لی۔ ایک شام جب میں چائے پی رہا تھا، وہ میرے
پاس آ بیٹھی۔ اس نے استدعا کی کہ میں اپنی پرائیویسی کا
اختیار نامہ اس کے نام لکھ دوں۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں
جب میں نے نہایت بے رغبتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ”اچھا“
کہہ کر چائے کا کپ لیوں سے لگا لیا۔

وہ بے اختیار بولی۔ ”کیا تمہیں اتنی قیمتی جائداد میں بھی
کوئی دلچسپی نہیں ہے؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ استعجاب آمیز نظروں سے مجھے
دیکھتی رہی۔ پھر میرا ہاتھ تمام کر بولی۔ ”کیا تمہیں اس کی پروا بھی
نہیں کہ میں تمہاری ساری جائداد بیچ کر ضائع کر دوں؟“
میں نے کپ میز پر رکھتے ہوئے ساٹ لہجے میں کہا۔ ”نہیں۔“
”میرا غلط اقدام ہمیں تلاش کر سکتا ہے؟“ وہ جتنی لہجے
میں گویا ہوئی۔

میں نے اسے دیکھا۔ گویا بتایا کہ میں تو پہلے ہی تلاش
ہوں۔ گھر کے دیوالیا ہونے کا میری صحت پر کوئی فرق نہیں

چھ ماہ پر محیط ایسا دورانیہ بھی گزر جس میں میری ماں
نے گھر میں ہنگامہ کھڑا کیے رکھا۔ وہ مہر کے ایما پر میری
دوسری شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دو چار لڑکیاں بھی دیکھ
لیں مگر میری طرف سے ”اوکے“ کا سنکٹل نثر نہ ہو سکا۔ آخر کار
دونوں کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔

شادی کے بارہویں سال حویلی پر وچھوڑے کا آسیب
وارد ہو گیا۔ چند اختلافات اس قدر شدید نوعیت اختیار کر
گئے کہ بڑوں نے بیٹھ کر خاندانی ہوارے کا فیصلہ کر لیا۔
انہوں نے تمام اثاثہ جات اور رقم حصہ وار تقسیم کر دی۔
میرے بڑے بھائی نے پولٹری فیڈر کا کاروبار کر لیا تھا۔
کاروبار خوب چل نکلا۔ تبھی اس نے اچھی خاصی پراپرٹی بنا
لی تھی۔ جب خاندانی اثاثے تقسیم کیے گئے، اس نے اپنا
حصہ فراخ دلی سے مجھے دے دیا۔ اباجی نے کسی دور میں
ادا کاڑہ کے قریب ایک ایکڑ زرعی رقبہ خریدا تھا۔ چونکہ اباجی
سمیت کسی بھی شخص کو اس خطہ زمین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی،
اس لیے جب انہوں نے وہ ایکڑ مہر کو دینے کا اعلان کیا تو
کسی نے بھی اعتراض نہ کیا۔

اباجی کے بچپن کا ایک دوست اکرم علی ادا کاڑہ میں رہتا
تھا۔ وہ ایک مرتبہ حالات کی تنگی سے گھبرا کر اباجی کے پاس
آیا اور کچھ رقم ادھار چاہی۔ اباجی نے اسے وہ رقم بلا تامل
دے دی۔ وعدے کے مطابق وہ لوٹا نہ سکا تو اباجی نے
استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سال بھر بعد وہ ہمارے گھر
آیا۔ اباجی سے کہنے لگا کہ وہ رقم لوٹانے کے قابل نہیں ہے۔
اس لیے اپنے چھ ایکڑ رقبہ سے ایک ایکڑ اباجی کو دے کر اپنا
حساب بے باق کرنا چاہتا ہے۔ اباجی نے مناسب نہ سمجھا
اور اچھے وقت کا انتظار کرنے کا مشورہ دیا مگر اکرم علی نے
ادا کاڑہ جاتے ہی اباجی کے نام ایک ایکڑ رقبہ منتقل کر دیا۔
اگلی مرتبہ جب وہ ملنے کے لیے آیا تو زمین کے کاغذات بھی
ساتھ لایا۔ اباجی، یا خاندان کا کوئی بھی شخص زندگی بھر
ادا کاڑہ گیا نہ اپنا رقبہ سنبھالا۔ یوں اسے بے توقیر جائداد سمجھ
کر مہر کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔

چند دنوں میں ہم چنیوٹ شہر میں اپنے گھر میں منتقل ہو
گئے۔ مجھے اچانک حویلی کے شور شرابے سے چھٹکارا مل گیا
تھا، تبھی مجھے اطمینان اور ایک طرح سے تحفظ کا احساس ملا۔
یوں میں بیٹھے بٹھائے امیر ہو گیا مگر مجھے یہ سب بے معانی
لگا۔ اباجی میں نے کسی کا شکریہ ادا کیا نہ خوشی کا اظہار کیا۔

کچھ دنوں بعد مہر و دفتر سے چھٹیاں لے کر عظیم کے ساتھ
ادا کاڑہ گئی۔ کرم علی کے ہاں تین چار دن رہی۔ واپسی پر اس

وہ وسیم لوٹا دو جسے میں شادی سے پہلے دیکھا کرتی تھی۔
شور، ہنٹ کھٹ..... ہر وقت بولنے والا، زبردستی شعر ستانے
والا..... زبردستی داد و صلہ کرنے والا۔ ہائے اللہ! مجھے کس
گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ میں کیا کروں؟“

اس دن وہ اتنے دل دوز انداز میں پھوٹ پھوٹ کر
روئی کہ میرا دل بھی بھرا آ کر میں خواہش کے باوجود اسے
کوئی دلاسا دے سکا نہ آنکھوں ہی سے۔ امید کی کوئی
جوت اس کی گود میں ڈال سکا۔

اباجی ہر شام کو سونے سے پہلے میری خواب گاہ میں آیا
کرتے تھے۔ چند ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ میری بیزارگی پر
دل گرفتہ ہو جاتے اور میری پیشانی چوم کر کمرے سے نکل
جاتے۔ ماں اور بہنوں نے ابتدا میں تو آسمان سر پر اٹھایا مگر
پھر مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل میری خاموشی کی
چادر سب کو غیر فطری لگی بعد میں معمول کا حصہ بن گئی۔ حویلی پر
مجیب سی سوگواری مسلط رہتی مگر رفتہ رفتہ حویلی کی رونقیں لوٹ
آئیں۔ شام کی چاندنی میں محن میں جننے والی محفل سے شکوے
پھوٹنے لگے۔ لیکن میرے دل میں بھی یہی خواہش پیدا نہیں
ہوتی تھی کہ میں اٹھ کر ایک نظر دیکھ ہی لوں۔

ایک ایک دن کر کے دس سال کا طویل عرصہ بیت گیا۔
اس دوران حویلی میں چار شادیاں سرانجام پائیں، دو
جنازے اٹھے مگر میں ذہنی طور پر کسی دکھ سکھ میں شامل نہ
ہوا۔ ایک طرف مہر کی وجہ سے قوی شہرت کے سفر پر
گامزن تھا تو دوسری طرف مجھے خاندان بھرنے پاگل اور
نفسیاتی مریض قرار دے کر نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔
ایک مہر کا دم تھا جو ابھی تک شکست تسلیم کرنے پر تیار
نہیں تھا۔ وہ ہر مہر میری نظروں کے سامنے تیار ہو کر میری
ڈاک اٹھاتی، آکس جاتی اور واپسی پر بچوں کے امور میں
زچہ جاتی یا میرے بکھرے ہوئے اوراق سنبھالنے لگتی۔
اس کی اکاؤنٹس کی جاب نے اسے بڑا پریکٹیکل کر دیا تھا۔
میں شاعری پڑھنے اور اپنے خیالات کو شعروں میں ڈھالنے
میں رات گئے تک مصروف رہتا جبکہ وہ اعداد و شمار میں الجھی
رہتی۔ نہ مجھے اس کے معمولات میں دلچسپی ہوئی، نہ میں نے
دریافت کیا۔ جہاں اسے آڈیٹر کی پوسٹ پر پروموٹ کر دیا
گیا وہاں وہ آپریشن کے بعد پہلے سے بھی زیادہ فربہ ہو گئی
تھی۔ مٹاپے کی وجہ سے بس کے سفر سے نالاں رہتی تھی۔
تنگ آ کر اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ شیراز کا خرید لی۔ تھوڑے
ہی عرصے میں اس نے ڈرائیونگ پر مہارت حاصل کر لی اور
یوں اسے بس کے تکلیف دہ سفر سے نجات مل گئی۔

پڑے گا۔ وہ شاید میرے دل سے نکلنے والے بے صوتی جملے سمجھ گئی۔ شکوہ بھری نگاہ ڈال کر اٹھ گئی۔ وہ اُس دن بڑی ملول اور بڑ حال دکھائی دے رہی تھی جس دن میں نے اس کے ایک بار کہنے پر ہی بے نیازی سے مختار تارے کی دستاویز پر دستخط کر دیے اور یہ تک نہ پوچھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے بہت کچھ بتانا چاہتی تھی مگر میری عدم دلچسپی کے سبب شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔

وہ مجھے ماں کی تحویل میں دے کر دونوں بچوں اور اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر اداکارہ گئی۔ مجھے بتا کر گئی تھی کہ کم و بیش دس دنوں بعد لوٹے گی۔ دس دن تک ماں میرے ساتھ رہی۔ اپنی عادت کے مطابق بولتی رہتی۔ ”تو نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ مجھے جیتے جی درگور کر رکھا ہے۔ ہم سب نے سوچا تھا کہ تو چند دن غصہ کرے گا پھر آپوں آپ مان جائے گا۔ پہلے بھی تو ایسا ہی کرتا تھا نا تو؟“..... کیا ہوا جو مہر و تم سے دس سال بڑی ہے۔ خاندانوں میں ایسی شادیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کتنی بڑی دنیا ہے۔ تو کہیں باہر کے ملک چلا جاتا۔ جس میم پر تیرا دل آتا، اس سے شادی کر لیتا۔ مذہب بھی چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔“

ماں میری نظروں کے کھوکھلے پن سے ڈر گئی۔ میرا سر اپنی گود میں رکھ کر رونے لگی۔ بالوں میں اٹھکھیاں پھیرتے ہوئے دعائیں مانگنے لگی۔ بتانے لگی۔ ”مہر و دیکھنے میں کو بھی ہے پر دل کی میلی نہیں ہے۔ وہ رات دن تیرے بارے پریشان رہتی ہے۔ چاہتی ہے کہ تیرے ہونٹ جو مسکراتا بھول گئے ہیں، پھر سے جاگ پڑیں۔ تیری آنکھوں کی وحشت ختم ہو جائے۔“

میں نے کروٹ بدل کر چہرہ ماں کی گود میں چھپا لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آنکھوں کی نمی اس پر آشکار ہو جائے اور مزید غم بار ہو۔ میرا یکبارگی جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر روؤں اور پوری دنیا کو اپنے اطراف اکٹھا کر لوں۔ سب کو بتاؤں کہ دنیا والو! میری انٹرویو پینک پرمت ہنسو۔ میرے ماں باپ کو دیکھو۔ میرے خونی رشتہ داروں کو دیکھو۔ جنہوں نے مجھے اپنی ضد پر قربان کر دیا۔ مجھ سے میرے سنے، مسکراہٹ، شوخی، رومان اور مستقبل کی طلب..... سب کچھ چھین لیا۔ آج بھی وہ میرے رویے کو بے جا قرار دیتے ہوئے مجھے ہی بدل جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

بڑے عرصے بعد میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ماں سے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں استفسار کروں۔

پوچھوں کہ مجھے زندہ کرنے کے لیے کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے مگر خاموش رہنے کی عادت بہت پختہ ہو گئی تھی۔ جیسی تو خاموشی سے آنسو بہا تا رہا۔

بچوں کے ماں کے ساتھ جانے کی وجہ سے گھر کی فضا پہلے سے بھی زیادہ خاموش اور پرسکون ہو گئی اور میں دل ہی دل میں اس کے نہ آنے کی دعائیں مانگتا رہا مگر عین دسویں دن میری دعائیں بے مراد ثابت ہو گئیں اور اس کا خوشی سے دھکتا ہوا چہرہ میرے سامنے سج گیا۔ رات کو جب بچے اپنی دادی کے ساتھ سو گئے تو وہ میرے پاس آ بیٹھی، مسرت سے لبریز آواز میں بولی۔ ”وسیم! میں آج بہت خوش ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟“

میں نے سپاٹ نگاہوں سے اُسے دیکھا، وہ بولی۔ ”اس لیے کہ میں وہ تمام خواب خریدنے کے قابل ہو گئی ہوں جو تمہاری آنکھوں نے دیکھے تھے۔ مجھے خدا یہ طاقت پہلے دے دیتا یا مجھے باقی بنا دیتا اور میں اپنے والدین کے فیصلے پر بزدلانہ انداز میں تسلیم خم نہ کرتی۔ مگر خیر! جو ہونا تھا، ہو گیا، اب اس کا کیا تذکرہ؟..... میں نے اداکارہ والی زمین بہت اچھے بھاؤ پر فروخت کر دی ہے۔ بہت بڑی رقم لے کر میں ان خوابوں کی تلاش میں نکلی جن کو نہ پا کر تمہاری آنکھیں دیکھنا بھول گئی تھیں۔ میں نے آدمی شاپنگ کر لی۔ آدمی رہ گئی ہے۔ وہ بھی ریٹائرمنٹ تک کر لوں گی۔ جب تمہارے خواب تمہاری تنگی میں جکڑی طرح جکڑ گئے لگیں گے، تب تو مسکراؤ گے نا؟“

میں اُسے بڑے مبر و گل سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بدنما چہرے پر کئی رنگ جھللا رہے تھے۔ میں نے جب اُس کی بات کا جواب نہیں دیا تو تھکیک کو جھیلنے کا موہوم سا عکس چہرے کی جھریوں پر ایک ذرا دیر کو لرزا پھر معدوم ہو گیا۔ سر جھکا کر بولی۔ ”وہ لوگ کتنے خوش بخت ہوتے ہیں جو ایک وقت میں بیسیوں آدمیوں کو راضی کر لیتے ہیں۔ شاید میں بد صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی بد قسمت بھی ہوں کہ چودہ برس میں ایک شخص کو راضی نہ کر سکی۔ مسکرانے پر مجبور نہ کر سکی۔“ اس کے لبوں سے ایک دھبہ بھری آہ خارج ہوئی اور بھگی بھگی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بیڈ کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔

میں اس کی ذہانت کا دل ہی دل میں معترف تھا۔ اس نے کبھی اپنے آفسرز کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ میری ہزاران کبی باتیں سن اور سمجھ لی تھیں۔ مجھی میرے دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ اب وہ ایسا کیا کرنے چلی گئی کہ اُسے یقین تھا کہ اپنے خود ساختہ خول سے نکلنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

وہ ریٹائرمنٹ لینے تک چار پانچ مرتبہ میری ماں کو میرے پاس ٹھہرا کر اسلام آباد گئی تھی۔ کبھی دو چار دن تو کبھی دس دنوں تک وہیں مقیم رہی۔ پھر جو بھی اسے واجبات ملے، اُس نے ہنگامی طور پر اسلام آباد شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کام میں اس کے بڑے بھائی نے معاونت کی اور ہماری مختصر سی سیل کو اسلام آباد منتقل کر دیا۔

یہاں پہنچنے تک میں خاموش تماشا کی بنا رہا مگر جو بھی میں نے اپنا بنگلا اور غیر معمولی خوب صورت لوکیشن دیکھی، مجھے خود پر سے ضبط و تحمل کی بھاری سل ٹپتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اسی خواب گاہ کی عقیقہ کمز کی میں کھڑے ہو کر بے اختیار کہا تھا۔ ”واؤ..... کتنا پیارا لینڈ اسکیپ ہے یہ!“

مہر و نے میری بات سن لی تھی۔ خوشی سے جھوم اٹھی، بولی۔ ”ٹھیکس گاڈ!“

تب مجھے سمجھ آئی کہ وہ ماحول کی تبدیلی کے ذریعے مجھے بدلنا چاہتی تھی۔ مگر وہ بھول گئی تھی کہ میرا خواب صرف خوب صورت ماحول کا حصول نہیں تھا بلکہ میری ترجیحات مختلف تھیں۔ چند دن وہ بے حد مصروف رہی جبکہ میں علی الصباح گھر سے اترائی کی جانب نکل جاتا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر موجود بڑھی ہوئی چٹان پر بیٹھ جاتا اور تاحد نگاہ پھیلی ہوئی چھوٹی بڑی پہاڑیوں کو دیکھتا رہتا۔ نجانے میری آنکھوں میں کتنی بڑی خیال کی جھل جھل رہی ہوئی تھی کہ گھنٹوں دیکھنے پر بھی ان مناظر سے دل اکٹا تا نہیں تھا۔ جب وہ ہنگام کی تزئین و آرائش سے فارغ ہو گئی تو اس نے ایک چمکتی صبح میں سرخ رنگ کی فائل میری جمبولی میں رکھ دی، بولی۔ ”وسیم! میں نے جو بیچا، جو خریدا، سب تفصیل اس میں درج ہے۔ دیکھ لو۔“

میں نے فائل پر دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر رکھ دیے اور ایک کتال رقبے پر مشتمل رنگا رنگ لان کے ایک شرارتی پودے پر نظریں جمادیں۔ وہ قدم میں بڑا تھا۔ دوسروں کی نسبت زیادہ جھوم رہا تھا۔ انسانوں کی طرح کئی پودے بھی بہت شوخ واقعہ ہوتے ہیں۔

”وسیم! میرا دل رکھنے کو ہی دیکھ لو۔ میں نے بڑی محنت سے یہ گوشوارہ مرتب کیا ہے۔“

میں نے تب بھی فائل نہیں کھولی تو اس کا چہرہ تاریک ہو گیا، بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ نہ دیکھو۔ میں بولتی جا رہی ہوں۔ بھلے نہ سنو۔ میں نے پچاسی لاکھ میں اداکارہ والی زمین بیچی تھی۔ چھ لاکھ میں چھوٹ والی زمین، سات لاکھ روپے میرے واجبات بنے جبکہ تین لاکھ روپے میں نے دوران ملازمت پس انداز کر رکھے تھے۔ یہ کل ملا کر ایک سو ایک لاکھ ہے۔“

اس نے میرے ہاتھوں کے نیچے دبی ہوئی فائل نکال کر کھول لی، بتانے لگی۔ ”میں نے پچپن لاکھ میں یہ بنگلا خریدا، بیس لاکھ کی دو دکانیں، دس لاکھ کا ایک چھوٹا سا پلاٹ جو میں نے ایک فون سمیٹی کو لیز پر دیا ہے۔ باقی رقم اپنے اکاؤنٹ میں رکھ چھوڑی ہے۔ وہ بھی جلد خرچ کر دوں گی۔ رہی ماہانہ آمدنی جس پر گھر چلے گا، اس کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ کرایوں کی مد میں ہمیں تیس ہزار روپے ملا کریں گے اور میری پینشن دس ہزار بتی ہے۔ چالیس ہزار میں ہم بہ آسانی گزر کر سکتے ہیں۔“ اسے احساس تھا کہ میں اس کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اس کے باوجود وہ بڑے اہتمام سے اپنی کارگزاری سے مطلع کر رہی تھی۔

مجھی مجھے یاد آیا کہ اس نے میرے پانچ مجموعہ کلام شائع کرائے تھے جنہیں میں نے ایک نظر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ یکبارگی میرے دل میں اپنی کتابوں کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چاہا کہ اُسے کہوں، کتابیں لا کر مجھے دکھاؤ، مگر بول نہ سکا۔ میری آنکھیں شاید بول پڑی تھیں، مہر و نے جلدی سے کہا۔ ”ہاں وسیم! میں نے پانچ گفٹ پیک سنبھال رکھے ہیں جو تمہیں پیش کرنے کی آرزو رکھتی ہوں مگر تب، جب تم نارمل ہو جاؤ گے۔“

میں نے ہونٹ چبھنے لپے۔ وہ بہت دیر باتیں کرتی رہی۔ اس کا معمول تھا کہ وہ دن میں جو بھی کرتی، شام کو میرے گوش گزارتی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق میگزین کی فائل تیار کی۔ میری شاعری سے کئی نام منتخب کئے اور این او سی کے لیے اپلائی کر دیا۔ اس نے اپنے طور پر میگزین کے اجراء کے لیے معلومات حاصل کر لیں۔ پھر مقامی اخبارات میں ایڈیٹر کی آسامی پر کرنے کے لیے اشتہار دیا۔ چونکہ اُس کا خیال تھا کہ عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ ذمے داری کا مظاہرہ کرتی ہیں، اس لیے اس نے اشتہار میں صرف خواتین امیدوار رجوع کریں کا جملہ لکھوا دیا۔

اس دوران مجھ میں یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ میں اس کے سوالوں کے جواب کے لیے لفظوں اور موہوم اشاروں کی دنیا سے نکل کر جملوں کا سہارا لینے لگا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس معمولی سے تغیر نے گھر کا ماحول ایک دم بدل دیا۔ میرے کم کو بیٹوں، علیم وسیم اور نسیم کی زبانیں تیز کام ہو گئیں۔ مہر و انسانی حرکات و سکنات میں برق خفیل ہو گئی۔ اس کے غیر معمولی فریہ اعضا میں جوانی کی مستعدی گل گئی اور وہ سولہویں سن میں جا کھڑی ہوئی۔ یہاں پہنچنے کے دسویں دن اُس نے مجھے میرے آراستہ آفس میں لے جا

کر بٹھا دیا تھا جہاں مریم ماہ و ش جیسی بکلی میری آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے بٹھک رہی۔

بلاشبہ مہر و بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اُس نے مجھے موم کرنے کے لیے بہت بڑی پلائنگ کی تھی جو کامیاب بھی رہی تھی مگر اُسے کیا خبر تھی کہ مریم ماہ و ش کا وجود فساد کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور اس کی تمام تر محنت ایک دم اکارت چلی جائے گی۔

میرا سر دُکھنے لگا۔ میں بیڈ پر اٹھ بیٹھا۔ سانسوں کی تال پر اوپر نیچے ہوتی ہوئی مہر و کے بھریدن کو بے تاثر آنکھوں سے دیکھا اور آہ بھر کر، سر تھام کر بیٹھ رہا۔ میں زندگی کی طرح عشق کی بازی ہار چکا تھا۔ اپنے خوابوں کی طرح مریم ماہ و ش کو کھو چکا تھا۔

میں شال اوڑھے سرد کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ سردی کا احساس مٹ گیا تھا اور گرمی کی طلب آخری سانسیں لے چکی تھی۔

☆☆☆

مہر و مجھ سے پہلے بیدار ہو چکی تھی۔ جب میں جاگا تو وہ بیڈ روم کے اٹنے ہاتھ و پاؤں کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ ان کمرے کو میں نے اب تک مقفل پایا تھا۔ اس نے ناشتے کے دوران مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش کی مگر غیر معمولی سرد مہری اور میرا دل شکن رد عمل دیکھ کر بچھ کر خاموش ہو گئی۔ ڈائننگ ٹیبل چھوڑتے ہوئے عام سے انداز میں مستنصر ہوئی۔ ”کیا تم پھر ہاں اور ہوں میں جواب دیا کرو گے؟“

میں نے رخ پھیر لیا۔ اُس پر باور کر دیا کہ اُس کے حصے کے یہ دو لفظ بھی ختم ہو چکے ہیں۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور گراؤنڈ فلور پر چلی گئی۔ گیارہ بجے اُس نے میرا ہاتھ تھاما۔ اپنی سابقہ روش پر چلتے ہوئے ہاتھ روم میں دھکیلا۔ پھر مجھے ایک نیا لباس پہنایا۔ خود بھی تیار ہوئی۔ پارکنگ میں لائی اور بولی۔ ”ہم اسلام آباد جا رہے ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اُس نے کندھے اُچکائے۔ شیرا ڈنگالی۔ مجھے بٹھایا۔ عبدالکریم کہیں دکھائی نہیں دیا۔ شاید وہ کسی کام سے گیا ہوا تھا یا پچھلے لان کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھا۔ میں تب چونکا جب مجھے محسوس ہوا کہ شیرا ڈنگا کا رخ مسز فردوس کی کونٹھی کی طرف تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ میں نے اُس سے دریافت نہیں کیا تھا۔

میں مسز فردوس کی کونٹھی کے گیٹ پر روکا نہیں گیا تو بھی میں چونکا۔ تیسرا جھٹکا تب لگا، جب مسز فردوس نے بڑے والہانہ انداز میں مہر و کا استقبال کیا اور مہر و کو گلے لگا کر بولی۔ ”ویکم میری جان! مہر و..... تم تو وقت کی بڑی پابند لگی ہو۔“

”مگر تم بہت لالچی.....“ مہر و کی بے تکلفی نے مجھے حیران کیا۔

میں سوچ میں مستغرق تھا کہ وہ مجھے یہاں کیوں لائی تھی۔ کیا وہ مجھے مریم کی شادی کا منظر دکھا کر اپنی فتح کا یقین دلانا چاہتی تھی؟

دونوں ایک دوسرے سے چٹ کر ڈرائنگ روم میں گھس گئیں جبکہ میں گاڑی میں بیٹھا رہا۔ پورچ میں پانچ چھ گاڑیاں دیکھ کر میرے شک کو تقویت ملی کہ کونٹھی میں مریم کی شادی کی تقریب منعقد تھی۔ میرا ہاتھ بے اختیار دل پر جا ٹکا اور لیوں سے دل دوز آہ نکل گئی۔ یکساں رنگی جی چاہا کہ اندر چلا جاؤں اور مہر و اور مسز فردوس کے گلے گھونٹ دوں، اپنے اندر بھڑکتی ہوئی جان لیوا آگ پر انتقام کا پانی ڈال دوں مگر ہمت نہ ہوئی۔

ایسے ہی وقت میں، جب میں گاڑی سے نکل کر کونٹھی سے باہر نکل جانے کا ارادہ کر رہا تھا، مسز فردوس کسی بات پر ہنسی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکلی اور سیدھی میری طرف آئی۔ اس نے شاندار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور اپنے چہرے پر میک اپ کی دبیز تہ چڑھا رکھی تھی۔ قریب آ کر بولی۔ ”ویکم بھروا نہ! تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر آؤ ناں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اُس کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔ ہنسی کی تال پر بے دم ہو کر جگی، دروازہ کھولا اور مہر و کے انداز میں مجھے بازو سے پکڑ کر باہر نکال لیا، بولی۔ ”اندر چلو..... مہر و تمہیں بلا رہی ہے۔“ برآمدے کی میز چھیاں چڑھتے ہوئے رُک کر بولی۔ ”شاید تمہیں علم نہیں کہ مہر و میری بہت پیاری دوست ہے۔ ہم جنگ کے کامرس کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ تب وہ اتنی موٹی اور کالی نہیں ہوا کرتی تھی۔ تم نے اُسے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔“

میں گویا اُس کی باتیں سن ہی نہیں رہا تھا۔ رات کو فون پر ہونے والی مہر و کی گفتگو سے میں نے دونوں کے درمیان استوار شدہ گہرا اور پرانا تعلق بھانپ لیا تھا۔ وہ مجھے لیے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی۔ دروازے میں ہی نہ دیکھا جاسکے والا منظر دکھائی دیا۔ صوفوں پر کم و بیش بیس مرد و خواتین بیٹھے تھے۔ درمیانی صوفے پر دلہن کے رواجی سرخ سوٹ میں مریم بیٹھی تھی جس کے داہنے پہلو میں مہر و بیٹھی محبت پاش نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا سرخ غرارہ درست کر رہی تھی۔

مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا محال ہو گیا تو میں نے دلہیز تھام لی۔ مسز فردوس نے جھٹکا دے کر مجھے آگے بڑھایا اور تھپتھپنے کے انداز میں چلاتی ہوئی، صوفوں کے بیچ سے گزرتی

ہوئی مریم اور مہر و کے پاس پہنچی۔ مجھے مریم کے پہلو میں بٹھا کر بولی۔ ”مہر و! دلہن کے ساتھ ساتھ اس ایب نارل دُلہا کو بھی سنبھالو۔ مجھے اس کی نورنہ سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اوئے انور! مولوی صاحب کو بلا لاؤ تا کہ نکاح پڑھایا جائے۔“

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچرہ گئی۔ آراستہ ڈرائنگ روم کا منظر ایک دم دھندلا گیا۔ کبھی خوش کن چہرے گھومنے لگے۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مہر و کو دیکھا، پھر مریم کو۔ پھر کونٹھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی مسز فردوس کو..... تب اچانک کبھی عقدے کھل گئے۔ میں سائیں سائیں دماغ سنبھالنے میں مصروف رہا جبکہ وہاں موجود لوگ اپنی ڈمے دار یوں سے عہدہ برآ ہونے لگے۔

نکاح سے فارغ ہوتے ہی پر تکلف کھانا پیش کیا گیا مگر مجھ سے ایک لقمہ بھی حلق سے اتارنا نہ گیا۔ پھر محنتی کافرینہ سرانجام دیتے ہوئے مسز فردوس خانم نے میرے ہاتھ میں مریم کا ہاتھ دیتے ہوئے پیار سے کہا۔ ”ویکم! آئی لو یو..... میں تمہارے عشق کی طاقت دیکھنے کے لیے تم سے بدسلوکی کرتی تھی۔ تم نے برا مانا۔ معاف کر دو۔ میری مریم کو خوش رکھنا۔ اور ہاں..... مہر و تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ صرف اُس ویکم کو دیکھنا چاہتی ہے جو اُس سے چندہ برس پہلے جین لیا گیا تھا۔ ناؤ..... یو کمین گو و یو ر برائیڈ.....“

اُس نے مریم کو چومنا، گالوں کو پیار سے چھوا اور پرس کھول لیا۔ ایک چپک نکال کر اس کے حوالے کیا۔ ”یہ دس لاکھ کا چیک تمہارے دلہانے دیا تھا۔ سلائی سمجھو یا ز یور..... جو سمجھو تمہاری مرضی۔“

دوسرا چیک میرے ہاتھ میں تھمایا، بولی۔ ”یہ مریم کا جہیز ہے۔ قبول کرو۔ اور ہاں! مریم میری بیٹی ہے۔ مجھے بہت پیاری ہے۔ میرے پیار کو کسی آزمائش میں مت ڈالنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ آج تک ’مس مریم‘ تھی، آج ’مسز ویکم‘ بنی ہے۔ سدرہ اس کی جی نہیں..... میری بیٹی ہے۔ جس طرح مریم میری بیٹی ہے۔ اُسے میں مظفر آباد کے ایک کھنڈر سے اٹھا لائی تھی۔ مریم نے اُسے پالا ہے۔ یہی اُسے اپنے ساتھ رکھنے پر بغداد ہے۔ میں نے اجازت دے دی۔ تمہارے دل میں گنجائش ہو تو اپنے ساتھ رکھ لینا مگر وہ میری امانت ہوگی..... تم دونوں کے پاس..... جب کہو گے، لینے کے لیے پہنچ جاؤں گی۔“

میں نے بغیر کسی خواہش کے چیک تھاما اور مریم کی طرف بڑھا دیا۔ اُس کے ہاتھوں میں دونوں چیک لرزنے لگے۔ لرزتی ہوئی مگر نہایت دھیمی آواز میں بولی۔ ”میں کافی

مہنگی ہوں ناں!“

مسز فردوس نے پیار سے اُس کے گال پر چپٹ لگائی اور ہم دونوں کو مہر و کے حوالے کر کے مہمانوں کے ساتھ پلٹ گئی۔ میں نے دھڑکتے دل سے مریم کی طرف دیکھا جو بیس میک اپ میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ میں نے مہر و کی طرف دیکھا جس کا چہرہ کچی خوشیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ لپک کر ہمارے درمیان آئی۔ دونوں کی کمرے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پارکنگ میں آئی۔ پلٹ کر برآمدے میں کھڑی مسز فردوس کو گڈ بائے کہہ کر ہاتھ لہرانے لگی۔

میں نے مریم کا ہاتھ تھاما اور شیرا ڈنگا کی طرف بڑھا۔ مہر و کی آواز نے تھام لیا۔ ہمیں پارکنگ کے نشانی کوٹنے میں لگی جہاں ایک نئی ٹویلی سیاہ رنگ کی چمکدار کار کھڑی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر جھٹکا سا لگا کہ اُس کی ڈرائیونگ سیٹ پر عبدالکریم براجمان تھا۔

میں نے مہر و کی طرف دیکھا۔ وہ بہت پر جوش تھی۔ ہمیں گاڑی میں دھکیل کر بولی۔ ”کالے رنگ کی فیکٹ گلاس والی نئی کار ہو، تمہاری دلہن نے گہرے نیلے ویلوٹ کا سوٹ پہنا ہو، تم نے سیاہ بیٹن اور سرخ شرٹ..... اور اس شان سے ہنی مون پر جانا چاہتے تھاناں تم؟“

مجھے حیران چھوڑ کر اپنی شیرا ڈنگا کی طرف بڑھ گئی۔ کاریں آگے پیچھے گیٹ سے نکلیں۔ میرا دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مہر و اور مسز فردوس نے میرے ساتھ کیوں اتنا بڑا کھیل کھیلا تھا۔ شیرا ڈنگا کے مین گیٹ پر رُک گئی جبکہ عبدالکریم نے مین روڈ پر ہی گاڑی روک دی۔ مہر و اتری اور تیز قدموں سے ہماری جانب آئی۔ گاڑی کے پورٹ پر ہاتھ رکھ کر فرنٹ اسکرین میں سے جھانک کر ہمیں دیکھتی رہی پھر ہاتھ اٹھا کر کوئی دعا مانگنے لگی۔ یہ آواز بلند ماشاء اللہ کہہ کر عبدالکریم کی طرف آئی، بولی۔ ”تمہیں ہوٹل کا علم ہے ناں، فیکٹریلا۔ کرا نمبر دو سو بائیس..... تم دس دنوں تک ویکم اور مریم کے ساتھ رہو گے۔“

پھر میری طرف آئی۔ شیشہ اتارنے کا اشارہ کیا۔ عبدالکریم نے شیشہ اتارا۔ میرا ہاتھ تھام کر خوشی سے بولی۔ ”تم دونوں دس دن ہنی مون منانے کے لیے مری جا رہے ہو۔ اوکے..... اور دیکھ لینا..... تمہارے کبھی خواب پورے ہو چکے ہیں۔ کالی کار، دنیا کی خوبصورت ترین دلہن جسے میں عروسی غرارے کے نیچے نیلا ویلوٹ کا سوٹ پہنا کر لائی ہوں..... اور ویکم! تم اپنے سوٹ کا بھی جائزہ لو..... مہر و چندہ سالوں میں کچھ بھول گئی ہو تو معاف کر دینا..... گڈ بائے!“

ہوئے بولی۔ ”کافی دنوں سے بھرپور نیند نہیں ملی۔ سو جا، آج جی بھر کر سوتی ہوں۔ ساری تھکاوٹ اتر جائے گی۔ کل بچوں کو لینے اسکول جاؤں گی۔ سدرہ کو بھی لانا ہے۔ تمہارے آنے تک وہ میرے ساتھ رہیں گے۔“

میں نے دیکھا کہ اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آنکھوں کا موت آگیاں خلا دیکھ کر میری رہی سہی تاب بھی دم توڑ گئی۔ میں بے اختیار بیڈ پر گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔ ”مہر! مجھے ڈر لگنے لگا ہے، تمہاری خالی آنکھیں دیکھ کر..... مجھے بتاؤ، تمہاری آنکھوں میں خلا کیوں ہے؟“

وہ مسکرائی۔ بارش اور دھوپ کا منظر اُس کے چہرے پر سج گیا، بولی۔ ”نہیں وسیم! میں آج بہت خوش ہوں۔ میں نے تمہارے خواب دنیا کے بازار سے خرید لیے ہیں۔ کیا یہ معمولی خوشی ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”مگر تم بڑے کھور ہو۔ اپنے خوابوں کی تکمیل کے بدلے ایک کھوکھلی مسکراہٹ بھی مجھے نہیں دے پائے۔ ہے ناں؟ کبھی مرد ایسے ہی ہوتے ہیں کیا؟“ اس کے لہجے نے مجھے آہن واحد میں توڑ دیا اور میں اُس کے ہاتھ چوم کر اُس کی گود میں سر ڈال کر سسکنے لگا۔ وہ کہنے لگی۔ ”کیوں رونے لگ گئے؟ ہیں؟..... مسکراؤ ناں میرے وسیم!“

میں نے نفی میں سر ہلایا، وہ بولی۔ ”کچھ کمی رہ گئی؟“ میں نے سر اٹھایا۔ میری آنسوؤں سے دھلی آنکھوں کو مہر و بڑی خوب صورت لگی۔ میں نے دالہانہ انداز میں اُسے چوم لیا اور بانہوں میں بھر کر اٹھا دیا، کہا۔ ”میرے خواب میں ڈرائیور کا کردار نہیں تھا۔ تم یہ بات بھول گئی تھیں ناں..... چلو ہمارے ساتھ کیونکہ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔“

میں نے اُسے کھینچ کر بیڈ سے اُتارا۔ ایسے ہی وقت میں کمرے میں سایہ سا لہرایا۔ پلٹ کر دیکھا۔ مریم دروازے کی دہلیز تھام کر بڑے جاندار انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میرے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ تیر گئی جو بدترجیح بڑھتی ہوئی قہقہے میں بدل گئی اور میں نے خالی آنکھوں والی مہر کو بانہوں میں بھر کر کھینچ لیا، اتنی قوت سے کہ اُس کی آنکھوں کا خلا ایک دم ختم ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد سیاہ کار کے بندشیشوں میں ٹیپ پلیئر سے موسیقی پھوٹ رہی تھی جبکہ مہر کی مدھرا آواز سازوں کے ہم آہنگ نغمہ ریز تھی۔ ”ایک احساس ہے یہ، روح سے محسوس کرو..... پیار تو بیکار ہے، رہنے دو، کوئی نام نہ دو.....“



میرے منہ سے نکلا۔ ”گڈ بائے!“

وہ بولی۔ ”وسیم! میری جان! میری جھولی خالی ہے۔ ایک مسکراہٹ ہی دے دو.....“

میں اُسے کئی لمحے تک دیکھتا رہا۔ کوشش کے باوجود مسکرا نہ پایا تو سر انگٹندہ ہو گیا۔ شاید میری نہ ہنسنے کی عادت بہت پختہ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے۔ آنکھوں کی جگہ خلا بھر گیا۔ موت کی سی خشکی دیکھ کر میرے رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اچانک پلٹی اور تیز تیز قدموں سے گیٹ پر کھڑی شیراڈ کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے کن آنکھوں سے اپنا سوٹ دیکھا۔ مریم پر نظر ڈالی جو وارفتہ نظروں سے دور جاتی ہوئی مہر کو دیکھ رہی تھی۔

عبدالکریم نے جیب سے پرس نکالا۔ دونوں سیٹوں کے درمیان سے میری طرف بڑھایا۔ بولا۔ ”صاحب! یہ بیگم صاحبہ نے آپ کے لیے دیا ہے۔ اس میں پیسے ہیں۔“

میں نے لرزتے ہاتھوں سے تھام لیا۔ اُس نے گاڑی سیدھ میں بڑھالی۔ مین گیٹ پیچھے رہ گیا۔ مجھے ایک خیال آیا، پوچھا۔ ”عبدالکریم! یہ گاڑی مہر النساء نے خریدی ہے؟“

”جی صاحب! میں اور بیگم صاحبہ اکٹھے گئے تھے شوروم پر۔ پندرہ لاکھ کی آئی تھی۔ ہفتہ بھر شوروم پر ہی کھڑی رہی۔ آج صبح میں نے جا کر وصول کی ہے۔“

”پندرہ لاکھ!“ میرے حلق سے لمبی سانس خارج ہوئی۔ مہر نے یقینی طور پر اپنی جمع خرچ والی قائل کے آخری خانے میں پندرہ لاکھ کے ہندسوں کے سامنے نئی کار کے لفظ لکھ دیے ہوں گے۔ اچانک جیسے کوئی میرے دل میں ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ میں نے بے ساختہ عبدالکریم کو رکنے اور گھر چلنے کا حکم دیا۔ وہ مہر کے حکم کو اولیت دیتا تھا۔ میرے حکم پر پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ مریم کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”سر! آپ کیوں واپس جانا چاہتے ہیں؟“

”میں جانے سے پہلے مہر سے ایک مرتبہ ملنا چاہتا ہوں۔“ مریم نے میری تائید کی۔ ناچار عبدالکریم کو گاڑی موڑنا پڑی۔ اُسے مین گیٹ پر روک کر میں گاڑی سے اُترا اور دوڑتا ہوا پچھلے میں کھس گیا۔ میری توقع کے برعکس مہر و بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اُس کی کھلی ہتھیلی پر ایک ننھی سی گولی اور دائیں ہاتھ میں پانی کا گلاس دبا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر گھبرا سی گئی، بولی۔ ”تم؟ تم لوٹ کیوں آئے؟ وہ مریم کہاں ہے؟“

میں نے اس کی پریشانی کو نظر انداز کیا۔ گولی کی طرف اشارہ کیا، بولا۔ ”تم یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ ہنسی۔ گولی پھانک کر، پانی کا گھونٹ بھر کر نگلتے